

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

ماچ 2015

شعاع

پاکستان کی عورتوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM



275	خالہ جیلانی	کھلنا کسی سے	26	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پگوان	270	صابحہ	مسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے سے	276	واصفہ بیگل	ایسے خالے میں
			272	شگفتہ جاہ	یا اول سے خوشبو لے
			285	امت الصبور	تاریخ کے چھروکے
			278	آمنہ زین	سیر و جہاں

سابقہ 2015
 جلد 29 نمبر 7
 قیمت 60 روپے

قلم و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
 رقبہ تجلیاں ملوں حصہ ہشتنگ پڑی ہے سمجھا کر شائع کیا - مقالہ اللہ باری ہی پر ہی اللہ سوا کی کوئی
 Phone: 32721777, 32726817, 021-32022494 Fax: 0092-21-32768872
 Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

Copied From Web



94 غریقِ رحمتؑ مسو ساجد
66 یہ تو دل کی باتؑ نازیہ جمال

10 رضیہ جمیل پہلی شعاعؑ
11 تنویر بھول حمدؑ
ریاض الدین سہروردی نعتؑ
12 ادارہ نئی کی باتیںؑ



54 نور عین جھکؑ
63 ملیحہ صدیقی اللہ بخشےؑ
91 جویریہ شاہ احساہیںؑ



22 شاہین رشید دستکؑ
283 ادارہ شعاع کے ساتھؑ
17 شاہین رشید اغا علی عباسؑ



268 اقبال صفی پوری غزلؑ
268 علی عباس زبیری غزلؑ
269 تاجدار عادل غزلؑ
269 ثناء شیخ نظمؑ



36 رضوان گاروستان ایک تھی پیشالؑ
252 نبیلہ عزیز قصہ بزمؑ



178 سیر احمد یامؑ
124 روزنا افتخار قیدؑ

زکریا اللہ شاہ صاحب کی تصانیف
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 100 روپے

اعتبار: ہمارے شعاع اور جست کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلے کی کسی بھی اجازت سے دقت شائع کیا جاسکتا ہے۔ وہ کسی بھی ٹی وی چینل پر یا ماس میڈیا پر منسلک اور منسلک اداروں کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



شعرا کا مدارج کا شمار آپ کے ناموں میں ہے۔
 تخلیق کائنات کا مرکز و محور انسان ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی۔ اسے شعور عطا کیا گیا،
 خود فکر کی صلاحیت دی گئی، قدرت نے انسان کی فطرت میں نیکی، خیر، سچائی و دیانت کی بے جو کائنات کا
 من اور اس کی بقا کی اساس ہے۔ بات اس الگ ہی کی ہے جو انسان کی اپنی ذات کا عرفان دیتی ہے۔ انسان کو
 اس قابل بناتی ہے کہ وہ غایبوں کو جان کر اپنے دود کرے اور اپنی نفسی خوبیوں کو اجاگر کرے۔ خود کرے کہ
 کائنات میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے، اس کی تخلیق کس مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ اپنی ذات کا عرفان ہی
 اللہ تعالیٰ کی پہچان کرتا ہے اور یہ ہمیں خود و فکر اور علم سے حاصل ہوتا ہے۔ علم کے لیے کبھی بھی مرد و عورت کی
 تخصیص نہیں ہے۔

ایک لمحے کو ایک لمحے معاشرے کی تشکیل میں خواتین کا کردار بہت اہم ہے۔ کیونکہ بچے کی پہلی درس گاہ
 ماں کی آغوش ہے اقدار استقامت تربیت کے اثرات تمام زندگی شخصیت پر عائد رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے
 کہ لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر بھی توجہ دی جائے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاسکے جس کی بنیاد
 مادیت نہیں بلکہ اخلاقی اور باطنی اقدار ہوں۔

روز بروز

سیر احمد کا ناول 'یارم' اختتام کو پہنچا۔ محنت من عزم کے بعد یہ سیر احمد کا دوسرا ناول تھا۔ پہلی قسط سے ہی
 اس ناول نے قارئین کی توجہ حاصل کر لی۔ بولوں ناول کے بڑھتا رہا۔ مختلف آڈیو سائٹس آئی ہیں۔ اب جبکہ ناول
 کا اختتام ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ لوگوں کو اپنے بہت سے سوالات کے جوابات مل گئے ہوں گے۔
 اگر آپ سیر احمد سے کوئی پوچھنا چاہتی ہیں، تو روز بروز اپنی 'یارم' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتی
 ہیں۔ اس پر کوئی تنقید و تبصرہ کرنا چاہتی ہیں تو لکھ کر بھجوائیں۔ سیر احمد آپ کے سوالات کے جواب دیں گی۔
 سوالات اس طرح بھجوائیں کہ 25 مارچ تک ہمیں ارسال ہو جائیں۔

ایڈیٹس ہے۔

سیر احمد، معرفت شعاع 37۔ 2015 بازار کراچی۔

اس شمارے میں،

- موت انوار کا ناول۔ قید
- سیر احمد کے ناول 'یارم' کی آخری قسط،
- سحر مایہ اور نازیہ جمال کے ناولٹ
- نور عین، علیہ مدنی اور جریرہ شاہ کے افسانے،
- رخصت نگار ورنانہ اور سید عزیز کے ناول،
- فی وی فنکار افاغیہ اس سے ملاقات،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جوش گیسو وہاں کرنا۔ آمنہ ندیم کا تبصرہ،
- پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خدا آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

ماہنامہ شعاع مارچ 2015

باری تعالیٰ
صد

پروردگار بھی ہے، وہ کارساز بھی ہے
بندوں کا ہے وہ آقا، بندہ نواز بھی ہے

محشر میں سب کہیں گے ہم ایک دن ہے ہیں
دنیا میں یوں تو حاصل عمر فرماز بھی ہے

وہ ہے عظیم و شاکر اور واحد و حمد بھی
بندوں کا قدرواں ہے اور بے نیاز بھی ہے

آنکھوں میں جو نمی ہے وہ جانتا ہے اُس کو
رحمت کا اُس کی مرکز ارضِ حجاز بھی ہے

انسانیت کی خدمت انسان پر ہے لازم
آدابِ بندگی میں روزہ نماز بھی ہے

اُس کا کرم ہے اُس نے سوزِ دلی بے نغتا
آنکھوں سے اشک نکلے دل میں گداز بھی ہے

لا تعظو کہا ہے قرآن میں پھول اُس نے
ذرا اُس کی رحمتوں کا ہر وقت باز بھی ہے

تنویر پھول

رسول مقبول
سبح

مجھ میں ان کی ثنا کا سلیقہ کہاں وہ شہبہ دو جہاں وہ کہاں میں کہاں
ان کا مدح سرا خالق ایں و اں وہ رسول زماں وہ کہاں میں کہاں

ان کے دامن سے والبتہ میری نجات ان پہ قرباں میری حیات عمت
میں گنہگار وہ شافع عاصیاں نیکوں کی اماں وہ کہاں میں کہاں

وہ مدینہ، یگینہ ہے جو عرش کا وہ مدینہ بھرم جو بنا فرش کا
وہ مدینہ جہاں رحمت بیکراں میں بھی پہنچوں وہاں وہ کہاں میں کہاں

میں سراپا آدم، وہ سراپا وجود ان پہ ہر دم سلام ان پر ہر دم دود
وہ حقیقت میں افسانہ و داستان ان کا میں مدح خواں وہ کہاں میں کہاں

شک نہیں اے ریاض اس میں ہرگز ذرا، وہ سراپا عطا میں سراپا خلا
نام ان کا رہے کیوں نہ دود زباں میں وہ تسکین جاں وہ کہاں میں کہاں

ریاض الدین سہروردی

ماہِ شعل مارچ 2015ء

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اللہ کی رضا مندی

اللہ کی رضا مندی کے لیے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو شخص وہ علم جس سے اللہ کی رضا مندی طلب
کی جاتی ہے، اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے
ذریعے سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرے تو وہ
قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔
(اسے ابو داؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)
فائدہ: اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ علم دین
صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے اگر دنیا
حاصل کرنے کا مقصد پیش نظر ہو گا تو یہ بہت بوجرم
ہے کہ دین کا عالم جنت کی خوشبو تک سے محروم رہے
گاہل ناغیر تصدو نیت کے دنیا مل جائے تو اور بہت ہے،
وہ انسان کے لیے نقصان دہ نہیں۔

علم کا اٹھ جانا

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ
بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
”اللہ تعالیٰ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے
لوگوں (کے سینوں) سے کھینچ لے، لیکن وہ علم کو علماء
کی وفات کے ذریعے سے اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ
جب وہ کسی عالم کو پائی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو
سرور بنا لیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ
بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اور (لوگوں) خود بھی گمراہ ہوں
گے اور وہ سوال کو بھی گمراہ کریں گے“ (بخاری و
مسلم)

فوائد و مسائل:

1- یہ قرب قیامت کی ایک علامت کا بیان ہے کہ
علمائے دین ناپید ہو جائیں گے اور جاہل لوگ سرور
پیشوا اور امام بن جائیں گے جن کو قرآن و حدیث کا علم
ہی نہیں ہو گا اس کے باوجود مفتی اور مجتہد بنے ہوں
گے اور اپنے فتویٰ اور خود ساختہ مسئلوں سے اپنے
ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہی کا باعث بنیں گے۔
2- اس میں جہاں اس امر کی ترغیب ہے کہ علمائے
دین زیادہ سے زیادہ تیار کیے جائیں وہاں اس کی بھی
تائید ہے کہ جاہلوں کو دین کا پیشوا بنانے سے اجتناب
کیا جائے۔

اللہ کی حمد و شکر کا بیان

شکر کی فرضیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”ہیں تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور تم
میرا شکر ادا کرو اور میری شکری نہ کرو۔“ (البقرہ۔
152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اگر تم شکر کرو گے تو
یقیناً میں تمہیں اور زیادہ (نعیمیں) دوں گا۔“ (سورہ
براہیم)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے پیغمبر! کہہ دیجئے
تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔“ (اسراء 111)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اور ان کی آخری پکاری
ہو گی کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام
جہانوں کا پالنہار ہے۔“ (نورس۔ 10)

فائدہ : اس میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ کی حمد کرنے کی نصیحت کا بیان ہے۔ خاص طور پر اولاد کی دائمی جدائی کے صدمے پر جزع فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اللہ کی رضا و تقدیر پر صبر و شکر کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔
تقریباً اور زیادہ۔

جنت کا بیان

حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ تمہارے لیے اب زندگی ہی زندگی ہے۔ تم کبھی موت سے ہمتا نہیں ہو گے اور یہ بھی کہ تم صحت مند رہو گے، کبھی بیمار نہیں ہو گے اور یہ کہ تم جوان رہو گے، کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور یہ کہ تمہارے لیے راحت ہی راحت ہے، تمہیں کبھی تکلیف نہیں آئے گی۔“ (مسلم)

فوائد مسائل : دنیا میں انسان جب تک اس کی زندگی ہے، زندہ تو رہتا ہے لیکن یہ پتا نہیں ہو گا کہ یہ زندگی کب ختم ہو جائے گی۔ صحت مند سے صحت مند انسان بھی اس خطرے کی زد میں رہتا ہے کہ پتا نہیں کب کوئی بیماری اس پر حملہ کرے۔ اسی طرح جوانی کو قرار نہیں دیا جہاں بے خبری ہو جاتی ہے، راحت و آرام کا بھروسہ نہیں کہ انسان کب اس سے محروم ہو جائے اور کلفتوں اور تکلیفوں میں گھر جائے۔ غرض دنیا کی کسی چیز کو ثبات و دوام نہیں۔ جب کہ جنت میں ہر چیز نازل و ناسا سے محفوظ ہوگی۔ زندگی ہوگی موت نہیں۔ صحت ہوگی بیماری نہیں۔ جوانی ہوگی بوچھلا نہیں۔ راحت و آسائش ہوگی دکھ اور تکلیف نہیں۔

علم چھپانے والا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

فائدہ آیات : اللہ کو یاد کرنے کا مطلب اس کا ذکر اور اس کی اطاعت و قربانی ہے۔ اسی طرح خوش حالی میں بھی اسے یاد رکھنا اور حالات کی شدتوں میں بھی کسی اور کے در پر جانے سے گریز کرنا ہے اور اللہ کے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں پر اس کا تذکرہ فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کا مفہوم انسان کی قدر افزائی اور اسے اپنی مغفرت و رحمت سے شکر کا کام فرماتا اور غنیمتوں میں اس کی چارہ سازی کرنا بھی ہے۔ شکر یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ سب کچھ دینے والا صرف ایک اللہ ہے، پھر اللہ کی نعمتوں پر زبان سے اللہ کی حمد کرنا قبول شکر ہے اور اس کے حکموں کی اطاعت کرنا عملی شکر ہے۔ اور عدم شکر، کفران نعمت ہے جو بہت بڑا گنہ ہے۔ حمد کا مطلب ہے : زبان سے تعظیم کے طور پر منعم کی شکر تعریف کرنا۔ نل ایمان کی زبانوں پر جنت میں بھی اللہ کی حمد کے ترانے ہوں گے۔ جعلنا اللہ منہم۔

مجر

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جب کسی بندے کی اولاد فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے : ”تمہارے میرے بندے کی اولاد کی مدح کو بعض کیا ہے؟“
تو وہ کہتے ہیں : ”ہاں۔“

چنانچہ اللہ فرماتا ہے : ”تم نے اس کے بل کا پھل بعض کیا ہے؟“
وہ کہتے ہیں : ”ہاں۔“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :
”میرے بندے نے کیا کہا؟“

وہ کہتے ہیں : ”اس نے تمہاری حمد بیان کی اور اللہ و اہل بیت پر حمد۔“
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ”تم میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔“
(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”جس سے علم دین کی کوئی بات پوچھی جائے، پھر وہ
 اسے چھپائے تو قیامت والے دن اس کو آگ کی لگام
 دی جائے گی۔“

(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور
 ترمذی نے کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے)
 قائلہ : اس سے معلوم ہوا کہ مسائل کو دین کی صحیح
 بات نہ اتانا سخت کبیرہ گنہ ہے جس پر جہنم کی شدید
 وعید ہے۔

نایاب قول

حضرت ابو ہریرہؓ کا کرتے تھے۔
 ”اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی محبوب نہیں۔ (زمانہ
 نبویؐ میں) بھوک کے مارے میں زمین پر اپنے پیٹ
 کے بل لیٹ جاتا تھا اور یہی میں بھوک کے مارے
 اپنے پیٹ پر پھر باندھا کرتا تھا۔ ایک دن میں اس
 راستے پر بیٹھ گیا جس سے صحابہ گزر رہے تھے۔
 حضرت ابو ہریرہؓ نے گزرے اور میں نے ان سے
 کتاب اللہ کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا، میرے
 پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں، مگر وہ
 چلے گئے اور کچھ نہیں کیا۔“

پھر حضرت عمرؓ میرے پاس سے گزرے، میں نے
 ان سے بھی فرق مجید کی ایک آیت پوچھی اور پوچھنے
 کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں، مگر وہ بھی
 گزر گئے اور کچھ نہیں کیا۔
 اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور
 آیت نے جب مجھے دکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم
 مسکرا دیئے اور آپ میرے دل کی بات سمجھ گئے اور
 میرے چہرے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تازہ کیا۔
 پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”ابا ہریرہ!“

میں نے عرض کیا: ”بلبیک یا رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم!“
 فرمایا: ”میرے ساتھ آجیو۔“ اور آپ صلی اللہ
 علیہ وسلم چلنے لگے۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کے پیچھے چل دیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھر گھر میں تشریف
 لے گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تو
 ایک بیالے میں ۱۵۵۵ ملا سوریا نت فرمایا۔

”یہ ۱۵۵۵ کھان سے آیا ہے؟“
 کہا۔ لائل یا قلانی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے
 لیے تحفہ میں بھیجا ہے۔
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ابا ہریرہ!“
 میں نے عرض کیا کہ لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم!“
 ”فرمایا اگل صفحہ کے پاس جاؤ اور انہیں بھی میرے
 پاس بلا لاؤ۔“

اگل صفحہ اسلام کے مہمان تھے وہ نہ کسی کے گھر
 پناہ دھونڈتے نہ کسی کے محل میں اونہ نہ کسی کے پاس آ
 جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ آتا تو
 اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی کے پاس بھیج
 دیتے اور خود اس میں سے کچھ نہ رکھتے البتہ جب آپ
 کے پاس تحفہ آتا تو انہیں بلا بھیجتے اور خود بھی اس میں
 سے کچھ کھاتے اور انہیں بھی شریک کرتے چنانچہ
 مجھے یہ بات ناگوار گزری اور میں نے سوچا کہ یہ ۱۵۵۵
 ہے ہی کتنا کہ سارے صفحہ والوں میں تقسیم ہو اس کا
 حق دار میں تھا کہ اسے لی کر کچھ قوت حاصل کرنا جب
 صفحہ والے آئیں گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 مجھ سے فرمائیں گے اور میں انہیں اسے دے دلاں گا
 مجھے تو شاید اس ۱۵۵۵ میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا
 لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم
 برداری کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں
 ان کے پاس آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
 دعوت پوچھ لی۔

وہ آگئے اور اجازت چاہی، انہیں اجازت مل گئی پھر
 وہ گھر میں اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ابا ہریرہ!“
 میں نے عرض کیا۔ ”لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم!“
 فرمایا۔ ”تو اور سے کون سب حاضرین کو دے دو۔“
 پھر میں نے پالہ پکڑ لیا اور ایک ایک کو دینے لگا
 ایک شخص ۱۵۵۵ لی کر جب سیراب ہو جاتا تو مجھے پالہ

امرازی کی وجہ سے ہوگا۔
2۔ نمازیوں سے مراد مسلمان ہیں۔

سزا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلق منقطع رکھے چنانچہ جو شخص تین دن سے اوپر تعلق منقطع کر کے رکھے گا اور اسی حالت میں اسے موت آئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔“ (اسے ابو داؤد نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو بخاری کی شرط پر ہے۔)
فائدہ : جہنم میں یہ دخول بطور سزا کے ہوگا سزا بھگتنے کے بعد اسے جہنم سے نکل کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ بیشہ جہنم میں رہنا صرف کافروں کے لیے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جو چاہے کر لے وہ بطور سزا بھی جہنم میں نہیں جائے گا ایسا سمجھنا غلط ہے۔

تعلق توڑنا

حضرت ابو خراش حدیث میں لہی حدیث اسلمی اور بعض کے نزدیک سلمی، صحابی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی سے ایک سال تک تعلق منقطع رکھے گا تو اس کا یہ عمل اس کا خون بہانے کے برابر ہے۔“ (اسے ابو داؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل : 1۔ ترک تعلق بھی ایک طرح سے معنوی قتل ہے جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ذہنی لڑت سے گزرنا پڑتا ہے اس لیے اسے قتل کے مترادف قرار دیا۔

2۔ بول چال یا ترک تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، مثلاً کوئی شخص بدھتی ہے یا کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود وہ اپنی

واپس کرتا پھر دوسرے شخص کو تادم بھی میر ہو کر چتا پھر یہاں مجھے واپس کر دینا اور اسی طرح میرانی کر پھر مجھے یہاں واپس کر دینا اس طرح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پکڑا اور اپنے ہاتھ پر رکھ کر آپ نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر فرمایا۔

”ابا ہریرہ“

میں نے عرض کیا۔ ”بلیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح فرمایا۔“
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بیشہ جاؤ اور یہ۔“

میں بیشہ گیا اور میں نے دیکھا یہاں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر فرماتے رہے کہ

”اور یہ۔“

آخر مجھے کہنا پڑا، نہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ سمجھا ہے اب بالکل تمنا بخش نہیں ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”پھر مجھے دے دو۔“

میں نے یہاں آپ کو دے دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد بیان کی اور بسم اللہ پڑھ کر بچا ہوا خود پٹی گئے۔

شیطان

حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
”شیطان یقیناً اس بات سے ماہوس ہو گیا ہے کہ نمازی جزیرہ عرب میں اس کی عبادت کریں گے مگر ان کے درمیان فسوڈالنے میں (وہ کامیاب رہے گا۔“)

(مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے، مگر آپس کے اور باہم تعلقات منقطع کر لیں گے اور یہ کام شیطان کی شرارت، اس کی لنگھت اور دوسرے

فوائد مسائل : کوئے کی طرح ٹھوٹھیں مارنے کا مطلب جلدی جلدی سجدے کرنا ہے یہ عمل نماز میں توجہ اور خشوع کے خلاف ہے اس لیے تمام ارکان اطمینان سے پورے اذکار اور دعائیں پڑھتے ہوئے ادا کرنے چاہئیں۔

سجود کرتے وقت صرف ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں، کھنٹیوں تک بائو زمین پر پھیلاؤ اور ست نہیں۔

نماز کے لیے جگہ مقرر کرنا اور وہ سروں کو وہاں نماز پڑھنے سے، کنا جائز نہیں کیونکہ مسجد سب کے لیے مشترک ہے ہاں اگر جگہ خالی دیکھ کر وہاں نماز پڑھتا ہے اور اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ وہیں نماز پڑھے تو جائز ہے یا مثلاً : ایک شخص صف میں دائیں طرف کھڑا ہونا پسند کرتا ہے تو یہ جائز ہے جبکہ پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص کو اٹھایا نہ جائے۔

نماز پڑھتے وقت اگر جوتے اتارے جائیں تو کھل رکھے جائیں۔

1431- حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت

ہے انہوں نے فرمایا۔ "میں نے حج مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے نماز پڑھی تو اپنے جوتے اپنے بائیں طرف رکھے۔"

فوائد مسائل : جوتے پہن کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور جوتے اتار کر پڑھنا بھی۔ جوتے اتار کر نماز پڑھیں تو انہیں بائیں طرف رکھیں۔



بدعت یا فسق و فجور سے باز نہ آئے تو ایسے شخص سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بول چال بند کروں تا اور تعلق منقطع کر لیتا جائز بلکہ مستحب ہے، تاکہ اسے عبرت و نصیحت ہو اور اس طرح شاید وہ باز آجائے۔ لیکن محض دعویٰ و تجسوس کی وجہ سے تین دن سے زیادہ تعلق منقطع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سلام کا جواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مومن سے تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے۔ چنانچہ اگر اسی حالت میں تین دن گزر جائیں تو چاہیے کہ اس سے ملاقات کر کے اسے سلام کرے، اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں لوگوں کو اب میں شریک ہو گئے اور اگر اس نے (کشیدگی کو برقرار رکھے ہوئے) سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہگار ہو اور سلام کرنے والا ترک تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔"

(اسے امام ابو داؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے نیز انہوں نے فرمایا: اگر ترک تعلق اللہ کے لیے ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں۔)

باب : 204- مسجد میں نماز کے لیے ایک جگہ مقرر کر لینے کا بیان

1429- حضرت عبدالرحمن بن حبل سے

روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کاموں سے منع فرمایا ہے۔ کوئے کی طرح ٹھوٹھیں مارنے سے، دندے کی طرح ہانڈ پھیلانے سے اور اس بات سے کہ آدمی نماز کے لیے ایک جگہ مقرر کر لے جس طرح لوٹ (باڑے میں اپنے لیے) جگہ مقرر کر لیتا ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

آغا علی عیاشی سے ملاقات

شاہین رشید

”جی جی ضرور۔ اور تیل نہیں رہا۔ سچ بتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی پروجیکٹ مینوں میں کھل ہو جاتا ہے اور کوئی سائوں میں۔ تو بس اس فیلڈ میں سب کچھ چٹا ہے۔ اس لیے نہیں بتا رہا۔“

”ڈراموں کے حوالے سے تو آپ کو لب لب ہی جانتے ہیں اپنی نجی لائف کے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”میں جی 4 دسمبر 1986ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ پیر سے سب ”سونو“ کہتے ہیں۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں بھائی مجھ سے بڑے ہیں اور بہن چھوٹی۔ اور میں بیچ کا۔“

”بیچ کے لوگ عموماً شکوہ کرتے ہیں کہ انصاف نہیں ملتا۔ آپ کے ساتھ ایسا ہوا۔“

”بہتے ہوئے“ نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا، ہم تینوں بہن بھائیوں میں ماشاء اللہ بہت محبت ہے اور میں اس بات کو نہیں مانتا کہ بیچ کے لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔“

”اس فیلڈ میں نام بنانے کے لیے مقام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ آسانی سے مل گیا یا کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑی؟“

”کچھ جدوجہد؟ ارے جی جدوجہد سے ہی سب کچھ حاصل کیا۔ کیونکہ والد صاحب کا جب انتقال ہوا تو ہم تینوں کافی کم عمر تھے۔ اور کم عمری میں ماں یا باپ کا ساتھ نہ رہے تو پھر سوائے اللہ کے اور کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ تو بہت محنت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔“

”ہوں۔ تمہوڑا جانا پسند کریں گے کہ کس طرح وقت گزرا۔ اور کیا کیا کیا؟“

شوہر میں اگرچہ سفارش بہت چلتی ہے، مگر کامیاب وہ ہی ہوتا ہے جس کے پاس لیٹنٹ ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اس فیلڈ میں کامیاب ہوتا ہے جس کے خون میں فن لوکاری جذب ہوتا ہے۔ آغا علی عباس کے خون میں بھی اداکاری رہتی رہی ہوئی ہے۔ آغا سکندر کے صاحبزادے جو ہیں۔ آج کل ٹائمز میں انہیں مختلف ڈراموں میں دیکھ رہے ہوں گے بہترین ریٹائٹنگ پرفارمر ہیں۔ اس لیے نوجوانوں کی پسند ہیں اور ڈائریکٹرز کی بھی۔

”کیسے ہیں آغا علی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”بہت مصروف رہتے ہیں۔ بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ہے آپ کے پاس؟“

”جی جی۔ واقعی بہت مصروف ہوں اور بیچ میرے پاس ٹائم نہیں ہے بات کرنے کا۔“

”مائے اللہ آج کل ہر دوسرا تیرا ڈرامہ آپ کا ہی ہوتا ہے۔ کیا لگ رہا ہے؟“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے عزت و شہرت دی۔ تو کون ہو گا جس کو اچھا نہ لگ رہا ہو۔ مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”اور کیا مصروفیات ہیں آج کل۔“

”جو آن ایر ہیں۔ آپ دیکھ رہی ہوں گی اور جو انڈر پروڈکشن ہیں ان کے بارے میں بتانا فضول ہے۔ کیونکہ نہ جانے کب مکمل ہوں۔ کب آن ایر ہوں اور نہ جانے کس چینل پہ آن ایر ہوں۔“

”گڈ۔ بات کو ٹالنا خوب آتا ہے خیر کچھ اور باتیں ہو جائیں؟“



کہ مجھے اپنے پہلے پہلے ڈراموں سے اتنی شہرت مل جائے گی کہ یہ راستہ نہیں گئے میرے اگلے پروجیکٹ کے لیے۔ میں تو شکر گزار ہوں طارق معراج صاحب تاکہ جنہوں نے مجھ پر بھروسا کر کے اتنے بڑے سیریل میں ایک بڑا اور جان دار رول دیا۔ حالانکہ اس وقت میں بالکل نیا تھا۔ اور میں تو وہ وقت بھی نہیں بھولوں گا جب طارق معراج صاحب نے مجھے فون کر کے کہا کہ آتا مجھے تم پر خرابے بتائیے اس وقت میرا خون کتنا بڑھا ہو گا۔

”بتدائیں اور کیا کیا کیا؟“

”بتدائیں تو ہوسٹنگ کی سوشل راولڈ اپ کیا۔ 2006ء میں اس فیلڈ میں آیا۔ اور آج 2015ء ہو گیا ہے۔ تو قدم بہ قدم ترقی حاصل کی ہے راتوں رات نہیں۔ کرسٹلز بھی کیسے فلم بھی۔ ڈرامے تو بہت کر چکا ہوں۔“

”اب مطمئن ہیں۔ شہرت پا کر مزا آرہا ہے؟“

”الحمد للہ اپنی لائف سے بہت مطمئن ہوں۔ اللہ بڑا مہربان ہے محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے اور شہرت؟؟، شہرت اور فیلڈ تو میرا خواب تھا۔ اللہ نے میرا یہ خواب

نے آج ہم تینوں بہن بھائیوں کو سرخرو کیا ہے۔“

”اس جدوجہد کے دور میں کیا سوجتے تھے کہ منزل کیا ہے۔ فیوچر میں کیا کرنا ہے۔ یا منتظر تھے کہ کوئی راستہ دکھائے۔“

”کوئی راستہ دکھائے؟ اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ بس اللہ راستہ دکھائے یہ ضرور سوچا کرنا تھا۔ اور جیسا کہ کہا کہ والد صاحب اس فیلڈ میں تھے اور بن کا بڑا نام تھا تو دل چاہتا تھا کہ ہم بھی اس فیلڈ میں ہوں اور والد کی طرح مشہور ہوں۔ اور یہ میرا خواب تھا کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔ اور اللہ نے میرا یہ خواب پورا کیا۔“

”یا قائدہ آدہ کیسے ہوئی، کس نے متعارف کرایا؟“

”مجھے اس فیلڈ میں طارق معراج صاحب اور رفیق و زاہد صاحب نے متعارف کرایا اور میرا پہلا پروگرام ”راؤنڈ اپ“ تھا جس کا میں میزبان تھا ان دنوں نے

پھر مجھے اداکاری کی فیلڈ میں بھی متعارف کرایا۔ لوگ مجھے راولڈ اپ سے ہی پہچاننے لگے تھے لیکن مجھے اصل شہرت ڈرامہ سیریل ”تیسری اک نظر“ اور ”جنات کے ہم“ سے ملی۔ اور میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا

جب پوچھتے ہیں کہ آج کل کون سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ تو سوچتا ہوں کہ پسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کون کون سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ تو پھر اس وقت تھوڑا موڈ خراب ہوتا ہے۔

”آپ کے پرستاروں میں لشکریوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ فون آئے تو بات کرتے ہیں؟“
 ”ہاں جی بات کر لیتا ہوں۔ مگر مختصر۔ کیونکہ اکثر ریکارڈنگ میں مصروف ہوتا ہوں۔ اور چونکہ میں کسی کو جانتا بھی نہیں تو پھر پہلو ہائے کر لیتا ہوں۔“
 ”تمنا کی سٹے۔ تو کس سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یا میوزک سے دل بہلاتے ہیں؟“

”میوزک تو ڈراما ہیجنگ کے دوران سنتا ہوں۔ تمنا کی میں تو اپنے رب سے اور اپنے والد سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ رب کائنات سے اپنی باتیں شیئر کرتا ہوں اور اما سے شکوہ کرتا ہوں کہ جلدی کیوں چلے گئے اور یہ کہ اگر آپ آج ہمارے درمیان ہوتے تو ہم بھائیوں کی ترقی دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔“

”وائس۔ چھٹی کے دن کیا کرتے ہیں۔ سوتے ہیں یا گھومنے پھرنے جاتے ہیں؟“
 ”چھٹی کا دن عموماً گھر میں گزارتا ہے، گھر والوں کے ساتھ مزے کرتا ہوں۔ کم ہی سوتا ہوں چھٹی کے دن۔ ویسے بھی میری نیند بہت کم ہے۔ کوئی آہٹ بھی ہو جائے تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ حالانکہ گھر والے بہت خیال رکھتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے آغا علی عباس سے اجازت چاہی اس شکرپہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ہمیں نام دیا۔



پورا کیا ہے اور بھرپور شہرت والا خواب بھی لن شاء اللہ ضرور پورا کرے گا۔“
 ”نوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پرائیویسی نہیں رہی۔ ہم کہیں جا نہیں سکتے۔ آپ بھی یہی کہیں گے بھرپور شہرت کے بعد۔“

”نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ شہرت سب کے حصے میں نہیں آتی یہ اللہ کا اپنے بندے کے لیے خاص انتخاب ہوتا ہے تو میں بھی اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ اچھی شہرت کے لیے اللہ نے میرا انتخاب کیا۔ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے جب میں کہیں جاتا ہوں لوگ پہچانتے ہیں محبت سے پیش آتے

ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔“
 ”اور ایک عدد تصویر کھنڈنے کی فرمائش بھی کرتے ہیں؟“

”جی جی۔ پہلے آؤ گراف ہوتا تھا اور اب تصویر۔ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں اس میں اپنی محنت و مشقت کا عمل دخل تو ہے ہی مگر ناظرین کی پسندیدگی کا بھی عمل دخل ہے۔ کیونکہ اگر وہ مجھے پسند نہیں کریں گے تو ڈائریکٹرز مجھے بک نہیں کریں گے۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ آپ نے کم عمری میں ہی پریکٹیکل لائف میں قدم رکھا۔ حالات سے گھبرا کر کسی بھی عادت میں مبتلا ہوئے؟“

”ہمارے یہاں کم عمری میں سگریٹ پینے کو ہی بری عادت تصور کیا جاتا ہے اور ہاں۔ میں جب اکیلا ہوتا تھا اور تھک جاتا تھا یا کسی بات پر مجھے غصہ آتا تھا تو سگریٹ پی لیتا تھا۔ تو بس آہستہ آہستہ پھر اس کی عادت ہو گئی۔ اب بھی پیتا ہوں۔ مگر کم پیتا ہوں۔ اب غصہ بھی کم آتا ہے۔ ٹینشن میں بھی کمی آتی ہے۔ اور حالات بھی مائل طور پر آجھے ہیں۔“

”نوگ محبت سے ملتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں پھر بھی کوئی بات جو ناگوار گزرتی ہو؟“
 ”بہت محبت کرتے ہیں لوگ بلکہ



شاہین خان

”کیسی ہیں شاہین صاحبہ؟“
 ”جی اللہ کا شکر ہے۔“
 ”ابھی آپ کے دو سیریز ختم ہوئے ہیں۔ گو کہ آپ کے کردار تو پہلے ختم ہو گئے تھے مگر سیریز اب ختم ہوئے ہیں مزید کیا کر رہی ہیں آپ؟“
 ”کلنی کلم ہے ماشاء اللہ سے سستا نہیں چاہوں گی کہ پھر چارم ختم ہو جائے۔ کچھ کام شروع ہو چکا ہے کچھ کلم باقی ہے اور کچھ شروع ہونے والا ہے۔ ڈراموں کے علاوہ یا سرنواز کے ساتھ ایک فلم بھی کر رہی ہوں جس کی ریکارڈنگز شروع ہو چکی ہیں۔“
 ”پہلے آپ سعودی ایرلائن میں تھیں اور کلنی ٹائم آپ نے اس ایرلائن میں گزارا۔ اب پاکستان میں ہیں تو کتنے سال ہوئے پاکستان آئے ہوئے اور آپ خوش ہیں؟“
 ”جی میں پاکستان آکر بہت خوش ہوں۔ اگرچہ ملک سے باہر رہ کر ہمیں بہت سی سہولتوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ مگر ایک وقت آتا ہے کہ ہمیں اپنے ملک آنا پڑتا ہے۔ مجھے پاکستان آئے دس سال ہو چکے ہیں اور

ابھی خاصی شکل کے مالک ہو۔ اور آکاری کیوں نہیں کرتے اور پھر انہی کے کہنے پر مجھے ایک سوپ میں کام مل گیا۔ اور بس پھر سلسلہ چل پڑا۔“
 ”چلیں جی اللہ آپ کو مزید ترقی دے۔ ازدواجی لائف کب شروع ہوئی اور کیسی گزر رہی ہے؟“
 ”جی دسمبر 2011ء میں شادی ہوئی ماشاء اللہ سے ایک بیٹی ہے اور (Inaya) عتیایم ہے۔“
 ”آپتی مصروفیات میں بیٹی کو اور بیگم کو کتنا ٹائم دیتے ہیں؟“
 ”جی میں مصروفیات میں کبھی کبھی نا انصافی ہو جاتی ہے۔ مگر میری کوشش ہوتی ہے کہ بیگم کو اور بیٹی کو برابر ٹائم دوں اور سال میں ایک بار ضرور کہیں نہ کہیں گھمنا لے جاؤں۔“
 ”آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بیگم اور بیٹی کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔“

”جی بالکل۔“
 ”آج کل ورلڈ کپ ہو رہا ہے دیکھ رہے ہیں۔ لگاؤ ہے آپ کو کرکٹ سے؟“
 ”کرکٹ مجھے پسند تو بہت ہے۔ مگر امیدیں نہیں لگانا کہ پھر باؤسی ہو تو ویل ٹوٹ جانا ہے۔ اور مصروفیات بھی اب اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ ذاتی خواہشات پوری کرنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا۔“
 ”آپنی کامیابیوں کے لیے کس کا نام لیں گے۔“
 ”میں لوگوں کا نام تو ضرور ہی لوں گا۔ سب سے پہلے تو حسین اختر صاحب کا نام لوں گا کہ جنہوں نے مجھے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ مجھ میں لو آکاری کی صلاحیت ہے۔ اور دو سرائام ”مومنہ وریڈ“ کا ہے جن کی وجہ سے مجھے بے حد شہرت ملی اور تیسرا نام سہیل ہاشمی صاحب کا کہ جنہوں نے میرے گیپ کے بعد دوبارہ مجھے اس فیلڈ میں متعارف کرایا۔“
 ”اور کسی سے کوئی شکایت؟“
 ”نہیں الحمد للہ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ سب میرے ساتھ بہت پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔“

میرے شوہری خواہش تھی کہ اب ہمیں پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔

”اس فیملڈ میں شوقیہ آئیں یا ضرور نا؟“

”نہ شوقیہ نہ ضرور نا“ میری ایک دوست ہے جو ڈرامہ رائٹر ہے وہ مجھے اس فیملڈ میں لے کر آئی کاظم پاشا کے پاس۔ وہ لن ولوں ڈرامہ سیریل ”تھوڑا سا آسٹن“ بنا رہے تھے۔ کاظم صاحب کو مجھ میں شاید اواکارہ نظر آئی انہوں نے اپنے سیریل کے لیے منتخب کر لیا اور بس۔ پھر آفرز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر چونکہ میرا بیٹا چھوٹا تھا تو میں کبھی کبھار ڈرامے کر لیا کرتی تھی مگر تو تک میں ضرور نا“ تو تکی نہیں تھی کہ میرے گھر کا دانا پانی اس سے تھا۔ ڈرامہ کیا اچھا رسپانس ملا تو بس پھر شوق بھی پیدا ہو گیا۔

”آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔۔۔ جب آپ کاظم پاشا صاحب کے پاس گئیں؟“

”مجھ میں ایک خوبی تو ہے میں اسے اپنی خوبی ہی کہوں گی کہ اگر میں کسی ٹارگٹ کو ایچ کرنے کا سوچ لوں تو بس پھر اسے کر کے ہی رہتی ہوں۔ تو جب مجھے آفر آئی تو میں نے سوچ لیا کہ انہوں نے اتنا بھروسہ سا کر کے مجھے لیا ہے تو مجھے بھی لن کی امیدوں پر پورا اتنا ہے اگرچہ بیچ میں میں نے گپ دیا اپنے بیٹے کی وجہ سے کہ وہ چھوٹا تھا۔ لیکن جب میری دوست نے بھی کہا کہ گپ نہ دو تو پھر لگ گئی کام سے۔“

”آپ نے کہا کہ آپ یا سر نواز کے ساتھ فلم بھی کر رہی ہیں تو کون کون ہو گا آپ کے ساتھ کاسٹ میں؟“

”اس میں حالیہ شیخ صاحب ’میکال‘ سولہائے علی وغیرہ ہیں۔ پہلی فلم ہوگی باقی تو ڈرامہ سیریلز ہی ہیں اور جب فلم مکمل ہو جائے گی تو پھر تھوڑا آرام کروں گی۔“

”اتنے ڈرامے بن رہے اور آپ کے ڈرامے بھی مختلف چینلز سے آن امیر ہیں۔ کیا لوگ سب دیکھتے ہیں؟“

”بالکل دیکھتے ہیں اور میں آپ کو بتاؤں ہمارے مختلف چینلز کی اہمیت مختلف شہروں میں ہے جیسے A پس کے ڈرامے اور پنی وی کے ڈرامے زیادہ تر

جناب میں دیکھے جاتے ہیں۔ بلورن ایریا ز میں دیکھے جاتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ ان چینلز کو ناظرین کی ایک بڑی تعداد دیکھتی ہے اور ایک واقعہ آپ کو بتاتی ہوں۔ کہ آج سے تین چار سال پہلے جب سیلاب آیا تھا تو ہم لوگ کلام میں تھے ہم وہاں پھنس گئے تھے اور آری نے ہمیں نکالا تھا تو وہاں کچھ خواتین بھی تھیں وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ ”ارے ہم نے آپ کو ڈراموں میں دیکھا تھا“ آپ ڈراموں میں آتی ہیں؟“ تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہاں پنی وی اور A لی وی آتا ہے تو آپ سوچیں کہ وہاں کتنے زیادہ یہ چینلز دیکھے جاتے ہیں۔ تب ہی تو لوگوں نے مجھے پچھانے۔“

”ایک ڈرامہ آرٹسٹ کی حیثیت سے کیا آپ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اپنا سین چینج کرائیں۔ یا کسی رول کو کرنے سے انکار کریں؟“

”بالکل ہے۔ ایک ڈراموں میں میں نے اپنے سین چینج کروائے اور ایک سیریل میں مجھے ایک رول ملا کہ آپ جی عمر کی خاتون ہیں لیکن ایک چھوٹی عمر کے لڑکے سے افریل رہا ہے۔ تو میں نے اس رول کو کرنے سے انکار کر دیا۔ پروڈکشن بھی اچھی تھی پیسے بھی اچھے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔ تو بس میری کوشش ہوتی ہے کہ میرا بیچ خراب نہ ہو۔“

”تو آفر کرنے والے ناراض تو ہوتے ہوں گے؟“

”ہاں۔ انہوں نے کہا کہ رول اچھا ہے اور پیسے بھی تو میں نے کہا کہ آپ ریلوں کی بات نہ کریں۔ کیونکہ میں پیسوں کے لیے کام نہیں کرتی مگر میں نے کہا کہ بہت سی اور بھی آرٹسٹ ہیں آپ کسی سے بھی یہ رول کر سکتے ہیں۔ اور پھر اس رول کو ایک شخص آرٹسٹ نے کیا اور اس طرح میں وہ رول بھی نہیں کرتی کہ جس میں شادی بیاہ میں ناچ رہی ہوتی ہیں خواتین۔ میری بھی کچھ قدریں اور روایات ہیں کہ جن کو میں کھونا نہیں چاہتی انہیں برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“

”گنڈ چلیں جی انشاء اللہ پھر آپ سے بات کریں گے۔“

”حصار ذات دعا“ پڑھ تو لیا جانیے کیوں پرانے واقعات
 پھینکنے، مٹنے، وقا بے وفا، بے وفائی، جھگڑی انداز کا پر تو لگا۔ ”سببت
 زندگی ہے۔“ راشدہ جی نے پھر سے دل بیت لیا۔ آسیر
 رزائی نے جو بکا پھلکا کھلے سے بھر پور شادی کا احوال تحریر
 کیا، ”اچھا لگا۔“ (ساڑھی طرفوں کی مبارک گل با) تاریخ کے جھروکے
 اور باتوں سے خوشبو از حد کھل گئی تھی۔ شعاع کے ساتھ
 ساتھ بھی دونوں خوب تھے۔ ڈیر شعاع حرا کے لیے نو
 انٹری کا پور ڈ کیوں؟



پیاری حرا لیے کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنی باقاعدہ قاری کا جو
 ہر ماہ اتحاد پبلسٹک اور تفضیلی تبصرہ کرتی ہو شعاع میں
 داخلہ بند کر دیں۔ کچھ مجبوریاں ہیں جن کی بنا پر ہم سارے
 خطوط شامل نہیں کر پاتے، کبھی تاخیر سے موصول ہوتے
 ہیں اور کبھی صفحات کی مجبوری آڑے آجاتی ہے۔ ہر بار کی
 طرح آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے مصنفین تک آپ کی
 رائے ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

ماہم حمید نے میر پور خاص سے لکھا ہے

مجھے قلم اٹھانے پر میرا حمید کے ٹائٹل یا ریم نے مجبور کیا
 ہے۔ میں ساتویں کلاس میں تھی جب میں نے پہلی بار
 شعاع پڑھا تھا اور اب میں بی ایس سی فائنل میں ہوں اور
 مجھے یہ شوق اپنی امی سے ورثے میں ملا ہے۔

خط بھجوانے کے لیے ہا
 ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

email: info@khwateendigest.com
 shuaamonthly@yahoo.com

پیاری ماہما آپ کی امی شعاع کی قاری ہیں اور آپ
 بھی آتے سہول سے شعاع کی قاری ہیں پھر بھی خط لکھنے
 میں اتنی تاخیر؟ اب یارم نے آپ کو خاموشی توڑنے پر مجبور
 کیا ہے تو دوبارہ خاموشی اختیار نہ کر لیجئے گا۔ شعاع کی
 دوسری تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے سے آگاہ
 کریں۔

اقصیٰ سونیا اور ہاجرہ۔ تزلزلی ظلال اسلام تیلوس
 تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے میرا حمید کی طرف آتے ہیں کیا خوب
 لکھتی ہیں ”یارم“ نمبر 1 پر ہے اور رقص بٹل نیلہ بھی
 بہت اچھا لکھتی ہیں۔ 89.4 کے DJ (ڈی جے) فیضان
 خان کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔ سب کی تحریریں ہمیں
 بہت پسند ہیں۔ ہم نے کچھ کہانیاں اور افسانے لکھے ہیں اگر
 قابل اشاعت ہوتے تو آپ شامل کریں گے۔
 اقصیٰ سونیا اور ہاجرہ خوش آمدید اور دعا میں۔ کہانیاں

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
 آپ سب کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے
 دعائیں
 اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں
 رکھے۔ آمین
 پہلا خط مٹان سے حرا قلمی کاٹنے لگتی ہیں۔
 پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جن میں نماز،
 روزہ اور قہر سے متعلق احکامات نے ذہن پر پڑی گئی
 گرہوں کا منہ کھول دیا۔

”خط آپ کے“ میں اب تو تبصرے دلچسپ اور مزا
 دینے لگے ہیں۔ ہماری اکثر قارئین اچھا اور بہت عمدہ لکھنے
 لگی ہیں۔ (مبارک ہو بھئی ہا)
 فرح بخاری کا طویل مکمل ٹائٹل جب تک پڑھ نہ لیا، دم
 نہ لیا۔ ہر آنے والی اگلی قسط ”یارم“ کی دلکشی اور حسن کو
 پڑھا رہی ہے۔ (جیسی رہے میرا جی) افسانے چاروں ہی
 اپنی اپنی جگہ سٹی کے پیراٹن سے مزین تھے۔ یعنی جہوں کا

اور افسانے قابل اشاعت ہیں تو ضرور شائع ہوں گے
انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

گھٹت نورین نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی
ہیں

امرہ۔ آخر یہ ہے کیا چیز؟ ویسے مجھ تو آئی۔ گولی کس
کو لگی؟ سیراجی آپ اچھا لکھتی ہیں مگر کچھ زیادہ ہی فلسفہ
نہیں جھاڑ دیتیں۔ ہمیں آپ کا یہ انداز پسند ہے مگر کچھ
زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ آگے کون آ رہا ہے۔ پلیز عنوان اور

مصنفہ بتائیں۔ قسم ہے آپ کو۔؟ ایک تھی مثل کتنا
چلے گا؟ صحیح صحیح بتائیے لگا۔ ”رقص نعل“ اتنا سٹو۔ اتنا
تھوڑا۔ نیلہ جی دار دل تو اتنی کم قسط نہ ہوتی تھی۔ اب کیا
ہو گیا ہے؟ ویسے یہ اصل کون ہیں۔ امت الصبور کیا؟
مسئلہ دور کریں۔ ”مزین رحمت“ اسٹوری اچھی ہے۔ مگر
قسط بہت کم ہوتی ہے۔ یہ ساتھ رضا کہاں ہیں۔ دل کر رہا
ہے امرہ مل جائے تو مار دوں۔ مگر بھی عالیان کو تنگ کر
کے ہی جائے گی۔ جب میں قسط پڑھ رہی تھی تو گا شاید اس
قسط میں میں دیر امرہ لے گی۔ اچھا تھا مری جائے۔ بہت
بری لگتی ہے مجھے۔ ”رفعت“ کا نام سنا تو جلد ہی ”محبت
زندگی“ سے پڑھنے لگے مگر مزہ نہ آیا۔ ”مزہ تو آیا تھا تب مگر
اک مگر“ کا وہ پارٹ اور مامون والا۔ یاد کریں۔ افسانوں
میں ”سیمانت عامم“ بازی لے گئیں۔ واہ سیراجی جب
بھی آتی ہیں۔ مزا کدیتی ہیں۔ ویسے بس ایک بات بتائیں
کہ آپ لوگ ”مزا جا“ کیسی ہیں۔ کبھی ہمیں اپنی تصویریں
دکھائیں۔ پلیز۔ آپ مجھے لگتی تو نہیں یا ہمیں موزن نے
والی۔ نہیں ہیں نا۔ وہ ڈرامے والی۔ کرخت مدیرہ۔ اگر
ہاں تو ہم تو مری جائیں گے۔ سچ۔ ڈائجسٹ ہی ہماری جان
ہے۔ بھائی بھی پڑھتا ہے۔ کہ رہا ہے سلام ہے۔ محمود
صاحب کو۔ خدا ان کے درجات بلند کرے (آمین)
شکایتیں۔ ایک لمبی تفصیل ہے۔ پھر کبھی کے لیے اٹھا
رکھتے ہیں۔ اب اتنی اچھی مدیرہ ہوں تو شکایتیں کرتے
ہمیں خود بھی حیا آتی ہے۔ ویسے ایک بات پوچھنا تھی کہ
”دسیم سحر“ لکھنا چھوڑ چکی ہیں کیا۔

پہاری قسمت لا دھنے کے طویل خط میں آپ نے بار بار
تاکید کی ہے کہ خط پورا شائع کیجئے گا۔ اس میں شک نہیں
کہ آپ نے بہت دلچسپ خط لکھا ہے لیکن ہمیں بے حد

افسوس ہے کہ ہم آپ کی اس فرمائش کو پورا کرنے سے
قاصر ہیں۔ ایک سوال جو آج کل ہم سے بار بار کیا جا رہا ہے
آپ نے بھی کہا ہے کیا ہم ڈرامے والی کرخت مدیرہ ہیں تو
اس کے لیے ہم ہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کبھی کراچی آئیں
تو ہم سے ضرور ملیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ ہم کیسے
ہیں۔ آپ خود سوچیں اگر ہم کرخت مدیرہ ہوتے اور اپنی
مصنفین سے اتنا تنگ آئیں سلوک کرتے جو ڈرامے میں
مدیرہ صاحبہ کر رہی ہیں تو کیا وہ ہمارے بچوں میں لکھتیں؟
اتنی تو ہیں کوئی عزت شمس رکھنے والا شخص برداشت نہیں
کر سکتا اور تخلیق کار تو عام لوگوں سے زیادہ ہی حساس ہونا
چاہئے۔

آپ کا اندازہ درست ہے امت الصبور ہی اصل ہیں۔
مصنفین کے انٹرویو کی فرمائش کا سلسلہ اپریل سے خواتین
میں شروع کر رہے ہیں۔

”ایک تھی مثل“ کتنا چلے گا؟ یہ تو ہمیں بھی اندازہ
نہیں۔ رخسانہ ہی بتا سکتی ہیں آپ۔ کادل امرہ کو
مارنے کو چاہ رہا ہے اور آپ کو ویرا بے چاری بری لگتی
ہے۔ آخر کیوں بھتی؟ ان دونوں نے کیا تصور کیا ہے۔
ساتھ ابھی فی المل قسط دار نائل نہیں شروع کر رہی ہیں۔
کہنگہ وہ چیٹل کے لیے ڈراما لکھ رہی ہیں لیکن وہ آپ
کے لیے اہم ضرور لکھیں گی۔

دردہ بٹ نے ڈسکہ سیالکوٹ سے لکھا ہے

شعل کے فروری کے بہترین شمارے کے لیے جس
طرح بھی آپ کا شکر۔ کیا بائے کم ہے۔ جس نائل نے
آج مجھے بہت ادا اس کیا اور خط لکھے پر مجبور کیا وہ ہے سیرا
حمید کا ”یارم“۔

اگر میں سی رائٹر کے نام خط لکھوں تو کیا آپ لائن تک
پہنچا دیں گے؟

رائٹر کے نام ہماری معرفت خط لکھ سکتی ہیں ہم ان
تک پہنچا دیں گے۔

مشعل فیاض گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

رخسانہ نگار کو نہ دیکھ کر نائل کو اچھا نہیں لگا۔ رقص نعل
بہت ہی بور ہے۔ یہ کہانی متاثر نہ کر سکی۔ فرح بخاری کا
نائل بہت اچھا تھا۔ لیکن اس کی ایک لائن کہ ”اتنا مضبوط
محبت کا رشتہ بھی ہو تا شاید تقدیر ہم سے جیت نہ پاتی“

چونکہ تقدیر سے جیتنا ممکن نہیں۔ خیر ٹولٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ "حصار دعا" تھا۔ بہت خوب صورت تھا۔ محرم ساجد کا ٹولٹ ٹھیک ہی تھا۔ راشدہ رفعت کا ٹولٹ پسند نہیں آیا۔ پرانا موضوع تھا۔ افسانوں میں "محدثیں یا نہیں" فریدہ فرید نے بہت زبردست لکھا۔ اور پھر نظیر فاطمہ کا بھی۔ انٹرویوز اچھے تھے۔ ڈاکٹر اکیس عامر کا "شعاع کے

ساتھ ساتھ ساتھ "پسند آیا۔ ٹائٹل اس ماہ کا بہت زبردست تھا۔ "سیر احمد" (آف) "میلے ہی معذرت کرتی ہوں۔ پرا مت مٹائے گا" آپ کہانی تم اور لفظوں کی بھہار زیادہ کرتی ہیں۔ جیسے اگر کوئی بیہوش کے کہ مجھے تم سے محبت ہے تو آپ محبت لفظ پر ہی دوٹو مجھوں میں۔ کچھ فلسفہ کم کریں یا رام میں کیونکہ ہم ماچھڑ میں نہیں پاکستان میں رہتے ہیں۔ خیر یا رام کا ایڈ ہو رہا ہے تو اچھی بات ہے۔ کہ نویں قسط پر ختم ہو رہا ہے۔ آپ اپنی اعلیٰ کہانی میں پلیر کہانی ہی لکھیے گا۔ کیونکہ اخلاقی انسان معمول جاتا ہے پر کہانی یاد رہ جاتی ہے۔ خیر یا رام اچھی اسٹوری ہے۔ ہائی شعاع تو اچھا ہے۔ میں نے ہر قسم کے رسالے پڑھے ہیں پر شعاع اور خواتین رسالوں میں ٹاپ آف دی لسٹ ہیں۔

پجاری مشعل آپ کی تنقید و تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ خط لکھنے کے لیے شکریہ۔

طلعت اقبل لطیف آباد نمبر 6 سے لکھتی ہیں

سورتی کوئی خاص نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے رسالہ پڑھتے گئے دلچسپی بڑھتی گئی۔ پیار سے نئی نئی پجاری باتیں اسلامی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس سے ہمیں اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے بعد محبت زندگی سے "شام خزاں طویل سہمی" حصار ذات دعا "غریقِ رحمت" اور "یارم" کی تو بات ہی کیا ہے۔ افسانے بھی سب بہت خوب تھے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ 1980ء سے شعاع میں جو اچھی تحریر شائع ہوئی ہو وہ ہر شمارے میں شامل کیا کریں۔ یعنی نئی تحریروں کے ساتھ ایک پرانی تحریر کیا خیال ہے؟

پجاری طلعت! خیال تو بہت اچھا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پھر نئی مصنفین کی تحریروں کو شامل ہوں گی پہلے ہی پجاری بہت سی نئی لکھنے والی مصنفین شکایت کرتی ہیں کہ ان کو موقع نہیں دیا جاتا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

لاہور سے کول گلزار لکھتی ہیں

مجھے اتنے سالوں میں پہلی بار "یارم" نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اور آخر کار یہ بری خبر میری نظروں سے گزر گئی۔ میری نیورٹ اسٹوری آخر کار ختم ہو گئی۔ میں مصحف کے بعد یارم کی سب سے بڑی مداح ہوں۔ میں نے ویرا کا دل سائی جیسے کردار کبھی نہیں پڑھے۔ غریقِ رحمت بھی بہت اچھی اسٹوری ہے۔ میری ایک ریکویسٹ ہے کہ "شاعری سچ ہوتی ہے" کو دوبارہ شامل اشاعت کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر شعاع ادھر اور ہے۔

پجاری کول! سیر احمد اور محرم ساجد تک آپ کی تعریف پہنچا رہی ہے۔

ثروت بانو نے منجھوٹ سے لکھا ہے

فلمی دنیا کا بہت بڑا نام ہمارا قیمتی سرمایہ علی سفیان آفاق صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی وفات کا دلی رنج ہوا۔ فروری کے شعاع میں شادی کا احوال پڑھنے پر انکشاف ہوا کہ وہ تیب رزاقی صاحب کے بہنوئی بھی تھے۔ "یارم" ایک بہترین ٹائٹل بہترین کاوش۔ گوکہ سیر احمد کی بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ امرہ پجاری اچھی لڑکی ہے۔ لیکن کیا کریں۔ عالمیان بڑا صابر بچہ ہے امرہ کی موت کو جلد ہی قبول کر لے گا۔ کیونکہ ویرا بھی اچھی لڑکی ہے اور وہ گئے امرہ کے دادا تو وہ بھی اس عمر میں ہیں کہ جلد ہی پوتی سے ملاقات کر لیں گے۔ نبیلہ عزیز کی کہانی "رقصِ شعل" اچھی ہے روایتی ہی لیکن اب یہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ عمیرہ عنینہ "نمو اور میرا کی غیر روایتی کہانیاں بڑھ پڑے کر سیدھی سادی کہانیاں کو بھاتی ہی نہیں ہیں۔ ایک بھی مثال کی کمی محسوس ہوئی۔

پجاری ثروت! آپ نے تو خود ہی سب کچھ طے کر لیا۔ امرہ مرحلے کی اس کے مرنے کے بعد جس کے ساتھ کیا ہو گا۔ دادا جان عالمیان ویرا سب کا بتا دیا لیکن سیر احمد نے تو کچھ اور ہی سوچی رکھا ہے جو آپ یہ قسط پڑھ کر جان لیں گی۔ گھرواری اور بچوں کی مصروفیات سے وقت نکال کر آپ نے خط لکھا بہت شکریہ۔ آپ کی فرمائش پر تنجمن کی ترتیب دی جا رہی ہے۔

سارے رسالے لیے۔ اقد قموڑی دہریں راکھ کا ڈھیر۔
افسوس صد افسوس۔ اب آتے ہیں۔ شعاع کی طرف۔
ناگنل پروانٹ ڈریں میں ماؤں کے ساتھ چوڑی بھی پسند
آئی۔ یارم بڑھ کر خوشی ہوئی۔ ویل ڈن۔ پھر اس کے بعد
شام خزاں طویل سہی بہت ہی منفو ناؤں لگا۔ زبردست۔
ناولٹ میں محبت زندگی بے پسند آیا۔ افسانے سب پسند
آئے۔ انٹرویو میں یحییٰ زیدی سے ملاقات اچھی رہی۔
آسیہ رزاقی۔ شادی مبارک کا احوال بھی پسند آیا۔ خوب
صورت بیٹے کچھ خاص پسند نہیں آئے۔ لوجی "رقص
نیل" کو پسند بھول گئی۔ اس بار یہ قسط شاندار رہی۔

پیاری سمیٹھا آپ کے بھائی نے آپ کی آپنی کے
ساتھ جو کیا اسے جان کر بہت افسوس ہوا، ہمیں تو بھائیوں
پر جان دیتی ہیں، ان پر مان کرتی ہیں، ان کا دل تو ہاتھوں میں
رکھنا چاہیے، ان کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان آگن
کی چیزوں کو تو ایک دن گھر چھوڑ کر طے ہی جانا سے سکے کی
اچھی یادیں ان میں جگنو بن کر ان کے دلوں کو جگمگا میں
گی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکر یہ۔

ماہم نور نے گوجر انوالہ سے لکھا ہے

ویسے تو سچ بات کہنی چاہیے۔ "یارم" کا سلسلہ بالکل
اچھا نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک بات پھر خسانہ نگار عدنان
کی تو ایک نئی مثال بہت اچھا ناول ہے۔
ماہم! میں افسوس ہے کہ آپ کو "یارم" اچھا نہیں
لگ رہا جبکہ ہماری بیشتر قارئین نے اسے بہت پسند کیا
ہے۔

آپ کی فرمائش پر زنگر برگر — کی ترکیب
شامل ہے۔

سیدہ نسبت زہونے کہوڑپکا سے لکھا ہے

2 فروری کی رات کچھ یاد آیا تو بارل بھی سب ساتھ
رہنے لگا بہت اوس تھا، بہت بے چین "افسوس" لیکن
شعاع رسالہ دیکھا تو حقیقت میں خوشی ہوئی تو شعاع کے
ساتھ ساتھ میں "ڈاکٹر ایس عامر لاہور" نے لکھا کہ ایک
مہترہ ہوتی ہمیں سیدہ نسبت زہر گیلانی ان کے تبصرے
کمل کے ہوتے تھے آج کل کدھر غائب ہیں، یقین ماننے
ایک لائن میں کے گئے اس جیسے نے جو خوشی دی وہ میں
الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی آگے سے بے اختیار خوشی کا

سردہ نثار وانا نے پھول نگر سے شرکت کی ہے

میں شعاع اور خواتین کی بارہ سال سے خاموش قاری
ہوں۔ اتنے سالوں میں رائٹرز کے مختلف شمارے ناولوں نے
دل پر کاری دار کے لیکن "یارم" انوارات کے ساڑھے
گیارہ بجے اس ماہ کی قسط ختم کی۔ اور ساری جان مٹھی میں
آگنی ہائے میراجی۔ کیا کیا؟ ہمارا محبت سے گندھا عالیان
اکیلا؟ نہ جی ایسے عشق کا یہ انجام امر جدی لاسٹ ڈک
دی مینڈ کی اور عشق زادی کا یہ انجام میرے دل ہاتھوں کی
حالت بیان سے باہر۔ لفظ لفظ موٹی بوند بوند امرت مجھے

میرا سے پوچھتا ہے کہ آپ کا ناول پڑھتے ہوئے جو ہم پر
گزرتی ہے۔ لکھتے وقت آپ بھی ان ہی کیفیات سے
گزرتی ہیں۔

پیاری سردہ مستحق جب تک اپنے کرداروں کے
احساسات اور جذبات کو محسوس نہ کرے، تخلیق نہیں
کر سکتا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ میرا تخلیق کرتے
ہوئے کس کرب سے گزرتی ہوں گی، ہم نے میرا حمید کو
دوبارہ کا مسلمان بنایا ہے۔ آپ ان سے ڈائریکٹ یہ سوال
پوچھ سکتی ہیں۔

ام احمد حسن نے حافظ آباد سے لکھا ہے

شعاع میرا موٹ لیورٹ رسالہ ہے۔ سوچا کہ اپنی
محبت کا اظہار کری دیا جائے کیونکہ محبت کو اظہار کی بھی
ضرورت ہوتی ہے نا! ایک نئی مثال اور رقص نیل
زبردست ناول ہیں، جو عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہے
ہیں۔

جی ام احمد بالکل صحیح سوچا آپ نے محبت کو بیٹھ اظہار
کی حاجت رہتی ہے۔ اور محبت کے اظہار میں بھی کوئی
نہیں کرنا چاہیے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکر یہ۔

سیدہ سحر قریشی۔ ضلع جھول نگر سے لکھتی ہیں

شعاع اس بار یکم کو ملا۔ اتنی خوشی ہوئی۔ میں سوچتی
ہوں کہ اگر شعاع نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ
میری آپنی رسالہ بڑھ رہی تھی۔ کہ میرے بھائی نے کہا کہ
چائے بناؤ۔ کمانی میں چویشن ایسی تھی آپنی نہیں اور ہستی
جلی گئی۔ میرے بھائی کو قصہ آیا۔ اس نے سارے کے

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2015ء کے شمارے کی ایک جگہ



- میرا سہارا دل "آپ حیات"
- نمرہ حسنہ نعل ناول "نعل"
- تنزیلہ بخش کا ناول "عہد الست"
- وجیہا کا ناول "عہد الست"
- فدیہ صفت علی کا ناول "کارِ جہاں دراز ہے"
- صاحبزادہ سید زینب، نعل رضا اور نیر کا ناول "کاشف کے سامنے"
- باغی کی فنکار "عہد زینبی" سے ۲۰۱۴ء
- خیرناک کی بیویاں "زیبہ جمیل" سے ۲۰۱۴ء
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "مستکی"
- کرن کران روشنی، نغمیاتی اور واہی انجمنیں بھٹان کے طور پر اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مارچ 2015ء کا شمارہ آج ہی خرید لیں

آنسو ٹپکا کر دیکھو کسی نے تو یاد رکھا ناں۔
پیاری زہرا ہمیں بھی آپ نہیں بھولیں۔ ہم اپنی
باقاعدہ لکھنے والی قارئین کو یاد رکھتے ہیں اور ان کی بھی
محسوس کرتے ہیں شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نور عبدالسلام نے نواب شاہ سے لکھا ہے

مجھے اپنے یہ خیال ہی رسالے بے حد پسند ہیں کیونکہ
آج کے اس دور میں ہمارے گھر ٹی وی ڈیفیو کو کچھ بھی نہیں
ہے۔ شادی کے ان پندرہ سالوں بعد آج میں نے یہ کاغذ
قلم لیا ہے ہاتھ میں۔ کتنے موسم آئے گئے کتنے دوست
ساتھی سب چھپے صرف واحد ان دوستوں نے میرا ساتھ
نہیں چھوڑا۔ میرے سر آج کتنے ہیں یا پھر ڈووان کا پتلی
میری صرف ایک یہ ہی تو واحد فریق ہے باقی سب کچھ
چھوڑ دیا۔ مجھے یاد ہے اسکول لائف کالج لائف سٹیجنگ
لائف کیسے ہم سب فریڈز کی من رسالوں پر لڑائی ہوتی تھی
پہلے پڑھنے پر بیچ جب میری شادی ہوئی ان دونوں پر کمال
چل رہا تھا میں نے اپنے میاں سے کہا آپ بھی پڑھیے پھر
مل کر بھروسہ کریں گے اب یقین کریں مجھ سے پہلے میری بیٹی
پڑھ لیتی ہے اتنی جلد کیا باتوں شعلہ میں آج کل سب سے
بہت "یارم" اس قسط نے تو بس سانس تک روک دیا
ہے۔ پھر سے "ایک نئی مثال" رخصانہ جی جلدی سے
مشائے کے لیے سب اچھا کریں "رقص نعل" بھی اچھا جا
رہا ہے شکر ہے ولید کو کچھ نہ ہوا۔ "فریق رحمت" سحر سا جہ
کی بہت ہی اچھی کہانی ہے اور پورے رسالے کی جاننا سے
نعل نعل "فرح بخاری" ذیل ڈن فرح جی شادی سے پہلے
بھی میں اپنے پیارے شہزاد پور سے لکھتی تھیں ہر
رسالے میں اب تو بس اپنی زندگی ایک مشین کی طرح بہ
گئی ہے۔

پیاری نور! شادی زندگی کا ایسا موڑ ہے جو ایک لڑکی کی
زندگی کو یکسر بدل دیتا ہے۔ گھر بچے شوہر ان سب ذمہ
داریوں میں الجھ کر اپنے مشاغل اور دلچسپیاں تو کہیں بہت
پہچھے رہ جاتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے ہمارے بچوں کا
ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ آپ کی محبت ہے اور آپ کے شوہر
کی مہربانی سے کہ انہوں نے آپ کے مطالبے پر کوئی
پابندی نہیں لگائی۔

شعلہ کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکریہ۔ پندرہ
سال بعد آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی

سے لکھتی رہے گا۔

فرحین ہاشمی نے حویلیاں ایجوٹ کیا وہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ایک دفعہ آپ نے خطوط کے جوابات میں لکھا تھا ہم کمانی اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں جواب ہوتے ہیں بلکہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں خواب ہوتے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے ہمارے اور آپ کے رشتے کی وہ رشتہ جس کو دائمی بنانے میں بہت ساری مصنفین کا حصہ ہے۔

میں وہ قاری ہوں جو رفعت سراج، عمیرہ احمد، نمرہ احمد، انیس فیوی، فرحت اشتیاق، حنیذہ سید، نعمت سیمہ، راحت جبین، تنزیلہ ریاض کی تحاریر کو اپنے دل کی آنکھ سے دیکھتی ہوں مگر اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود ان کے لیے کچھ نہیں لکھ سکی۔ آج اتنی مجبور ہو گئی کہ میرا دل چاہ رہا ہے میرا حبیہ کے اس ظلم کو چوم لوں جو ہمیں ہمارے گم گشتہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں لے گئیں۔

اس زندگی کو چند مسلسل سببہ کر گزارنے والے ایک دفعہ پھر میرا حبیہ کی وجہ سے کھل کر سانس لینے لگے ہنسنے لگے اور رونے لگے۔ دل بڑن میرا حبیہ۔

امردہ کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ! "محبت ایسا نغمہ ہے ذرا بھی جھول ہو لے میں تو سر قائم نہیں ہوتا۔"

اور واقعی کچھ نعلے صرف دائمی جدائی کے ہاتھوں ملے پاتے ہیں۔ امردہ کے ساتھ عالیان بھی اس حقیقت کو بھٹانے کی کوششوں میں مصروف رہا کہ "جب دل انسان میں روشنی نہ ہو تو چراغوں کے میلے میں بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جب ایک دفعہ دل میں عشق مقیم ہو جائے تو وہاں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔"

آپ کہیں گی کسی اور کہانی پر تبصرہ نہیں کیا تو آپ یہ مت سمجھیے گا میں سب تحاریر کو نہیں پڑھتی۔ میں آپ کے دونوں پرچے خوانین و شعاع کا ایک ایک لفظ اپنے دل کی آنکھ سے پڑھتی ہوں۔

بیاری فرحین اشغلت کی مجبوری کی وجہ سے آپ کا پورا خط شائع نہ کر سکے اس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔ اتنے خوب صورت خط کے جواب میں ہم کیا لکھیں۔ میرا حبیہ

کی تحریروں پڑھتے ہوئے ہم خود بار بار چونک جاتے ہیں کہ اتنی جموٹی کی بیاری ہی لڑکی کی تحریروں میں اتنا اثر کیسے آ گیا؟ زندگی کے رخ حقائق ہوں یا محبت کی حادو ٹھری۔ میرا ہر موضوع پر لکھ رہی ہیں اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ تب افسانہ نگاری کی طرف توجہ دیں ہمارا اندازہ ہے کہ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

علیہما بھلاج نے ڈیرہ اسماعیل خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

الف اللہ مجھے تو روحانی آگیا اب کیا ہو گا کیا امردہ! (مرثیہ نہیں جائے گی) فرح بخاری کا "شام خزاں طویل سی" طوالت کے باوجود خاصا مزہ آیا۔ عازم کا کردار انتہائی پر خلوص تھا۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف تو حصار ذات دعا ایک اچھا ناولٹ تھا مجھے پڑا پسند آیا یعنی جدون ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ "محبت زندگی ہے" جب اپنے چہ سارے التزامات حادث کے کھاتے میں آئے تو میں جس جس کے لوٹ پوٹ ہو گئی وہ جی دواہ کیا کہنے تب کے۔ فریدہ فرید کا بھتیس پائین دین ٹائن ڈے منانے کا اچھا طریقہ ہے۔ باقی افسانے سارے ہی اچھے بلکہ نہیں زبردست تھے یعنی زیدی کا انٹرویو شاندار رہا اب ہماری ملاقات شانو یعنی فائزہ خان سے بھی کروا دیں۔ ٹھیک جلالی اور حیدر شاہین دونوں کی ہی غزلیں قابل تحسین ہیں۔

بیاری علیہما شعاع کچ پسندیدگی کے لیے تمہیں سے شکریہ۔

روینہ ریاضت ملتان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سب سے پہلے ہم نے رقص بسمل پڑھا پڑھا نہیں آیا کیونکہ قسط بہت کم تھی پلیر (نیلہ جی رفقا پڑھا لیجئے) راشدہ رفعت کا بلکا پھٹا ناولٹ "محبت زندگی ہے" اچھا تھا۔ "غریب رحمت" پڑھ کر ہم روی پڑے۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ "یارم" کی یہ قسط ابھی پڑھی نہیں۔

بیاری روینہ! آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ اور یہ بھلا کیا بات ہوئی پانچ سال پہلے آپ نے خط لکھا وہ شائع نہیں ہوا تو آپ نے خط لکھا ہی چھوڑ دیا۔ خط شائع نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہوئی ہیں۔ لیکن ایک بات یہ ہے کہ ہم تمام خطوط پوری توجہ اور محبت سے پڑھتے ہیں اور آپ کی رائے ہم تک پہنچ جاتی ہے۔

مدیحہ عارف نے سنا مکمل سے لکھا ہے

اس بار نے کوئی شعاع خرید کر آج یعنی 14 فروری کو پورا ختم کر ڈالا۔ امی جی کا آنکھ کا آپریشن ہے جس کی وجہ سے فیصل آباد جانا ہے میری امی کے لیے دعا کیجئے گا کہ وہ بخیر و عافیت گھر واپس آئیں (آمین)

یوں تو یارم سب کی طرح مجھے بھی بے حد پسند ہے (کارن کی وجہ سے) لیکن اس بار پورے کا پورا شعاع اسے دن تھا۔ فرح بخاری فبرے لکھن بست زبردست تحریر۔

عازم پر فیکٹ بند ہے زبردست ہیرو اور خزان عمدہ سوچ کی مالک اچھی لکھی ایسے خزان کا مطلب کیا ہو گا۔؟ حصار دعا بست ظہری ساگا اور عجیب بھی۔ محبت زندگی ہے مزا آیا پڑھ کر ہلکی پھلکی محبت کی داستان امان جی بے حد پسند آئیں۔ اہ نو آئی جی سحر ساجد کی تحریر کا اتمام پھر

انگلے ہو۔ بست اداس کیا اس بات نے کیونکہ ایسا زبردست ناوٹ ہے حادث کار و ناوڑ اور تکلیف مجھے بھی رلا لیا ہے مہربی سے اس کے ختم ہونے کا انتظار ہے۔

مجھے افسانے ہمیشہ سے ہی شعاع کی جان لگتے ہیں اور بڑھنے کا مزہ بھی آتا ہے اس بار ٹاپ آف وی لسٹ رہا نصیب تیس بائیس ویسے ایک راز کی بات بتاؤں آئی امیری پیدائش کا دن بھی 14 فروری ہے۔

"اکھوتا" نے تو خوب ہنسایا نظیر فاطمہ نے خوب لکھا۔ پیاری مدیحہ! خزان لفظ خزان سے نکلا ہے پاس کی نرم کو پھل کو خزان کہتے ہیں۔ عباسی خلیفہ ہارون رشیدی کا والدہ کا نام تھا۔ آپ کی امی کے لیے دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ ان کا آپریشن کامیاب کرے۔ او دن میں پورا شعاع پڑھ کر آپ نے فوراً خط لکھا اس محبت کے لیے تمہ دن سے ممنون ہیں۔

تحریم اختر 155 عثمانی شاعرانہ کلمہ سے لکھا ہے

میں 9th میں تھی تب سے شعاع پڑھ رہی ہوں اب B.A کر رہی ہوں میرا حمید کا ناں "یارم" پڑھ کر رہا ہے۔ باقی ناں بھی اچھے ہیں اور پلیز رخسانہ نگار عدنان بی تموزاً فراخ دلی سے لکھا کریں کہ بھی پڑھنے میں مزہ آیا اور ناوٹ ختم۔

پیاری تحریم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ رخسانہ نگار عدنان تک آپ کا پیغام پہنچا رہا ہے۔

پھول مگر جمبو خورد سے آمنہ پھول چوہدری نے لکھا ہے

وجہ میرا حمید کا "یارم" ہے۔ جو مجھے بے حد پسند ہے۔ میں نے پچھ افسانے ناولوں اور ناوٹ لکھے ہیں اگر اجازت دیں تو بھجواؤں۔ رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناوٹ بھی اچھے ہیں "اکھوتا" افسانہ بے حد اچھا تھا۔ پیاری آمنہ! افسانے ناوٹ لکھے ہیں تو ضرور بھجواؤں پچھنے کی ضرورت نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دن سے شکریہ۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے لکھا ہے

ماٹشل بست ہی بروقا اور پاکیزہ لگا پیارے نبی کی پیاری باتوں سے اپنے کمزور اور ڈگمگاتے ایمان کو پختہ کیا محبت زندگی ہے "راشدہ رفعت کا زبردست اور دلکش ناول جس کے اتمام پر سوڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ "حصار دعا" میں بست سے پہلو سوال طلب تھے مثلاً "اتنی بڑی غلط فہمی کسی لڑکی کے پارے میں ہو اور وہ لڑکی کچھ بولے ہی نہ وہ بن قبول نہیں کرتا۔ فرح بخاری کا مکمل ناول "شام خزاں" ناول سہی "ایسا خوب صورت" احساسات و محسوسات کی دانش ترقی جانی مرکی یہ اعلا طرفی بست ہی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ "غریق رحمت" سحر ساجد کا ناول بست ہی "رقص بسل" کی کہانی عجیب سی لگتی ہے ماورا کا رویہ اور انداز اتنا سچا اور روونگ ہوتا ہے کہ مزا نہیں آتا۔ بست شکریہ ارم! آپ کا تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچایا جا رہا ہے۔

سامرہ بختلور رفعت مشمنہ تمہینہ اینڈ زیب گاؤں ملتان والہ تحصیل و ضلع ملتان سے لکھا ہے

اس ماہ کا ناٹل بست پیارا تھا۔ حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں کے بعد "یارم کی طرف لپکے۔ اس مرتبہ عالیان اور امجد نے رنا دیا۔

"رقص بسل" کے کچھ صفحات بڑھا دیجیے اور ماورا مرتضیٰ کی امی کے ماضی سے پرہ اٹھائیے۔ "غریق رحمت" ناول بست اچھا رہا۔

"شعاع کے ساتھ ساتھ" میں ڈاکٹر انیس عامر کا احوال اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بیوی کو صحت عطا فرمائے اور ان کی بیٹی کو خوش رکھے۔ (آمین)

ایف ایم U11 ملان کے R1 نصف نور کا انٹرویو دینے اور ڈرامہ سیریل بشروسن کی "رواجہ" کا انٹرویو دینے۔ پلیز

کارن بیسی ایک میری دوست سی ہوں۔ پیاری کنوں! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے امرت کی زندگی کے لیے دو مضمونوں کا طویل خط لکھا ہے میرا حیرت انگیز ہے! یہی ظالم نہیں کہ آپ کا معصوم سا دل توڑ دے۔ آنسو پونچھ لیں۔ امرت اور عالیان کو کچھ نہیں ہوگا۔

مازہ! بخار اور 'رحمت'، 'شینہ'، 'تہینہ' اور 'نسیب'! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکر ہے۔ انٹرویو کی فرمائش متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

حافظ حنا ہاشم انڈیا امرت ہاشم صاحبہ مجسمہ R-1707
کچھ دالات لکھتی ہیں

کنول اقبال نے ضلع جہلم سے لکھا ہے

ہمیں ڈائجسٹ منگوانے میں بہت مشکل پیش آتی ہے ہمارے گھر والے پڑھنے نہیں دیتے لیکن پھر بھی ہم پڑھنا نہیں چھوڑتے جب تیار سدا آتا ہے تو ہم میں لڑائی بہت ہوتی ہے لیکن پھر بھی پہلے میں یعنی حنا ہی پڑھتی ہوں نیلہ عزیز کا ناول بہت فائنٹک لگا اور پلیز اس کو جلدی کمپلیٹ کریں ہم مزید اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے اور رخصتہ نگار عدین کا ناول بھی بہت شاندار ہے اور مثال کے ساتھ مزید برامت کریں۔

میرے خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ "یارم" ہے میرا جی جب یہ شروع ہوا تھا تو شکر کیا تھا ہم نے کسی نے گھریلو جھگڑوں اور ساس بوسے ہٹ کر لکھا ہمیں اس کو پڑھتے ہوئے بہت مزہ آیا۔ زبردست ناول رہا ہے ویسے

حنا امرت اور صاحبہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ کتابوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کریں۔ 021-32216361

قارئین متوجہ ہوں!

ٹویہ انک سے لکھتی ہیں

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام طے ایک ہی نالی میں بھجوانے چاہئے ہیں۔ تاہم ہر خط کے لیے انک کا قلم استعمال کریں۔
- 2- امانتے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کا قلم استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور طے کی بہت پر مبنی طے کی دوسری طرف برگزیدہ لکھیں۔

پہلی شعاع سے لے کر خوب صورت ہنسی سے لکھا کون سا سلسلہ ہے جو قابل تعریف اور قابل ذکر نہیں ہے۔ رقص بھل یارم اور ایک نئی مثال ایسی تحریریں ہیں جن کی تعریف کرنے کو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ "غزل رحمت" بھی زبردست کہانی ہے "شام غزلیں طویل سہی" اپنے نام کی طرح طویل اور خوب صورت تحریر بھی عازم کا گروار بہت پسند آیا۔ پلیز عازم کے نام کا معنی بتائیں "اکوٹا" ایک بلی پھلکی تحریر بھی ہو مزاد، مہلی۔ "مختصین بانٹیں" ایک سبق آموز تحریر بھی۔ واقعی اگر ہمارا آج کا نوجوان ہماری نوجوان نسل محبت کے معنی سمجھ جائے۔ پیاری ٹویہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے۔ عازم کے معنی ہیں عزم کرنے والا جو صلہ مند۔

- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پانچا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- سوادے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، تاہم قابل شاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر واپس کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کاپی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شعاع کے لیے امانتے، خط و سطحوں کے لیے انتخاب اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر ہر ہفتی کر دینا۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ شعاع انجمن ڈائجسٹ اور ناول خواہن ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچون ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقیقی طے و طے ہیں۔ کسی بھی ناول کے بارے میں کسی بھی قسم کی اشاعت یا کسی بھی قسم کی اشاعت سے ڈراما اور ناول کی اشاعت اور سلسلہ وار لکھنے کے کسی بھی طرح کے مسئلے سے پہلے پیش سے تحریر کی اجازت لینا ضروری ہے۔ سب صورتوں میں ناول کا طے یا حقیقی طے کا حق رکھتا ہے۔

دستک دستک

شاہین رشید

عمران اسلم

”کسے ہیں عمران اسلم صاحب؟“

”آج کل“

”تج کل تو انشاء اللہ آپ ہی آپ اسکرین پر ہیں۔ آن ایر تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ مزید مصروفیات بتائیے؟“

”بس کلام ہو رہا ہے اور کوشش ہے کہ اچھا کلام کر دوں تاکہ لوگ ہمیشہ مجھے پسند کرتے رہیں اور مصروفیات کے بارے میں بتانا میرے خیال سے عمل از وقت ہو جائے گا کیونکہ کچھ کلام ابھی شروع ہوا ہے اور کچھ شروع ہونے والا ہے۔ اب یہ تو معلوم نہیں ہو گا کہ کب مکمل ہو گا اور پھر کب آن ایر ہو گا۔“

”چلیں یہ بات تو بتادیں کہ رول نیگیٹو ہوں گے یا پوزیٹو؟“

”گزشتہ سال میں نے زیادہ تر نیگیٹو رولز کیے مگر اس سال کوشش ہو گی کہ لائٹ کامیڈی اور پوزیٹو رولز کر دوں اور نئے آنے والے سیریز میں کبھی رہا ہوں۔“

”اپنی طبیعت سے ہٹ کر کردار کرنے میں لطف آتا ہے یا اپنی طبیعت کے مطابق؟“

”اپنی طبیعت کے مطابق کردار کرنے کا مزہ نہیں ہے۔ اور آپ کو بتاؤں کہ میں نے اس فیلڈ کا انتخاب اس لیے کیا کہ میں اپنی لائف کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤں مگر اس دنیا میں چلا جاؤں جو میرے لیے بالکل نئی ہو تو بس اس لیے ایسے کردار لیتا ہوں جو میں خود نہیں ہوتا۔“

”بہت خوب۔ کیا اپنی لائف سے خوش نہیں ہیں آپ؟“

”ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے میں ایک خوشگوار اسی لائف گزار رہا ہوں۔ لیکن چونکہ میں زندگی میں تھوڑا ہی بیچ چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے مزاج سے ہٹ کر کردار کرنے میں مزا آتا ہے۔“

”فیلڈ میں آکر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ دوسروں سے مختلف ہو گئے ہیں؟“

”نہیں جیسا ہرگز نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جو پہلے تھا بلکہ اب تو اس فیلڈ میں آنے کے بعد تو میں لوگوں سے زیادہ قریب ہو گیا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے جب لوگ مجھے پہچان کر مجھ سے ہیلو بٹے کرتے ہیں۔ مجھ میں زیادہ انکساری آگئی ہے۔“

”اچھا۔ کیوں زوال سے ڈرتے ہیں شہرت کی؟“

”نرم مزاج تو خیر میں پہلے ہی تھا اور فرحانی اور لوگوں کی محبت کو دیکھ کر رب کا شکر لو کرتا ہوں۔ اور زوال سے ڈرتا نہیں ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کلام میں کوئی نہ کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے اور میرے ساتھ اگر ایسا ہوا تو میرے رب نے میرے لیے کوئی دوسرا راستہ منتخب کیا ہو گا۔ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا یہ رب کی ہی تو مہربانی ہے۔“

”لوگوں کو مشورہ دین گے اس فیلڈ میں آنے کا؟“

”بالکل کیوں نہیں مجن میں صلاحیت ہے نہ ضرور اس فیلڈ میں آئیں۔ ہر صلاحیت انسان کے لیے اس فیلڈ کے راستے کھلے ہیں اور میرا ایمان ہے کہ فیلڈ اپنی جگہ بتاتی لیتا ہے۔“

”تو آپ کو مشکل ہوئی اپنا فیلڈ منوانے میں؟“

”مجھ پر تو اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی مجھے یاد ہے کہ کسی کام کے سلسلے میں میری ملاقات حسین اختر صاحب (مرحوم) سے ہوئی۔ تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ

رخسانہ نگار عدنان

ایک ہی حیرانی

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بیٹے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ حنا ذکیہ بیگم کی نوایس اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں رواجی ساس بہو کا تعلق ہے۔ سچ سال کی سنسنیل کوششوں کے بعد بشری کی نذر فوزیہ کا ہالا ٹرا ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری کو لہما لہما طیسر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل طیسر کا بشری کے لیے بھی رشتہ تیار تھا مگر بہت مندین سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زادہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پہچان جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو قاتلے سے منع کرتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پہچانا ہے کہ بشری کے ہاں سات ماہ بعد پھر خوش خبری ہے۔

حفاان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ حفاان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گرجو بیٹی اور گاؤس کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ حفاان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈیکٹی کی واردات میں گل ہو جاتے ہیں۔ حفاان کے قریبی دوست زہیر کی مدد سے عاصمہ حفاان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گرجو بیٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زہیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مٹھولین کو دکھاتا ہے۔ زاہرہ نسیم بیگم سے تین لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بھڑا اے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ عاصمہ کی بھجوری ہے کہ گھر میں کوئی موٹیس۔ اس کا بیٹا ابھی پھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کئے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زہیر کسی مٹھی سے تھوٹی لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عہد امتحالی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ مگر وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے





Copy Right Web

جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ جاتی ہے۔

رلم مسانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھروالوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا اپارٹمنٹ ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر مٹھی مانتا ہے۔ گھر وہ ہوز تاراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو بتا چلتا ہے کہ زہر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفور ہے۔ صحت کو نشوونما کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان بولا جاتا ہے۔

بشری اپنی واپس آگم گھر سے مشروط کرتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ بیگم کی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اور بولا پر رشن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے بشری کے آنے کے بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں ملتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی بہت دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو بھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو رہی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے بھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کھاتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چٹخیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپیکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا کر صلحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچتی ہیں۔ فوزیہ کی اہلیک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپیکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانتے ہیں۔ ذکیہ بیگم

خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بیٹی سے شادی کر لیتا ہے۔ پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سینٹی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری لالچ کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا عزم کرتا ہے مگر بشری اقلی نہیں مانتی پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ بیٹے کے ابتدائی بندہ دونوں میں مثال بشری کے پاس رہے گی اور نقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل محنت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکن بن جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سینٹی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی بدسری ہوئی محنت۔ مثال کے لیے مزر زمن تنگ۔ بشری اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد گھوٹتی ہے۔ احسن کمال اپنی جلی کو لے کر لائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک منشی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً پوش آریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کونگ سینئر خوب ترقی کر جاتا

بے مثال واقعہ کی نظروں میں آئی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔
 عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اور اسیہ کو اپنے
 بیٹوں و قار و قاس کے لیے لگا لگتا ہے۔ عاصمہ اور واقعہ بہت خوش ہوتے ہیں۔
 سیٹی، مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیزوں سے سب وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ سیٹی الٹا مثال پر الزام
 لگاتا ہے کہ وہ اسے بھکاری سمجھی۔ حسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشری مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ
 نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری ٹیلی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشری، مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ
 جاتی ہے۔ جہاں محنت اور پریشانی سے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واقعہ کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واقعہ کے
 درمیان ان کا ماسا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واقعہ البتہ محل
 کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ واقعہ، عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر
 پر بھی مثال کو پیمان نہیں پائی۔ واقعہ، عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر روزانے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو
 برسوں پرانی رات یاد آتی ہے۔ جب زہیر نے عاصمہ کی صحت دہری کر کے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے
 عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا جی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ
 کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے
 احساس سے عاصمہ کو انجانا کا انہک ہو جاتا ہے۔ واقعہ روزانے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار
 کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن ایوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے قند سے مثال کا
 رشتہ طے کر دیتا ہے۔ محنت، مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح مل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ
 کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہو جائے۔ مثال ہی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں
 پاتی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنجھتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی قند سے
 منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واقعہ کی ملاقات پریشے سے ہو جاتی ہے جو کافی ناز و ادا سے واقعہ سے
 بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس ٹیلور وہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے، واقعہ کی بہن ہے۔
 منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ محنت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشری کو فون
 کر کے مثال کو بیچنے کی بات کرتا ہے۔ مگر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کلج کی لائبریری میں واقعہ سے ملتی
 ہے۔ واپسی میں محنت اسے واقعہ کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتاتی ہے۔ عدیل اذہد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشے
 و رد سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واقعہ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

۲۳ چوبیسویں قسط

بری کی آنکھوں میں جھک اور عجیب سی خوشی ابھری۔ واقعہ کے مسکراتے لب اس کی آنکھوں کی جھک کو دیکھ
 کر بہت بہت مسکراتے طے گئے
 ”ہائے!“ بری نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے اپنا دو دھیانزہرہ گداز ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ واقعہ اس
 کے انداز کو بس دیکھ کر رہ گیا۔
 ”آپ کون؟“ وہ کچھ موت، بھرے لہجے میں فقط یہی کہہ سکا۔
 ”سلام دعا کا فیشن نہیں ہے کیا آپ کے پاس؟“ وہ شوخی سے آگے ہو کر گنگٹانے والے انداز میں بولی۔
 ”آپ کے خیال میں سلام دعا ایک فیشن ہے۔ فیشن جو ٹائم پائی ٹائم بدلتا ہے۔“ وہ الٹا تنقیدی انداز میں
 جتانے کو پوچھنے لگا۔

”میں بری ہوں۔“ وہ مزید کسی بے کار بحث میں الجھنے کے بجائے بڑے فخریہ انداز میں اپنی تعارف کرائے گئی۔
 ”اور پلیز یہ مت کہیے گا کہ آپ واقعی بری ہیں۔“ پھر فوراً ہی مضمورانہ انداز میں بولا۔
 وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”بٹ رٹلی! میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ تم واقعی بری تو نہیں؟“ وہ کچھ طنزیہ کچھ شوخ لہجے میں بولا۔
 بری نے۔۔ آنکھیں سکوڑ کر واقع کو دیکھا۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟“
 ”کمپلیمنٹ بھی آپ کو مذاق لگتا ہے۔ رٹلی یو آر اے فری۔“ وہ آنکھوں میں خمیں لیے کتنا ایک دم سے
 بری کو بے حد اچھا لگا۔

”اے۔۔ یہ الگ بات ہے آپ کو یہ کمپلیمنٹ بار بار سننا اچھا لگتا ہوگا۔ ہے نا۔“ وہ شرارت سے بولا۔
 ”میں اتنی بھی خود پرست نہیں ہوں۔“ وہ کچھ ٹھنک کر بولی۔
 ”یعنی تو بڑی بہت تو ہیں نا؟“ وہ جانتے ہوئے کہہ کر جانے لگا۔

”اللہ آپ دونوں میں تعارف ہو بھی گیا اور میں نے جو اتنا شاندار ابتدائیہ سوچ رکھا تھا کہ آپ دونوں کے
 تعارف سے پہلے کہوں گی یوں کہوں گی اور۔“ وہ وہ پیچھے سے آکر تاسف بھرے لہجے میں بتا کر کہتی چلی گئی۔
 ”اوہ بن میری! کہیں فل اسٹاپ کھاؤ وغیرہ بھی لگا لیا کرو یہ بھی ہماری زبان کا حصہ ہیں۔“ واقع اس کے تیز تیز
 بولنے سے کچھ چڑ کر بولا۔

”بھائی! یہ بری ہے۔“ وہ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے کھینچ کر بری کے سامنے لاتے ہوئے بے باکی سے
 بولی۔

”ف۔“ وہ مصنوعی انداز میں سر پکڑ کر کہا۔

”سنو لڈی! تمہارا انکجووٹل نم کیا ہے؟“ وہ بری سے جبر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
 ”ریش۔“ وہ کچھ کنفیوز ہو کر جلدی سے بولی۔

”لوگ۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان محترمہ کو ان کے مکمل نام سے پکارا جائے۔ یہ بار بار بری بری کی گردن۔
 ایمان سے بندھا اچھا خاصا کنفیوز ہو جائے کہ واقعی آسمانوں سے اللہ نے کوئی بری تو نہیں بنی تھی۔“ وہ دونوں کے
 چہروں کے بدلتے تاثرات دیکھتے ہوئے کچھ مفلوظ ہونے والے انداز میں کہنے لگا۔

”بھائی! وہ تو رووے کو تھی۔ اس کی اتنی خوب صورت سبلی جسے آج اس نے گھر میں کسی سربراہی کی طرح
 بلایا تھا اسے نکا واقع اس کی بے عزتی کر رہا ہے۔

”اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ تم سے میری دوست کسی بھی آملی بری سے کم نہیں۔“ وہ روہانی ہو کر
 بولی۔

”آپ واپس کب جا رہی ہیں؟“ وہ جھک کر سنجیدگی سے بری سے پوچھ رہا تھا۔

”جی! بری سخت حیرت زدہ تھی۔ کوئی یوں تھوڑی پوچھتا ہے مہمان سے!

”آسمانوں پر۔“ وہ فوراً ”صحیح کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

بری نے بے بسی سے مدد طلب نظروں سے دور وہ کی طرف دیکھا۔

”بھائی! یہ بالکل بھی اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔
 ”کیا! اسیں واپس نہیں جانا؟“ وہ بوکھلا کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔

”کیا اسے جانا چاہیے؟“ وہ الٹا معنی خیز انداز میں واٹن سے پوچھنے لگی۔ وہ اسے جواباً گھور کر رہ گیا۔
اسی وقت عاصمہ نماز پڑھ کر وہ پٹا ٹھیک کرتی ان کے درمیان آگئی۔ درود پڑھے متاثر کن انداز میں پری کاہاں سے تعارف کرانے لگی۔
واٹن کو کھسنے کا موقع مل گیا۔

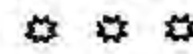
پری اسے در تک جا کر دیکھتے ہوئے جانے کیا کیا سوچتی چلی گئی۔
”اس دن مثل کی انکج جمنٹ والے دن یہ شخص مجھے نظر آیا اور پہلی نظر میں مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اس کے پھر ملنے کی تمنا کی تھی اور میری دعا اتنی جلدی قبول ہو گئی۔ میں نے سوچا نہیں تھا لیکن مجھے لگتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور میری یہ خواہش پوری کرے گا۔۔۔۔۔ تب ہی تو یہ مجھے پھر مل گیا۔ مل گیا۔“ وہ خود ہی اپنی سوچ پر ہنس پڑی۔

”اگر وہ واٹن کی نہیں ہم دونوں کہاں اسٹڈی ہی تو کریں گے۔ خدا انخواستہ کچھ اور تو نہیں میرے کہنے پر یوں ہنس پڑیں۔“ درود اس کے یوں ہنسنے پر اسے شوکا دے کر بولی تو وہ سر ہلا کر مسکراتے لگی۔
عاصمہ دونوں کو دیکھ کر شفقت سے مسکراتے ہوئے جانے لگی۔
”میں اندر ہوں کرے میں درود اگر کچھ کھانے کے لیے چاہیے ہو تو نسرین کو بتاؤ تا وہ ابھی ہمیں ہے رات میں جانے کی۔“ وہ ملازمہ کا ہاتھ کر جانے لگی۔

”جی ہاں! میں کہہ دوں گی۔“ ہنسنے سے گوازا لگا کر درود نے جواب دیا۔ پری ابھی بھی کسی سوچ میں مگمگ تھی۔
”ارے! تم کیا سوچ سوچ کر مسکراتے جا رہی ہو۔“ درود اتنی بھی سیدھی نہیں تھی مگر پری اسے سمجھے ہوئے تھی۔

”جواب کیا مجھے مسکراتا ہی نہیں چاہیے۔“ وہ الٹا انگلی سے بولی۔
”پہلے تو تم ذرا بھی مسکرا نہیں رہی تھیں۔ اتنی ہی شل بنا کر بیٹھی تھیں جیسے میں تمہیں زبردستی باندھ کر لائی ہوں یہاں۔“

وہ جتانے والے انداز میں بولی تو پری فوری طور پر کچھ کہہ نہیں سکی۔
”اب میں چلوں درود! کالی لیٹ ہو گئی ہوں امی کو میں تھوڑی دیر کا ہی کہہ کر آئی تھی۔“



”کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ عدیل کو یہ بات سوچنا اور ہضم کرنا بہت مشکل لگ رہی تھی۔
اسے عفت کی بات پر بھی کچھ شک تھا۔
بشری یہ بات۔۔۔ نہیں مانتی کہ مثال کسی میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ مثال اس نام پر کی

لڑکی نہیں ہے۔ لیکن عفت بلاوجہ اپنے بچوں کی قسم نہیں کھا سکتی۔
دل دیکھ کر پر تگاہ تھا۔ عاف بھی اس کا ساتھ دیتا مگر پھر عدیل کو لگتا یہ سب غلط ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔
اسے ایک عجیب سا خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔
اگر مثال نے یہ بات کہہ دی کہ ہاں وہ واقعی کسی اور کو پسند کرتی ہے بھلے خد میں بھلے کسی اور وجہ سے۔ تو وہ کیا کرے گا اسے زبردستی روک تو نہیں سکے گا اور اس کا رشتہ وہاں بھی نہیں کر سکے گا جس میں وہ چاہے گی۔
اور بشری اسے کپاس مثال کو بھجوانا۔ وہ بات کر کے دیکھ چکا تھا یہ بات سنتے ہی بشری کی اور مثال کی حالت بگڑنے

لگتی۔
 کچھ بھید بھاؤ اس میں بھی تھا جو دونوں ہی یہ نہیں چاہتی تھیں، لیکن جب سیدھے سیدھے شادی ہو رہی ہے،
 اتنے اچھے رشتے کامل جانا کسی نعمت سے کم نہیں تو پھر مثال کو کیا مسئلہ ہے؟
 وہ عفت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فوری طور پر مثال سے کچھ نہیں پوچھ سکا تھا۔
 مگر بے قرار دل کو چین بھی ایک پل نہیں آ رہا تھا۔
 ”نہیں مجھے ایک بار تو مثال سے بات کرنا ہوگی۔“ وہ طے کرنے والے انداز میں خود سے کہہ کر باہر نکلے گا کہ
 اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے بے زاری سے اجنبی نمبر کو یہ کرکال ریسیو کی تھی، نمبر سرے لے کر اس کے ہاتھوں کے
 توتے اڑ گئے تھے۔

”جی بات کر رہا ہوں عدیل احمد! استفسار پر اس نے ناگواری سے جواب دیا تھا۔
 ”دانیال احمد کے والد ہیں آپ؟“ گلا استفسار چوکا دینے والا تھا۔ عدیل ٹھٹھک کر رہ گیا۔
 ”جی۔ دانیال میرا ہی بیٹا ہے، آپ کون ہیں؟“ وہ سمجھا شاید دانیال کے کسی دوست کے والد ہوں گے یا کوئی
 ٹیچر اسے لگا شاید اس کی طرف سے کوئی شکایت ہے، سو متوجہ ہو کر دوسری طرف کا جواب سننے لگا۔
 ”آپ کو اسی وقت قتلے آنا ہوگا۔ میں انسپکٹر رؤف بات کر رہا ہوں۔ آپ کا بیٹا ہمارے پاس۔“ اس سے
 آگے انسپکٹر قتلے کا پتا پتا رہا تھا اور عدیل جیسے کچھ بھی سن نہیں پاتا تھا۔
 ”تو آپ کچھ رہے ہیں۔ میں آپ کا سیٹ کر رہا ہوں خدا حافظ۔“ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔
 عدیل من ہاتھوں کے ساتھ فون ایک طرف ڈال کر بیڑھال سا بیٹھ گیا۔
 اس کا دل غچند لکھوں میں جیسے ماؤنٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

”یہ بری مجھے گھنہ بھر کا کہہ کر گئی تھی اپنی دوست کی طرف، ابھی تک آئی نہیں۔“ عفت استری کیے ہوئے
 کپڑوں کے ڈیگرز ہاتھ میں لیے اندر آکر الماری میں شکاتے ہوئے بیڑھاتے ہوئے کچھ اطلاعی انداز میں بول رہی
 تھی۔

عدیل کے چہرے پر وہ سرے لے کر طیش بھرے تاثرات ابھر آئے۔
 ”آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟ فائنڈ بھائی کی کال آئی تھی وہ ہر جس۔ میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ فائدہ جلد آ رہا
 ہے۔ وہ کہہ رہی تھی اور آتے ہی شادی کی تاریخ رکھ دیں گے۔ انہوں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ ان کے
 فون کا مقصد یہ تھا کہ ہم بھی تیاریاں شروع کر دیں۔ سن رہے ہیں نا آپ؟“ وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔
 ”دانیال کہاں ہے؟“ وہ اس کے سر پر کچھ کر دہشت لہجے میں بولا۔ عفت اس بات کے لیے تیار نہیں تھی۔
 وہ ششدر رہی عدیل کو دیکھتی رہ گئی۔

اس نے باقی ڈیگرز بونٹی بیڈ کے کنارے پر رکھ دیے۔ اسے لگا عدیل کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔
 ”کیا مطلب؟ وہ اس کا کچھ تھا۔ آج کرکٹ کا۔ تو اسکول سے آکر وہیں گیا ہے۔ کل ان کے اسکول میں کپٹین

ہے۔“ وہ کچھ ڈری ہوئی انک انک کر کہہ رہی تھی۔
 ”آری غافل عورت، اس طرح کی ماں ہو تم کہ تمہیں کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہے۔ وہ سروں کے عیب اور
 برائیاں ڈھونڈنے سے فرصت لے تمہیں تو تم اپنی اولاد کی طرف دھیان دو۔“
 عدیل کا لہجہ اس کا طرز خطاب اور الزامات۔
 عفت کو لگا جیسے کسی نے اس پر چڑوں سے بھرا گیلن، الٹا دیا ہو اور اسے سلائی بھڑکنے کو ہے۔

”میری اولاد۔ میری اولاد۔ میرے لے کر آئی تھی میں، کسی حیم خانے سے پکڑ کر جو ہر وقت ایک ہی بات کا طعن بن کر آپ کے منہ پر رہنے لگی ہے، آپ کے کچھ نہیں لگتے کیا وہ دونوں؟“ وہاں گلوں کی طرح چہنچہنے لگی تھی۔
 ”وہ اس وقت کسی بیچ میں نہیں ہے۔ حوالات میں ہے۔ جانتی ہو تم؟“ وہ غرا کر اسے حقارت سے پرے دھکیل کر بلا۔

اور عفت کو لگا کسی نے اس کے پورے وجود کو مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ اس سے سانس بھی نہیں لیا جا رہا تھا۔
 وہ بے یقین نظروں سے ہونٹ پیچھے عدیل کو دیکھے جا رہی تھی۔
 ”تسم نے کس عدیل۔ دانیال اور پری آپ کے بچے ہیں۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں پھر آپ نے کہا اپنی اولاد سے اس طرح کا یہ باندھ لیا ہے۔“ وہ سر پکڑ کر وہیں پیچھے بیٹھ گئی۔ اور گھٹی گھٹی ہچکچکیوں سے رونے لگی۔
 عدیل کو لگا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

”وہ صرف میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ آپ کا بھی ہے۔ آپ کا خون، آپ کا اکلوتا بیٹا پھر آپ اس کے بارے میں ایسی بات کیسے کر سکتے ہیں۔ کیسے؟“ وہ آخر میں چیخی تھی۔
 ”صفت۔“ عدیل بھی ضبط کھو بیٹھا۔ ”تم میری بات سن بھی رہی ہو یا نہیں؟“ وہ سخت غصے اور اور جھلاہٹ میں چیخا تھا۔

”دانیال تھانے میں ہے۔ مجھے ابھی پولیس اسٹیشن سے کال آئی ہے۔ انہوں نے فوری طور پر مجھے تھانے بلایا ہے۔“ وہ زور سے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عفت اور بھی حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”چتا نہیں ابھی اور کیا دیکھنا باقی ہے مجھے اس ادارے کے ہاتھوں ابھی جو ان نہیں ہوا یہ لڑکا اور باپ کو تھانے کے چکر لگوانے لگا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے الماری سے اپنی بیڑس نکالنے لگا۔
 ”اور سن لو! اگر کچھ سیریس معاملہ ہوا، کوئی ایسی ایسی بات تو تسم سے میں اسے وہیں چھوڑ کر چلا آؤں گا۔ جرم کی سرپرستی تو بہر حال میں نہیں کر سکتا۔“

وہ اس کے قریب رک کر کچھ سے تھانے والے لمبے میں کہہ رہا تھا۔ تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لگی۔
 ”عدیل! رکیں۔ میں۔ مجھے بھی جانا ہے آپ کے ساتھ۔“ وہ حواس باختہ سی لادپٹے سے بے خبر اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

”میرے ساتھ تم تھانے چلو گی؟“ وہ حقارت سے بولا اور رات کا کھانا تیار کرتی شکل کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ وہ عدیل کی بات سن کر حیران سی رہ گئی۔

”میں جاؤں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے، پلیز مجھے ساتھ لے کر چلیں۔“ وہ آنکھوں میں جیسے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ مت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مثال اسپتالی سے کچن کے دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ہوش میں تو ہو؟“ وہ نہی آواز میں غرایا۔
 ”خدا کے لیے میری ہامتا کا اور امتحان نہیں لیں۔ مجھے جانا ہے رانی کے پاس۔ ساتھ لے کر جائیں مجھے پلیز۔“

وہ مثال کی موجودگی سے بے خبر مت کر رہی تھی۔
 ”صفت! امیر ایف خراب نہیں کرو میں جا رہا ہوں ابھی پولیس اسٹیشن وہاں کیا معاملہ پیش آنے والا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم مجھے یوں روک کر مزید پریشان نہیں کرو۔ میں وہاں جاتے ہی تمہیں کل کر کے جتاؤں گا کہ کیا معاملہ ہے۔ چتا ہوں میں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر جانے لگا۔

”عدیل! خدا کے لیے مجھے ساتھ لے کر جائیں۔“ وہ روٹی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ عدیل ان سنی کرتا ہوا چاچا تھا۔ عفت بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔



”یہ کیا کہہ رہی ہو وردہ! عاصمہ اور واثق تو جیسے ششدر ہو گئے۔ وردہ کے چہرے پر جوش اور اطمینان تھا۔ واثق کے چہرے پر اب ہلکا ہلکا غصہ نمودار ہونے لگا تھا۔“

”تمہاری اس فضول بات کا مطلب کیا ہے؟“ وہ اپنا غصہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکا۔

وردہ واثق کے لمبے پر لٹھے بھر کو کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”وردہ! سوچ سمجھ کر بولا کہ۔“ عاصمہ نے بھی اسی لمبے میں اسے گھرا۔

”یہ کیا ہے۔ اس گھر میں کوئی اچھی بات کرنے پر بھی ڈانٹ ڈپٹ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ عاصمہ اور واثق ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

”ایہ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ پلیز آپ ایمان داری سے بتائیں۔“ وہ دونوں کو خاموش دیکھ کر فوراً بولی۔

واثق نے کھانا دیکھا تو بھوڑا۔

”تمہاری عمر بے اس باتیں کرنے کی؟“ عاصمہ کو اس طرح سے منع کرنا ٹھیک لگا۔

”کم آن ای! مجھے کیا ہوا ہے؟ پھر آپ بھی تو بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ اگر ایک لڑکی میں نے پسند کر لی تو کیا برا کیا۔“

”وردہ۔“ واثق کو اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔

”واثق! تم کھانا کھاؤ تاکہ بولتے دو۔“ واثق کو غصے میں دیکھ کر نرمی سے بولی۔

”ایہی! بری ہر لحاظ سے بھائی کو سوٹ کرے گی۔ دونوں کی جوڑی چاند سورج کی ہے۔ اتنا پر لکٹ کھیل ہو گا کہ لوگ آپ کو مبارکباد دیا کریں گے راستہ روک روک کر۔“ واثق کو آنکھ مار کر بولی۔

”ایہی! اسے چپ کر دالیں۔“ وردہ سے کچھ سخت نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کو براہ راست نہیں ٹوکا۔

”وردہ بیٹا! یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔“

”ایہی! مجھے کوئی ایک ریڑن بتا دیں انکار کی۔“ وہ بھی اسی لمبے میں بولی۔ یوں بھی واثق اور عاصمہ نے وردہ کو بہت سا ڈس رکھا ہوا تھا۔ وہ ہر طرح کی بات آرام سے کر لیا کرتی تھی۔

”بیٹا! واثق اور بری کا اتنا بڑا بھروسہ دیکھا ہے تم نے؟“ عاصمہ کے ذہنی طور پر یہی وجہ سمجھ میں آئی تو بولی۔

”اللہ کو مانیں امی! وردہ کھانا چھوڑ کر دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر بڑے مفکرانہ لمبے میں بولی۔ دونوں بے اختیار مسکرانے لگے۔

”تم چاہتی کیا ہو؟“ واثق اب دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

”پری! ہمارے گھر میں آجائے میرے پیارے سے اتنے ونڈ سم و جیسہ بھائی کی دلہن بن کر اور امی لبتی میں نے یہ بات اسی دن سوچ لی تھی جس دن میں نے پری کو پہلی بار دیکھا تھا۔“ وہ شوق سے کہہ رہی تھی۔

”ایہی۔ یہ کیا پڑھنے جاتی ہے کلج میں؟“ واثق اسے گھور کر بولا۔

”اب تو میں کہہ سکتی ہوں“ یہی پڑھنے جاتی ہے۔“ عاصمہ کچھ بے بسی سے بولی۔

”اس لیے تو اس کے گریڈز کا حال دیکھ لیں“ فرسٹ ٹرم میں۔“ وہ بھی لقمہ دیتے ہوئے بولا۔

وردہ دونوں کو دیکھ کر ایک دم سے رونے لگی۔
 ”حد ہے بھئی۔ یہ تمہارا حوصلہ ہے اور اتنی اتنی سی بات پر رونے لگو گی تو آگے کیا کرو گی؟“ وہ اسے نشوونے
 ہوئے چھیڑنے کے سے انداز میں بولا۔
 ”آگے کیا مطلب؟“ وہ آنسو بھری آنکھوں سے بولی۔
 ”مطلب جب تم اپنے بھیا کا پروپونل اس پری کے لیے لے کر جاؤ گی اور وہاں تمہیں جوتے پڑیں گے تم تو وہیں
 رونا شروع کرو گی۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔
 وردہ اور بھی شدت سے رونے لگی۔
 ”وردہ اکیا پچھتا ہے یہ کیوں اس طرح بے وجہ رونے لگی ہو، کھانا کھاؤ ٹھیک طرح سے۔“ عاصمہ نے اسے
 ڈانٹا۔

”میری تو اس گھر میں کوئی ویلو ہی نہیں ہے، مجھے تو کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں۔“ اس کے رونے میں اور بھی
 شدت آئی، عاصمہ نے بے بسی سے واٹھ کو دیکھا۔
 ”وو کے تم رو لو جی بھر کر اور اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ تمہاری فضول باتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے
 تمہیں شہہ دی جائے گی۔ آج اگر تم نے یہ بات مذاق میں کہہ دی ہے تو میں رگنور کر رہا ہوں۔“ واٹھ سنجیدہ تھا۔
 اٹھ کر کھڑا ہوا تو وردہ کچھ سسم کر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”لیکن آئندہ اگر تم نے اس طرح کی بات سنجیدگی میں کی تو وردہ لیا اور کھنا تمہارا ابرا بھائی ہوں۔ مجھے اس
 طرح کا مذاق دوسری بار پسند نہیں آئے گا۔“
 ”بھائی!“ وہ ششدر سی رہ گئی۔

”یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ تم اس طرح کسی بھی راہ چلی لڑکی کا نام میرے ساتھ جوڑ کر مجھے مذاق کا نشانہ بنانا
 چاہو یہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ چھوٹی ہو گھر میں، سو اسی حساب سے بات کرو۔“ وہ سخت درشت لہجے میں
 کہتا ہوا وردہ اور عاصمہ کے تاثرات دیکھے بغیر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ دونوں کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش
 ہو گئیں۔ دوسرے لمحے وردہ پھر سے رونے لگی۔
 ”وردہ بس کرو بہت ہو گیا واٹھ نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ کم از کم تمہیں کھانے کے دوران یہ سب
 نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اب تم سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو، کم از کم کسی بات کو کرنے کا موقع مل سمجھ سکتی ہو۔“ عاصمہ
 نے بھی اسے ڈانٹا۔

”ہی اکیا اتنی ہی بری بات کر دی میں نے جو بھائی نے اس طرح سے مجھے ڈانٹ دیا ہے۔ پری اتنی بری ہے
 کیا؟“ اس کی سوتی وہیں اٹھی ہوئی تھی۔
 عاصمہ نے بے اعتبار ماتھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”اب تم دوبارہ اس لڑکی کا نام نہیں لو گی۔ او کے! کھانا کھاؤ۔ میں واٹھ کو دے کر آتی ہوں۔“ عاصمہ اٹھ کر پہلی
 گئی وردہ یونسی بیٹھی رہ گئی۔



”لہا لہا کا فون نہیں آیا؟“ پری سخت پریشانی میں اندر آگیاں سے پوچھنے لگی۔

عفت جو اجڑے حلیے میں بیٹھی تھی، نفی میں سر ہلا کر پھر آنسو پینے لگی۔ مثال اس کے پاس بالکل خاموش
 بیٹھی تھی۔

”میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں چلی جاتی تو یوں ان چار گھنٹوں میں ہزار بار مرنی تو نہیں۔“ وہ سخت گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگی۔ مثال کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔
 وہ اٹھ کر خاموشی سے پانی کا گلاس لے آئی اور محنت کے آگے کیا وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے پانی کا گلاس لے کر پینے لگی۔

”پپا نے کچھ بتایا بھی نہیں کیوں پکڑا ہے انہوں نے ان کو۔“ پری بے قرار تھی۔
 ”بتایا ہوتا تو میرے دل کو چین نہیں ہو جاتا۔ کئی بار فون کر چکی ہوں۔ کال ہی کاشدے تے ہیں۔ کس تھانے میں گئے ہیں مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ڈرنہ میں ٹیکسی کروا کے ہی جاتی۔“ محنت کے دل کو سخت بے قراری لگی تھی۔
 ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔
 ”میں کال کروں؟“ پری نے اپنے سِل پر نمبر پایا۔

کچھ دیر بعد فون ہاوی سے بند کر دیا۔
 ”اگر عدل کے کسی دوست کو فون کر کے کہتی ہوں تو تھکا ہوں گے اگر۔ ورنہ وقار بھائی کی بھی اچھی خاصی واقفیت تو ہوگی۔ اب وہاں رشتہ ایسا نازک ہے یا اللہ میں کیا کروں۔ میرے بچے کو اپنی امان میں رکھنا۔ اسے کچھ بھی نہ ہو تو ساتھ خبرت کے گھر آجائے۔“ محنت دوتے ہوئے وعائیں مانگنے لگی تھی۔
 ”جاؤ آئی! تمہارا فون بج رہا ہے اندر۔“ پری گم صم بیٹھی مثال کو تھانے والے انداز میں بولی۔
 ”جاؤ جلدی دیکھو تمہارے پپا کا ہو گا۔ ایک تمہی تو ہو ان کی سگی اولاد پائی تو سب کو ڈا ہے۔“ محنت ایسے میں بھی طعنہ دینے سے باز نہیں آئی۔

مثال تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی۔

فون مسلسل بجتے ہوئے بند ہو چکا تھا۔

اس نے فون اٹھایا۔ بشری کی کال پھر سے آ رہی تھی۔

مثال بجتے فون کو دیکھتی رہی۔

”کس کا فون ہے؟“ پری دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”میری بل کا ہے۔“ مثال مجھانہ لہجے میں آہستگی سے بولی۔

”اب بتاؤ نا انہیں ساری رپورٹ دے دینا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں ماں کی طرح طعنہ دے کر چلی گئی۔

مثال کا جی تو بے اختیار چاہا فون ہی کاشدے۔

خند میں آکر میں وہی کام کھیل کر لی ہوں جو دوسرے چاہتے ہیں اور دوسرے لمحے اسے خیال کیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔

”میں دوسرے کمرے میں تھی۔“ بشری کے پوچھنے پر وہ سرسری لہجے میں بولی۔

”کیسی ہو تم؟“ بشری نے اس سے وہ سوال اٹھے دنوں بعد آج پوچھا تھا جو وہ اس سے ان دنوں متوقع کر رہی تھی، جب وہ اس سے دور گئی تھی۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”اور تمہارے پپا؟“ وہ بات پر چھانے کو بولی۔

بشری کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔ مثال سمجھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہیں وہ بھی۔“

”تمہارے پیانے دوبارہ کوئی بات تو نہیں کی۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میں نے پوچھا ہی تھی۔ وہ خوف نہ تھی کہ کہیں عدیل
مثال کو بشری کے پاس بھجوانے دے۔“

”تمہارے اور ان کے درمیان جو جھگڑا ہوا تھا۔“ وہ کھل کر نہیں پوچھا ہی تھی۔
”ماما! میرا کل کالج میں ٹیسٹ ہے۔ میں وہ تیار کر رہی تھی۔ آپ پلیز پھر کال کر لیجئے گا۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔
خدا حافظ۔“ ایک دم سے اسے بشری سے عجیب سی ہزاری ہوئی تھی۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔
انہیں مجھ سے میرے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”میں واقف سے کہوں تو جا کر پیانے اور دانی کا ہاتھ کرے۔“ اسے خیال آیا۔
”نہیں اگر پیانے کو یہ بات اچھی نہیں لگی پھر شاید واقف کو بھی عجیب لگے۔ معلوم نہیں دانی کس مسئلے میں پکڑا گیا
ہے۔“ وہ گفت و شنید سے ہنسنے لگی۔

پھر اس نے ہمت کر کے عدیل کا نمبر ملا ہی لیا اور حیرت انگیز طور پر عدیل نے اس کی کال ریسیو کر بھی لی۔
”پاپا! آپ کب گھر آ رہے ہیں ہمارا بہت پریشان ہیں۔“ اسے فوری طور پر کئی سمجھ میں آیا۔

”میں آ رہا ہوں کچھ دیر میں۔ کہہ دو تم۔“ وہ روٹھے لگے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
”آپ ٹھیک ہیں نا؟“ وہ ایک دم سے پریشان ہوئی۔

”میں ٹھیک ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں۔“
”اور دانی۔ وہ ٹھیک ہے؟ آپ اسے ساتھ لے کر آ رہے ہیں نا؟“ وہ جلدی سے پوچھنے لگی۔

مگر وہ سری طرف سے عدیل نے جواب دینے پر بغیر خون ہی ہنڈ کر دیا تھا۔ وہ فکر مند سی ہو گئی۔
بہت دنوں بعد اسے اس گھر میں ایک فیملی گیمبر کی طرح عجیب سی فکر لاحق ہوئی۔ جیسا بھی تھا دانی اس کا چھوٹا
بھائی تھا اور بچپن میں مثال نے اسے بہت گود میں کھلایا تھا۔

”اللہ نہ کرے دانی کو کچھ ہو تو وہ خیریت سے ہو گا اور پیانے کے ساتھ ہی ہو۔“ وہ انجانے میں دعا مانگنے لگی۔
”اتنی لمبی ہو گئی تمہاری ملاکی کال۔ سب کچھ بتا رہی ہو انہیں مزے لے لے کر۔“ پری کو چین نہیں آ رہا تھا،
اندرا کر رہے لہجے میں بولی۔

مثال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ عفت اسی طرح اسی پوزیشن میں بیٹھی
تھی۔

”ماما! پیانے آ رہے ہیں گھر۔ میری ابھی بات ہوئی ہے پیانے سے۔ وہ ٹھیک ہیں۔“ وہ عفت کو تسلی دینے کی خاطر بتانے
لگی۔

”اور دانی۔ دانی۔ وہ ٹھیک ہے نا۔ وہ ساتھ ہے نا تمہارے پیانے کے؟“ وہ بے قراری سے بولی۔
مثال نے بھر کو بالکل خاموش ہو گئی۔ اگر اس نے سچ بتا دیا کہ پیانے دانی سے متعلق اس کے سوال کا جواب
نہیں دیا تو عفت اس پر چیخنے لگے گی۔

”ماما! ٹھیک ہے“ آپ پلیز اتنی ٹینشن نہیں لیں پاپا آ رہے ہیں تمہاری دیر میں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“
وہ نرم لہجے میں عفت کے پاس ہنسنے لگی۔

”ماما! آپ تو یہ دیکھیے پیانے آپ کی کال ریسیو کی نہ میری، لیکن مثال آپ کی کال فوراً لے لی۔ آخر وہ ہمیں
کچھ سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ پتا نہیں کب ہمیں دوسرے درجے کے شہری سے آگے کچھ سمجھا جائے گا۔“ عفت

جو مثال کے ساتھ ہنرمندوں کر رہی تھی پری کے کہنے پر طنز بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”ایسی باتوں کا شکوہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جسے کوئی کچھ سمجھتا نہیں۔ چھوڑو اب ان باتوں کا گلہ کرنا جو تمہاری مثال آپلی ہیں، وہ تمہارا دانی کبھی نہیں ہو سکتے۔“
 مثال ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے اور گاڑی کا دروازے کھلنے اور دوسرے لمحے ڈور بتل بجنے کی آواز آئی۔
 ”پاپا آگئے!“ پری سب کچھ بھلا کر تیزی سے گیٹ کھولنے کے لیے باہر بھاگی گئی۔
 اور دوسرا لمحہ عفت کے ساتھ مثال کے لیے بہت حیرت انگیز اور پریشان کن تھا۔ پری کے ساتھ وقار اور فائزہ مسکراتے ہوئے پھول اور یکے کے لیے اندر آ رہے تھے۔
 مثال ایک دم سے کھڑے ہو کر انہیں سلام کرنا بھی بھول گئی۔ فائزہ نے خود ہی آگے پیچھے کرا سے گلے سے لگا کر پیار کرنا شروع کر دیا۔

عفت کو خود کو سنبھالنے میں کچھ ہی وقت لگا تھا۔
 ”ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو سوچا آپ لوگوں سے ملنے چلیں بلکہ بھابھی ایچ کون تو ماں سے گزرتے ہوئے اپنی مثال بیٹی کو رکھے بغیر جانا اچھا نہیں لگا“ اس لیے بغیر بتائے آگئے۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟“ فائزہ مثال کو پیار کرنے سے قابو ہو کر خوشوار لہجے میں آنے کی وجہ بتانے لگی۔
 ”آپ کا اپنا گھر ہے جب چاہیں آئیں۔ اطلاع دینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔“ عفت بظاہر سنبھل کر بولی۔
 ”کوئی بھی مصیبت کب اطلاع دے کر آتی ہے۔“ فعل میں جل کر بولی تھی۔
 ”عدیل بھائی کہاں ہیں؟ کیا آئیں سے نہیں آئے ابھی تک۔“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر کچھ گھری خاموش پریشان فضا سے کچھ اخذ کرتے ہوئے بولی۔

”ناٹم تو نہیں ہے اب آئیں گا۔“ وقار گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔
 ”جی آگئے تھے آئیں سے تو ایک کام سے باہر گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ آپ آئیں اندر ڈورا تک دروم میں بیٹھتے ہیں۔ پری کال کر دینا یا لپٹا کو ذرا جلدی گھر آجائیں۔“ عفت انہیں یہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھی۔
 ”آرے بھابھی! کلفت نہیں ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔“ وقار وہیں رکھی کر سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے اپنا بیٹھتے بھرے لہجے میں بولے۔
 عفت کو اور بھی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اگر ابھی عدیل آگئے وہانی کو لے کر تو برا مسئلہ ہو جائے گا اور اس بات کا لپٹا بھی مجھ پر ڈالا جائے گا کہ میں نے جان بوجھ کر ان لوگوں کو یہاں بٹھا دیا۔
 وہ پریشان ہوتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

”آئی! انکل پلیز آپ اندر آجائیں۔ یہاں ٹھنڈ ہے اور پھر پاپا بھی اتنی ہی فضا ہوں گے کہ آپ کو یہاں راستے میں کیوں بٹھا دیا۔ آجائیں پلیز۔“
 مثال بے تکلفی سے فائزہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اندر لے جانے لگی۔ وقار نے فائزہ کو اشارہ کیا اور دونوں اندر چلے گئے۔

”دیکھا آپ نے آپلی کو کس چالاکی سے انہیں اندر لے گئی ہیں، اوپر اوپر سے ڈرامے کر رہی ہے کہ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں اور اندر سے۔“ پری ان کے جاتے ہی وہی آواز میں بولی۔
 ”جانتی ہوں میں۔ کس ماں کی بیٹی ہے۔“ عفت بڑبڑا کر اندر چلی گئی۔



اگر میرے نصیب میں نہیں تھیں تو مجھے ملیں کیوں۔ واثق کو لگتا تھا اب اس کی ہر بات اسی طرح کے گلے شکوے کرتے گزرے گی۔

وہ پھر سے مثال کے ادھر سے اسکا چہرہ نکال کر بیٹھا تھا اور شام غمناک رہا تھا۔
 ”کیا کہیں مثال میں کہ تم میری ہو جاؤ۔“ وہ ایک ننگ ایک ہی تصویر کو جس میں اس کے چہرے کا بایاں رخ اس کے ریشمی بالوں میں چھپا ہوا تھا دیکھے جا رہا تھا۔

”اور یہ دورہ بے وقوف لڑکی۔“ اسے خیال آیا۔ ”لیکن نہیں صرف دورہ بے وقوف نہیں وہ لڑکی پری۔ اس کے انداز اس کے دیکھنے کا طریقہ۔ وہ جس طرح مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی۔“
 واثق کے دماغ میں پری کے چہرے کی خوشی اور آنکھوں کی جھک کر روش کرنے لگی۔

”کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ یہ کیڑا صرف دورہ کے دماغ میں نہیں ہے اس لڑکی کے دل میں بھی کیسے موجود ہے۔ اور وہ۔“ مثال کی سوتیلی بہن۔ ”وہ ٹھنک سا گیا تھا۔“ نہیں مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتا بلکہ مجھے اس لڑکی سے ملنے میں اب احتیاط کرنا ہوگی۔ ”وہ مثال کو سوچتے سوچتے کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا۔

”مجھے دورہ کو بھی سختی سے منع کرنا ہو گا کہ وہ لڑکی دوبارہ یہاں نہیں آئے۔“ وہ دل میں فیصلہ کرنے لگا۔
 ”لیکن نہیں۔ اس طرح تو دورہ کو بھی شک ہونے لگا کہ شاید میں اس میں انوالو ہوں۔ اور اس پری کو بھی۔“
 اسے دوسری سوچ نے ٹھنکایا۔

”کیا بات ہے واثق! میں تمہیں کھانا دے کر رہی۔ ابھی تک ویسے ہی رکھا ہے تم نے کھایا کیوں نہیں؟“ صاحبہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا تو اس نے آہستگی سے الماری کا پتہ بند کر دیا اور پیچھے ہٹ کر خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے دراز میں کچھ ٹٹولنے لگا۔

”واثق! کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
 ”جی ای۔ آئی ایم فائن۔ بس دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے نہیں کھایا۔ آپ یہ گناہ گرم چائے دے دیں۔ اس کی سخت طلب ہو رہی تھی اور پلیز ای! آپ اب یہ چھوٹے چھوٹے کام دورہ سے کروایا کریں۔ اسے بھی کچھ کام کی عادت ہو۔ دوسرے آپ کو تھوڑا ریٹ کرنا چاہیے۔“

وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے نرمی سے بولا۔
 ”میں بھی اسے کام کرنے کی عادت کماں ہے پھر پڑھائی کا بھی بوجھ ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ ابھی صرف اپنی پڑھائی پر فوس کرے۔“

”پھر بھی ای! اسے تھوڑا کام میں ڈالیں۔ یہ آپ کے لیے ضروری ہے۔“ وہ پھر سے بولا۔ صاحبہ کسی اور ہی دھیان میں گم تھی۔

”واثق! وہ کچھ دیر بعد بولی۔
 ”جی ای! وہ اس کے انداز پر کچھ جوڑا۔“
 ”ایک بات کہوں اگر تمہارے دل سے غور کرو گے۔ فوراً مضہ نہیں کرو گے۔“

واثق کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یعنی کوئی اہم بات تھی؟
 ”پلیز ای! آپ جانتی ہیں میں بلاوجہ غصہ نہیں کرتا۔“ وہ جیسے کویا دلاتے ہوئے بولا۔
 ”میں جانتی ہوں۔ میرا بیٹا کتنا سمجھ دار ہے۔“ وہ کچھ اوپر سے پن سے بولی تھی۔ واثق کو یہی لگا۔

”واثق! اور وہ کی بات میں وزن ہے۔ وہ لڑکی پری مجھے بھی اچھی لگی ہے۔ بے شک تمہارے ساتھ اس کا عمر کا کچھ فرق بیٹا لیکن۔“ وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔

”تھار گاڈ سیک ای! آپ تو ایسی بات نہیں کہیں۔“ وہ بری طرح سے جیسے ہرٹ ہوا تھا۔
 ”واثق! پرئی نہ سسی کچھ دنوں کچھ مینوں بعد تو تمہیں ایسی کسی بات کے بارے میں سوچنا ہے میری جان!
 کیونکہ سرحال شاہوی تو تمہاری مجھے کرنی ہے تو پھر بری اس لحاظ سے بہترین آپشن ہوگا۔“ وہ سمجھاتے ہوئے کہہ
 رہی تھی۔ اور واثق کو لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کو کسی اندھیرے عمار کی طرف مدھیل رہا ہو۔
 ”واثق! تم سن رہے ہونے۔“ اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر وہ اسے ہلا کر بولی۔
 ”اسی پلیز! مجھے بہت کام کرنا ہے۔ آپ بھی جا کر اب ریسٹ کریں۔“ وہ الے لی تھی آپ نے؟“ وہ موضوع کو
 صاف ٹالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”واثق۔ کیا تم نے میری بات سنی نہیں ابھی جو میں نے تم سے کہی؟“ وہ کچھ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”سن رہی ہے۔“ وہ عجیب کی سے بولا۔
 ”پھر تم نے جواب کیوں نہیں دیا۔“ وہ اسی خفگی سے بولی۔
 ”آپ کو شاید میرا جواب اچھا نہیں لگے۔“ وہ حنا کر بولا۔ عاصمہ سے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی شاید
 اسے سمجھانے کے لیے الفاظ سوچتی رہی۔
 ”واثق! تم جانتے ہوناں مثال کی انکم جمنٹ ہو چکی ہے۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا نا!“ وہ اسے یاد دلاتے ہوئے
 کہہ رہی تھی۔

”اسی! آپ جو کہنا چاہتی ہیں اس میں کچھ بھی ایسا نہیں جو میرے لیے کچھ خاص ہو۔ مثال میری قسمت میں
 نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ اس سے آگے مجھے کیا سوچنا ہے کیا کرنا ہے۔ میں کچھ بھی طے نہیں کر سکا اور فی الحال کچھ
 مینے طے کرنا بھی نہیں۔ کیا آپ مجھے اتنا نا تم دیر گی؟“ وہ کچھ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عاصمہ کو لگا جیسے
 اس کے دل کو بھی کچھ ہونے لگا ہے۔

اس کا اتنا بار اہل سمجھا ہوا سمجھ دار مثال دل کے معاملے میں پہلی قدم پر ٹھوکر کھا بیٹھا تھا۔
 ”بالکل واثق! تم جتنا چاہو نا تم لو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن بیٹا! تم جب بھی سوچو پرئی بہت پر لہ کٹ ہے
 تم سمجھ رہے ہوناں!“ وہ اپنی پسند ڈھکے چھے انداز میں اس پر ظاہر کر رہی تھی۔
 ”اسی! مثال کے بعد بری اگر دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوگی تو بھی میں اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں
 کروں گا۔ میں ساری زندگی شادی کے بغیر رہ سکتا ہوں لیکن بری کے بارے میں قطعاً نہیں سوچ سکتا۔ آپ
 آئندہ مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کیجئے گا۔“
 وہ اتنے حتی اور نفوس لہجے میں کہہ رہا تھا کہ لہجہ بھر کو عاصمہ بھی جیسے گنگ سی رہ گئی۔
 ”اتنے سخت لہجے میں انکار کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔“ وہ کچھ ناگواری سے بولی۔
 ”کیا مجھے وجہ بھی بتانی ہوگی؟“ وہ اٹنا ناراضی سے پوچھنے لگا۔
 ”واثق!“ وہ خفگی سے بولی۔

”اسی پلیز! آپ ورہ کو سمجھائیے گا۔ آئندہ وہ مجھے اس معاملے میں پریشاں نہیں کرے گی۔ مجھے بالکل بھی یہ
 بات پسند نہیں۔ مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔ اسکا کوڑی۔“ کہہ کر فون اٹھا کر کوئی نمبر ملانے لگا۔ عاصمہ
 اسے دیکھتی رہی پھر اندر چلی گئی۔



”عدیل!“ عفت زور سے چیخی تھی اور باہر کھڑی مثال جوان کے لیے چائے لے کر آ رہی تھی۔ وہیں ٹھنک کر رہ

گئی۔
 ”چلاؤ مت۔ میں نہ صرف چلا سکتا ہوں بلکہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ جس طرح تمہارے لاڈلے کو میں اتنا ذلیل ہو کر حوالات سے لایا ہوں۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں وہیں کسی گاڑی کے نیچے خود کو ختم کر لوں۔ ایسی رسوائی کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ مثال نے بھی عدیل کو اس طرح چیخے ہوئے نہیں سنا تھا سوائے اس دھندلی یاد کے جب اس نے بشریٰ کو چلانے ہوئے طلاق دی تھی۔

”اس نے جو کچھ کیا وہ سب بعد میں بتانا ہی صرف یہ بتائیے یہ لڑکا کیا آپ کی اولاد نہیں ہے۔“ حضرت اس کے چیخنے پر خوف زدہ ہونے کے بجائے اور بھی تھری سے بولی تھی۔

”تمہارا دلخ انہیں دو سوسوں نے خراب کر دیا ہے۔ تم نے کبھی دھیان نہیں دیا کہ تم ان بچوں کی پرورش کیسے کر رہی ہو۔ ایک ہی بیٹا جس کا تمہیں زعم تھا عفت! تم سے وہ نہیں سنبھالا گیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ چوریاں کرنے لگا ہے۔ اس نے تین لڑکوں کے ساتھ مل کر گینگ بنا رکھا ہے اور آج کی واردات اس کی پہلی واردات نہیں تھی۔“ عدیل کو بولتے ہوئے جیسے سانس پھولنے لگا۔
 اور عفت اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

”تذکیوں کے پرس چینیٹا ان سے ملنے والی چیزوں سے انہیں بلیک میل کرنا اور نہ جانے کیا کیا۔ ایک لمبی فہرست تھی الزامات کی اس پر اور ان تین لڑکوں پر۔“ عدیل بولتے بولتے ہاتھ گیا۔
 ”اگر ایف آئی آر درج ہو جاتی اگر ڈی ایس پی میرا واقف کار نہیں نکلا اگر میں ان کی مفت نہیں کرتا تو تمہارا بیٹا۔ چلو۔ میری اولاد آج سے لے کر کتنے سینوں کے لیے جیل میں پڑ جاتا تم سوچ سکتی ہو۔“

وہ تڑھال بیڈ پر گر گیا تھا۔
 ”تم سے ایک بیٹا نہیں سنبھالا گیا۔“
 ”صرف میری ذمہ داری نہیں ہے بچوں کی پرورش۔“

”یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں ایک غیر ذمہ دار باپ ہوں۔ ہاں ٹھیک کہا تم نے مجھے بھی تھانے جا کر ایسا ہی لگا کہ میں ایک انتہائی غیر ذمہ دار باپ ہوں جس کا جوان ہوتا بیٹا گندے کاموں میں ملوث اور مجھے کسی بات کی خبر نہیں۔“
 عدیل کو لگ رہا تھا جیسے وہ سو سال کا ہو گیا ہو ان چند گفتگوں میں۔

”اور آپ کے خیال میں میں نے فائزہ اور وقار بھائی کو فون کر کے بلایا۔ آپ اور کتنے بدگمان ہوں گے مجھ سے۔“ عفت بھی سر پکڑ کر رونے لگی۔

”میں جیسی بھی سہی عدیل! مثال کی سوتیلی ماں سہی مگر ایک بیٹی کی ماں تو میں بھی ہوں۔ کبھی تو مجھے بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔“ عفت کا دل چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار روئے۔

آج اسے لگ رہا تھا جیسے اتنے سارے سال اس نے یونہی عدیل کی رفاقت میں گنوا دیے۔ اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ عدیل کی وفاقت نہ اس کی محبت اس کا اعتبار اور آج اولاد کی طرف سے ملنے والا یہ گھاؤ۔ وہ تو جیسے سراسر خسارے میں تھی۔

”وہ دونوں خود آئے تھے۔ میں کیوں بلاتی انہیں۔“ وہ ٹھکت خورہ۔ سی کہہ رہی تھی۔ ”آپ نے بات کی والی سے کیا سمجھایا اسے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے پھر خود ہی پونٹا ہوا۔

”تمہارے خیال میں میں اتنی دیر اور کیا کرتا رہا اسے سمجھاتا رہا اور پوچھتا رہا کہ میں نے اسے کب کسی چیز کی کسی کی ہے کب اسے محرومیاں دی ہیں اسے کچھ بھی چاہیے ہوتا تھا میں نے دیا تو ہے۔“ عدیل صدے سے

چور تھا۔
 ”آپ سے الگ جو بھی وہ مجھ سے کہتا میں بھی تو مانتی تھی۔“ وہ بھی آہستگی سے بولی۔
 ”میں نے تو ہمیشہ اس کے دوستوں کا بھی ہتار کھا۔ معلوم نہیں کہاں چوک ہو گئی۔“
 ”اب کیا کرنا ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ پھر عدیل سے آگے کالا ٹیچر کھل جانا چاہ رہی تھی۔
 ”میں کیا بتاؤں۔ ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔ قسمیں کھاتا ہے۔ وعدے کرتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی ایسی حرکت۔ مجھے اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ معلوم نہیں اللہ مجھے کس گناہ کی سزا دے رہا ہے ایسی اولاد دے کر جو مجھے صرف اذیت دینا جانتی ہے۔“ عدیل کا ٹوٹا ہوا لہجہ کسی کرب کی مانند مثال کے دل میں اتر اٹھا وہ آہستگی سے مڑ گئی۔

”پتا نہیں کس گناہ کی خدا مجھے سزا دے رہا ہے ایسی اولاد دے کر جو مجھے صرف اذیت دینا جانتی ہے۔“
 مثال کے کانوں میں بار بار عدیل کا کرجی کرجی لہجہ گونج رہا تھا۔
 ”میرے پیادیتیا کے سب سے اچھے پیادے ہیں۔ سب سے بہادر سب سے زیادہ ہمت والے۔“ اسے یاد آیا۔
 زسری میں وہ اپنی فرزند کے ساتھ محبت سے اپنے پیادے کے متعلق اسی طرح کے جملے بولا کرتی تھی۔ آج اس کے بہادر پیادے اپنی اولاد کی وجہ سے اپنے گناہ شمار کر رہے تھے۔
 ”نہیں! میں اپنے پیادے کو اب کوئی دکھ نہیں دوں گی۔“ اس نے بستر لیٹنے سے پہلے فیصلہ کر لیا۔
 ”اور ماما سے اچھے تو پیادے ہیں۔ انہوں نے اس وقت مجھے قبول کیا جب ماما نے اس احسن کمال کے سامنے بھی میرے حق میں ایک لفظ نہیں بولا۔ صرف اپنے گمرو پچانے کے لیے انہوں نے اس کیسے سیٹی کو ایک بھی گالی نہیں دی۔“

اسے جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اسی وقت اس کا سیل فون بجنے لگا۔
 واٹن کی کال تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔
 ”کیا تم مجھے یاد کر رہی تھیں؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔
 ”نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔
 ”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ عمو سے بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ جو گئی۔
 ”یار ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک آدمی جس کا دل اسے بتائے کہ دو سراسر شخص اس کو مس کر رہا ہے، وہ سارے کام چھوڑ کر اسے کال کرے۔ سو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔“
 ”آپ کی باتیں بہت عجیب سی ہوتی ہیں۔“ وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی سو یونہی کہنے لگی۔
 ”تم پریشان ہو مثل؟“ وہ رک کر پوچھ رہا تھا۔
 ”نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولی۔
 ”پلیز تم مجھ سے جھوٹ بولنا بند کرو۔“ وہ اسے ٹوک کر بولا۔
 ”میں جھوٹ نہیں بول رہی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”تم بول رہی ہو۔“ وہ اسی لہجے میں بولا۔
 ”واٹن! میں نے فیصلہ کیا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”میں سن رہا ہوں۔ تم کہو۔“ وہ ہمہ تن گوش تھا۔
 ”میں اب اپنے پیادے کو کبھی کوئی دکھ نہیں دوں گی۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ واٹن کچھ لمحے خاموش رہا۔

”مثلاً۔ میرے خیال میں تم نے سب سے پہلے بھی اپنے پیپا کو کبھی کوئی دکھ شعوری طور پر نہیں دیا۔ جتنی کہانی تم نے مجھے اپنی سنا رکھی ہے، جو کچھ بھی غلط ہوا، مجھے بھی تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔“ وہ اسے کسی اور ہی طرح سے روشنی میں لارہا تھا۔

”ہاں، لیکن جس کی وجہ سے بھی ہوا، پاپا تو ہرٹ ہوئے اور واقعہ میں نے اپنے پاپا کو ملا سے سپوریشن کے بعد کبھی بھی کھل کر بٹھے خوش ہوتے نہیں دیکھا۔“ وہ اس وقت بہت حساس ہو رہی تھی۔

”تم ان کے لیے کیا کرنا چاہتی ہو؟ تمہارے ذہن میں کچھ ایسا ہے جس سے وہ واقعی خوش ہو جائیں۔“ وہ اس کے ارادے جانتا چاہ رہا تھا۔

”ہاں میں نے سوچ لیا ہے، شام میں فائزہ آئی اور انکل آئے تھے فندے کے پیرتس۔ فندہ اسی مہینے آ رہا ہے پاکستان۔ وہ فوراً شادی کرنا چاہیں گے اور۔“

”اور تم اس شادی کے لیے اب راضی ہو۔ اب اپنے پاپا کو انکار نہیں کرو گی۔ اس سے انہیں خوشی ملے گی۔“ وہ اسے ٹوٹ کر بولا۔

”ہاں بالکل! میں نے یہی سوچا ہے۔“ وہ جوش سے بولی۔

”اور تمہیں کیا ملے گا۔ یہ بھی تم نے سوچ لیا ہے۔“ وہ کچھ جتا کر کہہ رہا تھا۔

مثلاً کچھ بول نہیں سکی۔

”سو جاؤ۔ کالی رات ہو گئی ہے۔ رات کے ارادے اور فصلے دن کی روشنی میں اکثر کمزور پڑ جایا کرتے ہیں ہم کل بات کریں گے خدا حافظ۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

مثلاً اس کی بات لے کر سوچتی رہی اور جانے کب بینڈ کی وادی میں اتر گئی۔

وردہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

یہ اتنی بے یقینی کی بات تو نہیں تھی۔ لیکن نہیں۔ تھی! بس اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ یہ بات اب وہ کیسے بھی نہیں دہرائے گی اور نہ کسی سے کہے گی۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے اس کا بھائی اس سے خفا تھا۔

مگر یہ بات کس طرح ”مسٹر“ کرے گی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا۔

”میں خود نہیں جانتی وردہ! لیکن میرا دل۔ جب سے میں تمہارے گھر سے آئی۔“ بڑی بہت اب بھی ہوئی تھی۔

رک رک کر بول رہی تھی جیسے اسے اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہ آ رہا ہو۔

”میں رات بھر سو نہیں سکی۔ مجھے نہیں بتایا کیا ہے۔ محبت ہے یا۔ میں ساری رات صرف تمہارے بھائی کے بارے میں سوچتی رہی۔ خواب میں بھی انہیں دیکھتی رہی وردہ! یہ کیا ہے؟“

وہ آنکھوں میں نمی لیے بس رو دینے کو تھی۔ اور وردہ کو لگ رہا تھا وہ بھی ابھی سب کے بیچ بیٹھی رو ہی پڑے گی۔

اتنی اچانک بات کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور وہ پری کو کوئی دلا سے بھی نہیں دے سکی۔ بس بے بسی سے دیکھتی رہی۔

”میں آج واقعہ سے کہہ دوں گی کہ ہم آئندہ کبھی آپس میں نہ ملیں گے نہ فون پر بات کریں گے۔ آج سے ہم دونوں کے راستے بالکل جدا ہیں۔ مجھے صرف پاپا کی خوشی میں خوش ہونا ہے۔ فندہ یقیناً ”اچھا ہو گا۔ فائزہ آئی اور انکل اتنے اچھے ہیں“ مجھے اب کچھ اور نہیں سوچنا۔“ وہ سوچتی ہوئی آ رہی تھی جب سامنے گاڑی میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ شاکڈی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نعمتہ بیگم کی گود میں تلی۔ فراز صاحب اپنی اکلوتی بہن کی شادی کر کے فارغ ہوئے تھے۔ فاران چاہو نے جو اپنی دوست نما بہن کے محلے جانے پر بے حد لو اس تھے۔ منشی سی شہزادی کے گھر آنے پر باقاعدہ لڈیاں ڈالی تھیں۔ مٹھائیاں تقسیم کیں۔ صبح شام اس کے نگرے اٹھائے جاتے۔ حریم کا لٹا خیال رکھتے کہ حریم کا بڑا بھائی ایاز حقیقتاً "جہلس ہو جاگہ۔ پونہ روشی سے واپسی پر وہ حریم کے لیے ڈھیروں چرس لے کر آتے۔ حریم کی باتیں، حریم کے کپڑے، حریم کے جوئے، حریم کی شرارتیں۔ حریم بڑی ہوتی، تب بھی ان کے پیار میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ حریم بھی اپنے والدین اور بھائی سے زیادہ فاران چاہو کے قریب تھی۔ اپنے رعب دل بول لے لیا سے اسے بیٹھ سے ڈر لگتا تھا۔

وہ اپنے سارے مسائل فاران چاہو سے بیان کرتی۔
 "بچہ نے مجھے کہا کس لیے ہیں۔"
 "آج حرا نے اسکول میں بھگھار ل۔"
 "مجھے فلاں موٹ ہا ہے۔"
 "میں نے فلاں ہوٹل سے چکن منچورین کھانا ہے۔"

اس کی یہ ساری فرمائشیں صرف فاران چاہو ہی پوری کیا کرتے تھے۔ کلج ٹرپ پر جانے کی اجازت اسے فاران چاہو نے دلوائی تھی۔ کیوں کہ فراز صاحب کو لڑکیوں کا ٹرپ پہ جانا پسند نہیں تھا۔ جس دن فاران چاہو کو ایک بہت بڑی ملائی میٹھل کہنی میں جا بٹی، وہ خوشی سے بے حال ہو گئی۔ کتنی محنت اور محبت سے اس نے اس خوشی کو منایا تھا۔ ایک پھول، اس کے لیے ہاتھ کی تنی بڑائی اور خوشی

"مارے واؤ حریم! تمہاری رست دلچ کتنی خوب صورت ہے۔ کتنے کی بنا؟" رائے نے حریم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ چنگی گلبل رنگ کی خوب صورت گھڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا جس میں لگے سلور گھنٹے ہری آبد و تاب سے چمکتے ہوئے گھڑی کی شان بڑھا رہے تھے۔

"ہا نہیں، اصل میں ہم سب لوگ کل پڑا ہٹ گئے تھے نا تو واپسی پر مجھے یہ گھڑی پسند آئی۔ میں نے ضد کی تو چاہو نے طاہری۔ میں نے چاہو سے قیمت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ میں آم کھاؤں گھٹلیاں نہ کھوں ویسے میرے خیال میں چند سو سے اوپر کی ہے۔" اپنی کھائی میں بڑی تھیں سی گھڑی کو کھاتے ہوئے حریم نے لاپرواہی سے کہا۔

"تم نے رست دلچ لینے کے لیے اپنے چاہو سے ضد کی۔ یار حریم! تم یہ سب کچھ کیسے کرتی ہو؟ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں اپنے چاہو یا تاپا لبا سے کوئی فرمائش کروں۔ عین کو، عید شب رات پر بھی جب تاپا لبا چاہو ہمیں عیدی وغیرہ دیتے تو مجھے وہ ہی لینے میں اتنی جھجک ہوتی ہے کہ حد نہیں لور تم۔ امیزنگ! اپنے سر کو اٹھائیں بائیں ہلاتے رائے سی بھر کر حیران ہوئی۔

"ہیں واقعی؟" اس بار حیرت حریم کے چہرے پر تھی۔ "لیکن میں تو اپنے چاہو سے فرمائش کرتی ہوں بلکہ سچ بتاؤں تو مجھے پلا سے ہات کرنے میں وقت محسوس ہوتی ہے، لیکن میرے چاہو تو بہت بہت اچھے ہیں۔" حریم نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔
 وہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی، جس وقت وہ



میرا آکٹائکس کا ٹیسٹ تھا۔ ٹیسٹ میں میرے بارکس کم تھے تو میں نے پلٹا کو نہیں بتایا۔ پتا نہیں کیسے میرا ٹیسٹ لیا زکے ہاتھ لگ گیا اور اس نے وہ ٹیسٹ پلٹا کو دکھا دیا۔ آپ کو نہیں پتا چاہیے! پلٹا نے مجھے کتنا ڈانٹا ہے۔ وہ ایک بار پھر سے زور شور سے دہانے لگی۔

۳۳ "ہا اچھا روٹا بند کرو اور یہ رس ملائی کھاؤ۔ میں ابھی لیا زکی خبر لیتا ہوں۔" قارن نے اپنے کندھے پر نکاس کا آنسوؤں سے ترچھو اوپر اٹھانے ہوئے پیار سے کہا۔

۳۴ "آئندہ تم نے ایسی فضیلت رکھ کر، کی تو تمہاری خیر نہیں۔ چھوٹی بہن ہے تمہاری۔" تھوڑی دیر بعد قارن پھیل گیا ہے ایاز پر گرج رہا تھا جو تھوڑی سی مزاحمت کے بعد خاموشی سے کھڑا اپنی عزت افزائی کروا رہا تھا جبکہ مزے سے رس ملائی کھاتی حرم مسکراتے ہوئے ایاز کی درگت بند بندہ دیکھتی رہی۔



۳۵ "ہائے اللہ چاہیے! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے اور وہ بھی تھوڑا بعد۔ کج چاہیے! چاہیے اتنی بیماری ہیں اتنی بیماری ہیں کہ کیا ہاتھوں میں

سے جھللاتا چہو! اس کی بے پناہ خوشی کو بڑی خوب صورتی سے بیان کر رہے تھے۔ فراز صاحب نے اپنے والدین کی وفات کے بعد اپنے بہن بھائی کو اپنی اولاد سے بھڑ کر چھاپا تھا۔ اپنی شریک حیات کو پور کر دیا تھا کہ وہ واقعی اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رہیں اور ان کی شریک حیات نے بھی ان کے بہن بھائی کو اولاد سے کم نہیں سمجھا تھا۔



۳۶ کیا بات ہے حرم! کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟ لائٹ کن کر کے قارن بیڈ کے قریب آیا۔ "یہ دیکھو! میں تمہارے لیے تمہاری بھورٹ رس ملائی لے کر آیا ہوں۔" سر تک کیبل لوڑھے حرم کے قریب بیڈ پر بیٹھے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اشارہ اس کے

قریب رکھا۔

۳۷ "ارے! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں؟ حرم کے متورم چہرے کو دیکھ کر قارن کا دل مٹی میں آ گیا۔

۳۸ "چاہیے! دیکھیں! ایاز کتنا بد تمیز ہے۔ کل کلج میں

میں پائلٹ نہیں ہیں۔ تم فارمن کی ساس سے بات کرو ہم فارمن کی شادی اگلے سال ہی کہا میں گے۔
 ڈھیروں رجسٹر کھل کر بیٹھے فراز صاحب نے کلکویلیٹر کو ایک طرف رکھتے ہوئے ناعمہ بیگم کو مخاطب کیا جو عفرات کے دو بے پروی مہارت سے گونا گونا لگا رہی تھیں۔ حرم کی خواہش تھی کہ اس کے چچا کی بری میں کوئی کمی نہ رہے سو گولے کے کام کا ایک جوڑا بنا تا ضروری طے پایا۔

”ہیں۔ یہ یگانگ آپ کو کیا ہوا۔ ابھی پچھلے مہینے

ہی تو آپ نے کپڑے تک کے سارے انتظامات کی پلاننگ کی ہے۔“ آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے ناعمہ بیگم نے میون رنگ کے شیلون کے دو پٹے کو گود میں رکھا۔

”کاروبار میں بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اوپر سے جس فیکٹری سے ہم مال لیتے تھے وہ بھی مال دینے سے انکاری ہے۔ شادی میں کم از کم سات آٹھ لاکھ کا خرچ آئے گا۔ ایسی صورت میں نہ صرف ہم پر قرض چڑھ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔“ پیشانی کو مساتے ہوئے فراز صاحب بے حد پریشان تھے۔

”تو فاران سے کہیں بنا۔ اوپر والا پورشن بتانے پر اتنے پیسے لگا رہا ہے۔ آخر شادی بھی اسی کی ہے اگر شادی کے انتظامات پر بھی پیسے خرچ کر لے گا تو اس میں خرچ کیا ہے۔ آپ نے ساری زندگی اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے اب اگر اس وقت منع کیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔“ ناعمہ بیگم نے سچیدگی سے کہا۔

”مہمت اچھا مشورہ دیا ہے تم نے مجھے۔ تم سے ایسی ہی بات کی توقع تھی۔ اگر میں نے فاران کو پٹنا سمجھا ہے تو اس نے مجھے پٹنا بن کر بھی دکھایا ہے۔ تم نے دکھا نہیں کہ وہ ہمارے بچوں سے کتنی والہانہ محبت کرنا ہے۔ میری اور تمہاری کتنی عزت کرتا ہے لوہا یاز کے ایم پی اے کا سارا خرچ میرے منع کرنے کے باوجود اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ اگر لیا دکی شادی کے

نے تو سوچ لیا ہے بری کے سارے جوڑے میں خود بناؤ گی۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لوہا چاچی کا میک اپ ہم شہر کے سب سے مشہور پارلر سے کروا میں گے اور ہاں آپ کی شادی میں تو میں لنگا پنوں کی اور ہاں چچی کا فونو سیشن ہم اسی پارلر سے کروا میں گے۔ وہ پیسے تو زیادہ لیتے ہیں لیکن تصویریں غضب کی آتی ہیں۔ ایسا کریں مجھے دس ہزار روپے ابھی پکڑاؤں۔ بعد میں یہ نہ ہو کہ شادی کے اخراجات میں یہ پیسے بھی کھپ جائیں۔“ جوش سے بولتی بولتی حرم نے تاران کے سامنے اپنی اہمیلی پھیلائی۔

”نہیں نہیں چاچو! اسے پیسے پائلٹ مت دیجئے گا۔ کھانے پینے میں خرچ کر کے آپ کو ٹھیک ٹھاکا دے گی پھر یہ نہ کہنے کا کہ پہلے بتایا نہیں تھا۔“ دوپٹے تلے سے ایاز نے قدرے خن کر کہا۔ وہ ایم پی اے کے آخری سمسٹر میں تھا لیکن حرم سے اس کے تعلقات ویسے ہی تھے۔

”تم چپ رہو! یہ میری لوہا چاچی کی آپس کی بات ہے۔ جلدی پیسے دیں چاچو! ورنہ بعد میں ہمیں اوں گی۔“ حرم نے حسب عادت اہو تان کر مہنوی شیے سے کہا۔ وہ فاران سے یوں ہی پیسے لکھوایا کرتی تھی اور ایسے منہ بسورتی لڑتی، جھگڑتی وہ فاران کو بہت پیاری لگتی تھی۔ پائلٹ کسی مضموم بی کی طرح۔

”چاچو! حرم آپ سے بد تمیزی کر رہی ہے۔“ ایاز نے بھڑکایا۔

”بھلا ہنوں اور بیٹیوں کی ماں بھری فرمائیں کبھی بد تمیزی ہو سکتی ہیں۔ حرم کی دھونس تو اس کا ماں ہے جسے وہ محبت سے جانتی ہے اور پھر حرم کو تو میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔“ فاران نے حرم کے سر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر پیسے رکھے تو وہ ایاز کو زبان ٹٹل کر چلاتے ہوئے تھقہ لگاتی کمرے سے باہر نکل۔



”نہیں اس سال ہم یہ شادی کرنے کی پوزیشن

وقت ایسے حالات ہوتے تو کیا تم مجھے ایسا مشورہ دیتیں۔
 خیر، یہ کسی بحث ہے۔ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی
 ہوگی۔ میں گاڑی بیچ رہا ہوں اور وہاں تم کل صبح گھر پر
 موجود زیورات مجھے دے دینا۔ ان ہی کو تڑوا کر نئے
 ڈیزائن میں بنوائیں گے۔ نیا زیور بنوانے کی گنجائش
 بالکل نہیں ہے۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر فراز صاحب
 مطمئن ہو چکے تھے۔
 ”لیکن وہ زیور تو حرم کے ہیں۔ اگر اپنی ساری جمع
 پونجی اسی شادی پر خرچ کر دیں گے تو ہمارے پاس کیا
 جائے گا۔“

ہو نہ ایسے ہی پر جوش ہو جایا کرتی تھی۔
 ”اب بس بھی کرونا حرم! تمہارے پیپا کہہ تو رہے
 ہیں کہ لن کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اب جلدی سے
 چلو بازار میں ویسے ہی رش ہوتا ہے۔ لوپر سے رکشے
 ٹیکسیوں کے دھکے کھانے میں آو جان تو یوں ہی نکل
 جاتا ہے۔“ ناعصہ بیگم نے چلو لوڑھتے ہوئے غصے
 سے کہہ گاڑی بک جانے کے بعد وہ کس آتے جاتے
 ہوئے ایسے ہی برہم ہو جاتی تھیں۔ حرم نے بے بسی
 سے سر جھکاتے ہوئے طوعاً کہا ”میسے پکڑے تھے۔“



”یہ زیورات اسی لیے ہیں تاکہ ہماری اولاد کے کام
 آئیں۔ فاران کا درجہ ہماری اولاد سے کم تو نہیں حرم
 کے لیے لو رہیں جائیں گے اور ہاں اب جلدی سے اپنا
 کام سمیٹ کر لائٹ آف کر دو۔ مجھے صبح گاڑیوں کے
 شوروم بھی جانا ہے اور جیور کی شاپ پر بھی۔“ فراز
 صاحب نے کھلکھولے اور سارے رخصت بند کر کے
 رکھتے ہوئے کہا۔ ناعصہ بیگم دل ہی دل میں تھما کر
 گئی تھیں۔ جانتی تھیں کہ لن کی تھماہٹ ظاہر ہو گئی
 تو فراز صاحب کا آہن کو چھوٹا غصہ اور ناراضی
 پروا نہ کرنی پڑے گی۔ سو بڑی بے دلی سے چیزیں
 سمیٹتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو کوسل کاش کہ
 شادی ایک سل لیٹ کر دینے والی بات بن لیتیں تو
 شاید گاڑی اور زیور بیچ جاتے مگر اب حیرت کن سے نکل
 چکا تھا۔

”ایک تو تمہارے ابو کا دل بے پیلے ہی لسنے بہن
 بھانجوں سے آگے کچھ نہیں سوچتا رہی سہی گسز تم
 بہن بھائی نے پوری کر دی ہے۔ میں نے تمہارے پیپا
 سے اتنے مشکل سے تمہاری شاپنگ کے لیے پندرہ
 ہزار روپے الگ سے لیے تھے اور تم اپنی شاپنگ بھوڑ
 چھاؤ خد کر بیٹھیں کہ دلہن کا لنگا چالیس ہزار کا ہی لیں
 گی۔ تمہاری شاپنگ کے سارے پیسے بھی دلہن کا لنگا
 خریدنے میں لگ گئے اور شہزادی صاحبہ خوش خوش
 واپس آ گئیں۔ اب پرانے کپڑے پہننا اور ہاں باپ کو
 جی بھر کر ذلیل کروانا۔“ ناعصہ بیگم تو جیسے جلتے توے پر
 پتھری ہوئی تھیں۔

”کچھ نہیں ہو آما! اب اپنا غصہ تھو کر دیں۔ میں
 شادی میں سب سے خوب صورت اور شاندار
 کپڑے پہنوں گی۔ بس میں نے سوچ لیا ہے کہ جب
 آنٹی کی پانچ عدد بیٹیوں کو ٹھنڈی فیس پر نیوشن پر محلوں
 کی۔ میری شاپنگ بھی ہو جائے گی اور جب آنٹی کی پرانی
 شکایت بھی دور ہو جائے گی کہ میں نے ان کے اتنے
 اصرار کے باوجود لن کی بیٹیوں کو پر محلانے کی ہاں نہیں
 بھری۔“ بلکہ بھلے انداز میں کہتے ہوئے حرم نے
 ناعصہ بیگم کے گلے میں بائیں ڈالی تو وہ غصے سے پاؤں
 پٹختے ہوئے چلی گئیں۔

”لیکن تمہیں تو نیوشن پر چھانا کبھی پسند نہیں رہا اور
 جب آنٹی کی نڈا لٹی بیٹیوں کو پر چھانا تو پتہ بند یہ ترین۔“



”نہیں حرم! دلہن کے بیٹے کے لیے میں تمیں ہزار
 سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ گنجائش ہی نہیں ہے۔“
 فراز صاحب نے پانچ پانچ ہزار کے چھ نوٹ حرم کی
 طرف پھراتے ہوئے قطعیت سے کہا۔
 ”مجھے کچھ نہیں معلوم ہے! مجھے عفراتچی کے لیے جو
 لنگا پسند آیا ہے وہ چالیس ہزار کا ہے اور مجھے وہی لینا
 ہے۔“ خلاف معمول فراز صاحب سے بات کرتے
 ہوئے حرم کا لہجہ ضدی تھا، جہاں بات فاران چاچو کی

ایاز نے چپ چاپ بیٹھی حرم کو پکارا تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔

”کیا کریں بھیا! مجبوری ہے۔“ حرم لبتے کوڑے میں سے نکلتے ہوئے مسکرائی۔ ”تو بسے بھی وہ مینے کی تو بات ہے میں نے کون سا ساری زندگی ٹوشن پر حلالی ہے۔ اچھا چھوٹو یہ بتاؤ کہ یہ لنگا کیسا ہے۔ عفران جی پر اچھا لگے گا؟“ حرم نے ٹارل سے انداز میں کہتے ہوئے دو ہٹائی گو میں پھیلا یا تو جھلا تے دوپٹے کو دیکھ کر ایاز بھی تعریف کے بغیرہ نہیں سکا۔

کھانپنے کے بعد کمرے میں داخل ہوئی۔ حرم کے سر کو پیار سے تھمتھاتے ہوئے فاران دھیمی گواہ میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

عفران کی آنکھیں شرارے پلکنے لگیں۔

”تا سب کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے کچھ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ اتنی تکلیف خود ہی سہتے رہے اب آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں جو قصص مجھ جیسے جوان کھاؤ بیٹے کا باپ ہو۔ اسے کاروبار کے شتم ہو جانے یا پھر دوس پندرہ لاکھ کے مقروض ہو جانے پر اتنا پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ گھر کا خرچ میں خود ہی چلا لیں گے۔ ایاز کی پر حلالی بھی پوری ہونے والی ہے ایک دو سالوں میں وہ بھی اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا ہو جائے گا۔ بس اب آپ فکر مند نہ ہوں اور مجھے سارے بزدلے دیں میں بے کڑوں گا اور ہاں کل آفس سے آکر مینے بھرکارا شن بھی لے لوں گے۔“

فراز صاحب کے کانٹے ہوئے سرو وجود کو اپنی منسوب ہاتھوں میں سیٹھنے والی ہل رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ہر پریشانی ہر مسئلے کو فراز صاحب کھوں میں اس کے وجود سے اتار پھینکتے تھے۔

”بس کیا باتوں ای! یہی تو ہستی بہستی زندگی اجڑ کر رہ گئی ہے۔ کیا کیا خواب سہائے تھے میں نے گتے بڑے افسر کی بیوی بن کر خوب میٹھ کڑوں کی ہزاروں کے ڈرہیر۔ لاکھوں کی جیولری، لیکن میرے سارے خواب تو شادی کے بعد اپنی موت آپ ہی مر گئے۔ ان کے بھائی تو بزنس بہادر کر کے چکے سے بیٹھ گئے اور اب آپ کا دایلو نہ صرف گھر کا پورا خرچ اٹھا چکا ہے بلکہ قرضہ اتارنے کے لیے کیشیاں بھی بھر رہا ہے۔“

”تھوڑا تو بہت اچھی ہے لیکن اتنے بڑے گھر کے بزدل اور مینے کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ فاران کو ادیر کی

”یہ لیں جی! کھیر کھائیں۔“ حرم نے بلوریں پیالے میں ڈھکی ہوئی کھیر عفران کی طرف پر حلالی۔

”تھینک یو سوچی حرم! کھیر واقعی بہت مزے کی تھی۔ میں نے تو دو دنہ کھائی تھی کل بھی سب تو خوب لٹھری ہو گئی ہے۔ مزائے گا میں ابھی پیچھے لے کر آتی ہوں۔“ پیالے کی ٹھٹھک مسوس کر کے عفران نے آپ پر کھنول نہیں رکھائی تھی۔

”کیا ہوا حرم! تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ نو حرات میرے پاس بیٹھو۔“ فاران حرم کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا سو عفران کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے بلکے سے پوچھا۔

”پلیا پچھلے دو تین دن سے بہت پریشان ہیں۔ نہ کھانا ٹھیک طرح سے کھاتے ہیں اور نہ ہی ہم سے کوئی بات کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے ہی ٹھیک سے بات کرتے ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد پلایا پھر ویسے ہو جاتے ہیں لو اس اور خاموش۔ انہوں نے کل کھیر بھی نہیں کھائی، حالانکہ ان کی کتنی لٹورٹ ہے میں نے کئی بار ان سے پوچھنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ہر بار ٹال جاتے ہیں۔ پلایا چاہو! اب ہی ان سے بات کریں مجھے نہیں لگتا کہ وہ آپ کے علاوہ کسی کو اپنے دل کی بات بتائیں گے۔“

حرم کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو فاران حسیباً ”ترب اٹھا۔ جس وقت عفران کھیر کا تو حیا لایا جن میں ہی

طن بہلنے بہلنے سے قادران کو جلدی ہی اوپر والے
پورشن میں لے جاتی۔ آہستہ آہستہ کچھ دیر بھائی کے
پورشن میں گزار کر جلدی ہی اوپر چلے جانا قادران کی
رو میں بننا گیا۔

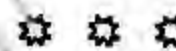


”بچی! اگر آپ کے پاس وہ سو روپے ہے تو مجھے
دے دیں۔ شام کو بیلا والیں آئیں گے تو واپس کھول
گی۔ اصل میں آئل ختم ہو گیا ہے اور سالن پکانے
میں دیر ہو رہی ہے۔“

حرم نے انگلیاں جھٹکاتے ہوئے کہا۔ کاروبار ڈوب
جانے کے باعث پہلی دوکان تو ختم ہو گئی تھی لیکن قادران
نے گھر کے قریب ہی فراز صاحب کو ایک چھوٹی سی
دکان کھلا دی تھی کہ مصروفیت کا ہونا فراز صاحب کے
لیے بہت ضروری تھا۔

”نہیں حرم! میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔“ عفرات
نے بیڈ پر بڑا برس حیرت انگیز طور پر بیٹھے کے نیچے
گھسایا۔ ”تھوڑا سا سو رو سو نکل بھی آتے تو تمہیں
واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی ویسے بھی تو گھر کا سارا
خرق قادران ہی چلا رہے ہیں تاہم وہ سو روپے کی کیا
حیثیت ہے اور یہاں بیٹوں میں لین دین کیسا۔“

خوب کھڑی گویا شوگر سیرپ میں ڈبو کر حرم کی
زبان پر رکھی گئی تھی۔ جسے حرم نے بڑی مشکل سے
حلق سے نیچے اتار تھا۔



”قادران! ہمارا کوئی احساس نہیں۔ میں نے کامارا
سالن ختم ہو گیا ہے۔ ابو کی چھوٹی سی دوکان سے بہت مشکل
اتنی ہی آمدنی ہوتی ہے کہ ابھی اور ابو کی لہو لہو
آجائیں۔ یہ سب کچھ ہم کیسے پھنسل کریں۔“ حرم
نے غصے سے کہا۔

”سوہو! آج تو موسم بڑا گرم ہے، ہاتھوں! اصل میں
پچھلے دنوں میں کافی بڑی تھا۔ اس لیے خیال نہیں رہا۔
آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ ایسا کوئی پیسے پکڑو اور گھر

کھلی کا بھی کوئی شوق نہیں۔ سارا سارا طن نیچے فراز
بھائی کے پاس بیٹھے تسلیاں ہی دیتے رہتے ہیں۔“
طن پر اپنی ماں سے بات کرتی عفرات نے سر کی ہلکی کی
مانڈ پورے کمرے میں چکرائی بھر رہی تھی۔



”دیکھیں قادران! مجھے آپ کی فراخ دلی بہت اچھی
لگتی ہے اور میں آپ کے قادران کی باہمی محبت کی ہل
سے قدر دان بھی ہوں۔ آپ جتنا چاہیں اتنا وقت اپنی
فیبلی کو دے سکتے ہیں۔ لیکن میں بھی تو آپ کی ذمہ
داری ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو تمہارا سا وقت مجھے
بھی دے دیں۔“

عفرات نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے ہولے
سے کہا۔ اسے اپنی امی کی بدولت ہر عمل جو کرنا تھا۔
قادران کو لے کر بھائی اور طن کے بچوں سے اکیلے میں نہ
لٹنے نہ ٹھنی خیر انہی کی پہلی بدولت تھی۔

”بھائی اور سچے بہت ڈسٹرب ہیں عفرات! نہیں
میرے تسلی بھرے الفاظ کی ضرورت ہے۔ حالات
تھوڑے ٹھیک ہو جائیں۔ ہم پھر سے پہلے کی طرح
لائگ ڈرائیو پر جایا کریں گے۔ ڈنر کریں گے اور میں
تمہیں ڈھیر ساری شاہنگ بھی کراؤں گا۔ لیکن اس
وقت مجھے دیر ہے پر کھڑا کرنے کی کوشش مت کرو۔“
قادران مضبوط لہجے میں بولا۔

”ارے نہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ اچھا ایسا
کرتے ہیں۔ کل سے آپ آتے ہی اوپر آ جایا کریں
پھر ہم دونوں مل کر نیچے جایا کریں گے اور مل کر سب
کے ساتھ خوشیوں بھرا وقت گزارنے کی کوشش کیا
کریں گے۔“

عفرات نے تیزی سے قادران کی بات کو ایک لیا اور پھر
ہر شام عفرات قادران کے ہمراہ دو تین گھنٹے حرم کے
پورشن میں گزارنے لگی۔ اس دوران وہ اپنی کہانی کا
دانا دانا کر ان سب کو شرمندہ کرتی رہتی اور اسی
شرمندگی کے زیر اثر وہ سب ہی اپنی ضروریات زندگی کو
مہلک کرتے جا رہے تھے جبکہ عفرات ہر دوسرے تیسرے

ہو جاتا ہے۔ "قارن نے عفران کا پھینکا دانہ چک لیا تھا اور اب قدرے غصے میں تھا۔

"جب مل ملت ہو تو بل بے رحم ہو ہی جاتا ہے۔ اچھا چلیں چھوڑیں یہ بتائیں کہ کل امی نے کہا ہے پر بلا یا ہے۔ کیا پہن کر جائیں گے؟" عفران نے اپنا تیر نشانے پر لگا دیکھ کر موضوع بدل دیا تھا اسے ڈر بھی تو تھا کہ کہیں باتوں باتوں میں یہ سچ اس کے منہ سے نہ نکل جائے کہ وہ کہاں ساتھ والوں کے گھر سے آئے تھے اور یہ بھی کہ حرم نے کل واقعی سبزی بیٹی تھی۔



"چاچو! کتنے دن ہو گئے۔ آپ نے ہماری طرف چکر نہیں لگایا۔ یا ابھی آپ کا پوچھ رہے تھے اور وہاں میں نے آپ کے لیے آپ کی ٹیورٹ کھیر بھی بیٹی ہے۔ آج آکر کھا لیجئے گا۔" حرم نے پیالے میں پڑی تھوڑی سی کھیر کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس نے چائے کا دودھ پچا کر صرف قارن کے لیے بیٹی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں قارن ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ جسے وہ سب ہی قارن کی مصروفیت پر محمول کرتے رہتے۔

"ٹھیک ہے۔ آؤں گا اور وہاں کھیر جیسی مہنگی چیز پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے گھر کی کسی اور ضرورت پر خرچ کریں تو بہتر ہوتا۔" قارن نے لیے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے فن رکھا تھا تو ایک ہل کے لیے حرم من رہ گئی۔

"چاچو بھی نا، ہر وقت ہمارے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں، اب ان کو کھیر کھانا ہم پر بھاری تو نہیں۔" حرم نے قارن کی بات کا خود ساختہ مطلب نکالتے ہوئے سوچا۔ اس کے دل میں قارن کی عزت، کچھ اور بڑھی تھی۔



"چاچو! کھیر کیسی مہنگی ہے؟" حرم نے پر شوق انداز میں پوچھا۔

مجھے بتا دینا۔" قارن نے ہزار ہزار کے کتنے ہی ٹوٹ حرم کی طرف پڑھائے تو حرم نے ہونہ کہتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"بھائی! آپ ہی کیسے نال سے کہہ من جائے۔ آسمند ایسی غلطی ہرگز نہیں ہوگی۔" قارن نے مسکراتے ہوئے قراز صاحب کو مدد طلب نظروں سے دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

"اچھا چلو سوری پلیز۔ اب تو مان جاؤ!" حرم کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے اس نے پیار سے کہا تو حرم ہنست کی طرح کھلکھلا کر من دی۔

"ایاز! ابھی جب پہ سیٹ ہو جائے پھر ساری سٹوڈنٹ

ہم آرام سے اپنے لوپر خرچ کریں گے، پھر میں اپنی ساری حسرتیں پوری کروں گی ویسے بڑی ہمت ہے آپ کی حوصلے کی سائل سے اپنے بھائی کے بچوں پر خرچ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے تو آپ پر بہت غم ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا ہے۔ آپ کا عمدہ نور آپ کا لائف اسٹائل سچ نہیں کرنا۔" عفران بڑی مہارت سے اپنا کام کر رہی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے، پتا نہیں ایاز کو نوکری کیوں نہیں مل پارہی۔ اب تو مجھے بھی اچھے وقت کا بے صبری سے انتظار ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ نئے اپنے بچوں پر کھڑے ہو جائیں۔ اچھا کھا سکیں۔ اچھا پہن سکیں۔" قارن نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"غیر یہ بات تو نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کا کھاتے نہیں، جو مل چاہتا ہے وہ کھاتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں نے حرم کو فون کیا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے بازار سے کباب منگوائے ہیں اور وہ سب کباب انجوائے کر رہے ہیں۔" عفران نے اپنے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"کباب! لیکن حرم نے تو مجھے کہا تھا کہ انہوں نے سبزی بیٹی ہے اور یہ کہ کل ایاز کا انٹرویو ہے۔ پٹرول کے لیے پیسے چاہئیں۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو کباب منگوانے کے بجائے سبزی یا پھر وہل منالیتے۔ اسے پتا تو

”ہوں بہت اچھی ہے۔ اچھا حرم! مجھے تم سے کتنا تھا کہ آئندہ سے گھر کا بلانہ سلمان میں خود لا کر دیا کروں گا۔ تم لوگ بہت سی چیزیں فضول میں ہی لے آتے ہو اور پہلے یا از سے کتنا۔“

”فضول میں کیا مطلب۔ ہم لوگ بچت کر کے تھک جاتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم فضول چیزیں لاتے ہیں۔ لائیں دیں مجھے پیسے پکڑائیں۔“
 پیشہ کی طرح حرم کو فوراً ہی غصہ آیا تھا۔ سو بولتے بولتے کہہ ہی ہو گئی۔

”بد تمیز! بالکل! سوائے بد تمیزی کے تمہیں اور کچھ آتا بھی ہے۔ پورے دو سال ہو گئے ہیں مجھے ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر اس گھر کا خرچ اٹھائے ہوئے اور تم لوگوں کو کوئی احساس ہی نہیں۔ تم بھی ٹیوشن پڑھاتی ہو۔ ایاز بھی سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا ہے۔ آخر گھر میں کچھ نہ کچھ تو آتا ہی ہو گا۔ کہانے پینے میں تم لوگوں کا اسٹینڈرڈ ہم سے اونچا ہے اور میں اتنی بڑی پوسٹ پہ ہوتے ہوئے ایک کلرک جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ کس کے لیے؟ صرف اور صرف تم لوگوں کے لیے اور تمہیں میری قربانیوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ صبح کتنی ہے صغرا میں اپنی ساری زندگی بھی تم لوگوں پر وار دوں۔ تب بھی تم لوگ مجھ سے خوش نہیں ہو گے۔“

ایک جھٹکے سے کھیر کا پیالا ٹیبل پر بیچ کر وہ کھلے ہوئے دروازے کو نذر سے لات مارنا ہوا کمرے سے باہر نکلا تھا۔

”ٹھٹک۔ ٹھٹک۔ ٹھٹک۔“ زہر میں جھجے کتنے ہی بھالے ایک کے بعد ایک اس کے دل میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ تذبذب اور لذت کے بے پناہ احساس کے باعث وہ کمری بھی نہ رہی اور کسی بے جان شے کی طرح کرسی پر ڈھس گئی۔ یہ بھی مقام شکر قتل اس کے دل نے دلچ کی طرف خون کا بہاؤ کم کر دیا تھا۔ سو ماؤف ہوئے ذہن کے ساتھ وہ صرف اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکن کو سمجھ پار ہی تھی ورنہ اگر اس وقت ذہن کے درپے روشن ہوتے تو وہ فاران کے اس روپ

کو بھی برداشت نہ کیا ہی۔
 ”کیا ہوا حرم! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“
 فراز صاحب نے حرم کے پیلے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے گھر مندی سے پوچھا۔ وہ دونوں رخ سے ہی اپنے کسی رشتے دار کی عیادت کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے۔ سوائیں اس سارے واقعہ کی کاتوں کٹن خبر نہیں ہوئی۔

”جی پیپا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور جو تو اس لیے زرد ہے کہ آج میں نے اپنے چہرے پر ہلدی والا اینٹن لگایا تھا۔“ حرم نے چہرے پر ہشاش تیرا کرتے ہوئے کہا۔ ناعصہ حکیم کے سامنے ایسی بات کرنا تو پارہ کو تیلی دکھانا تھا اور ویسے بھی وہ اپنے پیارے سے پیپا کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اچھا چلو جلدی سے جا کر فاران کو بلا کر لاؤ۔ ایاز کا فون آیا تھا۔ اسے نوکری مل گئی ہے۔ ماشاء اللہ اچھی جا بے اور ساتھ میں گھر اور گاڑی بھی۔ اللہ کا شکر ہے مشکل وقت کٹ گیا۔ ان کڑے دنوں میں فاران نے بڑی خوش دلی سے اپنی ذمہ دار نبھائی ہے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس گھر میں اپنا حصہ فاران کو گنٹ کر دوں گا۔ اس نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ بے شک تم نے اپنی اور ایاز کی بہت سی ضرورتیں ٹیوشن پڑھا کر پوری کی ہیں، لیکن ہم فاران کے احسان کا بدلہ ہرگز نہیں چکا سکتے۔“ اب فراز صاحب حرم سے مخاطب تھے۔

”تو آپ نے کون سا کم قربانیاں دی ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں کی خوشیوں اور جذبات کو اپنے بچوں کی خوشیوں اور جذبات سے مقدم سمجھتے رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ایاز چھوٹا تھا۔ آپ سے کتنا پوچھا کرتا تھا کہ پیپا! آپ کو چاہو زیادہ پیارے لگتے ہیں یا میں تو کبھی آپ نے اکیلے میں بھی جھوٹے منہ اسے یہ نہیں حکمایا کہ وہ آپ کی لولا ہے۔ آپ کو سب سے مقدم ہے، جب آپ نے اپنی بسلا سے بیوہ کران کا خیال رکھا ہے تو اب ان کی باری بھی تو بنتی ہے۔“
 ناعصہ حکیم کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتی تھیں۔

سماہے گا۔ بہت پریشان سی حالت میں قاریوں کا ہونا چاہیے۔ ہرگز منائے بغیر آپ ہونگے کرنے کیسے چلے گئے۔ دل کا خون ہوا تو ایک آنسو اس کی آنکھ سے نچکا تھا۔ یہ بے کواڑ شکوے سے مزید جو عمل کر گیا۔

”حرم کی دعوت تو اس کا من ہے۔ جسے وہ بیوی محبت سے جانتی ہے اور پھر حرم چاہے تو میرے گلے پر انگوٹھا رکھ کر میرے نکلوالے کس کی جمل ہے جو اس کی بات کو بد تیزی سمجھے۔“

تیسری بیڑھی لورہ سری یاد حرم کے حلق میں جیسے کانٹے آگ آئے۔

”کیوں چاہو! اگر ان توڑ تباہی تھا تو مجھے صدمہ ختم کی نور زہد سستی سے اپنی بات منوانے کی عادت کیوں

ڈالیں۔“ دو سرا شکوہ تھا اور اس کی آنکھ سے ٹپکتے والا دو سر لہائی آنسو۔

”میں حرم کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔“ پارہا مختلف مواقع پر یوں لایا قاریوں کا مخصوص جملہ اس وقت حرم کی آنکھوں سے ٹپکنے پانی بن کر بہ رہا تھا۔

”صرف تمہارا سا انتظار ہی تو تھا۔ چاہو دیکھیں آج آپ کی آنکھیں ختم ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ لب جلد ہی ہمارے آپس کے تعلقات معمول پر آجائیں گے، کیونکہ آپ کی فطرت اور عادت ہرگز بری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ دل ہی دل میں بچھتا بھی رہے ہوں، لیکن آنے والے دنوں میں ہمارے درمیان کچھ تو ایسا ہو گا جو غلاف معمول ہو گا۔ اب ہم اپنے تعلق کے کچھ دھارے کو چھٹی بھی کر لگائیں، لیکن تعلق میں کئی جھجک کی دیوار کو کبھی نہیں گرا پائیں گے اور یہ جھجک تو ایسا قند ہے کہ جب کسی تعلق میں ڈبرہ ڈال دے تو دونوں میں دیواریں آنے سے کہتی نہیں روک پاتا۔“

آخری بیڑھی بر قدم رکھتے ہوئے حرم نے چیزی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا تھا۔



تو صرف اور صرف میرے اس رویے کی وجہ سے اور نہ یہ ہی بچے میرے ہل گئے پر احساس برتری اور میرے نہ گئے پر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے۔ یہ ایک کبی بحث ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیا خاک آئے گی۔ تم جاتو حرم! قاریوں کو بلا کر لاؤ۔“ قراز صاحب نے خاموشی سے کھڑی حرم کو پکارا تو وہ جو تک اٹھی۔

”پہلے پتا تو کر لیں کہ وہ گھر پر ہیں بھی یا نہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب میں نے حرم کے ہارے میں پونچھنے کے لیے عفران کو فون کیا تھا۔ تب وہ دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ پتا بھی تھا کہ کبھی گھر میں آگئی ہے۔ پھر بھی سیو تفریح کے بغیر وہ نہیں سکے آپ کے

بھائی اور بھانج۔“ نامہ بیگم نے سخت سے کہا۔
”قاریوں کی گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ وہ لوگ گھر آچکے ہیں۔ حرم بیٹا اب جی بھی جاتو۔ لیاڑ مصلحتی لے کر آتا ہی ہو گا۔“ قراز صاحب کے لہجے میں اب ہلکی سی جھنجھلاہٹ شدہ آئی تھی۔



”میری گزیا ناراض ہو لورہ میں مزے سے کھانا کھاؤں، ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ چلو جلدی سے نکل پو آجاتو۔ قسم سے بھوک سے پیٹ میں جو ہے وہ ڈر ہے ہیں۔ آئی پر اس! تمہیں کل شام کو پرا کھاؤں گا۔ اس دفعہ وعدہ خلافی کی جرات ہرگز نہیں کروں گا۔“ گھنٹوں کے بل جھکا قاریوں لجاہت سے حرم کو متاثر تھا۔

تو سہ رانی یاد میں کھوئی حرم دو سری بیڑھی پر ہی لو کھڑا گئی تھی۔

”وہ دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ پتا بھی تھا کہ کبھی گھر پر آگئی ہے۔ پھر بھی سیو تفریح کے بغیر وہ نہیں سکے آپ کے بھائی لورہ بھانج۔“ نامہ بیگم کی چیخ ہوئی تو از اس کے کانوں میں پھللا ہوا ایسے اچھیل رہی تھی۔

”آپ کی گزیا، آپ کی ماں بھی آگئی ہونے کے



اشغال۔ انہوں نے ساری زندگی مجازی خدا کے آگے
 زمین بند کر کے گزار دی تھی۔ لب و لہجہ اور موقع ملا تھا تو یہ
 دلو کا پوتہ۔

”داؤدی جی ایہ چھری ہے۔“ وہ سیدھا کمرے میں
 ورنہ داؤدی نے عادت کے مطابق فوراً ”اسرائیل کی
 طرح وار کونہ تھا چاہے لو میں کوئی بھی آئے۔“
 ”اسی لیے کہہ رہی ہوں کم بختوں! لاؤ چشمہ۔ کیرے
 کٹ کٹ کر کھلاؤں گی سو کھتا۔“



داؤدی تخت پر بیٹھی سیم کی پھلی کٹ رہی تھیں۔
 اسی ہلار جی خانے میں گوشت، مہون رہی تھیں۔ جو یہ
 گن میں بندھی رہی ہر دو حلے کپڑے ڈال رہی تھی۔
 ایرار نے گھر میں داخل ہوتے ہی نظر نہ ڈالنی اور
 کپڑوں کی آڑ لے کر اپنے کمرے میں بحفاظت پہنچنے
 کا خوش کن تصور کیا مگر وہ جو یہی ہی کیا جو اس کے
 اشارے سمجھ جائے۔ ایسے ہی تو وہ اسے بو گئی نہیں کتا
 تھا۔

”ارے بھائی! میرا رسالہ لے کر آئے؟“ وہ چینی تو
 اس نے ٹھٹھی سانس بھری۔
 ”جو یہ ہے! تم یہ بچوں ولے رسالے پڑھنا کب
 چھوڑو گی؟“
 ”جب امی مجھے ڈیپٹمنٹ پڑھنے کی اجازت دیں گی،
 اور آپ مجھے فرسٹ ایر فل اور ڈی گائے کتا چھوڑ
 دیں گے۔“ اس نے بھی جواب دیا۔
 ”ارے یہ ایرار آ گیا۔“ داؤدی ہڑبڑا تھیں۔
 ”جی داؤدی جان! سلام کرتے کہ کسی مجرم کی طرح
 پیش ہوں۔“

”میرا نیا چشمہ لائے جو بنوائے کو بیا تھا؟“
 لن کے سوال پہ وہ ہلکایا۔ ”بس داؤدی جی اچھ میرا
 پورا ارمان تھا مگر گریہ اتنی تھی کہ۔ میں بھول گیا۔“
 اس نے اقرار کر ہی لیا۔
 ”لو جی بس۔“ داؤدی نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”وطن
 سے کہہ رہی ہوں مگر یہ لڑکا پورا اپنے دلو سے پر پڑا
 ہے۔“

وہ فوراً ”میدان میں آئیں۔“ لکھنے لکھی بھی
 کبھی وقت پر کوئی چیز لاکر نہیں دیتے تھے مگر ہر کام وقت
 پر چاہیے ہوتا تھا۔ میری تو ہر چیز بھول ہی جاتے تھے۔
 ہل پائی چیزیں وقت پر آتی تھیں۔“
 وہ اب کھٹنے کے چکروں میں تھا۔
 ”داؤدی جی! اتنے برے تھے واوا حضور تو لکھ کہیں
 بخشنے۔“

لوھر اس کی زمین میں کھلی ہوئی گوھر داؤدی نے
 برابر میں پڑی لکڑی کے بجائے لکڑی سے چھری

وہ اسی چھری سے تیز تیز سیم کاٹنے لگیں۔



”ای! اس دن تو میرے آفس میں پارٹی ہے۔“ وہ کوفت سے بولا۔ ”آپ عمار کے ساتھ چلی جائیے گا۔ اس نے معاملہ نمٹایا۔“

”اور جویریہ کو کون لے کر جائے گا ہم دو افراد تو جائیں کم از کم تمہارے ابو تو کلن سے لیٹ کھانے کے وقت ہی آئیں گے۔ عمار کا ٹکنا مشکل ہے۔“ انہوں نے حساب کتاب کیا۔

”اور اپنے بڑے ماموں کی اولاد کا تو تمہیں پتا ہے۔ فوراً براہ راست جاتے ہیں۔“ انہوں نے اسے دکھا جو برا سامنے بنائے لی دی دیکھنے میں مگن تھا۔ ”مجھے تو ضرور بتانا ہے۔“ جویریہ کمرے میں آتے ہوئے بولی۔

”ہاں! نہیں دیکھوں گے لے گئے بھی تو قربان کرنی ہوگی۔“ وہ بولا جویریہ نے احتجاجاً ممتہ کھلا۔

”جیا! فوراً جاؤ۔ گھلوں میں پانی ڈالو ورنہ رات ہو جائے گی۔ کیاری میں بھی ڈال دینا۔“ اسی نے اسے منظر سے غائب کیا ورنہ اصل معاملہ دب جاتا۔ وہ منہ پھلائی پلٹ گئی۔

”آپ دونوں عمار کے ساتھ بائیک پر چلی جائیے گا۔“ اس نے حل نکالا۔

”ہاں نا کہ وہ ہم کو لڑھکا دے رہے۔“ رکشا ہملا ہے۔“ انہوں نے خفگی سے کہا۔

”ایک تو ہر سال اتنے اہتمام سے برسی کرنے کی جانے کیا ضرورت ہے۔ غریبوں میں کھانا تقسیم کرو۔“ عییم خانے بھجوا دو اور بس۔“ ایرار بے زاری سے بولا۔

”ہاں تو اور کیا۔ لولا تو مل ہاپ کی یا نکل ہلٹ ہے اتنی فضول خرچی۔“ انہوں نے بھی منہ بنایا۔

”اللہ معاف کرے! بڑی بھابھی کوئی فقیر یا کوئی بھی مانگنے والا آتا تھا، کبھی دوا نہ نہیں کھوتی تھی۔ اور اللہ کی شان دیکھو! ان ہی کی برسی میں اتنا خرچا ورنہ ان

کی سنجوسی تو پورے خاندان میں مشہور تھی۔ بھائی ایک بار بھولے سے لال کے لیے سوٹ لے آئے۔ انہوں نے وہ باتیں سنا لیں کہ بس بھائی دونوں شرمندہ رہے۔ جب محض آٹھ سال کا تھا، بیمار تھا، بھائی رکشا چلاتے تھے جب تک کہ کوئی حق نہیں ہو تا کیل۔ کوئی مہمان آجاتا تو بھاری لگتا۔ گھر کا کھانا سامنے رکھ دیا جاتا۔ اس میں سے بھی اچھا ان کے بچے مہمان کے سامنے ہی کھا لیتے۔ پوچھتے بھی نہیں۔ ہمیں تو بہت شرم آتی ہے۔ اللہ بخشنے اب وہ اچھی لگے ہیں مگر کتنے میں تو آتا ہے۔“ انہیں کچھ خیال آیا تو گل پٹنے۔

”ممتہ نے تو بخش دیا ہو گا۔ آپ بھی بخش دیں۔“ ایرار جو نقل اسٹاپ کا انتظار کر رہا تھا بڑبڑایا۔ ”کیا کہہ رہے ہو۔“ ان کی سمجھ میں نہ آیا مگر اپنی اولاد کا پتا تھا۔ اس لیے کھورتی ہوئی اٹھ گئیں۔



پارٹی بہت اچھی رہی تھی۔ سب کئی طرح کے کھانوں، میٹھے اور کولڈ ڈرنک کے بعد چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باتوں کا دور چل رہا تھا۔ کہنی کے سینٹرز جو نیوز کو کہنی کے ماضی کے قصے سن رہے تھے۔ مثال صاحب بولے تو ایرار بھی متوجہ ہو گیا کیونکہ اس سے سینٹرز عثمانی صاحب تھے۔

”آپ لوگوں کو تو شکر اوار کرنا چاہیے کہ اب طارق صاحب ہیں۔ جب ہی اتنے بونس مل جاتے ہیں۔ ورنہ اللہ جنت نسیب کرے ان کے والد باجو صاحب کو جب وہ تھے بمشکل تنخواہ وقت پر ملتی تھی۔ تنخواہ میں اضافہ تو ہم بھول ہی گئے تھے مگر جب بھی کہنی کو نہیں چھوڑا۔“

عثمانی صاحب اور بھی جانے کیا کہہ رہے تھے مگر تنخواہ دور جا کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف یہی تکرار تھی۔ تنخواہی پر پورے صبر بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ”یار! یہ لوگوں کو جانے کیا مرض ہے ہر مرے ہوئے کوئی کی برائی کر کے پھر اللہ بخشنے کہہ کر جیسے فارغ ہو جاتے ہیں۔“ تنخواہ بے زار سا تھا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ جنید بھی بولا۔

”جبکہ اسلام آتا ہے کہ مرحلے والوں کو برائے کہا جائے۔ اپنے لیے کا بدلہ پا چکے ہوتے ہیں۔“ جنید کی بات پر وہ السوس سے سرلانے لگا۔

ای اور دلاوی کی کوششیں آخر تک لائیں اور وہ مشترکہ طور پر فرح کو ہونٹنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ ابرار ایم بی اے کر کے کامیونیکیشن میں ڈوٹل سٹڈیز کی پوسٹ پڑھا تو فرح نے بھی اسلامک اسٹڈیز میں ایم فل کیا ہوا تھا۔

ابرار درمیانے قدر کا اوسط شکل و صورت کا تھا تو فرح حسین تھی۔ ابرار کے دو چھوٹے بہن بھائی تھے تو اس کا بس ایک چھوٹا بھائی تھا۔ فرح کا خاندان بھی اچھا تھا اور لڑکے والوں کا خاندان تو ہمیشہ اچھا بلکہ لڑکی والوں سے بھی اچھا ہوتا ہے تو وہ دونوں جوڑا کر بہت خوش تھیں۔

ابرار بھی دلی تکی خوش شکل فرح کی سبکت میں خوش تھا۔ خاص کر وہ اس کے اسلامک اسٹڈیز کو بطور مضمون منتخب کرنے پر بہت خوش تھا۔ جب وہ سلیقے سے دیکھتا تھی پتوں میں کبھی کبھار قرآن وحدیث کا حوالہ دیتی تو اس کا دل جیت لیتی۔ ایسی ہی جیون ساتھی کا تو اس نے تصور کیا تھا۔ وہ ای اور دلاوی کا شکر گزار ہوتا۔

آج فرح کی خالہ کی طرف ان کے پورے گھر کی دعوت تھی۔

”ارے جیا! تم تیار نہیں ہوئیں؟“ ابرار اپنے کمرے کی طرف جانا ہوا بولا۔

”نہیں بھائی! اینٹ ہے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”یہ میری دوست نے مجھے گھٹ میں نل پالش دی تھی مگر میں تو کبھی کبھار لگاتی ہوں۔ لیکن بھائی کو میں ہر دفعہ لگایا کروں گی جب بھی دعوت ہو۔“ وہ گولڈن ٹیل پالش لہراتے ہوئے بولی۔

”ارے ہو گی۔“ بے اختیار ابرار کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ توازیہ کر بولا۔ ”بائی۔ بھیز! اس کو نل پالش لگائے۔ کھائے کبھی تو نہیں لگاتی۔“ ابرار کی بات پر وہ نکلی۔ بھول گئی۔ ”میں ہمیں نہیں لگائیں؟ وہ تو دلہن ہیں۔“

اب وہ جو ریہیلیٹی کو سمجھاتا تو دیر ہو جاتی تھی۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ فرح اس کو آتے تو یکے کر مسکرائی۔ اس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ہلکے کاسنی ٹراؤزر شرٹ میں وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی۔ دلکش سا میک اپ۔ انہوں میں اس کے لائے ہوئے موٹیا کے کجڑے۔ کانوں میں چھوٹی گولڈن جھمکیاں چہرے کے گرد بہت تھیں لگ رہی تھیں۔

”زبردست جیار! اس نے سر لہوہ مسکرائی۔“ شکرے کوئی بھی میری تیاری پر اعتراض نہیں کرتا تو کتنا نہیں ہے۔ آپ سب اتنے ہیں۔“ ابرار مسکرانے لگا۔

”ورنہ اللہ مغفرت کرے میری دلاوی مرحومہ! وہ تو ای کی ہر تیاری پر اعتراض کرتی تھی۔ لٹا پھینکا رنگ کیوں پہنتا۔ چونچیاں کیوں کم ہیں۔ سرخی گہری کیوں؟“ مندی لازمی لگاؤ۔ میں بہت چھوٹی تھی مگر بچپن سے ڈر بیٹھ گیا تھا کہ میری سانس بھی ایسی نہ ہوں۔ امی بے چاری گھبرائی ہوئی ہی رہتیں۔ ایسا بھی نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کی اپنی پسند ہی ختم ہو جائے۔ بس شکر ہے۔ یہاں ایسا کوئی نہیں۔“

وہ میک اپ واپس جگہ پر رکھتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

پائی پیٹے ابرار کو بھندالگ گیا وہ کھانسنے لگا۔

کیا ”اللہ بخشنے“ ہماری زندگیوں میں لازم ہو گیا ہے۔ اس نے سر بھی تھام لیا۔ فرح گھبرا کر آئی اور اس کی پشت سہلانے لگی۔ وہ سر پکڑے بیٹھا رہا۔

*

وہ بھی ہی اتنی بیماری کہ بے ساختہ ہر ایک کا دل اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو چاہتا۔ بڑی ہی دوستانہ طبیعت پائی تھی۔ کیا مجال کہ کسی اجنبی سے بدک جاٹے منزل سے نظر ہتے ہی بے ساختہ مطلوبہ منظر یہ جم گئیں۔ اس لڑکی میں ایسا کچھ بھی چونکانے پا سکتا تھا۔ وہ لانا تھلے سیاہ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی جوتی ایک طرف بڑی ہوئی تھی۔ دائیں کندھے پہ میوٹن شال جو نیچے پہنچ تک آ رہی تھی۔ گندی رحمت جس میں زردی واضح طور پر کھلی ہوئی تھی۔ گہری سرمئی آنکھیں اور ان میں چھایا حزن۔ ہاں اس لڑکی کے

وہ آج بھی وہیں بیٹھی تھی جہاں وہ اسے گزشتہ دو ہفتوں سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ سٹی بیچنگ بالکل سٹی جیسے کی طرح ساکت و خاموش۔ کسی غیر مٹی نقطے کو گھورتے ہوئے۔ پارک میں اس وقت روز کی طرح مردوزن اور بچوں کی بھیڑ تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بلند آہنگ قسمے دہلی دہلی ہنس کچھ بھی تو اس کا اور تکانہ توڑتا رہا تھا۔

”یہاں! مجھے سلائیڈ پہ چڑھائیں!“ کانلی دیر سے ادھر ادھر بھاگتا اپنے ہم عمر بچوں سے چہلے کرتا۔ سلجوق اس کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر لولا تو وہ جو کانلی

تازہ خیال



سراپے۔ ایک واضح دکھائی دیتی ملال کی چادر لہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھ ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا اور وہ بھی تو ان آنکھوں کی ہی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان سرمئی آنکھوں میں بلا کی کشش محسوس ہوئی تھی اسے۔

شام بے قدموں اترتا شروع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ پارک خالی ہونے لگا۔ بیروں میں لوہے پھیروں کی چکار میں ماحول کو بے حد حسین بنا رہی تھی۔ قریبی مسجد سے گندہ اکبری کی آواز بلند ہوئی تو فضا مزید کیف آور ہو گئی۔

وہ لڑکی بھی بیچنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور شل سے سر کو ڈھک کر چل دی۔ منزل کا چاکلیٹ سے بھرا منہ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے عالی حسن نے اس لڑکی کو

دیر سے اسے دیکھنے کا کام انتہائی توجہ اور محنت سے کر رہا تھا چونکہ کچھ حواسوں میں پلٹا۔

”ہاں چلو اپنے بیٹے کو سلائیڈ پہ چڑھاتے ہیں۔“ انتہائی خوش دلی سے بولتے ہوئے اس نے سلجوق کے پھولے سرخ رخساروں پہ لگا مار کئی بوسے دے ڈالے۔

”اور یہ ہر نفسہ منزل کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے سلجوق سے پوچھا۔

”وہ رہی“ سلجوق کی انگلی کے اشارے کی سمت دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیا۔ منزل روز کی طرح آج بھی ایک گروپ جو ان کے بیٹھی تھی۔ خاتون اسے پیس کا پکٹ کھول کر دے رہی تھی۔ جبکہ چاکلیٹ سے وہ پہلے ہی سارا منہ لور فراک خراب کر چکی تھی۔



Copied From

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

پہلے تو حیرت بھری دکھ کی کیفیت میں جاتے ہوئے دکھا۔ اس لڑکی کی چال میں واضح نظر آہٹ تھی۔
 سے سخی تھا آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔
 ”ذرا مجھے ڈاکٹر کا — نکھلا (سخت) دکھاؤ۔“ وہ
 سائیڈ ٹیبل پر رکھی دو اوس کو اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولا۔



”کچھ نہیں ہوا مجھے تم خواخوہ پریشان ہو رہے ہو۔
 آ۔۔۔ چھی۔“ تسلی آمیز لہجے میں بولتے ہوئے اس
 نے زور سے چھینک ماری ساتھ ہی نشو یا کس سے نشو
 گھسیٹ لیا۔

”کمال ہے یار! تم نے پندرہ منٹ کی کل میں بلا
 مبالغہ ساٹھ دفعہ چھینکیں ماری ہیں اور تم کہہ رہی کہ
 ٹھیک ہو۔۔۔ میری طرح بتاؤ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں یا
 پونسی گھر میں بڑی میڈیسنز سے کام چلا رہی ہو؟“ اب
 کے دفتر آہٹ کے پرچہ رہا تھا۔

”قسم سے عمیر! معمولی سا نزلہ بخار ہے۔ ذرا سا
 جاڑے نے جھاڑا ہے۔“ وہ زکام لہ آواز میں صفائی
 دینے لگی۔

”محترمہ! یہ تو قریب آ کے۔ معائنہ کرنے کے
 بعد ہی بتا چلے گا کہ یہ موسمی نزلہ بخار یا جو درد علاج کے
 ختم ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔“

”نہیں عمیر! میں بالکل ٹھیک ہوں۔
 آ۔۔۔ چھی۔“

اگلے پندرہ منٹوں میں عمیر اس کے کمرے میں
 اس کے روبرو موجود تھا مع ایک عدد وائٹ روڈ کے
 بوکے اور ڈیجر ساری چاکلیٹس کینڈیز اور سوپ کے
 بکٹس کے

”یہ لپکا سا نزلہ زکام ہے۔“ وہ اس کی تپتی پیشانی پر
 ہاتھ رکھ کر چلایا۔

”ہاں تو عمیر! اس میں بخار کا کیا قصور، موسم ہوا کیجو
 کتنا سرد ہے۔ کمرے کا تھرٹوٹ رہا ہے۔ پچھلے چار
 دنوں سے سورج کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اب ایسے
 بخ بہت موسم میں بخار کا ہونا کیا اچھا ہے۔“ وہ کونسی
 کے بل اٹھتے ہوئے نقاہت سے بولی۔ چہرہ بخار کی تپش

”کیوں اس نے تمہیں چلایا نہیں کہ اس کے بھائی
 دوالے آئے ہیں۔“ بے حد پتھرتے ہوئے انداز میں
 پوچھا۔
 ”لور اگر کسی ڈاکٹر سے چیک اب بھی کروانا ہے تو
 خالد خود آ کر اسے لے جائیں گے کسی کو خواخوہ
 تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت گھر میں
 موجود ہوں اور مشام کو یوں ڈاکٹر کے پاس جانے کی

اجازت نہیں دے سکتی بچہ تک خالد کمرے نہیں آجاتے۔ "ہینا کا لہجہ و انداز قلعی تھے مشائم نے عمرو کی طرف بے بسی سے دیکھا عمرو نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"میں خالد بھائی سے بات کر چکا ہوں۔ آپ تصدیق کر لیجئے مگ چلو مشائم۔" وہ دو ٹوک الفاظ میں کہہ کر مشائم کے کندھوں پہ پانڈر کے آگے بڑھ گیا۔ ہینا سلگ کر رہ گئی۔

گاڑی کا گرم دہر سکون ماحول اھصاب کو تقویت دینے لگا تھا۔

"عمرو! یہاں ہمارا مرض ہو گئی ہیں۔ پتا نہیں بھائی کو کیا ہے کیا لگائیں گی؟" وہ کار ڈرائیو کرتے عمرو کو دیکھتے ہوئے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

بھابھی کا منہ دو عمل اسے سانس دے رہا تھا۔ "دل یوشٹ اپ مشائم؟" عمرو ایک دم ٹھسے سے بولا۔

"کوئی چار سہل قبل ایک بہت بڑی سیر سنی ہوئی تھی۔ تین سو معزز مسافروں کی موجودگی میں 'عمرو' فیاض نے تمہیں رنگ پینا کر خود سے منسوب کیا تھا۔

محترمہ ہینا خالد بھی اس تقریب باسعید میں موجود تھیں۔ وہ تو نہ بھولی ہوں گی مگر ہم بار بار بھول جاتی ہو۔

کہ تم میری مگتیر ہو۔ ہونے والی شریک حیات۔ وہ تمہیں میرے ساتھ آنے جانے پر روکنے والی کون ہوتی ہیں؟" وہ سمارٹ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے

مخصوص دو ٹوک انداز میں پوچھ رہا تھا۔ مشائم تو بس ایک ٹک سے دیکھے جا رہی تھی۔

"ویسے! وہ مجھ سے کیوں اتنی خار کھاتی ہیں؟ جب بھی تم سے ملنے آتا ہوں۔ ایک دم سے گارڈ کی طرح تمہارا اپو دینے لگتی ہیں۔ نہ چاہتے نہ خاطر تواضع۔

چہرے پہ بڑا بڑا سا "دفع ہو جاؤ" لکھا ہوتا ہے۔ میں صرف تمہارا فیائسی ہی نہیں بلکہ پھوپھی زانو بھی ہوں۔ میرے لبا کی بسن کا گھر ہے یہ۔" ذرا سا گرجان موڈ کراس سے پوچھا۔

"تم بھابھی کی ناپسندیدگی کی وجہ سے بخوبی واقف ہو۔ خالد بھائی زار یہ بھتی سے بچپن سے ہی منسوب تھے۔ لیکن خالد بھائی کو پونہ ورثی میں شہنا بھابھی پسند آگئیں۔ اور ایسی پسند آئیں کہ لہاں بابا کے سامنے ڈٹ گئے کہ شہنا کے علاوہ کوئی لڑکی ان کی زندگی میں نہیں آ سکتی۔"

"ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔ ناراض تو لانا ہمیں ہونا چاہیے کہ خالد بھائی نے زار یہ بھتی سے منگنی ہی نہیں بلکہ ان کا دل اور خالد بھائی کے حوالے سے دیکھے گئے سارے خواب توڑ ڈالے ہیں۔ مگر ہم نے تو ایسا کوئی ایڈجسٹمنٹ نہیں کیا۔ نصیب کا لکھا جان کراچی بسن غیروں میں بیادوی سنہ کوئی انا کا مسئلہ اور نہ ہی حیرت کا طوفان۔" وہ وینڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر ذرا سانس دے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بھابھی سمجھتی ہیں کہ ان کی شادی کے وقت ان کے چیز میں۔ مائی راشدہ نے سو سو کپڑے نکلے تھے۔ ان کے خاندان پر باتیں بنائیں خالد بھائی کا دل خراب کر کے ان کا گھر خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ سو اسی ایک بات کو لے کر وہ نیگیٹر ہو جاتی ہیں۔" گاڑی ایک شہن دار کلیٹک کے سامنے رگ گئی۔ مریضوں کا ریش تھا۔ مگر عمرو کے دوست ہونے کی وجہ سے انہیں بلڈ نمبر مل گیا۔

"اب یہ میڈیسنز ہدایت کے مطابق باقاعدگی سے لیتی ہیں۔ مجھے دو دن کے اندر پہلے والی مشائم کی حترم دو لکھس آواز سننی ہے ہاں کہ یہ ہماری زکام زدہ اجنبی آواز اور لوپر سے چھینکوں کا توڑ کا۔" وہ بے حد اپنائیت سے اسے دھونس بھرے لہجے میں مخاطب ہوا۔ تو مشائم مسکرا دی۔

ڈاکٹر سے فارغ ہوتے ہی عمرو اسے ایک ایچ سے ریٹورنٹ میں لے آیا۔

"عمرو! گھر چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔" سر روٹا سیٹ کرتے ہوئے بے چینی سے بولی۔ ایک خوراک لینے سے اسے خاصا افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ سر جھکا کر نیچے دیکھا، سلجوق گہری خند سوچا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے اپنا ہانڈ سلجوق کے سر کے نیچے سے نکالا۔ اس کے ماتھے پہ بکھرے بل انگیوں سے ہٹائے اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

مثلاً تو کب کی سوچتی تھی۔ سوتے میں بھی اتنی پیاری لگ رہی تھی جتنی جانتے میں۔

”دیری تانی!“ مسکراتے ہوئے جھک کر مثال کو بوسہ دیا۔ کبیل درست کر کے اسپینے بیڈ پہ آگیا جو بچوں کے بیڈ سے ہانڈ بھر کے فاصلے پر تھا۔

”بیلا! آج اسکول میں پیرس نیچرز مینٹک ہے۔ آپ آئیں گے تلو۔“ صبح ناشتے کی ٹیبل پہ سلجوق نے اسے بتایا تو تیس پر جام لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔

”سوری جانو! آنا مشکل ہو گا مگر کبیل سے فلن پر بات کر لوں گا۔ کلڈ سٹک تو میرا رہتا ہے ان سے۔“ وہ پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”لو کے! نیچر نے کہا تھا اگر فلور بزی ہوں تو ملا کو لازمی آنا چاہیے۔“ سلجوق نے کہتے ہوئے دو دو کا گلاس لیواں سے لگا لیا۔ عالی حسن نے منظور سلجوق کا چہرہ دیکھا۔ دکھ کے ایک لہرنے بے ساختہ اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دل ایک دم سے ناشتے سے اچانک ہو گیا۔ سلجوق نے دو دو بی کر علانا ”زیل ہونٹوں کے گرد پھیری اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بیٹا! آپ نیچر کو بتا دیتے تا میرے پاپا ہیں ملا نہیں۔“ اس نے بے ساختہ سلجوق کو گلے سے لگا لیا، اور نم آنکھوں سے اس کے بالوں پہ لب رکھ دیے۔



مشائم کی بسٹ فرینڈ عفراتی آج مندی تھی۔ وہ دل لگا کر تیار ہوئی۔ زور رنگ کی گیس پہ سبز اور سرخ دھاگوں کا کام تھا۔ ساتھ میں فیوڈی جوڑی دار پابلسہ اور سرخ بڑا سا ہٹا۔ لمبے نکتے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے پر اندر سے میں قید کیا جس کے سروں پہ بے شمار نئے

طیبت کی کرائی کم ہوتی جا رہی تھی۔

”ڈونٹ وری، ڈونٹ کر کے چلتے ہیں۔ بخار کے طفل تو ہاتھ لگی ہو۔ ورنہ تو ہر وقت بچا بھی نام کی تلوار تمہارے سر پر لگتی رہتی ہے۔ لنگہ جھنڈ پریڈ کا سا رامز کر کر کر کے رکھ دیا ہے تمہارے اس بے بنیاد خوف نے۔ دنیا میں مجھ سا بے چارہ دمسکین منگیتر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا جو صرف اپنی منگیتر کی کلر پر گزارہ کر رہا ہو۔ اور کال بھی کتنی! کبھی پندرہ منٹ، تو کبھی پانچ منٹ۔ ٹھہریں عہد! میں نے واشنگ مشین کا بزر بنا ہے ابھی۔ عہد! مجھے لگ رہا ہے میری ہڈیا لگ رہی ہے۔“ وہ اس کی نقل کر کے اس کے سارے جیلے اسی کے انداز میں مہارت سے بول رہا تھا۔ مشائم بے ساختہ ہنسی چلی گئی۔ بے حد خوب صورت و مدھر ہنسی کہ جس سے چہرے کا ایک ایک نقش سج گیا تھا۔

نقاہت، سرور اور طبیعت کا اضمحلال نہ جانے چپکے سے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ دل و دماغ ایک فرحت آمیز کیفیت کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ دیر کھانا سرو کرنے لگا۔ عہد نے کل ملائی اور بے حد توجہ سے مشائم کی سرمئی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”بی خانہ بھائی! اب کچھ ہو سکی میرے ایک دوست کو اپنے تھوڑے کے حوالے سے چند اردو کلاسیکل ٹولز درکار تھے۔ میں ٹھہرا بزنس کا بندہ۔ مشائم کو بیک شاپ سے ساتھ لے گیا۔ اسے نہیں پتا تھا ساتھ ڈاکٹر سے بھی چیک کروا لیا۔“

یہ محبت کرنے والے ”اگر یوں ہی تحفظ و اعتبار بنانے لگیں تو زندگی بھی خود بہ تازگی ہونے لگتی ہے۔ مشائم عہد کی گہری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پلیٹ پہ جھک گئی۔



”پھریوں ہو! کہ شزاوے کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا شزاوے نے سست زور لگایا مگر۔“

نہیے کھٹکرو گئے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور لپ گلوں۔

مشائم کا کام تمام کیے دیتے تھے۔

دو تو عصر سے پہلے پہلے تک ٹیوٹر سلجوق کو پرہا کر رخصت ہو جاتا تھا مگر توج نہ جانے کیوں ابھی تک پڑھائی جاری تھی۔

آس سے واپسی تک اسے ایک ناقابل فہم سی بے چینی اور اضطراب گھیرے میں لے لیتے۔ ایک بے نام سا انتقار۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا یہ کیفیات دو چند ہوتی جاتیں۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

”کیا بات ہے؟ ابھی تک ہمارے بیٹے کو چھٹی نہیں دی آپ نے؟“ وہ کلنی دیر تک اسے گھرے میں سلجوق کے فری ہونے کا انتظار کرتا رہا مگر سلجوق کے نہ آنے پر اسے خود ہی ملاؤن میں آتا پڑا۔

”جی سلجوق کے ٹرم ہو رہے ہیں نا اس لیے ذرا ایکسٹرا ٹائم دینا پڑ رہا ہے۔“ نوجوان ٹیوٹر نے متانت سے جواب دیا تو وہ مسکراتے ہوئے سرانہات میں ہلکا کر باہر آ گیا۔

مثال آیا کے ساتھ مصروف تھی۔ اگلے چند دن مت بعد وہ پارک میں موجود تھا۔ سگی شیخ خالی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے اندر ریوسی اترنے لگی تھی۔ اس نے چاروں طرف پارک میں نظر دوڑائی۔ ہر کوننا آہلو تھا سوائے شیخ کے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں پارک میں چلا آیا۔ بے بغیر کسی ارادے و ضرورت کے بچوں کے بغیر بنن کو ہلانے کی خاطر وہ شام کے وقت تھوڑا سا پارک میں انیس لے آتا تھا۔ آج تو وہ بھی نہیں تھے۔ اس نے واپس کے

ارلوے سے قدم بوجھائے ہی تھے کہ وہ آئی ہوئی دو کھالی وی۔ دھیرے دھیرے لنگڑا کر چلتی ہوئی مسرخ میون شل اچھی طرح جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر آ کے بیٹھ گئی۔

عالی حسن کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل کا

بھائی سے تو وہ جاننے کی اجازت کب سے لے چکی تھی مسئلہ عفرات کے گھر ڈراپ کرنے کا تھا۔ خالد بھائی کی گاڑی سروس کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اور رکشا میں دو ڈیپ بی مل سکتا تھا۔

”عمید کو بلا لوں۔“ دل نے چپکے سے صلاح دی مگر دماغ انکاری تھا۔

”کونہ۔۔۔ بھابھی خواہ مخواہ روڈ ہو جاتی ہیں اور پھر بلاؤں مجھے اس کا لیکچر اور بھابھی کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔“ مگر جب دل کی مراد آتی ہے تو پاسن عقل کے سارے مشورے دھرے رہ جاتے ہیں۔ عمید کے ہاتھ میں برتھ ڈے انوی نیشن کارڈ تھا۔ اس کے پیچھے عمید کی برتھ ڈے سنی جس کے لیے وہ انیس مدعو کرنے آیا تھا۔ عمید کو سامنے بپا کر اس کے چہرے پر جو رنگ اترے سو اترے تھے۔ عمید خرد اسے مہموت سا دیکھنے لگا۔

”مجھے عفرات کے ہاں چھوڑنا ہے۔“

”ہاں تو چلو۔ اس سے بیٹھ کر بھلا اور کون سا کام میرے لیے اہم ہو سکتا ہے۔“ عمید سنبھلا مسکرایا۔ وہ پراعتدوسی اس کے پہلو پہ پہلو چلتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”مائی گڈ نائس! اتنی پہلی کہاں تھی آج سے پہلے تک۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک ہی حلیمے میں دیکھا ہے حدرف اور سلو۔ یو لو! آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ سیدھا نکال پڑھو کے گھر لے جاؤں۔“ وہ بے خود سا ذرا سا اس کی طرف جھک کر بولا۔

”سنبھل کے عمید! تاز سے مسکراتے ہوئے مشائم نے ذرا سا ٹوک۔

”یار! جملہ حقوق اپنے نام پانہابطہ طور پر کروانے کے بعد دیکھنا تمہیں میری چاہت کے کتنے روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔“ وہ غمور لہجے میں دھیمے دھیمے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ عمید کے یکا تیر تو

سلجوق کے پسندیدہ چائیزرائس بنائے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کے کارٹون دیکھے۔ سیکنڈ ہوا کی آمد سے دن مزید بر لطف ہو گیا۔ سیکنڈ ہوا ایسا کی فرسٹ کزن تھیں۔ کھبے میں علاج معالجے کی تشریح بخش سہولیات کی عدم دستیابی کی بنا پر وہ شہر کا چکر لگاتی رہیں۔ اس بار ڈاکٹر کے پاس آئیں تو کوہر بھی ملنے آئیں۔

”بیچے تو ماشاء اللہ سے بڑے ہو۔۔۔ رہے ہیں۔ چھٹی دفعہ آئی تو چھٹی الٹی سی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ بونے لگ گئی ہے۔“ کھلونوں سے کھیلنی منٹل کو دیکھتے ہوئے بوا محبت، نعرے انداز میں بولیں۔

”جی ہوا! سلجوق تو ماشاء اللہ بہت ہی فرماں بردار بیچہ ہے۔ مگر یہ منٹل بہت شرارتی ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ چائے کا کپ بوا کو تھمتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”جی بھی تو بیچے چھوٹے ہیں۔ کم سن اور انجان۔ بڑے ہوں گے تو اتنی ہی ذمہ داریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ یہ ذمہ داریاں تم اکیلے نہیں اٹھلاؤ گے۔“ چائے کا کھونٹ بھرتے ہوئے بوا نے اس کا چہرہ جانچا۔

”بیچے چاہے جتنے بھی فرماں بردار اور اور ٹیک طبیعت ہوں۔ انہیں ماں کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ تمہاری محبت توجہ بے شک بہت زیادہ ہے مگر زیادہ ایسے مسائل ہوتے ہیں جن کو ایک عورت ہی سمجھ اور حل کر سکتی ہے؟“ عالی حسن کے لب بے ساختہ بھینچ گئے۔

”نہیں ہوا! میں انہیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی کوشش رکھتا ہوں۔“ انداز میں قدرے بے گامگی تھی۔

”ماں دونوں کو تو چلو ماں باپ کا پیار مل رہا ہے۔ اور تمہیں کیا مل رہا ہے۔ کب تک ایسی سلی زندگی بسر کرتے رہو گے۔ عورت کے وجود سے ہی کفر مکمل ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ سے برسر روزگار ہو۔ صحت مند ہو۔ زندگی کی ہر نعمت ہے تو ایک جیون ساتھی کا انتخاب کرنے میں کیوں تامل کر رہے ہو؟“ بوا اس کے احساسات سے بے خبر ہاسخانہ انداز میں بولنے چلی۔

ایک کونہ جیکے سے آہا ہو گیا ہو۔ ساری کلفت سارا اضطراب نجانے کہاں منسوجھا کے بھاگ گئے تھے۔ ”تو کیا تم صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خاطر پارک آنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے؟“ دل نے اچانک اس سے سوال کیا اور وہ ششدر رہ گیا۔



کیسے مجھے تم مل گئیں؟
قسمت سے آئے نہ یہیں

عمیر نے سی ڈی کن کی۔ گاڑی میں مدھروں کو کھنچ اٹھے۔ سٹل پہ رکتے ہی پھول بیچنے والا لڑکا بھاگ کے آیا۔ عمیر نے سارے ہی لئے لیے۔

”آف عمیر! اتنے سارے پھول لینے کی کیا ضرورت تھی۔ بس ہاتھوں کے لیے دو گلن لے لیتے۔“ مشائیم زکات سے ساتھ انگلیاں نکا کر بولی۔

”صرف ہاتھ ہی نہیں نہیں پور پور پھولوں سے لدا رکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ گہری نظر میں مشائیم کے حیا کوہر سے پے ڈال کے بولا۔

”میری محبت اور چاہت ہماری زندگی کو پھولوں بھری بھنگو رہائے گی۔ ہر لمحہ مسکنا ہوا گزرے گا۔“

”میں نے لفظی کی تم سے لفت لے کر۔ اچھا تھا رکھے۔ چلی جاتی۔“ شدت جذبات سے بے تحاشا سرخ ہونے چہرے کو تھمتاتے ہوئے مشائیم نکلی سے گھور کر بولی۔ سکتل کھل گیا۔ عمیر نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”چھائی! ایسے کیسے چلی جاتیں۔ تمہارا یہ خادم خاص یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائے گا۔ بس اسی کو بھیجتا ہوں خالد بھائی سے ڈیٹ لینے کے لیے۔ اب مزید صبر نہیں ہوتا۔“ عمیر نے لہک کر مشائیم کے گلن میں جھک کر محبت سے کہا تھا کہ مشائیم زور سے چینی۔

”عمیر! سنو دیکھو۔ وٹرال۔“



چھٹی کا دن تھا اور وہ خوب انجوائے کر رہا تھا۔

جاری تھیں۔
 ”آپا پلیز! میری زندگی ان بچوں سے مکمل ہے۔
 کسی اور فرد کی ضرورت نہیں ہے۔ میری محبت توجہ
 بس ان ہی کے لیے وقف ہے۔ میں انہیں کسی بھی
 رشتے کی ناگواری و تنگی سے کوسوں دور رکھنا چاہتا
 ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں قطعیت سے
 بولا۔

”بند انخواست ناگواری و تنگی کیوں؟ میں بھلا کسی غیر
 ذمہ دار اور تنگ دل لڑکی سے شادی کا مشورہ توڑی
 دے رہی ہوں۔“ بوا اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر دل
 سوزی سے بولیں۔

”تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرو۔ جو تمہارے
 دل کو بھلی لگے؟“
 ”اچھی سی لڑکی۔“ چائے کے کپ کو بغور دیکھتے
 ہوئے عالی حسن تنگی سے مسکرایا۔



ایشیئرنگ یہ دھرمے خوب صورت، نازک نسوانی
 ہاتھوں نے گاڑی کو اچھالنے راستے یہ ڈال دیا۔
 ”اے بوا! یہ اچھے بھلے منزل کو جاتے راستے کو
 چھوڑ کر آپ کس راہ چل دیں؟“ عالی نے گفتگی سے
 ابرش سے پوچھا۔
 ”وہ نہیں! منزل کی طرف جانے والا راستہ نہیں،
 بلکہ یہ ہے۔“ ابرش نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے
 جواب دیا۔

”دیکھو! مجھے سیدھا سیدھا گھر ڈراپ کرو۔ میرے
 بھائی و سٹ کر رہے ہوں گے؟“ عالی کے لہجے میں
 فکر مندی تھی۔ ابرش ہنسی چلی گئی۔

”تو یہ ہے عالی! اسکول کو تنگ بچے کی طرح پریشان
 ہو رہے ہو جیسے گھر وقت پر نہ پہنچنے پر تمہیں سزا ملے
 گی۔ تمہارا اسکول جانا بند ہو جائے گا۔ شاید پاکٹ منی
 بھی بند ہو جائے۔ ویری لٹی! ابرش مسلسل ہنس چلی
 جا رہی تھی۔

”شاپ اٹ ابرا! تمہیں بتا تو ہے بھائی میرے زیادہ
 دیر باہر رہنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔“ وہ اس کے مذاق
 اڑانے سے ذرا اٹھا ہو کر بولا۔

”پھر بھی یار! تمہارے بھائی کو سمجھنا چاہیے کہ تم
 کوئی ننھے ننھے بچے نہیں ہو! ایم پی اے کے اسٹوڈنٹ ہو،
 تمہاری بھی سوشل لائف ہے۔ فرینڈز ہیں۔ جن کو ٹائم
 دینا پڑتا ہے، کچھ چاہنے والے ہیں۔“ بولتے بولتے آخر
 میں ابرش کا لہجہ دھیمہ اور گہرا ہو گیا۔

گاڑی ایک بے حد شان دار گھر کے سامنے جا رہی۔
 سفید ماربل سے تعمیر شدہ۔ مکمل پھولوں اور سبزے
 سے ڈھکا ہوا۔

”یہ کس کا گھر ہے؟“ عالی کی حیرت فطری تھی۔
 ”ہمارا اور کس کا؟“ ابرش گاڑی کی چابی ہوا میں
 اچھالتے ہوئے مسکرا کر بولا۔
 ”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ عالی نے نا سنجی
 سے بھنوس سکڑ کر پوچھا۔

”سپیل شادی کے بعد، ہم دونوں یہاں رہیں گے
 ڈیڑھ مجھے شادی کا گفٹ دے رہے ہیں۔“ ابرش بڑا سا
 منقش بھاری لکڑی کا دو اونڈہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
 اس کے ایک ایک عضو سے ترنگ چمک رہی تھی۔
 جینز کے اوپر سرخ ٹاپ پہنے، ہانگی ہیل کے ساتھ وہ
 اٹھکوں سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ عالی کے ساتھ پر ایل
 پڑ گئے۔

”واٹ رہش! میرا آل ریڈی ایک گھر ہے۔ تمہیں
 میری دلہن بن کر اسی گھر میں آنا ہے۔“ وہ ناگواری
 سے ایک ایک لفظ جتا کر بولا۔
 ”اے وہ نوع علی! وہ گھر؟“ ابرش نے ناپسندیدگی سے ناگ
 سکڑ کر کہا۔

”ہاں! کیا وہ گھر! وہ گھر میرے ابا کی حلال کی کمالی کہنا
 ہوا ہے۔ اسی گھر میں مراد بھائی اور میں نے آنکھے
 تاحیات رہنا ہے۔ انڈرا سٹینڈ!“ وہ خلاف فطرت
 نسبتاً بلند آواز میں غصے سے بولا۔

ٹھیک ہے اس ملک کے بہت بڑے انڈسٹریلسٹ

چاہے۔
 "انکو نموں! ڈنر نہیں تو چائے تو لازمی لی کر چلتے
 ہیں۔ کرم دلو بس لانے والا ہی ہو گا۔" امیرس مطمئن
 سی کر سی پریشہ گئی۔ اسی وقت عالی کے موبائل پہ کل
 آئی۔

"امیر! مراد بھائی کی کل ہے۔ آئی تھنک گھر واپسی
 کا کہتے ہوں گے۔" عالی نے کہتے ہوئے سیل آن کر
 کے کانوں سے لگایا۔

"جی بھائی! بس ذرا ایک دوست کے ساتھ کام تھا۔
 ابھی کچھ رہا ہوں۔" بات کرتے ہوئے وہ امیرس کو چٹنے
 کا اشارہ کر کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔
 "یہ مراد حسن، کباب میں بڑی، کبھی مجھے خوش
 نہیں ہونے دے گا۔" امیرس غصے سے مٹھیاں جھنجھ کر
 بادل خواستہ پیچھے چل دی۔



"راہیں ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ راپاں کنڈھا بھی خاصا
 متاثر ہوا ہے۔ باقی سر ہاتھوں اور کمر پہ تھوڑی بہت
 انجریز ہیں۔" ڈاکٹر نے مشائیم کی ابتدائی رپورٹ خالد کو
 پڑھ کر سنائی۔ ان کا دل بے تحاشا دکھ سے بھر گیا۔
 "میری پیاری بہن! کیسے حج و حج کے دست کی
 شادی پر جارہی تھی اور اب عضو عضو درد میں مبتلا
 ہے۔" وہ آدھ سے بچوں میں جکڑی مشائیم پہ جھک
 مٹنے لگا۔ مسکن ادویات کے زیر اثر سوئی ہوئی تھی۔
 ٹانگ پہ پلستر چڑھا ہوا تھا۔ عضو کی ڈریسنگ بھی اسی
 اسپتال میں کی گئی۔

"ہائے میرا لال! کیسے خون خراہ ہے۔ اچھا بھلا
 بیٹے کی سانگہ کا دعوت بندہ دینے کو بھیجا تھا کیا جی
 میں آئی کہ مشائیم کو لے کر چل رہا۔ مشائیم خود بھی تو
 خالد کے ساتھ جا سکتی تھی۔ رنگشا، کیسی کر لیتی۔
 میرے نازوں لپے بیٹے کا یوں حال نہ ہوتا۔" مای
 راشدہ کا با آواز بلند رونا ہوتا جا رہا تھا۔
 "پلیز مای! خدا کا شکر لو! کریں کہ کوئی جانی نقصان

سجاد پاشوئی کی اکلوتی بیٹی امیرس سچولہ سے بہت اچھی
 لگتی تھی۔ نکاس میں اس کی ٹیپ پوزیشن سے وہ بری
 طرح متاثر ہو چکا تھا۔ امیرس کی ذہانت، اس کا اعتماد اور
 مضبوط کردار سب ہی تو اسے بھائے تھے، مگر اس کا یہ
 مطلب نہیں تھا کہ وہ امیرس کو اپنے گھر والی حیثیت کا
 مذاق اڑانے کا حق دے۔ اس کے لبا امیرس کے لیے ایک
 ایماندار، فرض شناس معلم تھے۔ نایات تدریسی
 فرائض انتہائی لگن اور دیانت داری سے انجام دیتے
 تھے۔ اس کی کمائی سے ان دونوں بھائیوں کی پرورش کی۔
 خود داری اور خود اعتمادی تو اس کی کھٹی میں پڑی ہوئی
 تھی۔ اس لیے تو امیرس کی اپنے گھر پہ ناگواری کا اظہار
 اسے چاہک کی طرح محسوس ہوا تھا۔

"توہ تم آن برس! یہ بیڈ روم دکھو۔ اس کا انتہا
 میں نے خود پسند کیا ہے۔" وہ ناز و رشک سے تازمین
 تھی۔ محبوب کی ذرا سی برہمی اس کے لطیف و نازک
 جذبات پر گراں گزرنے لگی تھی۔ اس کا موڈ بھلا
 کرنے کی خاطر موضوع تبدیل کر دی۔

"ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ کھسا کر عالی نے طویل و
 عریض بیڈ روم کا جائزہ لیا، ہر چیز سے لگاتار ٹپک رہی
 تھی۔"

"اور ہر اگونی میں بیٹھ کر ہم چائے پیئیں گے۔"
 امیرس اس کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنے لگی۔ اس نے
 آہستگی سے اپنا ہاتھ نازک گرفت سے چھڑایا۔ امیرس
 بے حد کھلے ماحول کی۔ پورہ تھی۔ باپ و بیچ
 کا دیوار کی سلطنت کا مالک تو ماں ہی تھی۔ پارکر کی چیمین کی
 چیمبر سن۔ مگر اس کی تربیت خالص مذہبی و روایتی ماحول
 میں ہوئی تھی۔ اہل لہا دونوں مرحومین صوم و صلوة کے
 پابند ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کی جی جان
 سے پاسداری کرنے والے تھے۔ ایسے میں اتنے بڑے
 گھر میں یوں امیرس کا اسے تھا کرے میں لے آنا اس
 کی سبکی اور متین طبیعت پہ گراں گزر رہا تھا۔ سوزی
 سے امیرس سے مخاطب ہوا۔

"آئی تھنک کلنی وقت گزر چکا ہے۔ اب چلنا

نہیں ہوا۔ چوتھیں ہیں۔ وقت کے ساتھ بھر جائیں گی۔" خالد نے بے ساختہ انہیں ٹوک دیا۔ مگر ان پہ خاک اثر نہ پڑا۔

"ہائے میرا بیٹا! مجھے پتا ہوتا تو تم لوگوں کی طرف نہ بھیجتی۔ فون پہ دعوت دے دیتے۔ زیادہ سے زیادہ تم لوگ ناراض ہو جائے، لکنکٹس میں نہ آتے، مگر میرا عمو یوں خون میں لت پت نہ پڑا ہوتا۔" غم سے بڑھ چلا ہو کر وہ صوفے پر گر گئیں۔

"مامی! یہ حادثہ قسمت میں لکھا تھا۔ اگر مشائم اس سے ڈر اپ کرنے کا نہ کہتی تو کہیں اور جاتے ہوئے عمو جانے کا شکار ہو سکتا تھا۔ بیسیوں بار وہ اسے اپنی گاڑی میں لاتا لے جاتا ہے۔ بس اس بار نصیب میں یہ ایک سیلنٹ لکھا تھا۔" خالد کو مایہ راشدہ کی باتوں پہ حد درجہ افسوس ہو رہا تھا۔

"نرالہ ڈرائیور اور یعنی شاپڈین کے مطابق غلطی عمو کی اپنی تھی۔ نرالہ اپنے سچ روٹ پر چل رہا تھا۔ عمو کی گاڑی اسے روٹ سے ہٹ کر نرالہ سے ٹکر لگئی تھی۔" لب کے خالد نے انہیں مختلف حقائق سے آگاہ کیا۔

"کیوں اس کرتے ہیں سب۔ آنکھیں پھوٹیں سب کی۔ میرا بیٹا کوئی انارٹی ڈرائیور تھا۔ انیسویں سیل سے گاڑی چلا رہا ہے۔ اسے کوئی مرے کا شوق تھا۔" وہ سخت جھلبلا کر بولیں۔

"عمو کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر مشائم کو ڈر اپ کرنے گیا۔ سامی نے تنگ کر کہا۔" پلیز! آپ لوگ شور نہ کریں۔ مریض ڈسٹریس ہو رہے ہیں۔ ایک نرس نے انہیں آکر ٹوکا۔

"خون میں لت پت تو میری بسن پڑی ہے۔ اپنا بیٹا تو ٹھیک ٹھاک ڈرائنگ کروا کر گھر بھی چلا گیا۔ چوتھیں کتنی تمہیں 'صرف بازو پہ رگڑ اور گردن پہ خراشیں۔' خالد یہ سب کچھ سوچتی ہی سکے، مایہ راشدہ سے کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ مبادا انہیں اور زیادہ شور نہ ڈال دیں۔



شہنا کے لیے تو خواری ہی خواری تھی۔ گھر کے نہ

ختم ہونے والے کام اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ۔ وہ تو صحیح معنوں میں چکر اکر رہ گئی تھی۔ کتنے سالوں سے مشائم سارے گھر کے کام خوش اسلوبی سے نمٹاتی چلی آ رہی تھی۔ بے حد مبالغہ داری اور دل لگا کے کھانا پکانا، صفائی و دھلائی، کتنے ہی کام پھرتی سے کویتی تھی۔ شہنا کو تو اپنے چار بچے ہی کافی تھے۔ ناک میں دم کر دینے کی حد تک شریر۔ خالد کی موجودگی میں تو خاموش رہتی۔ مگر اس کے آفس جاتے ہی آپے سے باہر ہو جاتی۔

"گلازی جانا تھا دست کی شادی پر، کتنا روکا کمر نہ۔ محترمہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر چل دیں، وہ بھی کس کے ساتھ جو اپنی رگش ڈرائیونگ میں خاندان بھر میں مشہور ہے۔ اب اچھا ہے، بڑی پوسی ترنوا کے چنگ توڑ رہی ہیں۔" بھابھی کے با تو از بلند بلے کئے بھرے بخوبی اس تک پہنچتے رہتے۔ وہ کرب سے آنکھیں موندے لٹھی رہتی۔ جتنی جگہ ہٹ کے مارے شہنا بچوں کو بھی دھنگ ڈالتی۔ وہ بھاگ کے پھوپھو کے کمرے میں پناہ لیتے۔ اپنی بے حد بھاری پھوپھو کا یوں بستر سے لگے رہتا انہیں بے حد دکھی کرتا تھا۔ عمو بھی تقریباً روز آتا۔

"یار! اقصوہ تمہارا تھا۔ نہ تم ایسی آفت لگتیں نہ میں بے خود ہوتا۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے گرم و مضبوط ہاتھوں میں لے کر شرارت سے کہتا۔

"اچھا جی! میں نے کہا تھا کہ اپنے ہوش و حواس کھودیں۔ کتنی بار تو کہیں نرخیل رہنے کے لیے ٹوکا تھا۔" وہ اس الزام پہ آنکھیں نکال کر اسے گھورتی۔

عمو جب بھی آتا اس کے لیے جاگلیٹ، پھل، ڈرنگس اور ڈھیول چھڑیں لے آتا۔ "کیا تھا جو یہ چوتھیں مجھے لگ جاتیں۔ سارے زخم تم نے ہی اٹھائے۔" عمو اس کے زرد چہرے پہ محبت بھری نظر ڈال کے بولا تو وہ بے ساختہ تڑپ اٹھی۔

"خدا خواستہ۔ میری تو دعا ہے کہ تم پر آئی ہر مصیبت میں اپنی جان پہ لے لوں۔" مشائم ہیکے لیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میں بولی تو عموماً بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں لفظوں کی چٹائی رہی تھی۔



ایرش دعویٰ میں پوتھ فینٹیل اینڈ کرنے لگی ہوئی تھی۔ واپسی پہ عالی کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے گئی۔ جس قیمت ڈھیر سزا گزری پہلوم نہ جانے کیا کیا ساری چیزیں دعویٰ کے منگے ترین ماٹے سے خریدی گئی تھیں۔

”بتا بے اپنا آئیں؟“ وہ عالی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”جب میں انہیں لے ہی نہیں رہا تو پسند، پسند کا کیا سوال۔“ عالی بے حد عجیبہ تھا۔

”واٹ ڈیو میں؟“ ہر شے نے آنکھیں نکالیں۔

”یہ میں تمہارے لیے لانا ہوں۔ اور تم نے انہیں خوشی سے وصول کر کے مجھے تھینکس بھی کہتا ہے اور میرے ٹیٹ کی تعریف بھی کرتا ہے۔“ اب کے وہ دھولے بھرے انداز میں بولی۔

”تمہارا ادنیٰ بھی قتل تعریف ہے اور بہت بہت شکر ہے لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو زیادہ براہیڈ اور ہتھی اشیا پسند مجھے پسند نہیں۔“ عالی کا انداز ہنوز تھا۔ ایرش دل گرفتگی سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے تم سارے مہر اور روڈ بندہ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ پتا نہیں ایسی کون سی بات تھی کہ میں تمہیں اپنا دل دے چکی تھی، تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا کسی کے جذبات کو کیسے مجروح کرنا ہے، تم بخوبی جانتے ہو۔ پورے ہی ہرٹ می عالی!“ ایرش کی آواز میں تکی کھلی ہوئی تھی۔

وہ بے ساختہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ اسے رُلانا کب چاہتا تھا۔

”پلیز ایرش اپنی مت بنو، فرینڈز میں تمہا ف کا چلوا ہوتا ہے لیکن تم مجھے اچھا نہیں لگتا سب کچھ لیتا۔“ وہ انگلی کی پور سے اس کی آنکھوں کی نمی سمیٹتے ہوئے محبت اور نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

وہ بے ساختہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ اسے رُلانا کب چاہتا تھا۔

وہ بے ساختہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ اسے رُلانا کب چاہتا تھا۔

”تم بھی نہیں خواہ، خواہ اور سینسٹیو ہو جاتے ہو۔“ وہ بچوں کے سے انداز میں منہ بسور کر بولی تو عالی بے ساختہ مسکرا دیا۔

”ٹیکسٹ ویک میری برتھ ڈے آرہی ہے۔ تم بھی مجھے گفٹ دے نا، چھاسا۔“

”ہاں ضرور۔ مگر میں برتھ ڈے پارٹی میں نہیں آؤں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ ایک دم روہا سی ہو کر بولی۔

”میری برتھ ڈے ہے۔ تم نہیں آؤ گے تو میں سہیل پورٹ نہیں کروں گی۔“

”جو بھی کرو میں نہیں آسکتا۔“ وہ بے سوتلی سے بولا۔

”سوئیڈن، اشرافیہ کے مجمع میں مجھے جیب سی بے چینی ہونے لگتی ہے۔ ان کی ہٹائی باتیں، غورو کبیر سے آڑی گردنیں، ملک کا دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے سخت زہر لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔“

صاف گوئی سے ایرش نے اپنی پسندیدگی جتا کر بولی۔

”ہاں تو میں کوئی گیٹ نو گیدو نہیں کرنے والی۔ سیدھے سیدھے ریسٹورنٹ میں ایک ٹیبل ریزرو کرواؤں گی۔ پھر کینٹل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے ٹیکے کھاؤں گی۔“ وہ مزے سے پروگرام سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

”کوئی نہیں ہوگا۔ صرف میں، تم اور آنے والی زندگی کی ڈھیر ساری باتیں۔ یقیناً تمہارا گفٹ رنگ ہوگا جو تم مجھے بڑی چاؤ سے پیار سے پستاؤ گے۔“

ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چھوڑتے ہوئے ایرش عالی کو خوابناک لگا ہوں سے کہتے ہوئے حضور لہجے میں بولی۔

”گف! یہ روٹن پسند لڑکی۔“ عالی بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔



”ارے ماں کی! کیسی ہیں آپ؟“ ماں راشدہ ہنڈر داخل ہوئیں تو مشام انہیں دیکھ کر احتراما ”اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی کہ کندھے میں ایسا درد اٹھا کہ وہ گراہ کر دوبارہ لیٹ گئی۔ عمو بھی ان کے ہمراہ

”پلیز ایرش اپنی مت بنو، فرینڈز میں تمہا ف کا چلوا ہوتا ہے لیکن تم مجھے اچھا نہیں لگتا سب کچھ لیتا۔“ وہ انگلی کی پور سے اس کی آنکھوں کی نمی سمیٹتے ہوئے محبت اور نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

باجی کی نسبت سے ہمیں عزت دینا چاہئیں لگا ہوگا۔ "حصوں کے شانے دیا کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

"مشائتم لبا کی بھانجی ہے ساری خدمت اور خاطر داری آپ کو اس سے مطلوب ہونی چاہیے، مہینا بھابھی تو غیر خاندان کی ہیں۔ ان کا کیا کلمہ کرنا۔ مشائتم تو ساری زندگی آپ کی خدمت کرتی رہی آری ہے بس آپ کی توقعات اس سے وابستہ ہونی چاہئیں۔" حصو مخاطب تو میں سے تھا مگر وہ کلمہ مشائتم کو رہا تھا جس کی آنکھیں من اور قد روانی کے احساس سے جھللا رہی تھیں۔

"ہونہ مشائتم سے خدمت کی امید رکھوں جو خود پانی تک کے لیے وہ سروں کی محتاج ہے۔" راشدہ مای کے رخ انداز نے تو مشائتم کی روح تک کھینچ لی تھی۔



وہ آج مکمل عالی کی پسند کے مطابق تیار ہوئی تھی۔ گھیر وار ڈیزائنڈ فرائٹ چوڑی دار پاچامہ، بالوں کا لونچا جوڑا بیلیا تھا۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس۔ "آج تو محترم سے تعریف اگلا کر رہوں گی۔ نظرو انداز میں دھیر ساری ستائش مگر منہ سے ایک لفظ نہیں پھوٹا۔" وہ خوب دھیر سارا پر لیوم اسپرے کرتے ہوئے دل میں بولی۔

عالی کو اس کی ڈرنگ پر اعتراض ہوتا تھا۔ اس لیے تو آج اس خاص موقع کی مناسبت سے عین عالی کی پسند کے مطابق تیار ہوئی تھی۔ ایش جینی بونڈ جذبات کا بھرپور اظہار کرنے والی لڑکی تھی، عالی اتنا ہی محتاط طبیعت کا حامل تھا۔ وہ شوخ تھی، چیخ تھی، روٹس کوٹ کوٹ کر اس کی فطرت میں بھرا ہوا تھا اور عالی اتنا ہی نے تھے انداز میں گفتگو کرنے والا۔ ایش کبھی کبھی تو اس کے لیے دے والے انداز پر سخت جھنجھلا جاتی تھی۔ اپنے جذباتوں کی

تھامے تلی سے آگے بڑھا۔ "پلیز تم کبھی رو۔ اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ہاں راشدہ نے ایک کڑی نگاہ حصو پر ڈالی تھی۔ "میں بھی مشائتم کیسی ہو؟" اچھی بھلی چلتی پھرتی ہوتا نہیں کیسے معذور ہو کر پڑی ہو۔ لڑکی ذات کے چرے پہ ذرا سا ایک دلغ بڑ جائے تو وہ بھی فکر مندی کی بات ہوتی ہے اور تم تو لالچ ہو کر رہ گئی ہو۔ سچ پوچھو تو میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔" راشدہ نہایت دل سوزی سے بولیں۔ مشائتم کے چرے کا رنگ ایک دم پھیپکا پڑا تھا۔

"ہاں! اللہ اب میں پہلے سے کافی بہتر ہوں۔ باقی سب زخم تو ٹھیک ہیں بس یہ ٹانگ۔" مشائتم کا لہجہ تجلنے کیلئے بھرا گیا تھا۔

"ہاں وہی تو۔ ٹانگ کی ہی تو بات کر رہی ہوں۔ انسان کے جسم کا ایک حصو ہمارا ہو تو سارا جسم بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ معذور نہ تو خود ہر کسی کا محتاج ہوتا ہے بھلا کہ اس سے کسی کا مہیا کسی خدمت گزار کی توقع رکھی جائے۔" مشائتم کے جسم سے درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ حصو بغور اس کے چرے پر اذیت کی زردی دیکھ رہا تھا۔

"جھا ای! لوٹ کریں، مشائتم کے بیڈ ریسٹ لینے چھینا بھابھی کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔" وہ نیم مزاجیہ انداز میں میں سے مخاطب ہوا۔ مقصد میں کی باتوں کا اثر مشائتم پر سے زائل کرنا تھا۔

"ہاں اس مہارانی کے طور طریقے تو دیکھو۔ سلام کرنے کے بعد شکل تک نہیں دکھائی۔ نہ خاطر نہ تواضع۔ سالوں کا بغض سینے میں دیائے پھرتی ہے اب میں سانس کی جگہ برہوں۔ مگر نہ جی اگولی اوب لحاظ نہیں۔" وہ اپنے مخصوص کڑے لہجے میں بولیں۔

"اور خائف بھلا اس نے کبھی بزرگوں والا احترام دیا ہے جو اس کی بیوی میری تعظیم کرے۔ کب سے آئے بیٹھے ہیں۔ مہارانی نے پانی تک کا نہیں پوچھا۔ ایسے گھر آنے کا فائدہ جمل خاک عزت ہو رہی ہو۔"

"ہی! آپ شہنا بھابھی کو چھوڑیں، انہیں زاریہ

خاطر خول دیا نہ ہونے پر وہ بری طرح سچا ہوتی۔
حالات کی سنجیدہ و متین طبیعت نے ہی اسے اس
کی طرف مائل کیا تھا۔ اس کے ٹھہرے ہوئے بولنے
کے انداز نے ہی کھائل کیا تھا۔ پھر بھی بل شدت سے
اس کے والہانہ انداز کا تمنائی رہتا۔ اس کی طرف سے
دارفتوں کا شکر!

رینورٹ میں آئے ہوئے اسے کافی دیر ہو چکی
تھی مگر علی کا ابھی تک کوئی تانا نہ تھا۔ وہ بے مانی سے
داخلی راہداری کو دیکھ رہی تھی مگر تاحل اس کی آمد
نہیں ہوئی تھی۔ وہ پتھر اس سے ایک لور ویکر لوانت
سو کرنے کی اجازت طلب کر رہا تھا مگر اس نے انکار
کر دیا۔

”ابھی نہیں میرے فریڈ نے آنا ہے۔“ جوں جوں
وقت گزر رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی
تھی بارہا فون کیے جواب نہ آ رہا!
اتنے میں عالی کی کال آئی تھی۔

”عالی کس رو گئے ہو۔ تمہیں پتا ہے میں کب سے
تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔“ تواز سنتے ہی وہ جھگی سے
بولنے لگی۔

”سو رہی ابرش! آج میرا آنا ممکن نہیں۔“ عالی کا
انداز شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

”واٹ! کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے آنا ہے بس۔“ وہ
اتنے زور سے چبھی کہ ساتھ بیٹھے افراد گروں موڑ کر
اسے دیکھنے لگے تھے۔

”سر لو بھائی کی طبیعت خراب ہے۔ ایک ڈبلی
سگیشن سے انہیں ملنا تھا وہ تو نہیں جا سکتے سو مجھے
ہی انہیں اینڈ کرنا پڑے گا۔“ عالی دم لہجے میں بتا رہا
تھا۔

”سر لو حسن! آئی دل کل یو۔“ ابرش نے زور سے
سوال تل پھیل پھا تھا۔

”عمیرہ تمہیں معلوم ہے آج میں کچن میں تھی
ہوں ناہم کی فیورٹ اسپینیکس بنائی ہے۔“ کل پہ

مشائیم نے عمیرہ کو خوشی سے لڑائی آواز میں بتایا۔
”وہی گڈ! اسی طرح مضبوط قوت ارادی سے تم
اپنی زندگی پھر سے پہلے جیسی جاری رکھ سکتی ہو؟“
عمیرہ نے ہمیشگی طرح اس کے حوصلوں کو سراہا تھا۔
”نہ صرف کچن میں بلکہ پورے گھر کا چکر لگایا
پودوں کی کوڑی کی اپنے کمرے کی صفائی کی۔“

”مگر تمہاری ٹانگ؟“ عمیرہ کتے کتے رک گیا۔
”ہاں اب درد نہیں ہوتا ٹانگ میں پہلے ہوتا تھا“
میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرتی رہتی ہوں نا۔“ وہ
مخصوصیت سے بولی۔

”پھر بھی مشائیم! تمہیں جلنے میں تھوڑی بہت وقت
تو ہوتی ہوگی؟“ عمیرہ نجانے کیا پوچھتا چاہ رہا تھا وہ
خاموش رہ گئی۔

”ماہی پھر ہمارے گھر نہیں آئیں۔ انہیں کب لاؤ
گے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

”اسی بہت بڑی رہتی ہیں۔ تم جانتی تو ہو سیدہ
بھابھی بھائی کو لے کر آگے ہو گئی ہیں۔ ایک گھر میں دو دو
کچن وہی انڈی ساس بہو کی چھٹاں اس لیے نام نہیں
تکلی پاتیں۔“

”میں شاء اللہ ماہی کو مجھ سے ایسی کوئی شکایت نہیں
ہوگی۔ بہت مثالی تعلقات ہوں گے ہم دونوں کے۔ تم
دیکھنا؟“ مشائیم کے لہجے میں مان اور یقین بول رہے
تھے۔

مثال کو بہت چیز بخار تھا۔ وہ اسے ایک منٹ کے لیے
چھوڑے نہیں رہی تھی۔ مسلسل گڑ میں بیٹھی روئے
چلی جا رہی تھی۔ آس جانا بھی لازم تھا۔

شوہنی قسمت! اسی دنوں کیاجی کے عزیزوں میں
کوئی فونکئی ہو گئی وہ تو وہاں چلی گئیں۔ سلجوق کا ناشتا
بچ اسکول بیگ تیار کرنے میں وہ صبح صحنوں میں بو کھلا
کر رہ گیا تھا۔ سلجوق شام کو پارک چلنے کا کہتا تو دل اس کا
ہم لوارا ہو جاتا مگر مثال کو یوں اکیلا گھر میں چھوڑ کر جانا
بھی ممکن نہیں تھا۔ سول سوس کر رہ گیا۔



”زیادہ طفر کرنے کی ضرورت نہیں گولی چھوٹا موٹا کاروبار نہیں ہمارا۔ خود تو سارا دن ریٹ کرتی رہتی ہو اور میری مصروفیات پہ شک کیا جا رہا ہے“ عمیرہ خامے روکے لہجے میں بولا۔

”میں کہاں ریٹ کر رہی ہوں۔ گھر کے سارے کام کرتی ہوں پہلے کی طرح۔ تم وہ ہنسی سے آئے جو نہیں ہو۔ ورنہ مجھے دیکھتے۔“ وہ روپاسی ہو کر بولی۔ عمیرہ کے روکے لہجے نے اس کی آنکھوں کو نم ٹانگ کر دیا تھا۔

”گور تم مجھے باہر بھی نہیں لے کر گئے۔ کب سے میں نے باہر ہی دنیا نہیں دیکھی۔ نہ شاپنگ نہ ہوٹلنگ۔ واک کرنے بھی نہیں گئی۔ پلینزم آؤ میں مجھے باہر لے جاؤ۔“ سنبھل کر اس نے بات کا رخ بدلنے کو کہا۔

مشائم! میں تمہیں ایک بار واک یہ لے گیا تھا۔ میں دو منٹ میں دس قدم چلتا ہوں اور تم دس منٹوں میں دو قدم خود سوچو میں اور تم ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ میں ٹھہرا تیز رفتار۔ اور تم چلنے میں کئی وقت لیتی ہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ مشائم! عمیرہ کا لہجہ تو بے حد نرم تھا مگر لفاظی۔ مشائم کتنی دیر خلی اللہ ہی سے موبائل کو پیشی گھورتی رہی۔



”مائی جی! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“ خالد بے حد سنجیدہ اور رنجیدہ تھے۔
 ”کون سی زیادتی میاں! اپنے بیٹے کو کیا رہی ہوں؟ یہ زیادتی ہے؟ اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہوں تو کیا گناہ ہے؟ مائی راشدہ حیرت سے بولیں۔
 ”گور میری بسن! اس کا کیا مستقبل ہو گا۔ ہم کیا جواز دیں گے دنیا کو آپ کے اس فیصلے کا؟“ خالد نے کڑے ضبط سے پوچھا ورنہ دل تو سارے لوہ لوہ کو اب بلائے طاق رکھتے گوجا رہا تھا۔
 ”ارے بچے! دنیا جانتی ہے کہ مشائم ٹھک سے چل نہیں پاتی۔ خدا نخواستہ میرے بیٹے میں کوئی عیب

مشائم کے گھر کے کاموں میں ہاتھ لگتے ہی شینا کی جان میں جان آگئی تھی۔ روپیہ بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ اب خود بھی مشائم کے ساتھ لگی رہتی تھی۔
 ”مجھے ناہید بھابھی نے بتایا ہے کہ مائی راشدہ کا ارادہ مارچ میں عمیرہ کی شادی کرنے کا ہے؟“ منڑ چھپتے ہوئے شینا مشائم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس وقت مشائم لچ کی تیاری میں لگی ہوئی تھی شینا بھی اس کی مدد کے ارادے سے چکن میں آئی۔ بھابھی کی بات سن کر مشائم کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ آنکھیں کسی احساس سے چمک اٹھی تھیں۔

”چچا! عمیرہ نے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔“ مسکاتے لیوں سے جواب دیا۔

”ویسے عمیرہ نے کئی دنوں سے پکر نہیں لگایا مٹھن تو آتا ہو گا اس کل“ شینا نے چھلکے سمیٹ کر سٹین میں ڈال دیے۔ مشائم کے چاول بھگوتے ہاتھ شینا کی بات سن کر کھمکے تھے۔

”جی کل تک تھی کہ رہا تھا کچھ بزنس کی پراہموز ہیں۔“ اس نے پلو سے ہاتھ پوچھتے ہوئے جواب دیا۔
 ”پورے دو ہفتے ہو گئے ہیں عمیرہ نے چکر ٹنگ نہیں لگایا“ اس نے دل ہی دل میں دنوں کا حساب لگایا۔

سوچتے۔ ایک اور بات ذہن میں اٹک گئی۔
 ”پتلو آنا نہ سنی کل بھی اب کم کرتا ہے؟“ دل میں اور ہم جاتے حنفی خیالات کو پرے کرتے ہوئے اس نے خود گل ملالی۔

”مبولو عمیرہ! کہاں ہو! اتنے دن سے کوئی کل نہ مہینج۔“ وہ شکوہ کنیں انداز میں گویا ہوئی۔
 ”بتایا تھا میں بڑی بھائی بزنس کو پھیلا رہے ہیں سو فراغت نہیں ملتی۔“ عمیرہ ہموار انداز میں بولا۔

”دل اور مہینج کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ ایسی کون سی بزنس ایسا چلا رہے ہو۔“ لٹ کا لون کے پیچھے اڑتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بھابھی! آپ غلط کہہ رہی ہیں، مای ایسا نہیں کہہ سکتیں۔ وہ جانتی ہیں عصمو اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“ وہ بے یقینی سے شہنا کو تھلا رہی تھی۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے جسوٹ بولنے کی۔ مارچ میں عصمو کی صومیہ سے شادی طے ہے۔ یہ دیکھو کارڈ۔“ شہنا نے سائیز نیبل سے کارڈ اٹھا کر اسے تھمایا، وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے عصمو کے ساتھ صومیہ کا نام دیکھے گئی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً“ آپ نے مای سے مس بی ہو کیا ہو گا تب ہی انہوں نے اتنا غلامانہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ چاہتی ہی نہیں کہ میری عصمو سے شادی ہو۔ آپ ان کی روک ٹوک نہیں کرتی تھیں، اس لیے۔“ وہ ایک دم سے چیخنے لگی تھی۔ ناخن سے ندر زور سے کھج کر صومیہ کا نام کارڈ سے مٹا ڈالا۔

”کچھ بھی کر لو۔ صومیہ عصمو کا نصیب ہے۔ تم اس کے نصیب میں نہیں ہو۔“ شہنا زور سے کہی۔

”یہ مای نے عصمو کو بٹکایا ہو گا۔ ورنہ عصمو تو میرے علاوہ کسی اور کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ محض ٹانگ کو جواز بنا کر کیسے راستہ بدل سکتا ہے۔ اسے تو میرے دل سے غرض تھی۔ میں بات کرتی ہوں عصمو سے۔“

”کچھ بھی کر لو۔ یہ عصمو کا اپنا فیصلہ ہے۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا۔“ شہنا اسے پاگلوں کی طرح نمبر ملاتے دیکھ کر تڑپ سے بولی تھی۔

عصمو نے راستہ ہی نہیں اپنا نمبر بھی بدل لیا تھا۔



غم بھی جزو زندگی ہے لیکن
زندگی اشک اور آہ نہیں
مشائم لاؤنج کی صفائی کر رہی تھی۔ شہنا صوفے پہ
اسٹی پائٹی مارے بیٹھی اپنا پسندیدہ مارننگ شو دیکھ رہی
تھی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جس پر وہ پروگرام
میں لائو کھل لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

نہیں جو اسے مشائم سے بیاہ دوں۔ اور دوسری پلٹ
مجھے ایسی ہو چاہیے جو میرے گھر کے سارے کام دوڑ
دوڑ کر انجام دے۔ بڑی بہور لنی تو خیر سے شوہر کو لے کر
الگ ہو چکی ہیں۔ اب میں گھنٹوں کی مریض کام نہیں
کر سکتی۔ میری بیٹی صومیہ خیر سے بڑی فٹیل اور سکھڑ
ہے۔“ کب کے انداز میں میری کھل گئی تھی۔

”مشائم بھی پورا گھر سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی
ہے۔ میرا پورا گھر وہ خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔“
شہنا جس نے کبھی مشائم کی خدمت اور کارگزاری کا
اعتراف نہیں کیا تھا اب مشائم کی حمایت میں کھل کر
بول رہی تھی۔ ”تمہی تلخ دار اور نیک طبیعت۔
پورے دس سال ہو گئے ہیں میری شادی کو۔ کبھی پلٹ
کر مجھے جواب نہیں دیا۔“

”مای جی! اگر اس ایک سیٹ میں عصمو کی ٹانگ
ٹوٹ جاتی تو کیا آپ اس طرح مشائم کے لیے انکار
کر سکتی تھیں؟“ خالد نے مجموعہ نظروں سے انہیں
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں انکار نہ کرتی بلکہ اس وقت تم انکاری
ہو جاتے اپنی۔ من کسی لنگڑے سے بیابنے میں؟“ ان کا
احتمو قائل دید تھا۔

”ناممکن۔ میری۔ من کبھی بھی عصمو کو نہ چھوڑتی۔
چاہے دونوں ٹانگوں سے بھی معذور ہو جانا، کیونکہ یہ
لہلہ اور ماموں کی طے کہہ نسبت تھی جسے آپ توڑ
رہی ہیں۔“

”ہل جانتی ہوں یہ مرحوم کا طے کہہ رشتہ ہے مگر
جب عصمو خود ہی راستہ بدلنا چاہ رہا ہے تو میں اس
کے راستے کی کیوں دیوار بنوں؟“ مای راشدہ اب کے
قدرے دھتے لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
ان کی بات سن کر شہنا اور خالد کی آنکھیں بھر آئی
تھیں۔



بے تمنا محبت کے امین
بے وجہ چھوڑ بھی تو جاتے ہیں

”پتا نہیں کیا پر اہم ہے نمبر مل کے نہیں دے
 ”چھا مشائم! خالد تار ہے تھے کل لٹچ پر کچھ لوگ
 آ رہے ہیں۔ لٹچ زبردست ہونا چاہیے۔“ شینا اچانک
 یاد آنے پر بولی۔
 ”کون لوگ لور آنے کا مقصد؟“ اس کی نظر میں
 استفسار تھا۔

انہیں بہت پسند آئی تھی۔ بے حد معصوم لور من
 موہنی صورت والی۔ سلوہ و پیکش۔ خالد اور شینا
 مشائم کے رویے پر بہت خوش تھے۔ کہاں تو وہ اندر
 آ کر لٹنے سے بھی انکاری ہو رہی تھی اور کہاں ان
 خواتین سے سلیقے سے بات چیت کر لی۔ مگر ان کی یہ
 خوشی مہمانوں کے جانے ہی کا فور ہو گئی۔

”خالد کے بہت اچھے فرزند ہیں اشفاق۔“ بولتے
 ہوئے شینا نے لانا اٹھا کر چھیننا شروع کر دیا۔
 ”اس کے ایک بھائی ہیں مطلب اشفاق کے بھائی
 اتفاق ان کے رشتے کے لیے یہ فیملی آرہی ہے۔ بہت
 اچھے کھانڈ اور سبھی ہوئی فیملی ہے۔ خالد بہت تعریف
 کر رہے تھے۔“ دو تین انہی کا شمس منہ میں رکھتے
 ہوئے شینا نے اس کا ہنر بغور دیکھا۔ جہاں پر سختی
 چھاننے لگی تھی۔

”چھایا یہ اتفاق صاحب میرے لیے آپ کو پسند
 آئے ہیں۔ لوجیز عمر لور دو بچوں کے والد محترم۔“ خالد
 کی نظروں میں بے خوفی سے دیکھتے ہوئے اس نے طنز
 سے پوچھا۔
 ”مشائم! اتفاق بس میری اہلیج کا ہے یا مجھ سے دو
 تین سال بڑا۔ کم عمری میں شادی ہو گئی۔ نصیب میں
 صاحب اولاد ہونا لکھا تھا۔ یوی سے نبھ نہ سکی۔ اب یہ
 ایسی باتیں تو نہیں ہیں کہ جن کو لے کر ہم بلاوجہ انکار
 کر دیں۔“ خالد اس کے قریب آ کے محبت سے
 کندھوں پر ہاتھ رکھ کر قائل کرنے والے انداز میں
 بولے۔

”بھائی کو منع کر دیں۔ ان لوگوں کے آنے کی کوئی
 ضرورت نہیں۔“ وہ قطعیت سے کہہ کر رخ موڑ
 گئی۔ آنسو بھر بھر آنکھوں میں چلے آ رہے تھے۔ کچھ
 بھی صاف نظر نہیں رہا تھا۔ سب کچھ دھندلا ہو چکا تھا۔
 ”خواہ مخواہ ایویں منع کر دیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہے۔
 زندگی بس دکھی یادوں کو سینے سے لگائے رکھنے کا نام
 نہیں ہے۔ عہد کے جذبوں میں کھوٹ تھا۔ تنہا
 خاموش نہ تھا۔ بڑھل تھا اس لیے بیچ راستے میں چھوڑ
 گیا۔ اس نے تو اپنی دنیا بسلی اگلے ماہ اس کا بے بی
 آجائے گا اور تم کب تک بیویوں کے چھالے ٹھیک
 ہونے کا انتظار کرتی رہو گی۔ اس نے تو بھاگ کر اپنی
 منزل کو پایا۔“ شینا حد درجہ صاف گوئی اور کھرے پن
 سے بولی۔ مشائم کے کمزور رخسار آنسوؤں سے تر
 ہونے لگے۔

”کیوں میں کوئی اندھی ہوں، بہری ہوں، پھوٹا
 بد کردار ہوں جو دو بچوں کے باپ کے ساتھ چلی
 جاؤں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے چلا کر بولی، آنکھیں
 آنسوؤں سے لہا لہا ہوئی تھیں، شینا اور خالد
 نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
 ”یہ مشائم کا تو انداز نہیں۔“
 ”آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو اس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ
 کھر تلاش کرتے لور میرے لیے برتا ہوا سو جس کے
 دل اور جذبوں پہ کسی عورت کا تصرف رہ چکا ہو۔ اتنی
 بھاری بڑھائی ہوں میں آپ پر۔“ وہ سونے پر بیٹھ کر
 نذر نذر سے ہانپتے ہوئے بول رہی تھی۔
 ”ہاں اگر ہماری بیٹی تمہاری عمر کی ہوتی تو ہم ضرور
 اسے دو بچوں کے باپ کے ساتھ رخصت کر دیتے“
 کیوں کہ فرض کو پورا کرنے کی بھی ایک عمر اور وقت
 ہوتا ہے۔ ہم وقت ضائع بالکل نہ کرتے۔“ خالد کے
 بجائے شینا اس سے مخاطب ہوئی۔ بالکل دو ٹوک

شینا نے اسے روئے دیا۔ اس وقت کسی قسم کا
 دلاسا غیر ضروری لگ رہا تھا۔ اچھا ہے رو رو کر عہد کی
 یادوں کو اپنے دل سے دھو ڈالے۔



اشفاق اینڈ فیملی واقعی بہت اچھی تھی مشائم بھی انداز میں۔

کھول لیا جبکہ مثل کی توجہ برآمدے میں رکھے
 آسٹریلیا طوطوں کی طرف تھی۔ اپنی چلبلی اور باتنی
 فطرت کی بدولت گھر بھر کا دل موہ چکی تھی۔
 ”مشائخ! انہیں بہت پیار اور توجہ سے پر دھایا کرو۔
 ان کی مدد کی لائق ہو چکی ہے“ خالد بھائی نے اسے
 بتایا تو اس کا دل بے تحاشا دکھ سے بھر گیا۔



آج وہ کتنے دنوں بعد پارک میں آئی تھی۔ اوائل
 مارچ کی ٹھنڈی ٹھنڈی شام میں قسم قسم کے پھول اپنے
 منہ بند کرنے لگے تھے وہ دھیرے دھیرے بیٹھ گئی کہ
 اچانک ایک سمت سے مثل دوڑتی ہوئی آئی اور سچا
 چڑھ کر اس کی گود میں بیٹھ گئی۔

”ارے مثل صاحب! آپ یہاں کہاں سے
 آئیں۔“ اس نے مثل کے برادریں دیکھ کر بالکل
 میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
 ”پاپا کے ساتھ آئی ہوں۔“ مثل نے تو سلی زبان
 میں بتایا۔

”پر قس! آپ یہاں کہاں بیٹھ گئیں؟“ علی حسن
 نے بے حد حیرانی سے اسے اس لڑکی کی گود میں بیٹھے
 دیکھ کر کتنے مزے سے وہ اس کی گود میں چڑھی بیٹھی
 تھی اور اس نے بھی تو مثل سے مسکرا کر بولنا شروع
 کر دیا تھا۔ وہ سگڑی اور مثل کو لے کر جو نئی پارک
 میں داخل ہوا تو مثل اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتے
 ہوئے اس کی گود میں جا بیٹھی تھی جیسے برسوں کی
 آسٹریلیا ہو اس سے۔ اسی کی گود میں جسے بلاشبہ دیکھنے
 کی خاطر وہ بچوں کو لے کر پارک میں چلا آتا تھا اور جسے
 میں اب بھی طرح طرح دیکھنے کے سوا اور کچھ اور
 کچھ نہ کہہ پایا تھا۔ نہ آگے بیٹھ کر اس کا ہیم پونچے کی
 بہت خود میں پیدا کہہ پایا تھا۔ اپنا تعارف صرف یہی
 سوچ کہ ”وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ مجھے کوئی
 غلط قسم کا انسان نہ سمجھ لے۔ میرے بارے میں کوئی
 ایسا ویسا تاثر نہ لے لے۔“ کتنے ہی خدشات تھے
 جنہوں نے دل کو دیک کر رہنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ خود

”شہنا پلیر!“ خالد نے اسے مزید بولنے سے روک
 ”نہیں خالد! مجھے کہنے دیں یہ کتنی جلدی حقیقت
 کو قبول کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کہے کی تمنا ہی خوش
 رہے گی۔ اس کی عصا سے نسبت ٹوٹ چکی ہے۔
 ٹانگ میں نقص آچکا ہے۔ پھر بھی یہ بہت ہی ہلکی ٹانگی
 قسم کے پروپوزلز کی امید لگائے بیٹھی ہے تو یہ اس کی
 خام خیالی ہے۔“ شہنا کا زنبقہ حرف درست تھا مگر
 وہ اپنی بکھری ہستی کو کیسے اتنی جلدی سمیٹ پالی۔
 مشائخ نے سر موڑنے کی پشت سے نکارا تھا۔



جیسے تیسے ہی سہی زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ
 آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح گھر کے سارے کام نمٹاتی
 خوشی خوشی۔ فارغ وقت میں بھی کبھی کبھی کو نزدیکی
 پارک کا چکر لگاتی۔ بھانت بھانت کے لوگوں کے
 چہروں کو دیکھنا ان کی آوازیں سننا اسے اتنا لگا کہ خالد
 بھائی کے بچوں کو وہ شہنا سے پر دھاتی آ رہی تھی۔
 ہمسایوں میں سے ایک دن اس سے ٹوشن مانگی تو
 اس نے ہائی بھولی۔ مینہ بھر میں کٹنی بچوں کی تعداد
 ہوئی۔ اس کا وقت بہت مصروف اور ہلکا پھلکا گزارنے
 لگا تھا۔

”تو بھی مشائخ! سنبھالو اپنے نئے اسٹوڈنٹس۔
 اچھی طرح توجہ اور محنت سے پر دھانا ہے۔“
 اس شام خالد بھائی دو بچوں کو ہمراہ لے کر
 داخل ہوئے تھے۔
 وہ چین رکھ کر دلچسپی سے بچوں کی طرف متوجہ
 ہوئی۔

”نئے ہمسائے ہیں۔ ان کے ظہور نے شاید بچوں کو
 بیگ اٹھائے ہمارے گھراتے چلتے دیکھا ہو گا“ اس
 لیے مجھ سے ٹوشن کی بات کر لی۔ خالد نے مسکراتے
 ہوئے بتایا۔ بچوں کی طرف مڑے۔
 ”چلو بچو! شاباش اپنی بکس نکالو۔ آئی آپ کو
 پر دھائیں گی۔“
 کھونے نے تلخ داری سے سر ہلاتے ہوئے بیگ

اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ سلجوق پڑھنے آیا تو بلا ارادہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

”سلجوق! آپ لوگ پارک جاتے رہتے ہو؟“
 ”نہیں اب نہیں جاتے، منٹل ٹھیک ہو جائے گی تو پھر چلیں گے۔“
 ”یہاں کتے ہیں۔“ سلوکی سے کہتے ہوئے سلجوق نوٹ بکدہ لکھتے جھک گیا۔

”کیوں کیا ہوا منٹل کو۔ وہ کئی دنوں سے ابھی نہیں رہی۔“ اس نے بے ساختہ پریشان ہو کر پوچھا۔
 ”وہ میٹر چیلوں سے گر گئی تھی منہ پہ خون لگا تھا۔ پلپلا کتے ہیں نالی جو ہے۔“

”گود“ وہ سر ہلا کر وہ گئی۔
 شہنا کے کسی کزن کی شادی تھی۔ اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا، مگر اس نے انکار کر دیا۔

”ڈو فر لڑکی! اب تک گھر میں بیٹھی رہو گی۔ یا ہر نکلو۔ لوگوں کو فیس کرو۔ ورنہ پونہی تمہارے کانفیڈنس کا کباڑا ہو جائے گا۔“ شہنا کندھے اچکا کر روزرو میں والی نصیحتیں کرتی بچوں کو لے کر چلی گئی۔

اس نے گھر کو لاک کیا اور اگلے ہی منٹل پھودہ ایک خوب صورت سے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔
 دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ منٹل واقعی سر پر پٹی باندھے نظر آئی۔

”وہ مال گنہ نہیں! یہ کیا ہو گیا؟“ اس نے آگے بڑھ کر اسے ہانپوں میں بھر لیا۔
 ”گنہ گھر گئی تھی۔“ کہتے ہوئے ساتھ چلی ہوئی کہنی بھی دکھلائی۔

سلجوق آئی کو گھر میں جا کر خوشی سے پھولے لے نہ سارا تھا۔ فوراً اسے اپنا اور بابا کا مشترکہ کراؤ دکھایا۔ منٹل کی فرمائش پہ اس کے پسندیدہ نوڈلز بنانے پکن میں چلی گئی۔ جزوقتی ملازمہ شاید اس سے غائبانہ طور پر متعارف تھی تب ہی خوش دلی سے بولی۔

”سلجوق بابا بہت خوشی سے آپ سے پڑھنے جاتے ہیں، صاحب بتاتے رہتے ہیں کہ اب سلجوق کارڈ لٹ اچھا آ رہا ہے۔ بہت تعریفیں کرتے ہیں آپ کی۔“
 ”کون تعریفیں کرتا ہے؟“ پوچھتے ہوئے اس کا دل

بھی تو استغیا میر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”یہاں یہ ہماری نیشن والی آئی ہیں۔ مشائم آئی۔ ہم ان کے گھر پڑھنے جاتے ہیں۔“ سلجوق نے تعارف کروایا۔

”گود! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ دل سے بے ساختہ اگلی خوشی کی لہروں کو دباتے ہوئے وہ بظاہر نارمل اور تندرست سے بولا۔

”آپ کے بچے بہت سوئیٹ ہیں۔“ مشائم ذرا سا سکر اکر بولی۔
 ”آپ یہ بات سلجوق کے لیے کہہ سکتی ہیں۔ اس نالی گرنل کے لیے یقیناً“ آپ کی رائے مختلف ہوگی۔“
 وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولتا ہوا بیچ پر ذرا اٹلے پہ بیٹھ گیا اور منٹل کی تاک دیا کر بولا۔

”پورا گھر ٹیٹ کیے رکھتی ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر مل جائے ناممکن۔“
 ”آپ کی بہت ملان کیے رکھتی ہے۔“
 ”کیا اپنی منٹل کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے علی نے کہا۔“

”جی سلجوق کو جتنا شوق تھا میں پڑھنے کا ہے اسے اتنا ہی پھاڑنے کا۔“ علی اس کی بات پہ ذرا سا مسکرایا، پھر مشائم کے چہرے پہ بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”بچے آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں، آئی نے آج یہ کھلایا یہ بات جہاں ایسے پڑھایا۔ ان کا نیوٹر کسی ذاتی وجہ سے دوسرے شہر گیا تو میں کافی پریشان تھا، مگر شکر کہ خالد صاحب کے توسط سے آپ کی نیشن مل گئی۔“

دن ڈھلنے میں کچھ وقت رہتا تھا، مگر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس شخص کی نگاہیں گہری ہوتی جا رہی تھیں یا اسے معلوم ہو رہا تھا۔
 ”گھر بیٹے! ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“ علی حسن بھی مضبوط کبھے میں گستاخ کھڑا ہوا۔



پتا نہیں کہیں وہ اگلے کئی دنوں تک پارک نہ جا سکے۔ کام کرتے ہوئے توجہ بار بار مٹ جاتی دل جیسے

دھڑک دھڑک گیا

”یہ اپنے سلجوق پبلا لور کون؟“ صغریٰ سلوکی سے بولی تو اس کا سانس ہموار ہو گیا۔

نوڈلز کے ساتھ ساتھ منال کو کھلانے والی آئی بھی بہت پسند آ رہی تھی۔ بہت پیار اور اصرار سے کھلاتی ہوئی گد گداتی ہوئی۔

”واٹ اے سر براٹر! آپ ہمارے گھر؟“ عالی بے حد خوش گو اور حیرت میں گھرا ہوا چہرہ رکھا۔

”وہ مجھے سلجوق نے منال کے کرنے کا بتایا تو میں اسے دیکھنے ہی آئی۔“ وہ ایک دم سے کٹھن و ڈھونڈ ہوتے ہوئے بولی۔

”بہت اچھا کیا، میری بیٹی آپ کو بہت مس کر رہی تھی۔ آپ کو دیکھے بیٹا سے جمن کہاں آتا ہے آپ فرسٹ ٹائم آئی ہیں۔ صغریٰ بی نے کچھ کھانے کو پوچھا؟“ منال کی ٹانگ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے صمن نوازی والے آداب بھلتے ہوئے پرچھا۔

”ارے سیں اس کی ضرورت نہیں۔ منال کو دیکھ لیا۔ میں بس اب چلتی ہوں۔“ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جتنا میل آنے کے لیے اس کا دل چاہ رہا تھا اتنا ہی میل سے جانے کی بے چینی ہو رہی تھی۔

”دس ازٹ فیو آپ میرے بچوں کی اتنی کیر کرتی ہیں ان سے محبت کرتی ہیں لور میں سے ایک کپ چائے کا پی کر تو جانا بنتا ہے۔“ وہ بے حد دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔

”آپ سے سلجوق کی اسٹڈیز کے بارے میں کچھ ڈسکس کرنا ہے۔ ماشاء اللہ گریڈون میں ہے مگر کلن پروگریس دکھا رہا ہے۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ شام کے کھانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔“ وہ عالی کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ اپنے دل کی لمحہ یہ لمحہ بدلتی حالت اسے پریشان کیے جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ کچھ دیر لور میں رکھی تو پھر کبھی نہ باہر نکل سکے گی۔ عالی نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ ابھی تو اس نے کچھ کہا ہی

نہیں۔ ”آئی! آپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہی جائیں گی نا۔“ سلجوق معصومیت سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”مب ہماری آفر تو ٹھکرا دی۔ ذرا ہمارے بیٹے کی خواہش کیسے پس پشت ڈالیں گی؟“ مسکراتے ہوئے عالی کا انداز چہلچنگ تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو اب جا کر دکھائیں۔

”عالی حسن صاحب! میرا گھر لاک ہے۔ چالی میرے پاس ہے اور میں نے رات کے کھانے کی تیاری کرنی ہے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے عالی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوکے! آپ کے آنے کا بہت شکریہ۔“ عالی صمنون لہجے میں بولا۔

گھر سے نکلتے ہوئے مشائم کو بار بار سنڈریلا والی کپڑی کا وہ حصہ یاد آ رہا تھا جب سنڈریلا رات کے بارہ بجے کے بعد واپس اپنی بے کیف اور پُر مشقت زندگی میں جا رہی ہوتی ہے۔ ایک دم سرشاری و طمانیت سے بریز۔



”بھابھی! آپ کے کرن کی شادی کا فنکشن کیسا رہا؟“ اتنا پوچھا ہی غصہ نہھا گیا۔

”بہت انسلٹ ہوئی میری، کسی سے بات کرنے کے قتل تک نہیں رہ گئی جس کے ساتھ جنھو بھوجبات کو بس ایک ہی تکرار زندگی شادی کیوں نہیں کر رہی ہو، مشائم! آپ تم کوئی فیصلہ کر رہی لو۔“ شہناز جیسے پھٹتی ہوئی تھی۔

”بھابھی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ بھونچکا سی انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”صاف اور سہل بات کر رہی ہوں۔ تم شادی سے انکاری ہو، اور سب لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں تمہاری شادی کو لیٹ کیے جا رہی ہوں۔ صرف اس وجہ سے کہ تم میرا پورا گھر سنبھالے ہوئے ہو۔ میں نے

تمہیں تو کرائی بنا کر رکھا ہوا ہے۔" شہنا بے حد کڑوے انداز میں بولی۔

"مگر بھابھی! میں نے تو کسی سے کوئی بات نہیں کی۔" وہ وہاں ہی ہو کر بولی۔

"تم نہیں کرتیں، لیکن لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں تا کہ میں نے تمہاری شادی لیٹ کی ہوئی ہے۔ اتنی خود غرض ہوں میں۔" شہنا کو چڑھی تپ اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"محترمہ خود رانی یادوں کا نام کیے بیٹھی ہیں اور وہ ہم آپ کے گم کے کلام ان سے کروائے جا رہے ہیں۔" شہنا سارا دن کو لگن نکالتی رہی، نجانے رشتہ داروں نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ ٹھنڈی ہو کے نہیں دے رہی تھی۔

"اتفاق اب بھی خواہش مند ہیں اتنا بڑا بزنس گھر میں کھڑی گاڑیوں کا تو شمار ہی ممکن نہیں۔ تمہارے تو نصیب کھل جاتے۔ اب اس حالت میں ایسے ہی رشتے آئیں گے۔ دو بچوں کے باپ والے۔" شہنا شاید ٹھان چکی تھی کہ اسے رلا رلا کر تیم جاں کرنا ہے۔ بھائی کا بھی مشفقانہ انداز نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

"دیکھو مشائخ! اہل ایسا ہوتے تو شاید میرے کندھے اتنا بوجھ محسوس نہ کرتے، مگر اب تمہاری ذمہ داری کلی طور پر میرے اوپر ہے۔ تمہیں میرے فیصلے پر بھروسا ہونا چاہیے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ اتفاق میری طرف سے مثبت جواب کا منتظر ہے۔" خالد بے حد سنجیدہ انداز میں اپنا اونوک فیصلہ سنا کر چلے گئے۔

"یا اللہ! مجھ یہ مہمان وقت لے لے۔" اس نے حل کی گرائیوں سے خالق وہ الگ کو نکارا تھا۔



"بہت کما بچوں سے کہ گھنٹے دو کر رہے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہونے پہ چلوں گی، مگر سلجوق میاں بھند کہ آئی سے آج ہی ملنا ہے۔" مہمان بزرگ نے کہتے ہوئے اسے بازوؤں میں بھر کر اس کی تلخ پیشانی چوم لی۔

"میں عالی حسن کے اماں کی پھوپھی زلو بہن ہوں۔ عالی میاں کی بول،" بوا سیکینہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بے تکلفی سے صوفیہ بیٹھ گئیں۔

"اوہ۔" اس نے سر ہلایا۔ سلجوق بھی بوا کے ہمراہ تھا۔ فوراً اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

"باشاء اللہ! بیچے آپ کے ساتھ خوب بٹے ہوئے ہیں۔ جب سے آئی ہوں بس ایک ہی بات۔" بوا ہماری آئی اتنی اچھی ہیں۔ لن کے گھر ہمیں بہت مڑا آتا ہے، عالی میاں بولے کہ بوا آپ خود چل کر لن کی آئی سے مل لیں۔ تب ہی انہیں قرار آجائے گا۔" بوا مسکرا کر بتانے لگیں۔ تو وہ بھی انکساری سے مسکرا دی۔

"بھئی! گھر میں کوئی بزرگ تو ہو گا کوئی بڑا؟" بوا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شہنا تو ان سے مل گئی تھی۔

"جی لیاں ابا تو فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بڑا بھائی اور ان کے بیچے ہیں۔" اس نے دھیمے سے بتایا۔ خلاف توقع شہنا چائے کی ٹرائی کھینچی آئی۔ چائے کے ساتھ کلاں لوازمات تھے۔

"مشائخ سلجوق کو لے کر باہر لان کی طرف جانے ہی گئی تھی کہ اس نے عقب میں بوا سیکینہ کی آواز سنی۔ وہ بھاگی شہنا سے مخاطب تھیں۔

"میں عالی حسن کی بوا ہوں۔ اس کا رشتہ لے کر آئی ہوں، مشائخ بیٹی کے لیے۔" وہ ایک جھنگلے سے پیچھے مڑی تھی۔



"اتفاق، عالی حسن سے بدرجہا بہتر ہے۔ اتفاق کی فیصلی تو زیادہ تر باہر رہتی ہے۔ اتنا بڑا وکیل فرزند! گھر۔" چائے کا ٹھونٹ بھرتے ہوئے شہنا نے خالد کو دیکھا۔ لن کا چہرہ رُسوچ تھا۔

"ہاں مگر اتفاق کے بیچے کافی بڑے ہیں۔ عالی بہت بیک سے بیچے بھی کئی چھوٹے ہیں، مشائخ کو جلدی بلوریں ٹھیل کر لیں گے۔" خالد متذہب تھے۔

”کم آن خالد اعلیٰ ٹوٹی انجان ہیں۔ حل ہی میں
 اوھر شفٹ ہوئے ہیں۔ نہ فیملی بیک گراؤ بیڑ کا پتہ نہ
 سٹارٹر کن آئی پھر اشفاق بھائی کی تو ساری فیملی ہماری
 جانی پھالی ہے۔“ شہنا مکمل طور پر اشفاق والے
 پروپونل کی حامی تھی۔ اتنے امیر اور صاحب حیثیت
 گھرانے سے رشتہ استوار کرنا سے اپنی خوش نصیبی
 ہی تو لگ رہا تھا۔

”خیر دیکھتے ہیں۔ دونوں پروپونر کی تفصیلات مشام
 جانتی ہے۔ اسی کا فیصلہ مقدم ہوگا۔“ خالد نے گویا بات
 ختم کر لی۔

”کیا بات ہوئی۔ عالی بھی دو بچوں کا باپ اور
 اشفاق بھی چھرا سٹینس میں زمین آسمن کا فرق آکر رہا
 جو اور دو بچوں کے باپ سے رشتہ ہی کرنا ہے تو آفاق
 بیسٹ ہے۔“ شہنا کو خالد کی بات پسند نہ آئی تھی۔
 مشام گھر میں رشتوں کے حوالے سے ہونے والی
 گفتگو جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ بھائی اب اس
 سے جواب مانگیں گے سو حسب توڑ خالد نے جلد ہی
 اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

”مشام بیٹے! کلنی دن لے لے تم نے فیصلہ کرنے
 میں۔ اشفاق جواب مانگ رہا ہے اور اوھر عالی کی یو ا روز
 چکر لگاتی ہیں۔“ بے حد نرمی سے بولتے ہوئے خالد
 نے مشام سے دریافت کیا۔

”بھائی! آپ میرے لیے ابو کی جگہ پر ہیں۔ آپ کی
 ہر بات سر آنکھوں پر لیکن اگر مجھ سے رائے لی ہے تو
 مجھے منٹل اور سلجوق کے لاڈ اٹھانا پسند ہوگا۔“ وہ جھکے
 ہوئے سر کے ساتھ پرسکون لہجے میں بولی تھی۔



”بچے روز کہتے پاپا آئی نے صرف ایک بار گھر کا
 چکر لگایا پھر کیوں نہیں آئیں انہیں بلا میں تو میں نے
 سوچا کیوں نہ ہا نہ رابطہ طور پر آپ کی آئی کو اپنے گھر لے
 آئیں یہ آنے جانے کا بھجھکت تو نہیں ہوگا۔“
 مشام کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھاتے ہوئے عالی
 نے کہا اور اس کا سر میں ہاتھ تمام کے قریب بٹھاتے

ہوئے فریش موڈ میں بولا۔
 ”نہ آئی صاحبہ کو اوھر سے جانے کی جلدی ہوگی نہ
 ہم بے چارے خواہ مخواہ انہیں یاد کر کے دنوں لو اس رہا
 کریں گے۔“ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے عالی اس
 طرف ذرا سا جھک کر شوخی سے بولا تو لفظ ”ہم“ پہ وہ
 سرخ بڑبڑائی۔ شارٹ سلک کے سوٹ میں عالی کی تمام تر
 توجہ کانخورنی ہوئی تھی۔

کسی کی زندگی میں آپ ”نیو کلیس“ کی سی اہمیت
 رکھتے ہیں اس احساس نے مشام کی سر زمین جان کے
 کیونٹس پر شوخ و چنچل رنگ بکھیر کے رکھ دیے تھے۔
 عالی کے بھی تو من گھری میں ہولے ہولے یاد تو بہار
 طے لگی تھی۔ وقت نے ایسا تعویذ محبت دونوں کے
 گلے میں ڈال دیا کہ موسم گل نہ ہوتے ہوئے بھی ہر دم
 دور ہر وہ گزر جیسے سرخ گلوں سے آراستہ ہو گئی ہو۔
 زندگی پر تو جیسے موسم گل کا پہلو لگ چکا تھا۔ مشام تو
 جیسے سلجوق اور منٹل کے لیے محبت و وفا تھی کا دریا
 ثابت ہوتی تھی۔



”سلجوق کے لیے کچھ اینیشری کا سامن خریدنا ہے
 اور کچھ کچن کا سامن بھی۔“ رات کو نائٹ لوشن ہاتھوں
 پر ملتے ہوئے مشام عالی سے مخاطب ہوئی۔
 ”تو پھر اس سنڈے چلتے ہیں شاپنگ کو۔“ کتاب
 پڑھتے ہوئے عالی نے گفتگو سے جواب دیا۔
 ”اب خود لے آئیں پہلے بھی لے آتے تھے۔“
 وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”کیا مطلب میں جاؤں۔“ عالی نے مہنوس اچکا کر
 اسے دیکھا۔ ”صنڈا جب پورا گھر سمجھ لیا ہے تو
 خریداری کا ذمہ بھی اٹھائیے۔“ اس نے لاکھ پیلو تھی
 کی گھر عالی سے مارکیٹ لے ہی آیا۔
 ”لف کیسی لگوں گی اس کے ساتھ گھسٹ گھسٹ
 کر چلتے ہوئے۔“ دل کے کونوں سے کب سے دہکا ہوا
 احساس کتری پھر سے عمو تیا تھا۔
 اس نے لسٹ عالی کو تھمائی اور وہ مطلوبہ اشیاء ترا لی

”جی ایسے صفائی کرنے کو جی چاہا تو یہ الہم ہاتھ لگ
”میرا۔“

”کو۔“ میں تمہیں اپنے فیملی فوٹوز کے بارے میں
بتانا ہوں۔“ علی اس کے قریب بیٹھ پر بیٹھ گیا۔

”یہ دیکھو! یہ میرے لہاں لیا ہیں۔ دونوں میں خوب
محبت تھی۔ ایسی محبت کہ ابا کے جانے کے اگلے سال
اماں نے بھی رخت سترہ بندہ لیا۔“ مشائم کو یوں
محسوس ہوا کہ جیسے علی کی پلکوں پہ نمی چسکی ہو۔

”گور یہ مرلو بھالی۔ مجھ سے پورے سات سال
بڑے تھے مگر رعب پورا ابا دانی رکھتے تھے۔ مجھے
خوب کس کے رکھا۔“ بتاتے ہوئے علی کا لہجہ محبت
سے معمور تھا۔

”ان کی شادی پہ میں کلج میں پرہتا تھا۔ یہ دیکھو
صلح بھائی۔ ہماری کنٹن تھیں۔ بہت لوگ اور
کیرنگ۔ بھالی ہتھار عبڈالتے یہ اتنا ہی مجھ سے پیار
کر تھیں۔“

”کیا مطلب تھیں؟“ مشائم آنکھیں پھیلا کر علی
سے متفسر ہوئی۔

”ان کی ڈتھ ہو مئی شادی کے تیسرے سال۔“ علی
کی آنکھیں اور نگ ہو گئیں۔ مشائم بے تحاشا دکھ
میں گھر گئی۔

”بھابھی کی طبیعت خراب تھی بھالی انہیں ڈاکٹر
کے پاس لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک ٹرالر سے
ان کی گاڑی کا تصادم ہو گیا۔ تصادم اتنا خوفناک تھا کہ
موتح بری حدوں کی۔“ علی خاموش ہو ا تو کمرے میں
خاموشی بولنے لگی۔

”اور ان کے بچے؟ کیا ان کی اولاد نہ ہو سکی تھی؟“
مشائم نے دھیسے سے پوچھا۔

”ہیں نا۔ سلجوق اور متل۔“

”کیا؟“ مشائم کے تو سر پر حیرت کا پازا اگرا۔
”تو کیا یہ آپ کے بچے نہیں ہیں؟“ وہ لگتت زندہ
تواڑ میں بولی۔

”نہیں۔ مگر میں ہی ان کا باپ ہوں اور تم ماں۔ کیا
ماں نہیں ہو؟“ عالی التا عجیب لہجے میں اس سے پوچھنے

میں ڈال گیا۔ وہ ہر جہت میں اس کو رائے کو اولت دیتا رہا۔
”مشائم! اس دفعہ تو تمہ پر سٹ بدل کر نہ دیکھیں۔“

وہ اس سے پوچھ رہا تھا مگر جواب نہ دیا۔
”مشائم! اب کے مڑنے کے اسے دیکھا تو مشائم

”نگ نیکو دیم دم نہ کشیدم“ کی تفسیر سنا سنے دیکھے
جاری تھی۔ عالی نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

ایک پنڈ سم سامو بھی اسی کیفیت میں مشائم کو
دیکھا پایا گیا۔ موٹے کے ساتھ ایک بے حد اسارٹ اور
اسٹائلٹس کی لڑکی تھی جو غالباً اس کی بیوی تھی۔

”ہیلو! کہاں کھو گئی ہو؟“ عالی نے کندھا ہلا کر گویا
اسے نیند سے جگا دیا۔

”پہلو چلتے ہیں۔ کافی شاپنگ کرلی۔“ ایک ہاتھ سے
ٹرنٹی کو دھکیلتے اور دوسرے ہاتھ سے مشائم کا ہاتھ تھام

کر ہم قدم چلتے ہوئے وہ بار آگئے۔
”کون تھا یہ شخص؟“ عالی۔ زیونی سر سر ہل پوچھا۔

”میرا کن تھا عمو۔“ علی عرضہ بعد اسے دیکھ رہی
تھی۔ اس کی بیوی خاصی خوب صورت تھی۔

پائل نارمل انداز سے بولی۔ ہتھار اٹھوہ آج عالی کے
ساتھ چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی اتنا زندگی بھر نہ

کریا کی تھی۔ گلاس ڈور سے پار دور تک عمو نے
دونوں کو ساتھ چلتے دیکھا۔



سلجوق اور متل بیوی پہ لے بنے بند یہ کارٹون دیکھ
رہے تھے تو وہ یونی وقت گزارنے کو غصلی ہوئی اسٹڈی

میں چلی آئی۔ فراغت تھی سو صفائی کا سوچ لیا الماری
کا پہلا خانہ صاف کرنے پر ایک بوسیدہ فوٹو الہم ہاتھ

آنگ کاٹی پرانی تصاویر تھیں، کبھی پہ دو لڑکے تھے تو
کبھی عورت و موٹے کے ساتھ کوئی بچہ۔ ایک بیا جتا

جوڑے کی تصویر بھی تھی۔
علی کی بھی بے شمار تصاویر تھیں! اسکول اور کلج

لائف کی وہ نجانے کتنی دیر بیٹھی تصاویر دیکھتی رہی۔
”چھا تو فیملی الہم دیکھا جا رہا ہے۔“ عالی چپکے سے
پچھے آکر بولا تو وہ مسکرائی۔

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں ہی ان کی ماں ہوں۔“ وہ عالی کے انداز پر گزیرا گئی تھی۔

”مشائم! سلجوق دو سال کا اور متلل بمشکل ایک ہفتے کی تھی! جب بھائی اور بھائی چلے۔ تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے کہ ایک ماں اور باپ دونوں بن کر انہیں محبت دی ہے خود سے حمد کیا تھا کہ کبھی ان کو ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ کبھی پتا ہی نہیں چلنے دوں گا کہ میں ان کا چچا ہوں۔ سنو! کیا اس حمد کو پورا کرنے میں میری مدد کروگی؟“ وہ اب سرخ موڑ کر اس سے تعین مانگ رہا تھا۔

”کیوں نہیں عالی! ان بچوں کے طفیل ہی تو مجھے آپ جیسے انسان کی ہم سفری نصیب ہوئی ہے۔ ورنہ تو خود میرا وجود میرے لیے ہی باعث آزار بنا ہوا تھا۔“ وہ اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ کر تعین سے بولی۔

”ان شاء اللہ! جب ہمارے بچے ہوں گے تب بھی سلجوق اور متلل سے ہماری محبت اور توجہ میں کمی نہ آئے گی۔“ عالی اب کے ذرا سا مسکراتے ہوئے بولا تو مشائم کے لبوں پر شرمکس مسکان سج گئی۔

مشائم الہم بند کرنے لگی۔ وہ چلنا ہوا کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ نظریں سامنے لان میں کھیلتے اپنے بچوں پر جم گئیں۔

”نیور عالی! میں کسی چیز کا سانس تک تم پر برداشت نہیں کر سکتی۔ کچا کہ یہ لاہیجے تمہیں شیر کرنا بہت مشکل ہے۔ تمہاری محبت توجہ اور ٹائم کی زیادہ حق و وار میں ہوں تم ان دونوں کو کسی آرفن سینٹر میں۔“

”مشائم! ابرش! یہ کوئی میم پیج نہیں ہیں۔ یہ میرے بھائی کا خون ہیں۔ یہ میرے بچے ہیں۔“ وہ ابرش کی بات کاٹ کر حصے سے ہاتھ پاند بولا۔ گردن کی رکیں ایک دم کھینچ گئی تھیں۔ ابرش اس کے انداز پر ایک دم خائف ہو گئی تھی۔

”میرا زندگی میں شامل ہونا ہے تو انہیں ماں کا پیار دینا ہوگا۔ انہیں اتنی ہی محبت اور چاہت سے پالنا ہے جتنا میں تم سے توقع کر رہا ہوں۔“ عالی اب کے گھر سے

”سوری عالی! یہ گورنس کی جا ب مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔ میں تو خود ایک میڈ کے ہاتھوں پٹی ہوں کچا کہ تمہارے بھائی کے بچوں کی میڈ بنوں۔ بلکہ تمہاری زندگی میں جو بھی لڑکی آئے گی اسے یہ ہزارہ کبھی منظور نہیں ہوگا۔“ ابرش اپنی کہہ کر چلی گئی تھی۔

عالی سر جھٹک کر تھکی سے مسکرایا۔ مڑ کر دیکھا۔ مشائم کمرے سے جا چکی تھی۔

آفاق ہدائی کے مقابلے میں عالی حسن کو منتخب کرنے پر شینا بھائی اب تک اسے سالی آرہی تھیں۔

”مشائم! جب دو بچوں کا باپ ہی تمہارا نصیب بنا تھا تو آفاق میں کیا برائی تھی۔ کم از کم ویل آف تو ہے عالی حسن کی طرح سو بھی منظور خواہ۔ گزارا کرنے والا تو نہیں۔“ اس نے موبائل ہاتھ میں لے لیا۔

”آج میں بھائی کو بتائے دیتی ہوں کہ عالی حسن کے کورے کنوارے جنیوں کی واحد امین میں ہوں۔ میں ہی مسز عالی ہوں۔ اس کے دل کی دیواریں پہ کسی کا ہاتھ نہیں لکھا ہوا۔ تقدیر نے میرا نام لکھ دیا ہے۔“ اس کی انگلیاں تیزی سے شینا کا نمبر طاری تھیں۔

”کبھی ان کو بتا نہیں چلنے دوں گا کہ میں ان کا چچا ہوں۔ سنو! اس حمد کو پورا کرنے میں میرا ساتھ دو گی؟“ اچانک اس کے ذہن میں کچھ دیر پہلے عالی کی کسی بات گونجی تو وہ ساکت سی بیٹھ رہی۔

”جو دل میں بسنے والے ہوتے ہیں اگر وہ اپنے دل کی بات بتا دیں تو انہیں تاحیات دل میں رکھا جاتا ہے۔ یوں دو سروں پہ ظاہر کرنا محبت کی توہین ہوتی ہے۔“ اچانک اس کے دل نے سرگوشی کی تو وہ چونک گئی۔

”ہیلو! کیسی ہو مشائم؟“ شینا کل اوکے کر چکی تھی۔ عالی کے دل کی بات اب اس کے دل کی بات ہوئی تا اور دل کی بات ہر کسی کو تھوڑی بتائی جاتی ہے۔ مشائم نے کل منقطع کر دی۔

آجاؤں اگر لہلی کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو پھر
پر سوں تک آکوں گی۔ اچھا تم دونوں آرام سے رہنا۔
لڑنا نہیں۔ ” رشیدہ بیگم کو ملیں کی تیاری کی اطلاع ملی تو
وہ فوراً ” جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ
ہر اتھوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ دونوں بڑی سعادت
مندی سے ان کی باتوں پر سہارا ہی تھیں۔
” اور اپنے ابو کو وہ اپنی ٹائم پر دے دینا۔ وہ خود تو

جویریہ شاہ

احساس



” ابھی گھنٹہ ہی تو ہوا ہے کام دہلی کو رتن دھو کر گئے
ہوئے پھر اتنا ڈھیر چھوٹے برتنوں کا ہو گیا ہے دن میں دو
دفعہ آکر دھوتی ہے پھر بھی برتنوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔“
شازیہ لورنڈا! تم دونوں میں ذرا بھی احساس نہیں کسی
لور کا۔

کپڑوں کا بھی کی حال ہے۔ ہر روز تم دونوں کپڑے
پر لیتی ہو جا ہے صاف سی کیوں نہ ہوں جبکہ تم دونوں کو
کیس جانا بھی نہیں ہوگا۔ نہ کلج نہ نوکری نہ کسی
کے گھر۔ صفائی دیکھو تو وہ بھی جو کام دہلی کر کے جائے
بس وہی ہوتی ہے۔ چیل ہے جو تم دونوں نے بھی کوئی
صفائی کی ہو۔ اب چھوٹی چھوٹی ڈسٹنگ تو خود کر سکتی ہو
میں پر نہیں ہر کام کا بوجھ کام والی پر۔ ” اسی حسب
معمول برتنوں کا ڈھیر لگ کر شروع ہو گئی تھیں۔

” امی! ہم پیسے دیتے ہیں کام کے مفت تھوڑا ہی
کرواتے ہیں۔ جو آپ کو اتنی سہ روئی ہو رہی ہے۔“
” بڑا پیسے دینے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کا خیال
ہی نہ کر سولے بھی جب ہم پیسے ایکسٹرا نہیں دیتے تو
ہمیں کام بھی ایکسٹرا نہیں کروانا چاہیے۔“
” امی! اب گھر کے اور کام تو ہم خود کرتے ہیں جو وہ
تین کام ماسی سے کرواتے ہیں ” آپ چاہتی ہیں کہ وہ
بھی خود کریں۔“

” ایک تو تم دونوں کی زبانیں بست چلتی ہیں۔
میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود کو ہر کام
لیکن چن بوجھ کر کام بڑھانا ” زیادہ برتن گندے کرنا“
زیادہ کپڑے استعمال کرنا۔ صرف اسی وجہ سے کہ یہ کام
تم خود نہیں کرتیں۔ بست غلط حرکت ہے۔ اگر کسی
دن خود اتنے ڈھیر سارے کام کرنے پر مجا نہیں تو تب کسی
دوسرے کا احساس ہوگا۔“

اسی نوج ہو کر بولیں۔ وہ دونوں سمجھنے کو تیاری نہیں
تھیں ” ساری بات احساس کی تھی لور احساس کسی کے
دل میں پیدا نہیں کیا جاسکتا۔



” میں کوشش کروں گی کہ کل شام تک واپس

ماہنامہ شعلہ مارچ 2015ء

Copied From Web

بیٹھ بھول جاتے ہیں۔“

”ہاں یہ کی بات ہے تم نے کلم کی شازیہ۔“
”اچھا چلو چل کر ڈرامہ دیکھتے ہیں شروع ہونے والا ہے۔“

”خود اکون ہے دروازے پر۔“

”ضرور کاہلی ہوگی۔“

”آج تو خبر تھی ہوں اس کی۔ ایک تو کل شام بھی نہیں آئی اور سب دن کا ایک سچ رہا ہے یہ بھی کوئی نام ہے آئے گا۔“

”اُمی نے بھی بہت سرخ حار کھا ہے۔“

”جی ہاں سلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔“

”ہرے تم کہیں ہے تمہاری ماں محل بھی نہیں آئی اور آج بھی اتنی دیر کہی۔“

”وہ ہلکی اچھے ابلنے کی پتلے کے لیے بھیجا ہے کہ ہڈی کو تھکاؤ۔ وہ پورا ایک ہفتہ کلم پر نہیں آئے گی ابلنے کو سخت بخار ہے اور ڈاکٹر نے انہیں آرام کے لیے کہا ہے۔“

”وہ لڑکا تو اس پر ہم گرا کر چلا گیا۔“

”اور وہ ہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔“

”اگر ہتا ہوا کہ ماسی نے نہیں آنا اور یہ برتن خود دھونے ہیں تو کبھی بھی اتنے برتن نہ جمع کرتے ہم لوگ۔“

”آف کون دھوئے گا اتنے ڈھیر سارے برتن تا صرف برتن بلکہ صفائی اور کپڑے بھی رہتے ہیں اور تو اور اسی کے آنے کا وقت بھی ہو جا رہا ہے۔“

”ابن کا ابھی گھنٹہ پہلے فون آیا تھا کہ بس پر پڑھ گئی ہیں۔“

”اسے امی کی بات شدت سے یاد آ رہی تھی کہ۔“

”اگر کسی طن خود اتنے ڈھیر سارے کلم کہنے پڑ گئے تو تب کسی دوسرے کا احساس ہوگا۔“



”اچھا۔ میں چلتی ہوں دو دن بعد کر لو کوئی آئے تو پوچھ کر دو ان کو لٹ۔“

”امی کے جانے کے بعد گھر میں کتنی لو اس ہو گئی ہے میں نہ!۔“

”ہاں۔ میں تو خود پور پوری ہوں۔“

”چلو کوئی کلم دیکھتے ہیں۔“

”نہیں مہیرا کوئی موڈ نہیں اس وقت کلم دیکھنے کی۔“

”تو پھر۔“

”تو پھر چل کر کو کنگ کرتے ہیں۔“

”نہیں جی۔ میرا بھی کوئی ارادہ نہیں اس گری میں چلنے میں جا۔“

”چلو پیرا اب آئے گا کنگ کو کنگ کرنے میں۔“

”نہیں۔ تمہیں تو بتا ہے شازیہ! امیری اسکن کتنی جلدی خراب ہوتی ہے آگ کے قریب جانے سے۔“

”ایک تو تمہارے بھانے شتم نہیں ہوتے۔ سو یہاں بیٹھ کر میں تو جا رہی ہوں لیکن۔“

”آج تو اتنی دیر ہو گئی پر ابھی تک نہیں آئی کاہلی چھو بیچے آکر دھو جاتی گی برتن۔ سب تو آٹھ بج رہے ہیں رات کے۔“

”اچھا دفع کر دو برتنوں کی منتیں۔ آج تو امی بھی نہیں کہ غصہ ہوں۔ ویسے بھی تمہیں ہی دن میں کو کنگ کا شوق چڑھا تھا۔ اس چکر میں بھی اتنے ڈھیر سارے برتن جمع ہو گئے۔“

”ہاں کہہ تو سچ رہی ہو تم۔“

”اچھا چلو چھوٹو۔ کل آکر دھو لے گی۔ ہم نے بھی کون سا دھو لینے ہیں۔ اور اتنے سارے برتن جو بیڑے ہیں وہ کس دن کلم آئیں گے۔ ہم بھی وہی استعمال کرتے رہیں گے ماسی کو بھی منو آجانے کا چھٹی کرنے کا۔ جب اتنے ڈھیر سارے برتن اکٹھے دھوئے گی۔“



سحر ساجد

تعلیق برائے

قوم صاحب کی بیگم چودھویں بچے کی پیدائش پر فوج ہو جاتی ہیں۔ کثرت عیال کی وجہ سے قوم صاحب بچوں کی طرف سے لاپرواہ ہوجاتے ہیں۔ سوارث قوم کی تمام تر ذمہ داری زینب آپا پر آجاتی ہے جو اس سے سولہ سال بڑی ہیں۔ حارث قوم شروع سے ہی بد مزہ لگتا اور ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ اپنی حرکتوں اور زبان درازی کی وجہ سے سارے بہن بھائی اس سے ٹانناں اور درد رہا کرتے تھے۔ صرف زینب آپا اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتیں، جبکہ وہ زینب آپا سے بھی بد مزہ ہی سے نہیں آتا تھا۔ حارث قوم کھیل گود میں لڑائی لگتے ہیں اکثر ہی خطرناک چوٹیں لگوا لیا کرتا تھا مگر اسے تکلیف کا احساس زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سخت بڑی تھا۔ وہ ابا اور بے بھائیوں سے مار کھا کھا کر بھی بہت ڈھیٹ ہو گیا تھا جبکہ زینب آپا اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر رڑپ جاتی تھیں۔ زینب آپا بیاہ کر چکی تھیں تب بھی اس کی دل پل کی خبر رکھتیں اور ہر موقع پر سب سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ حارث قوم کو اپنے بہن بھائیوں سے نفرت تھی مگر زینب آپا کے لیے بھی دل سے محبت اور احترام نہ رکھتا تھا۔

زینب آپا کے میاں شیخ بھائی سعودی عرب میں رہتے تھے۔ شادی کے چھ عرصے بعد انہوں نے زینب آپا کو بلوایا۔

ماہنامہ شعاع مارچ 2015 94

Copied From Web



ناولٹ

اس وقت حارث سولہ سال کا تھا۔ زینب آپا کو شدید رنج تھا حارث کو یہ سو ڈر جانے کا مگر ان کے رونے دھونے سے وہ شدید چڑھا تھا۔ ان کے سعودی عرب جانے کے بعد زینب آپا کو اطلاع ملتی ہے کہ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک ٹرکی گاڑی کے عصمت دری کی ہے۔ ناپالغ ہونے پر اسے صرف قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے اپا اور بھائیوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا مگر زینب آپا نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رکھا۔ اگرچہ وہ اس کی اس حرکت پر بے حد شرمندہ اور ملین تھیں مگر اکثر اسے فون کرتیں۔ پاکستان میں مقیم اپنی سسکی کے ہاتھ اس کی ضرورت کی چیزیں بھجواتی رہتیں۔ وہ فون پر روتے ہوئے کہتا۔ مجھے چھڑا لو، دو چار لاکھ روپے انہیں دے دو اور جیل سے لکھو اور۔۔۔ زینب آپا اس سے وعدہ کرتی ہیں کہ جیل میں اچھا رویہ اور کروا رکھو۔ تمہاری سزا کم یا معاف کر دی جائے گی۔ پھر میں تمہیں سعودیہ بلوائیوں سے بچاؤں گا۔ حارث دل میں زینب آپا کو خوب گالیاں دیتا ہے۔ ساڑھے دس سال جیل میں گزار کر بالآخر زینب آپا اسے سعودیہ بلوائی ہیں۔ زینب آپا کے اولاد نہیں ہوئی، شفیق بھائی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان ہی کی خاطر وہ حارث کا بھی خیال رکھتے ہیں حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حارث آپا سے بہت بد تمیزی کر جاتا ہے۔ سعودیہ اگر بھی وہ اکثر زینب آپا کو طعنہ دیتا کہ تم نے مجھے بچائے اور میرے ساڑھے دس سال ضائع کیے۔ زینب آپا اس کی ساری بد تمیزیاں برداشت کرتیں کیونکہ وہ اسے ماں کی طرح چاہتی ہیں اور شفیق بھائی ان کی خاطر حارث کی بد تمیزیاں نظر انداز کرتے رہتے۔ حارث سعودی عرب واصل اپنے ساڑھے دس سال ضائع کر دینے پر زینب آپا سے بدلہ لینے آیا ہے۔ وہ یہاں اگر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ زینب آپا اور شفیق بھائی عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ ایک قلیا پتی عورت کو گھر لے کر آتا ہے مگر رقم کے معاملے میں جب بات نہیں ہوتی تو وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور تمہے میں بند کر دیتا ہے۔ اتفاق سے نکلت بھول جانے پر زینب آپا اور شفیق بھائی کو دوبارہ گھر تازہ پاتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ دونوں فحش رہ جاتے ہیں اور

ماہنامہ شعلہ مارچ 2015ء 95

Copied From Web

پھر بے حد مجبور ہو کر زینب آپا شفیق بھائی کو پولیس بٹانے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ پولیس آکر حارث اور اس فلپائی عورت کو گرفتار کرتی ہے اور سعودی قانون کے مطابق فلپائی عورت کو شادی شدہ ہونے کے باوجود اس گناہ کا مرتکب ہونے پر سنگسار اور حارث کو غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے سو کوڑوں کی سزا ہوتی ہے۔

حارث کو اس سزا پر کوئی خوف نہیں ہوتا کیوں کہ وہ بچپن سے بٹنے اور مار کھانے کا عادی تھا۔ ہر کوڑا لگنے پر اس کے دل میں زینب آپا کے لیے نفرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کوڑا لگنے کی انت پر وہ چیخ چیخ کر زینب آپا کو بددعا میں مبتلا ہے۔ زینب آپا حارث کے لیے بہت دکھی ہوتی ہیں۔ لیکن حارث ان کو بہت تنگ کرتا ہے۔ وہ اس کے زخموں پر روتے ہوئے مزاحم لگتی ہیں۔ ٹھیک ہونے پر حارث زینب آپا کے گھر سے نقدی اور ان کے زیور چرا کر امریکا بھاگ جاتا ہے۔ شفیق بھائی کے ناراض ہونے پر زینب آپا کہتی ہیں کہ وہ ان کے زیور تھے وہ اپنے بھائی کو معاف کرتی ہیں۔ امریکا پہنچنے پر حارث سے وہ زیور والا بیگ چھو جاتا ہے۔ حارث امریکا میں سخت محنت سے پیسے کما رہا ہے اور غلط کاموں میں گزارتا ہے۔ اپنی دولت میں اس طرح کر کے وہ زینب آپا کو دکھ دے رہا ہے۔

اسی دوران حارث خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ خوف اس پر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ اس کی نوکری چھوٹ جاتی ہے اس کی دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا روم میٹ گیان سنگھ اسے ڈاکٹر حسنت کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر حارث کہتا ہے کہ اسے اپنی بیماری سے نجات چاہیے وہ کہتے ہیں کہ بیماری سے نجات نہیں شفا ملتی ہے۔

تیسری اور آخری قسطیں

ابو جمل، ابولہب، عمر بن خطاب، ابو سفیان، لود اور بہت سے لوگ ان سب کی زندگیوں میں کوئی نہ کوئی۔ کبھی نہ کبھی وہ اک لہر ضرور آیا تھا۔ وہ لہر کہ جس میں انسان کے دل پر ہدایت اتاری جاتی ہے۔ اسے دگایا جاتا ہے اس کے دل کو نرم کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت تک کہ انزل ابھی ہے ابھی اس حارث کی قوم کے دل پر بھی اترا تھا۔ اس کا دل پھلا تھا اور اس طرح سے پھلا تھا کہ اسے محسوس ہوا، سارا جسم جیسے آگ پر رکھی سووم بن گیا ہو۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حسنت نے ماوس ہو کر گہرا سانس بھرا تھا اور اس کے آگے موجود کتاب کو اٹھانا چاہا۔ حارث نے یک دم تیزی سے اچانک ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں روکا تھا۔

”مجھے شفا چاہیے۔“ اب کہ وہ نم آنکھوں سے کہہ رہا تھا۔

”یہ ایک کتاب ہے حارث۔ ایسی کتاب جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ رحمت ہے۔ اس کے لیے جو کچھ ان کے سینوں میں ہے۔“

وہ ایک آیت کا مضمون بتا رہے تھے۔

”گور جو کچھ تمہارے سینے میں ہے۔ تمہیں اس کتاب کے علاوہ کوئی شفا نہیں دے سکتا اور اگر تمہیں لگتا ہے ایسا نہیں ہے تو آنا چاہو تو آنا۔“

”ساری دنیا محوم کر دیکھ لو۔ اچھے سے اچھا سٹریٹسٹ۔ پلر۔ میڈسن آنا کر دیکھ لو۔ ہر طریقہ ہر راستہ چلیج لو۔ اس کے بعد اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ تو محض ایک دائرے کا سفر تھا اور تم لوٹ کر اسی کرسی پر۔ اسی حالت، اسی بے چینی۔ اسی اضطراب کا شکار ہو کر بیٹھے ہو گے۔ فرق صرف اتنا ہو گا آج میں تمہیں یہ نسخہ شفا دے رہا ہوں۔ کل تم خود مانگو گے تو فیصلہ کر لو حارث کیوم۔ سوچ لو۔ دنیا میں ٹھوکریں کھاتی ہیں یا پھر شفا ملتی ہے۔“



وہ دن کے بارہ سالہ کیر پر کا عجیب ترین کیس تھا۔
 ایسا کیس جس میں ان کی مہارت جواب دے گئی تھی۔
 دنیا میں بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں، چاہے وہ
 مسک ہوں یا غیر مسلم۔ مگر اپنے اس خوف کو لے کر
 اس طرح سے نہیں کرتے جس طرح کہ حادثہ قیوم
 نے کیا تھا۔ ایسے وہ سب لوگ کسی نہ کسی فلاحتی
 سوشل ویلفیئر یا پھر جینی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں
 اور اگر مسک ہوں تو زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں
 ایسے تمام عمل اور کام کرنے کی جو اللہ اور اس کے
 رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھے۔ جن کا اللہ اور
 اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔
 لیکن سب حادثہ قیوم سے عجیب کوئی تھا۔
 اس کے جانے کے بعد، اگلا کوئی مریض نہیں دیکھ
 پائے تھے۔ مسلسل اس عجیب زمین شخص کو سوچے
 جا رہے تھے۔

کیا اس شخص کا کوئی اور علاج ہو سکتا تھا؟
 کتب لے گیا تھا۔ وہ کتاب جسے وہ پڑھتا نہیں
 جانتا تھا اس سے شفا لینے کے لیے
 اور ڈاکٹر حسنت سوچ رہے تھے کہ وہ کیسے کس
 طرح سے۔ اور کیونکر اس سے شفا لپائے گا جبکہ
 وہ ایک حرف تک نہیں پڑھ سکتا تھا۔ بے اختیار وہ
 مسکرائے تھے۔
 انہیں انتظار تھا اس دن کا۔ کہ جس دن حادثہ
 قیوم ہوا، ان کے پاس آئے گا وہی کتاب لے کر۔
 اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اتنی کہ
 کہنے کو اس نے کہہ دیا، ستر ماں جتنی۔ مگر
 وہ حقیقت وہ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔
 تو کیا اتنی محبت کے بل بوتے پر اللہ چاہے گا کہ اس کا کوئی
 بندہ اس راستے پر چلے جسے وہ پسند کرنا ہو۔ وہ راستہ جو
 سید عابدین میں لے جاتا ہو۔
 "کیا اللہ ایسا چاہے گا؟"
 "ہاں ایسا ہو سکتا تھا؟"
 "ہمیشہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اور اللہ کیوں کر ایسا چاہے گا۔"
 اللہ اپنے بندے کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ بندہ ہوتا
 ہے جو اللہ کا راستہ چھوڑتا ہے۔ اللہ تو تب بھی انسان
 کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنے لیے غلط راستے کا
 انتخاب کرتا ہے۔
 وہ اسے جگانا ہے، چھوڑتا ہے۔ وارن کرتا ہے
 قدم قدم پر۔ اسے بتاتا ہے کہ وہ غلط ہے۔ غلط راستے پر
 ہے اور غلط کر رہا ہے۔ اتنا غلط۔ کہ یہ اسے پہلا ہی پور
 چٹائی کی طرف لے جائے گا۔

پہلا ہی اور چٹائی بھی وہ خود بخود کی نہیں تھی۔ انجام کی
 تھی اور اس نے حادثہ قیوم کو بھی نہیں چھوڑا تھا
 اس حادثہ قیوم کو بھی بار بار جگانا گیا تھا۔ چھوڑا گیا
 تھا۔ تب جب وہ پکڑا گیا۔ تب جب اس پر حملہ ہوا۔
 تب جب اسے جیل ہوئی اور تب بھی جب وہ جیل سے
 رہا ہوا۔ تب بھی جب وہ لہنگہ کیا۔ گھر میں غلامی
 عورت کے ساتھ پایا گیا اور تب بھی تو جب اسے
 کوڑے پڑے تھے۔

یہ اتنا تھی یہ بس اتنا تھی۔ اس کے بعد بھی وہ
 انسان نہیں سنبھلا تھا۔ تو قریب تھا کہ اسے ڈھیل
 دے دی جاتی۔ اس کے دل کو ہر شہہ کر دیا جاتا۔ اس کی
 آنکھوں کاٹوں پر پردہ ڈال دیا جاتا اور وہ کبھی ڈاکٹر

حسنت تک پہنچ نہ سکتا اور نہ ہی کبھی ان کے ساتھ بیٹھ
 کہ قرآن پڑھتا رکھ کر کہہ پاتا۔
 "مجھے شفا چاہیے۔" اسے اپنی ہی گریہ میں
 سرگرداں کر دیا جاتا۔ یہ سب ہونا اور ضرور ہوتا ہے
 مگر



وہ ڈاکٹر حسنت کے کلینک سے نکلا تو بچپوں سے رو
 رہا تھا۔ اس نے کتاب کو دونوں ہاتھوں سے بچھ کر
 سینے سے لگایا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اس
 طرح روٹا کیوں آئے جا رہا تھا۔ اس لیے نہیں رو دیا
 تھا کہ اسے قرآن مل گیا تھا۔ ہدایت مل گئی تھی یا پھر

اس لیے کہ وہ آج سے پہلے تک کس قدر گمراہ رہا تھا یا پھر یہ کہ وہ اس کتاب کو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔
 ہمیں وہ ایسی کسی کیفیت کی وجہ سے رو نہیں رہا تھا۔ تو خوشی کے آنسو تھے۔

اسے اپنے دیکھ اپنے غم اپنی بیماری اپنی کیفیت سے غفلت مٹولی تھی۔
 وہ عذاب سے نجات پانے والا تھا۔ یہ آنسو اس لیے تھے۔

یہ ایسا ہی تھا کہ اچانک کسی کینسر کے مریض کو خبر ملے کہ اسے تو کینسر تھا ہی نہیں۔ وہ دین پر پاداشت یا کن سے جبری کسی بھی قسم کی کیفیت کا شکار نہیں تھا۔ اس نے کتاب کو کسی میڈیسن کی طرح سمجھا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ گمراہوں میں گاڑیوں میں گھوڑے کا نعل لٹکاتے ہیں یا پھر کوئی تعویذ یا کوئی دھواگ۔

اس نے دیکھا تھا کہ ہاں امریکہ میں بھی لوگ اس سے ملتی جلتی حرکات کیا کرتے تھے۔ کچھ مخصوص برعکس کے پہلوں سے نئی ہوئی ہونے چاہئے تھی چیز نکلیا کرتے تھے اور پاکستان میں بھی تو لوگ نظر آتے۔ آیت اللہ گلپایگانی۔ کلا کپڑا اور اس طرح کی بد سوری بہت سی چیزیں گھولیا کے اندر اور باہر رکھا کرتے تھے۔

اس نے بھی اس کتاب کو ایسی ہی کوئی چیز سمجھا تھا جسے وہ اپنے پاس رکھے گا اور۔ اور پھر۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بلکہ اس کے کہ اس کے اعمال کیا تھے؟ کسی حیرت کی طرح قرآن کو سینے سے لگائے وہ اپنے پارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔ اپنی چالی سے پارٹمنٹ کھول کر وہ اندر آیا تھا۔ قرآن کو اب بھی اس نے ایک ہاتھ سے سینے سے لگا رکھا تھا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی خلی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور پھر اچانک جیسے اسے کوئی خیال آیا تھا۔ چونکہ اس نے سینے پر بندھے ہاتھ سامنے کیے تھے۔ تو وہی دیر تک وہ برائے نگر کی اس کتاب کو دیکھا رہا جس کی جلد کے اوپر شہری رنگ

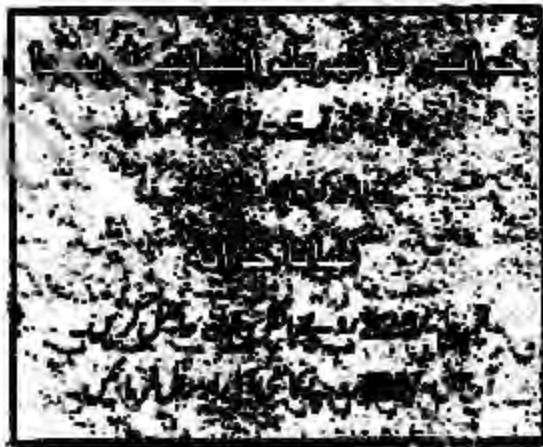
سے کھلے ہوئی کی گئی تھی۔
 وہ اب رو نہیں رہا تھا۔ مگر اس کا سر درد کر رہا تھا۔ کتاب کو سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد وہ اٹھتا ہوا اور کوٹ اتارا اور اسے نائٹ کے بعد وہ کچن میں آیا تھا۔ کچن میں گئے سے پہلے وہ الٹکب کو ساتھ لے کر آتا نہیں بھولا تھا۔ گیان سنگھ کھانا بنا گیا تھا۔ اسے بس لودن میں گرم کرنا اور کھانا تھا بے اختیار اس کے دل میں گیان سنگھ کے لیے تشکر کے تاثرات ابھرے تھے۔ کچن بنا ہوا تھا۔ وہ کھانا نکل کر سینگ روم میں آیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ کتاب کو ساتھ لے کر آتا نہیں بھولا تھا۔ کتاب کو سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ لب کھانا کھا رہا تھا اور کتنے دنوں بعد وہ سکون سے کھانا کھا رہا تھا اور نہ تو اپنے ذہن میں ابھرنے والی اس سوچ کے تحت اس نے منہ کی طرف جاتا ہوا ہوا کہ کر الٹکب کو دیکھا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ یہ یقیناً "اسی کتاب کی برکت کی وجہ سے تھا۔ اس نے کھانا چھوڑ کر کتاب کو پکڑا اور آنکھوں سے لگا کر حرم لیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے بے اختیار اسے زنب کیا یاد آئی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا کہ بچپن میں جب بھی زنب تپا اسے قرآن پڑھنے سے بھائی تھیں تو وہ دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی یوں ہی پارے کو آنکھوں سے لگا کر چھوڑتا تھا اور زنب تپا وہ بہت نرمی سے اسے لور دوسرے بچوں کو ایسا کرنے سے روکا کرتی تھیں لور وہ کہا کرتی تھیں۔

صحابت کے وہی طریقے پھر وہ ہی اصول ہیں جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دلچسپ بتلائے ہیں۔
 کیا اب ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو چھوڑ کر اپنے طریقوں سے عبادت کریں گے؟ کیا اب ہم وہ کریں گے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہ کیا ہو؟
 پھر وہ بے حد مسکرا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتیں اور کہتیں۔

”کتاب“ تھی اور اسی ”کتاب“ کی وجہ سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کچھ نہیں ہونے دے گی۔
اسے ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا، مگر رات کے باوجود کہیں کوئی ڈھارس بھی تھی۔ حادثہ قیوم نے ایک وفد پھر وہ رات سڑک کے کنارے لگے کسی بیچے سو کر گزار دی تھی۔



انہیں ہمیشہ مریضوں کا اپنے کلینک سے صحت یاب ہو کر چلے جانا خوشی دیتا تھا۔ وہ سلا مریض تھا جس کے آنے کی انہیں بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری تھی اور وہ بے ساختہ مسکرائے تھے۔ یوں جیسے اس کے آجانے کا یقین ہو۔ چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ اسے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے۔
وہ بہت محنت دکھائی دے رہا تھا۔ پورے دو دن کے بعد وہ پھر سے ان کے کلینک موجود تھا اور ایسا لگتا تھا کہ دو دن سے نہ ہی اس نے کپڑے بدلے تھے اور نہ ہی شیوہ کی تھی۔ خاموشی سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے کتاب ان کے سامنے ٹیبل پر رکھی تھی اور خود کرسی تھپتھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر حسنت بھی خاموشی سے اسے ٹوٹ کر رہے تھے۔
”کیا ہوا؟“ اس کے جھکے سر کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔
”آپ نے کہا یہ“ شفا ہے۔“



”ہیں کالو ب یہ ہے کہ تم اس کو پڑھو اور سمجھو اور اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔“ اسے کبھی آپا کی باتیں سمجھ نہیں آتی تھیں۔ وہ اب بھی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔
”زیادہ کیا؟“ اس نے زیر لب نام پوچھا۔

چند لمحوں میں ہی خلی بن کی کیفیت میں رہا اور پھر وہ سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے برتن اٹھا کر سنگ میں رکھے ٹیبل صاف کیا اور پھر برتن دھونے کے بعد وہ لیٹنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

اس نے قرآن کو اپنی دائیں طرف سے سلیڈ ٹیبل پر رکھا اور خود جوت سوئے کہے لیٹ گیا تھا۔
”کیا محض اس کتاب کی وجہ سے مجھے نیند آئے گی؟“ وہ دانستہ حسرت کی طرف دیکھے بغیر سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر جھٹکا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ”میرا خیال ہے مجھے پڑنے لینی چاہیے۔“ اس کی اس سوچ نے اسے لٹھے۔
”بیوقوف کیا تھا۔ پڑھنے کے تھوڑی دیر تک وہ بے چینی سے کونٹیں بدلتا رہا اور پھر اسے نیند آئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اور ہمیشہ کی طرح اس کی نیند رات کے درمیان جھے میں ٹوٹی تھی اور ایک گہرا خوف سے بھر اس اس لیتے ہوئے وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لاشعوری طور پر اس نے دائیں طرف موجود رکھی کتاب کو دیکھا۔ وہ وہیں تھی۔ اسے ڈھارس ہوئی۔ مگر اس کی نیند کیوں

ٹوٹی تھی۔ اس نے بے چینی سے بے بسی سے سر کو مسلا تھا۔ اب کی بار اس نے ”کتاب“ اٹھائی اور اسے دیکھا۔ یہ اب تو یہ طے تھا کہ اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی کی طرح پلڑی کی ایک اور خوراک لی اور پارٹمنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ اب کی بار وہ لارٹمنٹ لاک کرنا بھولا تھا اور نہ ہی کتاب اٹھا۔ وہ ایک بار پھر ”کتاب“ کو دونوں ہاتھوں سے سینے میں پیچھے ہوئے سڑکوں پر چلا جا رہا تھا، مگر اب کی بار اس کی حالت پہلے جیسی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں

راہیں کھول دیتا ہے جو ہاتھ اس کے بگھنے کے واسطے کو
 پڑھتا ہے۔
 وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا مگر کئی لمحوں تک
 وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہو رہا تھا۔
 ”میں تو رہنا نہیں جانتا۔“ پھر اس نے کہا۔
 ”تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم پڑھنا کبھی بھی
 جان ہی نہیں سکتے۔“ جواب کیا تھا۔ وہ پھر خاموش ہوا
 تھا۔

”کیسے۔ کہاں سے۔“ اس کی خاموشی دوبارہ ٹوٹی۔
 اور ڈاکٹر حسانت نے اپنے سامنے موہود کارڈ ہولڈر
 میں رکھے کارڈز میں سے ایک کارڈ نکالا اور اس کی بیک
 پر کچھ لکھ کر حارث کو پکڑا یا تھا۔
 حارث نے کچھ حیرانی کے عالم میں کارڈ پکڑا تھا اور
 اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ایک ایڈریس کے ساتھ۔ کارڈ
 کی بیک پر لکھا تھا ”شام 7 بجے۔“ اس نے کچھ الجھن
 کے ساتھ ڈاکٹر حسانت کو دیکھا مگر اب وہ متوجہ نہیں
 تھے۔ وہ ایک اور فائل کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اور وہ
 خوشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔



انہوں نے ہمیشہ کی طرح کلاس میں داخل ہونے
 کے بعد سام کیا تھا اور اجتماعی طور پر سب کا حل پوچھا
 تھا۔ اور حال پوچھنے کے بعد اپنا وہی مخصوص جملہ
 دہرایا تھا۔

”یقیناً اللہ آپ سب کو اپنی رحمت کے لیے جن
 چکا ہے۔“ مدھم مدھم مگر مسکراتا ہوا۔
 انہوں نے مڑ کر اسٹیڈپے لگے رائٹ بورڈ کو سیٹ کیا
 تھا۔ کل کے لیکچر کے لکھے ہوئے الفاظ اس پر سے
 مٹائے تھے اور آج کے لیکچر کی تیاری کرنے لگے تھے۔
 انہوں نے مار کر پکڑ کر اسے چیک کرنے کے لیے
 رائٹ بورڈ کے کنارے پر چند لائنیں کھینچیں اور پھر
 انہیں مٹا دیا۔

وہ آج لیکچر شروع کرنے میں معمول سے زیادہ وقت
 لے رہے تھے۔ اسی دوران انہوں نے کمرے کے

”ہاں تو؟“
 ”مگر یہ۔ یہ کتاب۔ میں دو راتوں سے سو نہیں
 پایا اور میری حالت میں اتنا بھی فرق نہیں آیا جسے میں
 ذرا برابر کہہ سکوں۔“ وہ پریشان تھا اور پریشانی کی وجہ
 سے غصے میں بھی تھا۔

ڈاکٹر حسانت سیدھا اس کے چہرے کو دیکھ رہے
 تھے جہاں پہ بے زاری تھی۔ بے چارگی تھی اور
 لاچاری بھی۔ انہوں نے ایک گہرا سانس بھر کر
 ”کتاب“ اٹھائی۔

”یہ کتاب کوئی ”تعویذ“ نہیں ہے حارث قیوم!
 جسے تم پاس رکھو گے تو ساری بیماری دفع ہو جائے گی۔
 یہ جزدان میں لپیٹ کر سولے کے لیے بھی نہیں
 ہے۔ یہ وہیں کسی طلاق پر تھی رہے گی مگر تم کو کچھ
 فائدہ نہیں دے گی اب تک کہ تم۔“ وہ کہتے تھے۔
 ”جب تک کہ کیا کیا کروں میں۔ بتائے مجھے کیا
 کروں میں۔ میں کچھ بھی کروں گا مگر لڑنے مجھے ٹھیک ہونا
 ہے۔“ حارث نے بے چینی سے بات کئی گھنٹے سے
 لے لے کر دیکھتے رہے۔

”حارث قیوم! جو ہاتھ اس کتاب کی طرف۔ جس
 غرض سے پڑھتا ہے۔ یہ کتاب اس کو وہ ہی دیتی ہے۔
 کوئی ہاتھ کبھی ڈھونڈنا ہے تو اسے کبھی مل جاتی ہے (کافر
 لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن میں غلطیاں ہیں تعویذ اللہ)
 کوئی ہاتھ تو اب کے لیے پڑھتا ہے۔ اسے تو اب
 دے دیا جاتا ہے۔ کوئی ہاتھ راہداریت۔ پانے کو پڑھتا
 ہے اور اسے مل جاتی ہے۔

اور کوئی۔ کوئی تمہاری طرح شفا چاہتا ہے اور وہ بھی
 اسے دے دی جاتی ہے۔
 مگر حارث قیوم! یہ سب تب تک نہیں ہو سکتا۔
 تب تک ممکن نہیں ہے کہ۔ جب تک تم اسے دھو
 گے نہیں اور پڑھنے کے بعد سمجھو گے نہیں اور سمجھنے
 کے بعد زندگی میں اسے اپنائی نہیں کرو گے۔

تب تک۔ تب تک یہ کتاب تمہیں کچھ نہیں
 دے گی۔ کچھ بھی نہیں یہ وہیں کسی طلاق میں آتی رہے
 گی مگر تم کو کچھ نفع نہ دے گی اور اللہ خود اس کے لیے

ہیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی میسرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو موکنا ہے
- بے بال لاکا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بنانا ہے
- مردوں اور بچوں اور بچوں کے لئے
- کبھی نہیں
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 120/- روپے

ذاتی ایسٹریٹس 72 جونی ہائوس کراچی ہے اور اس کی تیاری

کے عرصے میں بہت مشکل میں یہ ایسٹریٹس تیار کر رہے ہیں یہ ہمارے پاس
 ایک اور بڑے شہر میں دستیاب نہیں، اگرچہ میں ذہنی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ
 ہرگز ہی قیمت صرف 120/- روپے ہے، اور اسے شہر والے ایسٹریٹس کو بھی
 اور ہزاروں روپے سے کم قیمتوں پر بیچنے والے ایسٹریٹس کو بھی
 حسب سے بچانا ہے۔

- 2 بچوں کے لئے 300/- روپے
- 3 بچوں کے لئے 400/- روپے
- 6 بچوں کے لئے 800/- روپے

نوٹ: ان میں ذرا غرق اور پینکٹ چارجز شامل ہیں۔

میں آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

پوٹی ہس، 53، نور تجزیہ، روڈ، پینکٹ فور، ایچ اے جٹان روڈ، کراچی

دستی خط بندی والی حضرات، سوپس پیلو ایل آر سکھوں

میں حاصل کریں

پوٹی ہس، 53، نور تجزیہ، روڈ، پینکٹ فور، ایچ اے جٹان روڈ، کراچی

تکبیر، ان ڈائننگ روم، 37، ایچ اے جٹان روڈ، کراچی

فون نمبر: 32735021

آخری سرے تک نظر دوڑائی تھی وہ کہیں نہیں تھا۔
 چند لمحے کے تھے انہیں پھر سے اپنے کام کی طرف
 متوجہ ہونے میں۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھی اور مزکر
 انہوں نے پورڈھ سورہ کا نام اور رکوع نمبر لکھا۔ کالے
 موٹے اور خوب صورت لکھالی والے حروف پورڈھ
 ابھرتے گئے تھے۔

ان کے سامنے بیٹھے لوگوں کے ہاتھوں میں پورڈھ
 لکھی گئی سورت والا پارہ تھا اور دن میں سے جن کو کل کا
 لیکچر یاد تھا وہ ہی رکوع نمبر کھولے ہوئے تھے جو پورڈھ
 لکھا گیا تھا اور جن کو یاد نہیں رہا تھا وہ اب مطلوبہ رکوع
 نمبر کھول رہے تھے۔ اکثر حسنت نے رک کر انتظار
 کیا۔ یہ معمول کا حصہ تھا۔ ان کی نظروں نے اس
 دوران بے بال سے دوروازے کی سمت دیکھا تھا اور یہ
 معمول کا حصہ نہیں تھا۔ جن کو آنا تھا آچکے تھے
 انہیں باپوسی تو نہیں ہوتی تھی بلکہ افسوس ضرور تھا۔
 مگر سانس بھرتے ہوئے انہوں نے لیکچر شروع کیا
 تھا۔

وہاں صرف مومنہیں عورتیں بھی تھیں۔ وہ سولہ
 پائی پارہ کا کمرہ تھا جس کے درمیان میں پارٹیشن کی کئی
 گئی اور وہ سب افراد وہاں قرآن ترجمے کے ساتھ
 پڑھنے آئے تھے۔ اکثر حسنت علی نہیں سکھاتے اور
 نہ ہی وہ کوئی عالم تھے انہوں نے قرآن ترجمے کے
 ساتھ سیکھا تھا اور اب وہ اسے سکھا رہے تھے۔ علی
 سیکھنے کی نسبت قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھنا آسان
 تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی انگلش گرامر کو نہیں جانتا مگر
 انگلش پڑھ لیتا تھا۔ سمجھ سکتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔
 وہ لفظی ترجمہ سکھاتے اور ان الفاظ کے ترجمے سے
 آیت کا ترجمہ مکمل کرتے تھے۔ ان کا یہ انداز سادہ تھا
 اور نسبتاً آسان سمجھی تھا۔ وہ ایک سال میں اسی
 طرح سے قرآن کا ترجمہ ختم کرواتے تھے اور اس ایک
 سال میں بہت سے نئے لوگ آتے اور بہت سے
 پرانے چلے جاتے۔ تک کر قرآن ترجمے کے ساتھ
 پڑھنے والے افراد کی تعداد ہمیشہ کم ہی ہوتی تھی۔ اور
 اکثر وہی لوگ قرآن کو ترجمے کے ساتھ مکمل کرتے جو

کہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اکثر وہ طبقہ نوجوانوں کا ہی ہوتا تھا۔ انگلش اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ کھلتے تھے۔ اور آج بھی وہ اپنا لیکچر شروع کر چکے تھے۔ جس کو نہیں آتا تھا وہ نہیں آیا تھا اس کمرے میں پیشہ افراد کی تعداد کے حساب سے کرسیاں لگائی جاتی تھیں۔ اور جب بھی کوئی نئی کرسی لگائی جاتی سب ہی سمجھ جاتے کہ کوئی نیا فرد آنے والا ہے۔ آج بھی اک نئی کرسی لگائی گئی تھی مگر وہ نیا فرد نہیں آیا تھا۔

”ہمیں آسکا“
 ”مگر کیوں؟“
 ”آپ جو پرچار ہے تھوہ مشکل تھا اور سمجھتے باہر بھی۔“ ہم نے ٹھہر کر بات مکمل کی تھی۔
 ”تو تم“ وہ آگے بڑھے اور اس کا کندھا تپتہ پاپا تھا۔
 ”یہ آسان ہے۔ بہت آسان۔ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ“ وہ اب کہہ رہے تھے۔



ایسٹ گرین ویج ٹاؤن کا ایک گھر تھا۔ جس کے سولہ بائی پارے کے ایک کمرے میں حارث قیوم بیٹا تھا۔ اور وہ گھوڑا کٹر حسنت کے گھر کا ڈرائنگ روم تھا جسے وہ بطور لیکچر روم استعمال کیا کرتے تھے۔ حارث اپنے لیے لگائی کرسی تھی۔ کبھی بھی نہیں بیٹھ سکا تھا۔ اس کلاس کا حصہ بھی کبھی نہیں بن سکا تھا۔ حارث کا

لیکچر کے دوران بھی وہ بار بار اس خالی کرسی کو دیکھتے رہے۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے گا تو وہ پوری طرح سے لیکچر میں مگن ہو گئے تھے۔ لیکچر کے ختم ہوتے ہی کچھ لوگ تو فوراً مصافحہ کرتے چلے گئے تھے اور وہ جن کو جلدی نہیں تھی وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی پیشکش چھوڑ کر ڈاکٹر حسنت سے نا سمجھ میں آنے والے الفاظ کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔

شمار ان لوگوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا جنہیں عام کہا جاسکتا ہو۔ عام لوگ عموماً قرآن پڑھنا جانتے تھے۔ وہ نہیں۔ عام لوگ عموماً دین کے بارے میں بنیادی باتوں سے آگاہ تھے۔ بد قسمتی سے اب بھی وہ نہیں۔ ڈاکٹر حسنت اسے کبھی کلاس کا حصہ بنانی نہیں سکے تھے۔ ان کے لیے کسی نئے کی طرح تھا۔ انہیں اسے ایسے ہی ٹیٹ کرنا تھا جس طرح کہ کسی بچے کو کیا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب آخری شخص بھی ان سے مصافحہ کر کے چلا گیا تو انہیں پھر سے حارث کا خیال آیا تھا۔ بے ساختہ انہوں نے اس نئی لگائی کرسی کی طرف دیکھا۔

”مجھے اس دن کا انتظار رہے گا جب تم ادھر بیٹھو گے“ اس کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

انہوں نے اسے قرآن پڑھا لیا اور اس کا ترجمہ سکھایا اور نہ تو صرف ہم لکھ پڑھتا جاتا تھا۔ اور حارث اس نے کہا تھا کہ وہ کچھ بھی کہے گا۔ کیونکہ اسے شفا چاہیے تھی۔ اور اب کی بار بھی وہ قرآن کی دینی جذبے یا پھر آخرت کے خوف کی وجہ سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ تو محض اسے اپنا علاج سمجھ کر سیکھ رہا تھا۔ محض اک علاج۔

انہوں نے دست و پاچ کو دیکھا تھا شام کے سات بج رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد مغرب کی نماز تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد پلٹے تھے اور یہ ان کی زندگی کا حیران کن پل تھا۔ وہ دروازہ سے ٹیک لگائے چہرے پر بچوں کی سی مصعوبیت لیے جوتے کی ٹوہ سے زمین کو کھینچ رہا تھا۔

”حارث!“ وہ شدید حیران تھے۔ اس نے سراٹھا کر کہا تھا۔

”گوریہ وہ کتاب ہے کہ اس کی طرف جوا تھا جس غرض سے پڑھتا ہے اسے اس کی اس ہی غرض کے

”تم اندر کیوں نہیں آئے؟“ حیرت ابھی بھی باقی تھی۔

ساتھ لوٹایا جاتا ہے۔

مگر آج۔ آج کیا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹھا۔ لور ٹھٹھا کر رہا اور
رک کر جسم سنگ ہو گیا تھا۔

”حادثہ“ اسے متوجہ نہ پا کر ڈاکٹر حسنت نے
اسے پکارا تھا۔ چونکہ لور انہیں دیکھ اور دیکھ کر
متوجہ ہوا۔

ڈاکٹر حسنت اس کے متوجہ ہونے پر وہاں بولنے
لگے تھے۔ ڈاکٹر حسنت اس آیت کا مطلب واضح
کرتے ہوئے اسے ایک بدکار عورت کا واقعہ بتا رہے
تھے۔

”و عورت جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوئی اور بدکاری کی سزا چاہی مگر وہ حاملہ تھی۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کی ولادت ہونے تک
سزا کو ٹل دیا۔ پھر آئی بچہ تولد ہونے کے بعد آپ
صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اسے یہ کہہ کر ٹل دیا کہ وہ
شیر خوار بچے کو دودھ پلائے۔ دودھ پلانے جانے کی عمر
تک اور جب۔ جب یہ مدت بھی پوری ہوئی تو وہ
عورت دوبارہ آئی اور سزا کی طلب گار ہوئی۔“

اسے سزا دی گئی۔ سنگسار کیا گیا اور سنگساری کے
دوران جب خون کے چھینٹے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ
عنه کے کپڑوں پہ پڑتے ہیں تو وہ کراہیت کا اظہار
کرتے ہیں لور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کراہیت
کے اظہار پر فرماتے ہیں۔

”مگر اس عورت کی توبہ دینے کے مترکناہ گاروں
میں بھی ہانٹ دی جائے تو وہ سب بھی بخشے جائیں
گے۔“

(صحیح حدیث کا مفہوم)

ڈاکٹر حسنت بول رہے تھے اور وہ پھر سے اسی
کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔

اس پہ کچھی نہیں طاری ہو رہی تھی مگر وہ خود کہ
سنبھل بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ کیا تھا جو اس کے دل پہ
ابھی ابھی اترا تھا۔ وہ کیا تھا۔ آخر وہ کیا تھا۔ اگر وہ قرآن
تھا تو وہ پچھلے ایک سال سے جوڑ رہا تھا۔ سیکہ رہا تھا
کیا تھا؟ اس نے دل کی دھڑکن کو تیز ہوتے محسوس
کیا۔ نہیں شاید اس نے دل کی دھڑکن کو ڈبھتے

و اپنے حال میں کھڑا ماضی کو دیکھ رہا تھا اور اسے
ماضی اک مذاق کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
لور اگر آج۔ آج اسے ماضی میں چلنے دیا جاتا تو اسے
حل کبھی بھی اک مذاق کے سوا کچھ محسوس نہیں
ہوتا تو وہ سہ ساعتیں تھیں مگر وہ کب آئی
تھیں اس کی زندگی میں اس نے سوچنے کی کوشش
کی۔ مگر ہر کوشش اس لیے نہیں ہوتی کہ باہر
ہو سکے اور اسی کوشش میں اس نے تکلیف کی اک
اور لبر کو برداشت کیا تھا۔

ہاں! تو وہ سہ ساعتیں وہ کیا تھیں۔ کب
تھیں کہ لوہے کو سونا بنانے تھیں اب کی بار اس نے
آنکھیں لور ہونٹ بھیج کر رو کی شدت کو روکا تھا۔ وہ
کیا تھا جس نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ آخر وہ کیا تھا وہ جاتا
چاہتا تھا۔

لور پھر اسے یکدم۔ بہت اچانک ڈاکٹر حسنت یاد
آئے تھے اور ان کی کئی بات بھی۔
تو وہ وہ انسان۔ جو کہ کبھی لوہا تھا وہ رنگ آلود لوہا۔
وہ لہا ہی رہتا اگر...

”زانی مولود عورت کو سو سو کوڑے مارو لور وہ
آئے تم کو ان دونوں پر ترس اللہ کے دین میں اگر ہو تم
ایمان رکھتے اللہ لور یوم آخرت یہ لور چاہیے کہ ان
کے عذاب کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود
ہو۔“

(سورہ لور)

و تقریباً ایک سال سے اس کتاب کو سیکھ رہا تھا
جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس میں شفا
تھی۔

اور اس ایک سال کے دوران وہ کسی آیت۔ کسی
ڈراوے۔ کسی خوش خبری پہ ٹھٹھا کر رہا نہیں تھا۔ وہ
اسے علم سمجھ کر سیکھتا گیا اور شفا کے لیے عمل کر گیا

ہوئے محسوس کیا تھا۔ ڈاکٹر حسانت کہہ رہے تھے۔ اور
تو از کا سماعت سے رشتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ یہ ذہن کا قسم
سے تعلق تھا جو کہ ٹوٹ رہا تھا۔

”زینب تپا۔“ اس کے ہونٹوں نے بلا آواز اس نام
کو دہرایا تھا۔

اسے وہ کوڑے یاد آئے۔ اپنی کرپہ برستے وہ
کوڑے وہ تنگی سڑک اور برہنہ جسم یاد آیا۔ سڑک پہ
کھڑا کاشیاں لڑتا۔ لعنت کرتا وہ نجوم یاد آیا۔ زینب تپا کا
وہ یاد آیا اور۔ اور سمجھ میں بھی آ گیا تھا۔
وہاں بیٹھے بیٹھے اس پہ جیسے ایک ایک چیز آشکار
ہوتی تھی۔ واضح ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر حسانت نے ایک دفعہ پھر اس کی بے توجہی
بجائی تھی نہ پھر سے اس کی توجہ کو کھینچنا چاہتے تھے مگر
انہیں لگا کہ کم از کم اب کی بار وہ ایسا نہیں کہائے۔ وہ
وہاں نہیں تھا۔ یقیناً وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کا
ساکت جسم شری ہوئی آنکھ۔ یہ یہ بتانے کو۔ گواہی
دینے کو کافی تھی کہ حادثہ یوم وہاں نہیں تھا تو۔ تو پھر
وہ کہاں تھا۔ کہاں؟؟؟

”بعض نشان زخموں سے زیادہ اذیت دیتے ہیں۔“
اس نے باز گشت تھی۔

”یہ نشان کیسا ہے؟“ ابھی ابھی ساتھ کا لمس عین
اسے اپنی کرپہ محسوس ہوا۔

لور نشان دیکھنے لگا۔ سرخ انگارے کی طرح اور دہک
کر جلنے لگا اور جل کر اسے بھی جلانے لگا۔ وہ بھلا۔ اور
اس طرح سے بھلا کہ قطرو قطرو پئے لگا۔ ڈاکٹر حسانت
یک تک اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ
کسی آیت کو سن کر یوں ہو گیا تھا۔

وہ کیوں اسے متوجہ کرتے۔ یہ ہی تو وہ لہ تھا۔
انہوں نے کتاب بند کی۔ سائیز پر رکھی اور نموشی سے
اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

آج کا سبق کافی تھا۔ اور ان کا کام بھی یہیں تک
تھا۔ اور آگے اللہ جانے لور اس کا بندہ۔ ہر شخص اپنے
تعلق کا خود ذمہ دار ہے۔ اس تعلق کا جو اس کا اپنے اللہ
سے ہے۔ کیا ہے... ہے بھی کہ نہیں۔ زیادہ یا کم۔ گرا

شفیق بھائی اس کے منہ سے پولیس اسٹیشن کا نام
سن کر حیران نہ ہوتے تو لور کیا کرتے۔ وہ اب کیا کر کے
آ رہا تھا۔ ایسا کیا کر دیا تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن جانا چاہتا
تھا۔

”حادثہ! کیا کر دیا؟“ بے ساختہ وہ بولے۔

اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور پھر وہ خود
بستر سے اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ اس نے بستر کے ساتھ
رکھی گئی میز سے بھی اپنی چیزیں اٹھانی شروع کر دی
تھیں۔ وہ یقیناً خود جا رہا تھا۔ شفیق بھائی کے چہرے پہ
بڑا بڑا انگارہ جو لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”حادثہ!“ انہوں نے کندھے سے پکڑ کر اسے
رودکا۔

”یار! کچھ بتاؤ۔ کچھ سمجھاؤ تو سہی۔ آج بھی
تمہاری اگلے بندے کو غلط سمجھنے والی عادت نہیں
پہلی۔“

اب کی بار حادثہ قیوم بری طرح سے شرمندہ ہوا
اور اب وہ اکثر۔ ایسے ہی بری طرح سے شرمندہ ہو چلا
کر رہا تھا۔

”آپ مجھے لے چلیں۔ میں آپ کو راستے میں
بتاؤں گا۔“ وہ اسی شرمندگی کے زیر اثر ہوا۔
”۱۹۴۳۔ پلور۔“ اور شفیق بھائی نے یقیناً ”اسے لالی
پاپ دیا تھا۔“

زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ کیا کرتی ہے۔ آخر یہ کیا کرتی
ہے آپ کے ساتھ۔ کس کس طرح سے اور کہاں
کہاں سے کیسی کیسی حقیقتیں آپ کے سامنے لا کر
اسے آپ کے منہ پر دے مارتی ہے۔ مگر کیا واقعی ہے
سب زندگی کرتی ہے؟
کیا یہ سب وہ نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں زندگی
ہے۔

”ہم نے توبہ کب کی تھی؟“



واکنڈ حسرت نے اس کے دل پر اور دل میں کسی چیز کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وعظ نہیں سنائے تھے۔ جنت و جہنم کی بشارتیں نہیں بڑھ بڑھ کر بتائی تھیں۔ جہنم۔ عذاب گھولنا پالی۔ پیپ کی خوراک کی کہانی نہیں سنائی تھی۔ انہوں نے وہ ہی کیا تھا۔ جو اس جیسے انسان کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ قلم۔ قلمرو اس میں اٹھاتے گئے تھے۔ کسی امرت کی طرح۔ اور کتاب۔ یہ تو وہ ہے جو اگر پھاڑ پھاڑی کر دی جاتی تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا تو انسان۔ کیا وہ اس قاتل ہے کہ اسے ایک بار ہی میں۔ ایک گھونٹ میں ہی۔ سب کچھ کھول کر پٹا دیا جاتا۔

اور۔ حارث قیوم اور قیما۔ اس قاتل نہیں تھا۔ ہر کتاب کھلنے والا استلو نہیں ہوتا مگر اسے ہونا چاہیے۔ یہ گرائے ہاتھوں پر ڈھکے مار کر کھلائی جانے والی چیز ہوتی تو کوئی ابو جہل۔ ابو لباب نہ ہوتا۔ ”یہ نجات کو محبت سے سکھایا جانے والا کلم ہے۔ اور اس کے کھلنے والے کے ہاتھ اور لبان میں نجات ہو۔“

”چہ معنی وارث؟“

اور حارث قیوم۔ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ قرآن کو سیکھتا گیا۔ محض شفا کی خاطر یہ اس کے لیے کسی نئے کی طرح تھا جس میں لکھا ہوتا تھا ایک گویا صبح۔ ایک دن ہر اور وہ چھ رات میں۔ اس نے قرآن کو ایسی ہی مینڈھن سمجھا تھا جو اسے کسی خاص مدت تک کھلائی تھی۔ مگر اس کی حالت میں افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی راتوں کو سو نہیں پاتا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح سے ”موت“ سے خوف زدہ تھا۔ وہ ابھی سیلینگ پڑھتا تھا۔

اور وہ رات۔ جب اسے قرآن سیکھتے ہوئے مسلسل سات دن ہوئے تھے۔ اس ساتویں دن کی

تو ابھی ابھی ایسٹ گرین وچ ٹاؤن میں واقع ایک گھر کے سولہ ہالی بارہ کے کمرے میں بیٹھے شخص کے ساتھ بھی کی ہوا تھا۔

اس کے ساتھ بھی زندگی کو ہاتھ میں رکھنے والے نے یہی کہا تھا۔ اور وہ اس وار کو سینے اور سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ جو بن کو ڈائن کتا تھا اور یہ کتا تھا کہ تم جیسی کوئی بن نہیں کوئی گلہ ہی ہو سکتی ہے۔ اسے آج۔ اتنے عرصے بعد۔ سن سمجھ میں آئی تھی۔ پانچ سال پہلے بن کی وجہ سے جب شہرے اسے پکڑ کر لے جا رہے تھے تو وہ کیسا حیران ہوا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے ”نزیبا“ چورہ سل پہلے جب بن نے اسے جیل سے رہا کرانے سے انکار کیا تھا تب بھی وہ کیسی حیرت کا شکار ہوا تھا۔ آج تمام ترجیحوں کے رفع ہونے کا دن تھا۔

تو زینب قیوم چاہتی تھیں کہ حارث قیوم کو کیے گئے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی ملے۔ آگے جب وہ جائے تو اس کے نامہ اعمال میں یہ لکھا ہو کہ حارث قیوم ولد عبد القیوم فلاں فلاں جرم کا سزایافتہ ہے۔ اور وہ اس نے کیا چاہا تھا۔

دنیا کا عیش اور آخرت کی۔ بے ساختہ اس نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔

اس بدکار عورت نے توبہ کی اور ایسی توبہ جو کہ ستر گناہ گاروں کو بھی بخشواوے مگر پھر بھی وہ شرعی ”حد“ سے نہ بچ سکی۔

توبہ آخرت کی نجات ہے۔ دنیا میں کیے جانے والے گناہوں کی سزا ہے۔ جو کہ پورا کرنی ہے تب بھی جب آپ توبہ کر چکے ہوں۔

اور حارث قیوم۔ کتنے اور کوڑے؟۔ کتنے اور سٹرو؟ اس نے حساب لگانا چاہا۔ اور وہ غصہ کر گیا تھا۔ ہفتہ کے پانچ دن گناہ کرنے والا شخص کس طرح سے یہ حساب لگا سکتا تھا۔

”ہم نے دنیا کی سزا پوری نہیں کی تھی تو آخرت کی نجات کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کی توبہ۔“ اور اس لفظ پہ اگر جیسے اسے چار ہزار الٹ کا جوڑ لگا تھا۔

ہے۔ وہ سیدھا اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے ہول رہے تھے۔

”یہ زبردستی کا کام نہیں محترم۔ نہیں سیکھنا تو جاتو۔ تم نہ سہی۔ کوئی اور سہی۔ اللہ کسی اور کو لے آئے گا میرے سامنے۔ کوئی اور بالکل تم جیسا۔ اندھا۔ گولڈ۔ اور بہرہ۔ اور اللہ چاہے تو وہ اس کی بصارتوں کے سماعتوں کے اور لیوں کے ہرے ایک ایک کر کے ہٹا دے گا اور اگر اللہ چاہے۔ تو یہ سب میرے ذریعے سے ہوگا۔ مگر وہ تم نہیں ہوگے۔ وہ یقیناً کوئی اور ہوگا۔ کوئی اور۔ کہ جسے اللہ بدل دے گا تم سے۔ مگر یہ کہ وہ تم سے بہتر ہوگا۔ ہول کہ میں ارادہ کر دکھاؤں اور میرے پاس سیکھنے والوں کی کمی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔“ بے باثر۔ لٹھا لٹھا۔ ایسا لٹھا لٹھا جو کمری میں سوئی کی یاد دلا دے۔ حارث کا رنگ بدلا تھا۔ بے اختیار۔ وہ لب چیزیں سمیٹ رہے تھے۔

”اب تم جاؤ حارث۔ تمہیں دینا تمہاری بھینٹ ہے۔“ کڑے ہو کر قدرے نرم لہجے میں اب کے کہا گیا تھا۔ حارث قیوم کھڑا ہوا۔ اسے غصہ پھر سے آیا اور اسی غصے میں وہ زور دار ٹھوکر کرسی کو مار کر چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر حسنت کھل کر مسکرائے تھے۔ وہ بچہ تھا۔ بالکل بچہ۔ کیا اب کوئی نفسیات کے ڈاکٹر کو بچہ بتائے گا کہ مریضوں کو کس طرح سے پینٹل کرنا ہے۔



اور اس ساتویں دن کے ٹھیک سات دن بعد۔ ”کیا دینا گھونٹنے اور گھوم کر چیک کرنے کے لیے محض سات دن کلنی ہوتے ہیں؟ کیا یہ کام سات دن میں ہو جاتا ہے؟“ چھیڑتا ہوا مگر مسکراتا لٹھا۔ اور نہ نوج ہوا شخص۔

”اب کا کام سے نکھلا۔ اس سے لاہوا ہو کر کہہ سکتے والا کیسا ہے۔ کون ہے اور یہ کہ وہ کیا کر کے آیا ہے۔“ اور ڈاکٹر حسنت کی مسکراہٹ مٹھی اور سمٹ کر پھر

رات میں۔ جب وہ ساری رات گرین روم کی سڑکوں پہ خوار ہوتا رہا تھا اس ساتویں رات کے دن میں وہ ڈاکٹر حسنت پہ برس پڑا۔

”آپ مولوی لوگ۔ آپ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جمونے۔ اور فریب دینے والے۔ آپ نے جھوٹ بولا۔ آپ نے غلط کہا۔ یہ شفا نہیں ہے۔“ اس نے ڈاکٹر حسنت کے سامنے رکھی گئی کتاب پہ انگلی بجا کر کہا تھا۔

”آپ نے کیا اللہ سے ٹھیک لے رکھا ہے ہر انسان کو سزا دینے کا۔ ہر ایک کو جنت میں بھجوانے کا۔ کوئی آپ سے پوچھے۔ کس نے حق دیا آپ کو۔ مجھ جیسے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کا اور میں۔ میں۔ پاگل۔ گدھل۔ اجرت۔ الو۔ کیا ہوں میں۔ جو آپ کے جھانے میں آ گیا۔ آپ کی باتیں لے ڈیو میں مجھے افسوس۔ پھر سے افسوس۔ مجھے دنیا گھوم کر دیکھ لینی چاہیے تھی۔“ اشتعال سے بولتے بولتے وہ آخر میں رونے لگا تھا۔ ڈاکٹر حسنت نے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ سامنے موجود رونے اور پلٹتے شخص کو دیکھا۔

”تم اب بھی آدلو ہو۔ دنیا کو گھوم کر چیک کرنے میں مگر مجھے حیرت ہے کہ تمہیں۔ میری یہ بات یاد رہی مگر یہ یاد نہ رہا کہ یہ۔ یہ مقدس کتاب۔“ انہوں نے کتاب ہاتھ میں پکڑ کر فضا میں بلند کر لی تھی۔

”یہ تب تک آپ کو کچھ نہیں دے گی جب تک کہ اس کے سیکھے گئے الفاظ پہ عمل نہ ہو۔“ وہ ڈاکٹر حسنت کی بات کو کٹ کر رو کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا تھا۔

ان کا سرو لہجہ ہڈیوں میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”کیا میں نے تم کو یہ نہیں بتایا تھا۔ حارث قیوم یہ یاد کرو۔ کیا میں نے یہ حقیقت تمہیں آشکار نہیں کی تھی۔ مجھے کیا قطع۔ کیا فائدہ۔ کیا حاصل۔ کہ کسی گندگی میں لتھڑے شخص کو اٹھاؤں اور اسے بتاؤں کہ وہ کس قدر گندا ہے۔ اور یہ کہ وہ کس طرح سے صاف ہو سکتا

سے پہلی مہلی سے قدرے زیادہ۔
 ”پہلی معقول بات۔“ انہوں نے پھر سے چرایا۔
 اور وہ پھر سے چڑھی گیا تھا۔
 ”آپ؟“ اس نے وائٹ چیس کر کہا۔
 ”عمل کرو گے؟“ نرمی سے سوال کیا گیا۔
 دھوکہ شش کروں گا۔“ دوسرا معقول جواب آیا تھا۔
 تو ساتویں دن کے ٹھیک سات دن بعد۔ سیکھنے اور
 سکھانے کا عمل پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ ساتویں دن
 کے ٹھیک سات دن بعد۔

ظہر ہدایت“ یہ دیکھنے۔ سننے بڑھنے اور لکھنے میں
 اتنا عام سلفاظ ہے کہ ہر دوسرا شخص اسی کو دہراتا رہتا
 ہے مگر ہوں۔ مگر جب یہ کسی کی زندگی میں آتا ہے تو
 یہ ہرگز ہرگز بھی عام نہیں ہوتا۔ یہ دراصل کسی سعد
 ساعت کی طرح ہوتا۔ کوئی جاہلی لحد۔ اور ایسا دوسری
 ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ تب جب انسان یہ فیصلہ کرتا ہے
 کہ اسے دین کی طرف آنا ہے اور دوسری دفعہ تب
 جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے اسی طرز زندگی پہ
 قائم رہنا ہے۔ کچھ عرصے پہلے جب حادثہ قیوم
 ڈاکٹر حسانت کے کلینک پہ بیضا الکتاب پہ ہاتھ رکھ کر
 کہہ رہا تھا کہ اسے شفا چاہیے۔

وہ لحد۔ وہ اس انسان کی زندگی کا پہلا پارس لحد تھا۔
 اور آج جب وہ اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت پہ
 ٹھنک کر رہتا ہے تو وہ ایک سولہ ہائی پارے کے کمرے کی
 کرسی پہ بیٹھا سنگ ہوا شخص۔ کہ جس کی کمرے کے
 لہریے وار نشان دکھ رہے تھے۔ اور وہ جل رہا تھا۔
 ہاں۔ وہ جل رہا تھا۔ ہٹا آگ کے۔ اور اس کی آنکھوں
 میں جمع ہونے والا پانی۔ اس ہٹا آگ والی جلن کی پیش
 سے سوکھ سوکھ کر دھواں بن رہا تھا اور وہ سارا کا سارا
 دھواں اس کے اندر ہی جمع ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دھواں ہو
 کر راکھ ہوتا اور راکھ ہو کر خاک ہوتا اور خاک ہو کر
 بکھرتا وہ شخص۔

مگر اسے مقام حیرت۔ کہ وہ ابھی بھی سنگ ہو کر
 کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اور دوسرے بالکل صحیح سلامت دکھتا
 تھا۔

تب ہی۔ تب ہی اس نے دوسرے آئی آواز سنی۔
 براہم۔ خوب صورت۔ خوش الحان آواز۔
 ”اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔“
 تو یقیناً ”بڑا ہی ہے۔ سب سے بڑا ہی تو میرے
 جیسا شخص لوہرہاں اس کمرے میں بیٹھا ہے۔
 ”میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود
 نہیں۔“

”ہاں!۔ دی گواہی۔ دی میں نے گواہی اور آج
 صدق دل سے دی۔ کیا کسی اور میں اتنی طاقت تھی کہ
 وہ مجھے یہ راہ دکھلا سکے۔“

اس نے دل کو پیچھے ہونے کتے سنا مگر اس کے
 ہونٹ حسب تھے۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ
 کے رسول ہیں۔“ ان لفظ پہ اس نے اپنے دل کی
 حالت کو عجیب تر ہوتے محسوس کیا تھا۔ تو اس کا بھی
 کوئی ثبی تھا۔

”آؤ نماز کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔“ اور وہ اٹھ
 گیا تھا۔ بے ساختہ بے اختیار۔ اس لمحے کتنے لوگ
 ہوں گے جو اس طرح۔ محض اک آواز پہ اٹھ جاتے
 ہوں گے۔

حادثہ قیوم نے خود کو اس لمحے خوش قسمت ترین
 شخص محسوس کیا تھا کہ وہ اسی گروہ کا حصہ بنا دیا گیا
 تھا۔

”دو ڈو کامیابی کی طرف۔ دو ڈو کامیابی کی طرف“
 اس آواز پہ اٹھ کر کھڑے ہو کر۔ ہر بڑھتے قدم کے
 ساتھ۔ وہ خود کو کامیابی کی دوڑ میں شامل کرنے کا فیصلہ
 کر چکا تھا۔

اک دوسرا جاہلی لحد۔ اک اور سعد ساعت۔
 ”اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔“

مسجد کی طرف چھوٹے چھوٹے مگر مضبوط قدموں
 کے ساتھ چلتے شخص سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا کہ
 اللہ کتنا بڑا ہے۔

”نہیں کوئی معبود مگر سوائے اللہ کے“ اس آخری
 پکار پہ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ کس نظر سے

دیکھا۔ کیا اب بھی بتانا چاہیے کہ کس نظر سے دیکھا۔

”توبہ کیا ہوتی ہے؟“

”کامیابی کی طرف پہلا قدم۔“

”پھر آخری قدم؟“

”اسی توبہ جو ستر گناہ گاروں میں باقی جائے تو وہ
انہیں بھی بخشا دے۔“

ڈاکٹر حسانت نے اس سے پوچھا تھا کہ۔

”عمل کرو گے؟“ اور اس نے کہا تھا کہ کوشش

کریں گا۔

مگر وہ ایسی کوشش تھی کہ ایک سال سے الکتاب
سیکھنے کے بلوچہ ”شفا“ کے مضموم کو بھی جان نہیں
پایا تھا۔ اس کو بھی کسی دوا کی طرح ہی سمجھا تھا۔ پھر وہ
ہی طرز سوچ۔

پھر اللہ کو کیا فرض کہ آپ ان میں کتنی دفعہ زمین پر
نکریں مارتے ہیں۔

اسے سجدہ چاہیے۔

اور وہ جو کرتا تھا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر ”سجدہ“

نہیں۔ رٹے رٹائے چند الفاظ۔ بے دلی سے کی گئی چند
حرکتیں۔

اور توبہ۔

یہ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی اور نہ ہی اس

نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی وہ یہ

سمجھتا تھا کہ اس نے کوئی گناہ کیے تھے۔ تو پھر۔ پھر۔ یہ

کہل سے آگئی تھی اور اس کی زندگی کو یوں کر دیا تھا

جیسے کسی بھرے پیالے کو پکڑ کر الٹ دیا جائے۔

ہر چیز جیسے اپنے مقام سے ہل کر رہ گئی تھی۔ اور اپنی

جڑ کے مقام سے اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھی۔ وہ اگلے

دن نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے سے اگلے دن بھی نہیں آیا

تھا۔ اور پھر تیسرے دن وہ ڈاکٹر حسانت کے سامنے

موجود تھا۔

ستا ہوا چوہ۔ بڑھی ہوئی شیو اور سرخ آنکھیں

لے۔ یوں جیسے وہ پچھلی دو راتوں سے سخت تکلیف

میں تھا۔ سخت بے چینی و اضطراب کا شکار رہا تھا۔

انہوں نے بس ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا

تھا۔ جھکا ہوا سر۔ بھینچے ہوئے ہونٹ۔ کچھ کہنے کی

کوشش کرتے ہوئے۔ اور اسی کوشش میں ناکام

ہوتے ہوئے۔

”حادثہ؟“ انہوں نے تسلی کے سے انداز میں اس

کے گھٹنے ہاتھ رکھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حسانت کو دیکھا بس ایک

نظر ایسی نظر جو کہ شکستہ تر تھی۔

”ایک سال سے شفا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہ ہی تلاش

مجھے اس کتاب تک لے آئی۔ میں سیکھتا رہا۔ مگر یہ

احساس تک نہ ہوا کہ کیا سیکھ رہا ہوں۔ گناہ۔ توبہ۔

سزا۔ جزا۔ سب بڑھتا مگر یہ تک جان نہیں پایا کہ آخر

مجھے کرنا کیا ہے۔ اور توبہ اس کا خیال مجھے اتنا ہوس

بارے کی دوسری سورت یہ آتا ہے۔ پہلے بارے کی

پہلی سورت یہ کیوں نہیں آیا۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو کہ

میری سماعت اور دل کے درمیان حائل تھی کہ میں

سن کر بھی دل میں اتار نہ سکا۔ آخر ایسا کون سا پروردہ تھا

کہ دیکھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ میں اتنا اندھا تھا کیا؟ یہ

اب ہی کیوں ہوا؟ یہ پہلے کیوں نہ ہو گیا۔

آخر کیوں؟“ اس کی آواز۔ اس کا چہرہ جیسے ہر

تاڑ کا آئینہ بن گیا تھا۔ دکھ۔ پشیمالی۔ شرمندگی۔

اضطراب۔ ہر چیز کا۔

”قرآن تب تک کسی کے دل پہ اثر نہیں کرتا۔

جب تک کہ اس کا دل شفاف نہ ہو۔ اور دل کی

شفافیت کیا ہوتی ہے۔ حادثہ قیوم؟“ وہ ان کو منہ اٹھا

کر دیکھ ہی سکتا تھا سو دیکھ رہا تھا۔

”جب کوئی مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پہ

ایک سیاہ نقطہ لگھوایا جاتا ہے اور پھر اگر وہ توبہ کرے اور

گناہ کو چھوڑ دے اور اللہ سے معافی مانگے تو اس کے

دل کو صاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ گناہ میں بڑھ

جائے تو اس کے دل کی سیاہی بھی بڑھ جائے گی۔

(مضموم حدیث) تو سو جو حادثہ قیوم جب دل کی سیاہی

بڑھتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ جب انسان گناہ پہ گناہ کرنا

ہے تو اس کا دل کیسا سیاہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ایسا نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر حسنت نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی قریب رکھے پانی کے گلاس میں ڈالی تھی۔ سیاہی تیزی سے پانی میں حل ہو کر اسے سیاہ کر رہی تھی۔

حادثہ دم بخود اس عمل کو ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب مکمل طور پر سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ پانی نہیں اس کا دل تھا۔ وہ سیاہی نہیں۔ اس کے گناہ تھے۔ اس نے دکھ سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

”تم نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ اٹھارہ برس پارے کی دو سری سورت یہ کیوں ہو؟“ پہلے پارے کی پہلی آیت یہ کیوں نہ ہو گیا۔ کیا اب تم سمجھ سکتے ہو۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟“

ڈاکٹر حسنت کی تواریخ اس نے آنکھیں کھول کر سیاہ محلول والے گلاس کو دیکھا تھا۔ ”اب بھی تو میرا دل۔“ انہوں نے حادثہ کی بات کاٹی۔

”نہیں۔ حادثہ۔ نہیں اب یہ سیاہ نہیں ہے۔ دیکھئے ایک سال سے قرآن تمہارے دل کو صاف کر رہا تھا۔ اس طرح۔“

اب کی بار انہوں نے صاف پانی والے جگ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ صاف پانی سیاہ محلول والے گلاس میں ڈالتا شروع کر دیا تھا۔

پہلے گلاس کناروں تک بھر اور پھر وہ کلا پانی پینے لگا یوں کہ وہ ہمہ گیر میز کی سطح پر پھیلا اور پھیل کر نیچے فرش پر گرنے لگا۔ وہ ایک دلچسپ پھر سے ساکت ہوا تھا۔ گلاس کا پانی صاف ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ۔ مگر وہ صاف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنت مسلسل جگ سے پانی اندھا دیکھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ گلاس ایک دلچسپ پھر صاف اور شفاف پانی سے بھر گیا تھا۔

”گور اب۔ تمہارا دل صاف ہے تو جان سکتے ہو کہ جو تم بڑھ رہے ہو کیا ہے۔ کیوں ہے۔ کس کے لیے ہے۔ تمہیں اس قاتل بتایا گیا ہے تم اس کو سمجھ سکو۔ گناہ پہ پشیمان ہو سکو اور توبہ کو سمجھ سکو۔ اور یہ یہ۔“

سمجھ سکو کہ ڈاکٹر نے دلی جھڑپ نہیں۔ موت کے بعد کا انجام ہے۔“

سر سرائی ہوئی آواز اس کی سامنے تک پہنچی تھی اور کسی کھلی کی طرح پورے بدن میں پھیل گئی تھی۔ ”تمہارا اسوئل بجا ہے۔ درست ہے یہ ہو سکتا تھا۔“

پہلے پارے کی پہلی ہی آیت یہ مگر اس کے لیے شرط تھی کہ یہاں۔ اس کمرے میں اس کرسی پر تمہارے بجائے ایسا شخص بیٹھا ہو تاکہ جو صدق دل سے توبہ کر کے آیا ہو تو یہ تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا اور جانتے ہو توبہ کیا کرتی ہے؟“ وہ اب وہاں گلاس کے پانی میں سیاہی ملا رہے تھے اور پھر انہوں نے ایک جھٹکے سے اس پانی کو دور پھینک دیا تھا۔ وہ حیران ہوا اور حیران ہو کر اٹھیں۔

”توبہ یہ کرتی ہے۔“ خالی گلاس اس کی آنکھوں کے سامنے گر کے کما گیا تھا۔

اب کی بار اس نے کسی ٹھنڈی چیز کو اپنے پیروں سے لور لہری صورت اٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ کوئی بوجھ سا تھا جو یکدم اس کے سر کے سین اور گردن پر کلم ایک سیکنڈ میں ہو سکتا تھا۔ محض اک لمحے میں۔

دل کے ایک ہنستہ ارادے سے اور بس۔ اور وہ۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ ڈاکٹر حسنت نے اسے کہتے سنا۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ جھکا سر۔ جھکی نظر اور جھکی نظروں سے گرتے چند قطرے۔ وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ حادثہ خود کو مٹا ل۔ دکھ۔ پچھتاوے کے پہاڑ کے بوجھ تلے دیا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ”ہاں لہو ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔“



”میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے پولیس اسٹیشن لے جائیں۔“ تم نے مجھے کہا تھا کہ تم راتے میں مجھے وجہ بتاؤ گے۔“

”شفیق بھائی۔“

”تم نے وجہ نہیں بتائی۔ میں تمہیں لے کر نہیں گیا۔ حساب برابر۔“ انہوں نے بچوں کی طرح اسے

ڈیل کیا اور وہ بیچ ہوا۔

”اندروں کو“ دروازہ کھولتے ہوئے وہ پہلے اندر داخل ہوئے تھے۔ چند لمحوں میں گھر کی حالت داخل ہوا تھا۔

گھر کے بیوی گیت کو عبور کرتے ہی کارپوریج تھا اور اگر آگ لگے تو اسے اندرونی دروازے کی طرف ہوتو دائیں ہاتھ پہ لان تھا اور لان کے ساتھ ہی مغرب کی طرف بسمنٹ کا دروازہ تھا۔ اندر داخل ہونے کے

بعد لاشعوری طور پر اس کی نظر بسمنٹ کے دروازے پہ پڑی تھی اور وہ محک کر ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے سر کے سین لوہر لہوہ پھاڑا اگر تھا۔

”حارث!“ اپنے پیچھے اسے محسوس نہ کرتے ہوئے شفیق بھائی نے مڑ کر اسے پکارا۔

وہ وہیں نہیں تھا۔ شفیق بھائی نے اسے کسی ٹرائس کی سی کیفیت میں بسمنٹ کے دروازے تک جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چہرے کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

شفیق بھائی اس کے پیچھے نہیں گئے تھے۔ وہ وہیں رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ آخر وہ وہیں کیا کرنے آیا تھا؟ پھر شفیق بھائی نے اسے بسمنٹ کا دروازہ کھولتے

دیکھا۔ وہ ایک دلہہ پھر سے ٹرائس کی سی حالت میں اندر دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ اب وہیں کیا دیکھ رہا تھا؟ شفیق بھائی حیران ہوئے۔

”حارث!“ انہوں نے تواڑی۔

اس نے مڑ کر شفیق بھائی کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ محک کر اپنا چہرہ آستین سے صاف کیا تھا۔

دائیں آگرو شفیق بھائی کو دیکھے بغیر اندر کی طرف گیا تھا۔

شفیق بھائی اس کی حرکت پر حیران تھے۔ مگر درگزر کر گئے تھے اور جب وہ دونوں گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تو حارث بہت مغموم دکھائی دے رہا تھا اور حارث کیوں مغموم تھا؟ کیا اسے زہن کی وفات نے دکھی کیا تھا یا ان کی یاد نے؟ ان میں سے کچھ بھی ایسا نہیں تھا۔ جس نے اسے مغموم کیا تھا۔

”تو تم کیوں پولیس اسٹیشن جانا چاہتے تھے؟“ پانی کا گلاس حارث کو پکڑاتے ہوئے شفیق بھائی نے پوچھا۔ اس نے پانی کا گلاس پیے بغیر نیل پہ رکھ دیا تھا۔ وہ اگر یہ سوال نہ کرتے تو یقیناً ”حارث پانی پلینا کا ہوا۔“

وہ ایک دفعہ پھر سے ممکن نظر آنے لگا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی چیز کو ضبط کر رہا تھا۔ ”آخر کس چیز کو؟“ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔

”حارث!“

اس نے گہرا سانس بھر کر نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور دیکھ کر نظریں پھیر لی تھیں۔ وہ جانتا نہیں پاتا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا۔ ”حارث!“ کیا کچھ کہنا ہے کوئی

سیولس مسئلہ ہے؟“ شفیق بھائی نے اپنی طرف سے مولوں ترین الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ تڑپ کے رہ گیا تھا اور تڑپ کر بقیہ رفتار سے آگ تیز نظر سے انہیں دیکھا تھا۔

”میں عمو کر کے آ رہا ہوں شفیق بھائی۔“ بھرائی ہوئی تواڑ میں کہا تھا۔ اور وہ چمک پڑے۔ جس کو وہ ضبط کر رہا تھا۔ آخر وہ چمک ہی پڑے۔ شفیق بھائی نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

”میں نے حارث کے لیے کچھ اتنی لوہا لپی دھا میں مانگ رکھی ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے وہ ہی دے گا جو میں نے الگ۔“ آگ باز گشت۔

پھر شفیق بھائی نے وہاں کو مقبول ہو کر اپنے سامنے بیٹھا دیکھا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

”میں کبھی زہن پکا کونہ سمجھ سکا اور نہ ہی ان کی محبت کو اور نہ خود کو گورنہ اپنے خون کے ساتھ ساتھ بننے والے جذبے کو۔ جسے میں لہرت کہتا رہا۔ مگر

کیا جذبہ تھا یہ مجھے ایسٹ گرین وچ کی سڑکوں پہ خوار ہو کر روئے ہوئے لوہر رو کر زہن پکا کیا یاد کرتے ہوئے بھی نہ سمجھ میں آیا۔ میرے جیسے آدمی کو یہ تب سمجھ

میں آیا جب قرآن کے اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت کی آیت پڑھی جاتی ہے۔ یہ مجھے تب سمجھ میں آیا۔ ہاں۔ ہاں۔ تب ہی

تو اور میں نے کہا کہ میں زینب آپ کو دکھاؤں گا سو یہاں ہی بن کر جیسا چاہتی تھی۔ اتنا ہی اچھا بن کر جتنا وہ مجھے کرنا چاہتی تھی۔
مگر آج۔ آج۔
کیا ہونا چاہیے تم میرے ساتھ۔ یہ ہی۔ بالکل یہ ہی تو۔

اسلام۔ اسلام۔ دین۔ دین۔ کہنا آسان ہے۔ بہت آسان۔ مگر اسلام اور دین کو سمجھنا اور سمجھ کر اس پہ چلنا اور چل کر ڈٹے رہنا۔ یہ کس قدر مشکل اور جان لیوا کلم ہے۔ یہ کوئی آج مجھ سے پوچھے میں کہنے قدم اور پیچھے رکھیل دیا گیا ہوں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ زینب آپا ہوتی تو میں سمجھتا کہ منزل مل گئی۔ مگر "آنسوؤں نے اسے بات جاری رکھنے سے روکا تھا۔"

"میں کس قدر خلی ہا تھا ہوں۔ کس قدر کہ ساری عمر میں اپنی بقی ساری عمر زینب آپا کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کا حارث بدل گیا ہے۔ میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ زینب آپا مجھے معاف کریں۔ میں زینب آپا کو زینب آپا کہہ کر پکار نہیں سکتا۔"

ایسے میں جبکہ مجھے اپنی پشت پہ ان کا ہاتھ چاہیے تھا۔ میری پشت بے سہارا ہے اور میں کس قدر بے توازن ہوں۔ کاش کہ کوئی جان سکتا۔ کاش کہ۔"
اس نے دونوں ہاتھوں میں چروچھا کر پھوٹ پھوٹ کر لوہی تواز سے دوتا شروع کر دیا تھا۔

"زینب آپا۔ آپا۔" وہ دو سے بھری پکارت شفیق بھائی نے بے ساختہ دکھ سے آنکھیں بند کی تھیں۔

شفیق بھائی نے اٹھ کر اسے اپنے کندھے سے لگایا تھا۔ انہوں نے اسے پانی پلانا چاہا۔ مگر اور پھر کچھ بے بس ہوتے ہوئے ان کے بھی آنسو بہ نکلے تھے۔



اک گہرا سانس بھر کر انہوں نے الٹاب کو بند کیا اور مسکرا کر اسے دکھلا۔

جو سر جھکائے کافی سنجیدہ اور کچھ معنوم سا بیٹھا تھا۔ چند لمحوں سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ کرسی پیچھے کھیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی اور ان کی کرسی کے درمیان ایک چھوٹی ٹیبل دھری تھی۔ جس پر الٹاب رکھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی اور ٹیبل کے درمیان میں سے نکلے اور ذرا دور ہٹ کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے کسی نامعلوم احساس کے تحت اس نے سر اٹھایا تھا اور دو کھلے بازو اور اک مسکراتا چہرہ اس کا خطر تھا۔ وہ ٹھنکا۔ پھر جمبھکا اور جمبھکا کر اٹھ گیا اور اب وہ ان کے گلے۔ لگ رہا تھا۔

"مبارک ہو حارث قوم! آج تم نے دنیا کا اہم اور عظیم ترین کام سر انجام دے لیا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا پھر مسکرانے کی کوشش کی۔
"تم یقیناً یہ خبر سب سے پہلے اپنی ماں کو دے گے۔" اس نے ٹکے سے لٹی میں سر پلایا اور پھر ڈاکٹر حسات نے اک دم ہم سی توازن میں اک نام سننا۔
"نہیں۔ زینب آپا کو۔" وہ خاموش ہوئے تھے۔

"اس خبر پہ تمہاری ماں کا سب سے پہلا حق ہے حارث۔"
"مگر میں پھر بھی یہ زینب آپا کو ہی بتاؤں گا۔"
"کیوں؟"

"حارث نے اس نہیں دیکھی سر۔ ماں کے نام اور جبکہ یہ زینب آپا کو دیکھا تھا۔"
"حارث یہ نہیں جانتا کہ فیملی کیا ہوتی ہے سر۔ کیونکہ اس نے فیملی کے نام پہ صرف اک بہن کو ہی پایا ہے۔ وہ ہی۔ ہاں۔ وہ ہی تو۔ وہ ہی تو حارث کا ہر رشتہ ہے۔ ہر رشتہ۔"

ڈاکٹر حسات نے حارث کے چہرے کو کچھ اور معنوم ہونے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے لٹی کے سے انداز میں اس کا کندھا تپتے پایا۔

"جانتا اور جا کر اپنی ماں جیسی بہن کو بتاؤ کہ تم نے کیا کر لیا ہے۔" وہ اب کہہ رہے تھے۔
اس نے ایک عملگین سی مسکراہٹ کے ساتھ

یک دم اس نے کچھ کی ایک شدید لہر کو اپنے اندر اٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ جسے روکنے میں وہ ناکام رہا تھا۔



وہ ایک دفعہ پھر ایسٹ گرین وچ کی سڑکوں پہ چل رہا تھا۔ رات کے وقت دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے۔ سر قدرے جھکائے۔ ارد گرد سے تھوڑا بے نیانہ یوں جیسے کچھ سوچ رہا ہوں۔ مگر وہ خالی ذہن تھا۔ یوں جیسے دل میں کچھ چل رہا ہو۔ مگر وہ خالی دل تھا۔ وہ سو نہیں رہا تھا۔ آج۔ اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ وہ جنون کی سی کیفیت میں بھی نہیں تھا۔

اس نے سگریٹ بھی نہیں پیا تھا اور سیلینڈر پلو کی ڈوز بھی نہیں لی تھی۔

وہ آج سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرنا چاہتا تھا اس فرق کو۔ جو کہ آج کے حادثہ قیوم اور دو سال کے پہلے حادثہ قیوم میں تھا۔ سو وہ قدرے سر جھکائے۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ تھوڑا بے نیانہ۔ ذرا سالاروا ہو کر۔ خالی دل۔ خالی ذہن کے ساتھ وہ تھا اور گرین وچ کی سڑکیں اور پھر خالی دل۔ ایک بھرا تلاب بن گیا جس میں زنب تپانم کا کنکر گرا اور دور دور تک اس کی ذات میں۔ محسوس ہونے لگے تھے ایک کے بعد ایک۔ اک دو دم اور تسلسل کے ساتھ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی یادداشت میں محض اک نام ہی محفوظ تھا۔ حالانکہ یہ حیرت اسے نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ کچھ تھک کر ایک بیچہ بیچہ ہنسا تھا۔ یوں ہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے۔ اک ساکس بھر کر اس نے آہن کو دیکھا۔ نہیں۔ اس نے آہن سے بھی پرے دیکھنا چاہا۔

”بصارت اس کو پا نہیں سکتی۔ مگر یہ دل ہوتا ہے جو اس کو دیکھ لیتا ہے۔“

اور حادثہ قیوم کا دل؟
اس نے چاہ کی اور ایسی چاہ کی جو کسی شیر خوار روئے ہلکتے بچے کی ماں کے لمس کے لیے ہوتی ہے۔

انہیں دیکھا تھا۔
”آپ کا بہت شکریہ۔“
”ہاں۔ بس۔ خاموش۔“ ڈاکٹر حسنا نے حادثہ کی بات کالی۔

”حادثہ قیوم! اللہ سب کو دل و دماغ عطا کرتا ہے۔ ایک برابر۔ ایک ایسا۔ مگر وہ کسی کسی کو ایسا ذہن اور صلاحیت بخشتا ہے جو کہ اس قاتل ہوتا ہے کہ کسی علم کو کسی دوسرے ذہن میں ویسے ہی اینڈریل سکے جیسا کہ اس کے اپنے ذہن میں ہے۔ تو ایسی صلاحیت کو استعمال نہ کرنا یہ نا انصافی ہوگی۔ کسی کے ساتھ نہیں۔ میرے اپنے ساتھ۔ یہ ناشکری ہوگی۔ میں تو صرف اپنے جیسے کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو مگر اس طرح سے نہیں جس طرح تم ابھی میرا کرنے جا رہے تھے۔ اس طرح سے کرو جس طرح سے کہ وہ تم سے چاہتا ہے۔“ اس نے ہلکا سا سراپا دیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کہ پائے گا۔ اس نے ہاتھ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”مٹے رہتا۔“ مسکرا کر کہا گیا۔
”اس کے سوا چارہ نہیں۔“ جواباً کچھ بے بسی سے کہا گیا تھا۔

حادثہ نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ ڈاکٹر حسنا قدرے فاصلے پر کھڑے اس کی پشت کو دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک دم مڑا۔ اور مڑ کر دو کرسیوں کے درمیان رکھی گئی چھوٹی سی میز پر موجود اس کتاب کو دیکھا۔ ڈاکٹر حسنا نے حادثہ کی آنکھوں میں کسی چیز کو اس طرح سے چمکتے ہوئے محسوس کیا جس طرح کہ پالی کی سب سے اونچے پڑنے سے چمکتی ہے۔
”حادثہ! انہوں نے پکارا۔“

اس نے دیکھا۔
اور پھر انہوں نے حادثہ سے کچھ کہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ڈاکٹر حسنا کو دیکھا اور سوچا اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اگر وہ اسی حالت میں مر جاتا۔ تو اللہ اس کے ساتھ کیا کرتا؟

اس نے مجسم دعا بن کر پکارا تھا اور پھر اس نے سر جھکایا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کو فرق محسوس ہوا۔ اسے وہ بوجھ یاد آیا جسے وہ سال پہلے اپنے دل پہ لیے وہ اپنی سڑکوں پہ دوڑا پھر کرنا تھا۔

لور آج۔ آج۔ وہ کتنا ہلکا محسوس کر رہا تھا یوں جیسے اس پر کوئی بوجھ ہو۔

اور وہیں بیٹھے بیٹھے آگ اور فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔ وہاں جانے کا جو دنیا کی سب سے مقدس ترین پاک اور نور میں دھلی جگہ ہے۔ وہاں جہاں کہ ہر لمحہ ہر گھڑی۔ ہر ساعت۔ ہر لمبے رحمتیں نازل ہوتی ہیں ایسی مہلک جگہ۔ اور کیسے کیسے گندگی سے بھرے لوگ۔ سیاہ دل۔ سیاہ چہرے لیے وہاں جاتے ہیں۔

”کس لیے؟“ ہاں۔ ہاں۔ اسی لیے۔ بالکل۔ اسی کے لیے ہی تو۔



اسے سمجھ جانا تھا۔ عمو کے لیے اور جب یہی بات اس نے ڈاکٹر حسنت کو بتائی تو۔

”تمہیں خوف نہیں آتا۔ شرمندگی نہیں محسوس ہوگی اس کے سامنے۔ وہاں کھڑے ہوتے ہوئے جو اس کا گھر کھلتا ہے۔ جو کہ بیت الحرم ہے۔“ اس بات پہ ڈاکٹر حسنت نے اس کے چہرے کے رنگ کو بدلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ سفید ہوا تھا یا سیاہ نہیں وہ تو سرخ ہو رہا تھا یا حیرت کہ وہ سرخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنت نے بھی اس کے سرخ ہوتے چہرے کو قدرے تعجب سے دیکھا۔

”حادثہ۔“ انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور حادثہ نے اپنے اندر کے اہل کو اندر ہی دباتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے ڈاکٹر جہاں میں اس پورے یقین کے ساتھ ہاسکوں کہ وہاں سے میں اس طرح سے لوٹوں گا جس طرح سے کہ آج ہی پیدا ہوا ہوں کیا ہے ایسی جگہ۔ یقیناً نہیں۔ تو پھر میں وہاں کیوں نہ جاؤں۔“

تو کیا یہ بہتر نہیں کہ موت۔ وہ ڈاکٹر ابراہیم۔ یہ لفظ لو کرنا بھی اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔

”پہلے میں نئے سرے سے زندگی ہو کر آؤں۔ وہی بات شرمندگی اور خوف کی تو کیا یہ دوسروں کو بتانے کی باتیں ہیں یہ میرے پر سننا ہیں میں انہیں کبھی بھی دوسروں کے سامنے عیاں کرنا پسند نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر حسنت نے جو کہ کرسی کی بانڈ پر کھٹی نکائے ہاتھ کی انگلیوں پہ چہرے کا وزن ڈالنے اسے دیکھ رہے تھے بے ساختہ آگ گہرا سانس بھرا تھا۔ اسے جتنا سبق پڑھانا تھا۔ وہ پڑھا چکے تھے۔ اب عمل کا وقت تھا۔ ان کی زندگی میں حادثہ تو وہ واحد نہیں تھا جو کہ اس طرح سے دین کی طرف تیا تھا۔ مگر وہ منقو ضرور تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ محض اپنے گناہوں کی شرمندگی کی وجہ سے حج یا عمو نہیں جاتے اور اس نے یہ فیصلہ فوراً کیا تھا۔ گناہ بخشو نا۔ کوئی بدعت تو وہی تھا جو وہ اسے ہلکے سے نذیب کیا سے ملنے کی اتنی جلدی نہیں تھی، جتنی جلدی عمو اواد کرنے کی تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سمجھ جانا اور نذیب کیا سے نہ ملتا اور یہ کس طرح سے ہو سکتا تھا کہ وہ نذیب کیا سے ملتا مگر ان کی رقم کو (جو چرائی گئی تھی) نہ لوٹا تا اور ان دونوں باتوں کے درمیان۔ آگ بڑا سا مگر حاصل تھا۔

وہ عمو کے لیے رقم اکٹھی کرنا یا پھر نذیب کیا کی رقم واپس کرنا۔ اور وہ کبھی کلل رقم۔ حادثہ اب پہلے والی کمپنی سے منسلک نہیں تھا اس کی ذمہ داری حالت اور خراب کارکردگی کی وجہ سے اسے نکالا جا چکا تھا۔

لور اب وہ گیان سنگھ کے ساتھ لار ٹمنٹ بھی شیئر نہیں کرنا تھا۔ ایک مسلم ہونے کے ناطے اب اس کے اپنے مسئلے مسائل تھے۔ وہ اب کہانے پینے میں پہلی جیسی لار پروائی برت ہی نہیں سکتا تھا۔ البتہ گیان سنگھ سے دوستی ضرور تھی اور وہ اس کا احسان مند بھی تھا۔ گیان سنگھ اس کے لیے اللہ کا بھیجا ہوا وسیلہ تھا۔

حادثہ اب ایک لور کمپنی سے منسلک ہو چکا تھا۔



اس کی بے بسی کی نسبت کم تھی اور وہ پارٹ ٹائم جابز
 ہی پھونڈ چکا تھا۔ ان سب کا حقائق کے باوجود اسے
 عموماً بھی کہنا تھا اور زینب کی رقم بھی لوٹائی تھی۔
 حادثہ نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی رشتے کو بھری
 زنجیر بننے دیکھا تھا۔ اگر چار چھ ماہ کمانا پارٹ ٹائم
 نوکری کرنا۔ بچت کرنا۔ تو وہ اس قاتل ہو جاوے گا کہ عمو
 کو اس کے مگر چار چھ ماہ میں وہ کبھی اس قاتل نہ ہو یا تا
 کہ زینب آیا کی رقم واپس کر سکے۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی
 رقم تو تھی نہیں اور حادثہ قیوم کو ایسا کرنے کے لیے
 پھر سے گدھا بنا پارٹ۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کا
 کھانا کھانا پڑا۔ اور یہی بات زندگی تو۔ اب یہ اس
 کے لیے سزا نہیں تھی۔ وہ جاگ سکتا تھا۔ اگر
 اسے ساری رات ایک ٹانگ پہ گھڑا کر کے بھی چکایا
 جاتا۔ تو وہ یہ کر سکتا تھا۔
 اسے تین سال لگ گئے تھے۔ تین سال۔ مگر
 بھی وہ اس قاتل نہیں ہو سکا تھا کہ مطلوبہ رقم جمع
 کر پا سکے۔ آج کل بہت پریشانی نظر آ رہا تھا۔
 کوئی مسئلہ ہے حادثہ؟ اس دن وہ اکثر حسرت
 سے ملنے آیا تھا۔ جب چاہتا کہ انہوں نے پوچھا تھا۔
 اس نے چائے پیٹے ہوئے چوک کر انہیں دیکھا
 اور پھر دم سا مسکرا دیا۔
 ”زندگی مسئلوں سے کب خالی ہوتی ہے مر؟“ وہ
 اب کہہ رہا تھا۔
 ”مگر مسئلے شیر کر لینے سے دل ضرور خالی ہو جاتا
 ہے۔“ وہ اب کی بار کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ وہ اک
 کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ تائے یا نہ تائے۔
 ”مگر کہہ دو حادثہ۔ تم ہر بات کہہ سکتے ہو۔“ اس
 کی آنکھوں کے حلقوں کو کچھ اور گہرا محسوس کرتے
 ہوئے انہوں نے کہا تھا۔
 ”آپ جانتے ہیں میں نے زینب آیا کی رقم چرائی
 تھی۔“ اس کی زردی مائل رنگت اب کہہ سننے ہی
 ہونے لگی تھی۔
 ”ہاں۔ تو پھر؟“
 ”میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں عمر بے چاروں

زینب آیا سے نہ ملوں اور یہی فیصلہ ہو گا۔
 زینب آیا سے تو مل لیا۔ عمر ان کی رقم نہ واپس
 کر لیا۔ پچھلے تین سال سے میں اسی کوشش میں
 ہوں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاؤں کسی پکٹی مٹی
 پہ رکھے ہیں۔ پھسل پھسل جاتے ہیں تو وزن قائم ہی
 نہیں رہتا۔“ وہ قدرے تھکا لگ رہا تھا۔
 ”کتنی رقم چاہیے؟“ ہاتھ میں موجود چائے کا کپ
 سا سر میں رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ اس نے
 چوک کر انہیں دیکھا۔ کیا کرنا چاہتے تھے؟
 ”بہت ہی رقم ہے مر۔“
 ”پھر بھی؟“
 ”تقریباً“ ہزار ڈالر موجود ہیں میرے پاس۔ اور
 مزید کچھ چاہئیں؟“
 ”میں نے پوچھا کتنی؟“
 ”سات ہزار ڈالر۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئے
 تھے۔ اس نے کچھ کتنی لگا ہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ
 کچھ سوچ رہے تھے۔
 ”ضروری تو نہیں تم اپنی بہن کو ساری رقم ایک
 دفعہ ہی لوٹاؤ۔ بہن ہے تمہاری یقیناً“ اس بات پہ
 کہ وہ دباؤ کر لیں گی۔
 کچھ رقم کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔ کچھ دوستوں
 سے مانگیں گے مگر سوال یہ ہے کہ حادثہ کہ اتنی بڑی
 رقم کا قرض تم کسے واپس لوٹاؤ گے؟“
 وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اتنی بڑی رقم لوٹاتے
 اسے سالوں لگ سکتے تھے۔ تو یہ ہی ٹھیک تھا کہ وہ
 زینب کو ساری رقم نہ لوٹا۔ توڑی کر کے دے دیتا۔
 ”آپ کتنی رقم کا راج کر سکتے ہیں؟“
 ”تقریباً“ تین ہزار ڈالر۔“
 ”گیا اب مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟“
 قدرے توقف کے بعد بولا تھا۔ اس کا جواب پہلے
 سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ اکثر حسرت میں بیٹے تھے۔
 ”اور وہ جو تمہارا اتنا بڑا حلقہ احباب ہے ان سے لوٹا
 کچھ دے۔“
 ”نہیں! ان سب سے جو میں نے لینا تھا“ نے

چکا۔ ”وہ مسکرایا۔ نہایت مقدس سی مسکراہٹ۔“
”گیا لے چکو ہو؟“

”تختے“ انہیں اچنبھا ہوا۔ اس کی فیملی تو نہیں تھی اور خود اسے جتنی اشیاء کی ضرورت تھی وہ جانتے تھے۔

”کس کے لیے ہیں تختے“ مقدس سی مسکراہٹ کچھ اور شفاف ہوئی۔

”زینب تبا کے لیے“ اور اس کے منہ سے الفاظ کسی سیپ کے موتی کی طرح لڑا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر حسنت اب اس کے چہرے پہ پھیلنے والی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔



حادث کے دن گزرے تین سالوں میں ڈاکٹر حسنت کے ساتھ دو ایسا کچھ اور گہرے ہو چکے تھے وہ ان کے توسط مختلف مذہبی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے دوسرے شہروں اور ریاستوں میں موجود اسلامک سینٹرز والے بھی جاننے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے حلقہ احباب کی تعداد بہت ہو گئی تھی۔ جس میں مختلف النسل لوگ موجود تھے۔

ایرانی، پاکستانی، افغانی، انڈین، کشمیری، عربی، افریقین، ناچرن اور بہت سے۔ وہ ان سب سے زینب تبا کے لیے کچھ نہ کچھ منگوا تا رہتا تھا۔ اس کی الماری میں اٹنی چیزیں اتنی نہیں تھیں، جتنی کہ زینب تبا کے لیے تھیں۔

کشمیری شالیں۔ ایرانی پارچہ جلتے۔ انڈین دوپٹے۔ عربی عیلا اور کاہل۔ (کیونکہ زینب تبا سرمہ لگاتی تھیں) پاکستانی جاول بھی اس نے منگوا رکھے تھے اور ہلے۔ امریکہ کے سوئٹرز اور ہینڈ گمز اگر اس کے دوستوں میں ہر نسل شامل تھی تو اس کی الماری میں زینب تبا کے لیے ہر قوم کی سوغات موجود تھی۔

کتنے کتنے کوہ چتریلوں کا ایک ڈچر تھا۔ مگر وہ ڈچر نہیں تھا۔ وہ حارث بیوم کی محبت تھی۔ بے غرض محبت

وہی ہی جیسی زینب نے اس سے کی۔ بے ریا اور معصوم سی۔ اس کے تین سال اس خواہش اس چاہو اس میں گزرے تھے کہ اک دن ہر حال کسی اک دن وہ زینب تبا سے جا ملے گا۔ اپنا دکھ ہر ملال۔ ہر غم اپنے ہاتھوں سے مٹانے۔ وہ زینب کی آنکھوں کا اتارا تھا اور زینب کیا تھی اس کے لیے؟

جسم میں زندگی نہیں۔

دل کی دھڑکن نہیں۔۔۔

اس کے وجود کا حصہ نہیں؟

تو پھر آخر یہ زینب تھی کیا؟

”زینب وہ روح تھی جو اس کے اندر پھونک دی گئی تھی۔“



اس نے دیکھا اور کیا دیکھا۔ آخر کیا دیکھ لیا۔ مجسم زندگی کی حالت میں۔ وہ زینب تبا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ مگر ممکن کی لہرست میں آپکا تھا۔ وہ زندگی کی حالت میں نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اک خواب کا سا لگن ہو رہا تھا۔

ان کا شفاف چہرہ۔ بے دماغ اجلا لہا اس موتیوں کی سی مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ درد کی اک لہر اٹھی تھی اور اسے ڈاکٹر حسنت کی کسی بات یاد آئی۔ ڈاکٹر حسنت کی بات یاد آئی تو زینب تبا یاد آئیں اور جیسے ہی وہ یاد آئیں تو۔ تو۔ وہ سامنے موجود تھیں۔ بالکل سامنے۔

وہ انہیں دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ سانس بس رکنے کو ہے۔

تب ہی۔ تب ہی۔ اک اور تیز لہر وہ سے بھر پور۔ وہ بے ساختہ کرا رہا تھا۔ زینب تبا کا عکس دھندلایا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ نظر پھر سے انہیں کھو نہ دے۔ اس نے گہرا کر اس طرف دیکھا۔ وہ۔ وہ کہیں نہیں تھیں۔

ابھی وہ ٹھیک طرح سے بدحواس بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے اپنی پیشانی پہ کسی ٹھنڈک کا سا لگن

ہوا۔ ایسی لٹھک جو پور پور میں اتر جائے اور سکون کا باعث بن جائے۔ وہ زنبب کیا کانس تھا۔ یہی کانس جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ پور پور میں اترتی لٹھک۔ دم دم میں گھٹا سکون۔ اس کے غصے کی رفتار آہستہ آہستہ ٹارل ہونے لگی۔ اور پھر ٹارل ہوتے ہوتے۔ دم دم۔ دم دم۔ دم دم۔ بہت ہی دم دم۔ مگر سکون۔

کعبہ پہ چلی نظر پڑتی ہی اس نے کیا دعا مانگی؟ کیا مانگ سکتا تھا علاوہ؟ ظاہر ہے اس سال انسان مطلقاں لگنے کے علاوہ کیا مانگ سکتا تھا اور دوسری نظر یہ اس نے زنبب کے دل میں جگہ مانگی۔

کیا ہی بے عقل دلغیلا تھا اس شخص نے۔ دل کے دل میں اولاد اپنی جگہ مانگ رہی تھی۔ حد ہے۔ جب یہاں سے گیا تھا تو ریلے کا ہر ممکن ذریعہ بند کر کے گیا تھا اور اپنی اس حرکت پہ پچھلے پانچ سال سے جتنا وہ بچتا رہا تھا شاید ہی اس بھری دنیا میں کوئی بچھٹایا ہو اور اس کی زندگی میں تھا کیا۔ سوائے بچھٹاؤں اور کاش کے۔

کل بھی اور آج بھی۔ اس کی پوری زندگی کاش سے لٹی پڑی تھی۔

اور جب وہ زنبب کے گھر کی طرف سفر کر رہا تھا تو وہ کن کن کیفیات کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پشیمانی شرمندگی، خوشی، ملال، سکون اور پھر بے سکونی بھی اس نے لہا انتظار کیا تھا بہت لمبا انتظار۔

پانچ سال پور سے پانچ سال پانچ سالوں کے ایک ہزار آٹھ سو تیس دنوں میں اور ان دنوں کے گھنٹوں میں اور ان گھنٹوں کے منٹوں میں اور ان منٹس کے سیکنڈز میں اور ان سیکنڈز کی ہر ساعت میں اس کا انتظار لمبا تھا۔ واقعی ہی لمبا تھا اور جیسے وہ زنبب تپا کے دروازے پہ پہنچتا ہے گھنٹوں بجانا ہے، زنبب تپا کے چہرے کے بجائے شقیں بھائی کا چہرہ لگتا ہے تو کیا آپ اس شخص کی کیفیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟

وہ جو زنبب تپا کو ہر چیز ہر جگہ دیکھنے کا غوی تھا۔ ایک ہزار آٹھ سو تیس دنوں کے بعد اسے پتا چلا کہ

زنبب تپا تو کہیں نہیں تھیں۔ کہیں بھی نہیں۔ واقعی کئی قدم لور چھپو دھکیل دیا گیا تھا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اسلام کو گھٹنے پڑھنے لور تپا کے بعد عمل کرنے سے آپ میری بلذمہ ہو جاتے ہیں۔

نہیں۔ امتحان بھی تو ہونا ہوتا ہے منہ سے مذہب۔ مذہب کہنے اور کسی امتحان کا شکار ہو کر اس میں پاس ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

حادث کو بھی یہ ہی محسوس ہوا تھا اسے لگا بچھلے پانچ سالوں میں کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ نہ گرین وچ کی سڑکوں کی خواری۔ نہ اس کا خولہ۔ نہ برائی کو چھوڑنا اور نہ اسلام پہ عمل ہی ہونا۔

”یہ سب تو جیسے شروعات تھیں۔ اصل چیز تو اب آئی تھی۔“

”حمید“ یہی چیز ہوتی ہے۔ بہت ہی اتنی کہ انسان ساری عمر اسی کے سارے گزار سکتا ہے۔ مگر جس کی امید ختم ہو گئی ہو نور اس انسان کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ مایوسی کفر ہے۔ تو کیا حال ہو گا اس شخص کا۔

کس عذاب سے گزر رہا ہو گا وہ شخص۔

”آگہی کا عذاب۔ کس قدر دردناک اور جان لیوا۔ یہ کئی حادثات قوم سے پوچھتا۔“

پھوٹ پھوٹ کر رونے اور رو لینے کے بعد وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں کے بند مٹھی ہوتی رہے۔ خاموش بیٹھا رہا تھا۔ شقیں بھائی اسے اپنے سلمان کی طرف بدلتے رنگوں والے چہرے کے ساتھ پلٹے دیکھتے ہوئے لوٹ کر رہے تھے۔

وہ کل پانچ سوٹ کیس تھے۔

ایک دم حادث اٹھا تھا اور سولے ایک سوٹ سے چھوٹے بیگ کو چھوڑ کر وہ چاروں ہڈیے سوٹ کیس شقیں بھائی کے سامنے لایا تھا۔ وہ اب انہیں کھول رہا تھا اور کھول کر ایک ایک چیز کو باہر نکالتے ہوئے وہ انہیں بتا رہا تھا کہ اس نے کب کہاں لور کیسے وہ چیز کس سے منگوائی تھی۔ کس کے لیے منگوائی تھی۔ یہ بتانے

کی ضرورت نہیں تھی۔ شفیق بھائی اسے دیکھتے رہے یہاں تک کہ چاروں سوٹ کیس خالی ہو گئے تھے۔

”میں ان سب چیزوں کا کیا کروں شفیق بھائی۔“

عجیب نام کہی ہوئی ہے کسی سے وہ بولا تھا۔
شفیق بھائی کلہا پھٹ جانے کو تیار تھا۔ نہ جانے وہ اسے کیسے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے ہونٹ کاٹنے ہوئے سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور پھر وہ اس چھوٹے بیگ کی جانب بڑھا تھا۔

اس نے وہیں بیٹھ کر اس میں سے کچھ نکالا تھا اور شفیق بھائی کے سامنے رکھا تھا۔ وہ پیکٹ میں بند کچھ تھا۔ شفیق بھائی نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

”آپ کی لاتنت ہے؟“ وہ یہ نہیں کہہ پایا کہ وہ چرائے ہوئے پیسے لونا رہا ہے۔ ہمت ہی نہیں ہوئی۔ عجیب شرمندگی ہی شرمندگی تھی اور شفیق بھائی شروع ہی سے ہمت سمجھ دار رہے تھے۔

”جب تم یہ لاتنت لے کر جا رہے تھے تو میں نے چاہا کہ میں پولیس کو انفارم کروں، جانتے ہو، نینب نے کیا کیا۔“ اور وہ نظر جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑا رہا تھا۔ خاموش۔ بالکل ہی خاموش۔

”اس نے کہا۔ وہ میری چیزیں تھیں شفیق بھائی نے اسے معاف کیا۔ نینب نے اسے معاف کیا۔ یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔“

حادثے نے سختی سے ہونٹوں کو بچھڑے ہوئے کسی چیز کو گتے سے اتارا تھا۔
”تمہیں میں اتنا بے غیرت لگتا ہوں حادثے قوم کہ نینب قوم نے جسے اپنی زندگی میں معاف کر دیا۔ وہ رقم میں اس کی موت کے بعد لیتا پھروں۔ کیا تمہیں شفیق خان اتنا ہی بے غیرت لگتا ہے۔“ اور وہ شخص۔

ہاں وہ ہی شخص۔ جس کا چہرہ بل میں رنگ تبدیل رہا تھا اس نے عجیب احساس لیاں کے ساتھ اس پیکٹ کو دیکھا۔

اسے وہ محنت یاد آئی۔ جو اس نے وہ رقم جمع کرنے کے لیے کی تھی۔ ایک۔ ایک ڈالر کے لیے اپنی پریشانی

یاد آئی۔ چ۔ بیس گھنٹوں میں ایک وقت کا کھانا کھانے والا بھوکا پیٹ یاد آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ گن میں پڑنے والی گانٹھوں کو دیکھا اور وہ ان گانٹھوں کو ہونٹوں سے لگا کر پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

معلوم نہیں وہ کس کس غم کو یاد کر کے رو دیا تھا۔ شفیق بھائی نے اس سے پوچھا کہ وہ پولیس اسٹیشن کیوں جانا چاہتا ہے۔

”میں نے کہا گنڈا کی سزا پانے سے کوڑے کھانے۔“

”کون سے گنڈا؟“

”وہ جو امریکا میں کیے۔“

”کمال کرتے ہو حادثے قوم امریکا میں کیے جانے والے گنڈا کی سزا سمجھو یہ میں نہیں جانتی۔“

”۴۴ جرم کی تو ملتی ہوگی؟“

”ہاں ملتی ہے۔“ وہ فرکے۔

”شہوت ہے تو لاف۔“ اور وہ اک گمراہ سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ جب سزا نہیں پانا چاہتا تھا تب ملی تھی اور کیسا ہی خوب ملی تھی اور جب پانا چاہتا تھا۔



وہ سمجھو یہ جو اتارنے گیا تھا وہ وہاں سے بوجھ لا کر لارہا تھا پہلے سے گنڈا۔ اس کے ساتھ کافی عرصے کے اور برا تھا کہ وہ یوں قبرستان دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ خوف وہی تھا۔ نوعیت تبدیل تھی۔ اب انجام لے ڈارنا تھا۔

پہلے سزا کا بازی تھی نہ تو سب۔ اور نہ عمل پھر بھی کوئی خوف نہیں تھا، کوئی ڈر نہیں تھا، آگ عالم بے پروائی تھی۔

اور اب۔

سب کچھ تھا ہنگامہ عالم بے پروائی نہ رہی تھی۔

وہ نینب کیا کی قبر پر بھی نہیں جاسکا تھا۔ وہ کس طرح کیوں کر کیسے انہیں منوں مٹی تلے دفن دیکھتا یہ بڑا حوصلے اور بڑے جگرے کا کام تھا۔ وہ نہیں کہہ پایا تھا۔ جو کبھی سفاک اور بے رحم ہو کر تھا تھا۔

وہ اپنی۔ بس کو یوں لہری خیز سوتا نہیں دیکھ پایا تھا تو

لے کر گئے تھے۔ اس کے بخار کی نوعیت جان کر اس کے سر سے پاؤں تمام ٹیسٹ لے گئے تھے۔
 ”میں اسی لیے یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ ڈاکٹر۔ یہ بندے میں کچھ نکال کر ہی دم لیتے ہیں۔“ اس نے چڑ کر ڈاکٹر حسنت سے کہا تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ کیوں اسپتال اور بیماری سے خوف زدہ تھا۔

وہ اب بھی موت سے ڈرتا تھا اور اس کا خوف یہاں آکر بڑھ چلا کرتا تھا۔ حادثہ جس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔
 بلکہ۔



اس پور پور میں اترتی ٹھنڈک اور روم روم میں بسا سکون اس کو خود کی محسوس ہونے لگی۔ قریب تھا کہ وہ سو جاتا مگر اس نے اپنی زندگی کا وہ سرا بڑا جھٹکا کھلیا تھا۔ دروازے میں سے اب کہ جو شخص اندر داخل ہوا تھا اس نے حادثہ قیوم کو اپنی آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے کمنیوں کے بل اور اٹھنا چاہا۔ یک دم اس کی پیشانی پر وزن پڑا تھا۔ جو اس کو لینے رہنے کا اشارہ تھا۔ حادثہ قیوم بری طرح سے گھبرایا اور اس طرح سے گھبرایا کہ اتنی اور ایسی گھبراہٹ اس نے کبھی بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایک وحشت تھی کہ وہ سڑکوں پہ خوف سے بے ہوش ہو جانے کو ہواں گیا۔ تب ہی اس نے چند لوگوں کو تیزی سے اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کیا۔

ایک نے آسجین مارک لگایا تھا۔ دوسرے نے کسی نوکلی چیز کو اس کے ہانڈ میں کھپوایا تھا۔ اور تیسرا مسلسل اس کے سینے پہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال رہا تھا۔ مگر وہ اس سارے عمل کو اس طرح محسوس نہیں کیا رہا تھا جس طرح سے عام انسان کرتا ہے۔ اس کا دلغ باؤف ہونا چاہا تھا۔ تب ہی اس نے باپ کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب اس کے بیڈ کے

حادثہ قیوم واپس آیا۔ شفیق بھائی سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا باپ بھی وفات پا چکا تھا اور بن بھائی وہ تھے۔ اس نے ان سے رابطہ کیا۔ ان سے ملنا چاہا۔ فرائض کی جوٹی اسے پڑھائی گئی تھی انہیں اوار کرنا چاہا۔ مگر اس کی بہنوں میں سے ایک بھی زندگی قیوم کی سی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ آمنہ بھی نہیں اور بھالی۔ بہنوں کا یہ حال تھا تو بھالی کیسے اس کو پوچھتے۔ وہ سب اسے مار چکے تھے۔ ان کے لیے وہ قاتل اور مجرم تھا۔ تقریباً دس سال کا سزا یافتہ۔ حادثہ قیوم بری طرح سے دل برداشتہ ہوا تھا۔ جھکے کندھوں، ٹوٹے دل اور زخم زخم جگر کے ساتھ وہ واپس آیا تھا۔
 اس ٹوٹا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہ ریڑھ کی ہڈی پہ

ضرب لگادی جائے۔
 اس کی بھی بیک یون بری طرح سے متاثر ہوئی تھی اور اس بری طرح سے کہ وہ خود کو زندگی کے انفعال سرا انجام دینے میں لگا چاہتا تھا۔
 مگر وہ جان چکا تھا کہ تمام تر لاجپاری اور بے چارگی کے پلو جو اسے جینا تھا اور زندگی کے تمام انفعال سرا انجام دینے تھے یہ جان جانے کاغذ اب ہی تو تھا۔
 وہ گوتم بدھ کی طرح تمام آسائشوں کو لات مار کر گوش نشین نہیں ہو سکتا تھا۔

اور نہ ہی گردنک کی طرح تقیری کو اپنا سکتا تھا۔
 وہ اس نبی صلی اللہ علیہ کا امتی اور پیرو کار تھا جو شعب الی طالب جیسی آزمائش کے بعد بھی دنیا کے سارے ظلم سرا انجام دیا کرتے تھے۔ وہ کیسے تارک اندنیا ہو جائے۔ حالانکہ دل دنیا سے اٹھ چکا تھا مگر۔
 ”تو اگر یہ جان جانے کاغذ اب۔“ یہ ان ہی دنوں کی بات تھی کہ اس کی پہلی رگت مزید پہلی ہونے لگی تھی۔

وہ دراصل پچھلے تین سالوں سے کبھی بھی بھرپور صحت کو انجوائے نہیں کر سکا تھا۔ اتنی تھکا دینے والی محنت کے بعد وہ کبھی بھی فزیکلی فٹ نہیں رہ پایا تھا۔ مگر اب کی بار اس کا بخار جیسے اس کے پیچھے ہی پڑ چکا تھا۔ یہ ڈاکٹر حسنت ہی تھے جو کہ زبردستی اسے اسپتال

پاس پہنچ چکے تھے۔
 ایکسٹرا ڈوز لیتے ہوئے؟ سڑکوں پر خواری کرتے
 ہوئے؟ روتے۔ بلکتے ہوئے؟۔ اللہ سے زندگی کی
 بھیک مانگتے ہوئے؟
 آخر کس طرح سے اس نے یہ ڈیڑھ دو سال گزارا
 تھا؟ اگر اک لفظ میں کو تو سمجھو۔
 اگر اک لفظ میں بیان کرو تو "سکون سے۔"
 جب ہی تو جب وہ نمرل تو یوں لگتا ہے تھا سو گیا
 ہے۔ بس ابھی اٹھا کہ اٹھا۔
 اس بیماری کا سن کر وہ شدید شاکڈ ہوا تھا۔ مگر تقدیر
 وہ سخت چیز ہے جس کا "صبر" کے علاوہ چارہ نہیں۔ وہ
 خود حیران ہوا کہ موت سے ڈرنے کے باوجود وہ اتنا
 پرسکون کس طرح سے ہو گیا تھا۔

اس کا ہاپ سے مسکرا کر دیکھ رہا تھا اور وہ اسے بھی
 پھٹی آنکھوں سے نہنہب کیا کا نظر آتا سمجھ آتا تھا۔
 اسے نہنہب آیا سے محبت تھی۔ باپ کا نظر آتا سمجھ
 نہیں آتا تھا۔ اک وحشت اور گھبراہٹ کا سا عالم تھا۔
 اس نے کسی اجنبی چہرے کو اپنے پاس آنا دیکھا۔ اور۔
 اک لمحے کا سا وقت۔ اک ساعت کا فرق۔ وہ ٹھنڈک
 اس کے پورے بدن میں اتنی اور اس طرح سے پھیل
 گئی کہ اس کے منہ سے آکسیجن بلنک ہٹا لیا گیا تھا۔
 دونوں ہاتھوں سے سینے پہ دباؤ ڈالنے والا بھی رک گیا
 تھا۔

اور اس نے اک نظر مٹیوں اور آکلات میں
 جکڑے اس شخص کو دیکھا اس کے چہرے پہ ابدی
 سکون تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ تھپتھپتے
 ساکت ہو گئے تھے۔ وہ کسی نا فہم زبان میں کچھ پڑھتے
 پڑھتے یکدم خاموش ہو چکا تھا۔
 وہ سوچا تھا۔ اک ابدی نیند۔ مارٹ قیوم سوچا
 تھا۔

مارٹ قیوم کے کیے گئے ٹیسٹ میں سے کچھ نہیں
 نکلا تھا بلکہ اس کے کچھ اور ٹیسٹ کیے گئے تھے ڈاکٹر
 اس کی مگرٹی ہوئی صحت کو دیکھ کر مطمئن نہیں تھا
 اسے ایڈز تھی۔

اور حارث نے پورا ڈیڑھ سال موت کا انتظار اس
 سے خوفزدہ ہونے کے باوجود کیا تھا۔
 دنیا میں کتنے لوگ ہوتے ہونگے جو ایسی کسی بیماری
 کا شکار ہوتے ہوں گے اور پھر انگلیوں پہ دن کن کن کر
 زندگی کے ختم ہونے کا انتظار کرتے ہوں گے۔ یہ
 آسان نہیں۔ یہ بالکل بھی آسان نہیں۔ سوچ و
 خیال۔ گلن و دھیمان سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز ہے۔
 اور ایسا اک شخص اگر حارث قیوم ہو تو۔ وہ ڈیڑھ سال
 اس نے کیسے گزارا ہو گا۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے؟
 خوف سے بے ہوش ہوتے ہوئے؟ سلیپنگ پلیز کی

خواتین ڈائجسٹ

خواتین ڈائجسٹ

فوزیہ یاسمین



750

32735021

کیا یہ سجدہ ساحت ہو سکتا ہے وہ ہی سجدہ ساحت جو
انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ "پارس" بناوٹی
ہے۔
"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"
"کیا یہ ممکن ہے؟"



کاسیابی کی طرف پہلا قدم؟
"توبہ۔"

"اور آخری قدم؟"
"اسی توبہ جو ستر گناہ گاروں میں بھی پانسوی جائے
تو ان کے گناہ بھی بخشا دے۔"
"اور اک توبہ وہ بھی تو تھی۔ جو حارث قوم نے کی
تھی۔ تو کیا وہ بخشا گیا؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔
یہ دوسری دنیا ہے جہاں پہ جائے بغیر کسی راز کو پایا
نہیں جاسکتا۔
مگر آدھ سرے کے راز جاننے سے، ہتر ہے کہ اپنا
"راز" ڈھونڈ لیا جائے۔ کیونکہ۔ جانا تو ہے۔
دس پہلے سال مرنا نہیں۔
گوربا کوئی ہو۔
گوربا کوئی ہو۔"



وہ نوشہ تھا۔ پاکستان کا ایک شہر اور وہ۔ وہاں کا
قبرستان تھا۔
وہاں موجود۔ بہت سی قبروں کے درمیان قیوم نامی
حفص کی قبر کے دائیں طرف۔ اک اور قبر تھی۔ جس
کی منی ابھی گیلی تھی اور اس کے پاس اک حفص نام
آنکھوں کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ کون تھا۔
شفیق خان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اس کبھی
قبر کے کتبے کوئی نام نہیں لکھا گیا تھا۔
اس قبر کی اور قبر والے کی بس اک ہی شناخت
تھی۔
"غریقِ رحمت"

یہ اللہ کا انعام تھا اس شخص سے۔ وہ جان نہیں پایا تھا۔
اس کی بے چینی ختم کر دی گئی تھی۔ اس کے دل کو
مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ ایمان کے ساتھ یہ اجر تھا۔ اس کی
توبہ کا۔ اس کا دل اب سیاہ نہیں تھا۔ وہ خالص تھا۔ اس
بچے کی طرف جو ابھی ابھی پیدا ہوا ہو۔

ہر کسی کو کوئی نہ کوئی چیز ایمان کی طرف لے ہی آتی
ہے۔ اور اسے اس کا خوف لایا تھا اور اک اور چیز بھی تو
تھی۔ "مگر کیا؟" قریب تھا کہ اس کے دل کو مرثیت
کر دیا جاتا۔ اور وہ رنگ آلود لہلہ۔ رنگ آلود لہا ہتی رہتا
اگر۔ اگر وہ اس عورت کی دعا کے حصار میں نہ ہوتا۔
نہیں تپا کی وہ آنا تھا۔

ڈاکٹر حسنت نے بھی اس سے یہ ہی کیا تھا کہ
"حارث قوم تم پر کسی کی برا کاسیاب ہے۔"
تب ہی تو اس نے جانا تھا کہ اس جیسا حفص کس
طرح سے الکتاب تک پہنچایا ہے اور پھر اس کو پڑھ
بھی پاتا ہے اور عمل کے قائل بھی ہر جاتا ہے۔

اگر اس کا خوف اسے ایمان تک لایا تھا تو یہ لعنت
کی دعا تھی جو وہ طہیت قدم رہا تھا۔ اور اک پارس بن
گیا تھا۔ کیا ایسا نہیں تھا۔ کیا ہر وہ انسان پارس نہیں تھا
جو اک طرف زندگی کو محض اس بنا پہ چھوڑ دے کہ یہ
اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا
نہیں ہے۔

وہ محض اس لیے اپنے سر اور چہرے کو جھکا دے کہ
اسے ایسا کرنے کو کہا گیا ہے۔
وہ خود کو ویسا ہی بنا لے۔ جیسا کہ الکتاب میں حکم دیا
گیا ہے۔
یقیناً! "ہر وہ حفص "پارس" ہی ہے۔

ہاں ہی "پارس" ہی ہے۔
موت نے اسے نہیں بخشا تھا۔ اور موت نے تو
کسی کو بھی بخشا نہیں ہزار سالہ زندگی کے بعد بھی۔ تو
کیا یہ لمحہ۔ آپ کی زندگی کا۔ لمحہ ہدایت بن سکتا ہے۔
بالکل وہ ہی لمحہ جو ابھی ابھی آپ کی آنکھوں کے
نیچے سے گزر رہا ہے۔



بجلی کڑکنے کی زوردار تو از روہ ہڑبدا کر اٹھ بیٹھی۔
 کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بجلی کڑکنے کی وجہ
 سے کمرے میں تھوڑی سی روشنی ہوئی تو اس نے
 حیرت سے اردگرد کا منظر دیکھا۔ کمرے میں عجیب
 برامراریت چھائی ہوئی تھی۔ اسے اس کمرے سے
 خوف و وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی
 تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جلدی سے بستر سے نیچے اتری،
 اور دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے دروازہ کھولتے
 ہوئے اندھیرے میں دروازے کی تپ چھائی۔
 مگر دروازہ تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
 کافی دیر دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ نہ کھلا۔
 بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ بدھم سی روشنی میں اسے
 ایک جانب کھڑکی دکھائی دی۔ وہ اس کی جانب ہیگی۔
 کھڑکی کے آگے جالی لگی ہوئی تھی نہ کھڑکی سے باہر کا
 منظر دیکھنے لگی۔

سکھیل تافل



کاتبہ



Copied From Web



دیکھا۔ جو ہاتھ باندھے اس کے سامنے آکر اہوا تھا۔
 ”السلام علیکم صاحب! اس نے سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام! گل خان کیسے ہو۔“ اس نے خوش
 دلی سے کہا۔

”ام ٹھیک ہے صاحب! آپ کے واسطے خبر لایا
 ہے۔“ وہ نمائت مودب انداز میں بولا۔
 ”ہوں تو تھوڑا گل خان! ایسا خبر لائے ہو ہمارے
 لیے؟“

”خان صاحب۔! آپ نے جو کام ہمارے ذمے
 لگایا تھا۔ ام نے کر دیا ہے۔ شاہ میر صاحب کو کاروبار
 کے سلسلے میں کراچی بھجوا دیا ہے۔ کم از کم ایک مہینے
 تک وہ نہیں آئیں گے۔“ وہ ساری تفصیل اس کے
 گوش گزار کرتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب گل خان! ہم تمہیں اس کا انعام ضرور
 دیں گے مگر ابھی نہیں۔“ اس کی بات سن کر وہ ابھی
 خوش بھی نہ ہو پایا تھا کہ اگلی بات سن کر یوں ہو گیا۔
 ”ارے ہاں۔ اس لڑکی کا کیا حال ہے پریشان تو
 نہیں کیا اس نے۔“ کچھ یاد آئے پر وہ بولا۔

”نہیں صاحب۔ ہم اس کے کھانے میں نیند کی
 گولیاں ڈال دیتا ہے۔ اس واسطے وہ زیادہ دیر سوئی رہتی
 ہے۔ آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔“

”جو تمہیں ٹھیک لگے وہ کرو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا،
 مجھے وہ لڑکی زندہ چاہیے۔ اس کا زندہ رہنا بہت
 ضروری ہے۔ شاہ میر کو اس بارے میں بالکل بھی پتا
 نہیں چلنا چاہیے اور اگر اسے پتا چل گیا تو یاد رکھنا
 میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ آخری الفاظ
 درستی سے بولا۔

”جی صاحب! آپ فکر نہ کریں آپ کو شکایت کا
 موقع نہیں ملے گا۔“

”ہوں ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔“ اس نے اسے
 جانے کا اشارہ کیا۔ تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔
 ”اب دیکھوں گا شاہ میر آگے اپنی محبت کو بچانے کے
 لیے تم کیا کرتے ہو؟“ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے

کھڑکی کے اس پار گھسے درخت تھے جن کے پتے ہوا
 چلنے کی وجہ سے ہتے ہوئے عجیب آواز پیدا کر رہے
 تھے۔ رات کے اندھیرے میں درخت کالی خونخاک
 لگ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر دروازے کے پاس آئی اور
 زور زور سے اسے بجانا شروع کر دیا۔

”پلیز دروازہ کھولو۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے سیلا!
 علیزے۔! مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے۔ مجھے پلانے
 پاس جانا ہے۔ پلیز خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“ کہتے
 ہوئے وہ بلک بلک کر روئی۔ دروازہ بجا بجا کر اس کے
 ہاتھ میں نہ ہو گئے تھے۔

”خدا کے لیے۔ مجھے جانے دو۔ مجھے گھر۔ گھر
 چلے دو۔“
 وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”پلانے کے پاس جانا ہے۔ علیزے کے پاس۔“
 کہتے ہوئے وہ زین پر بیٹھتی چلی گئی۔
 پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسی کیفیت میں اس کمرے
 میں بند تھی اور اس ایک ہفتے سے اس کے ساتھ کیا ہوا،
 کسے کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ پچھلے کئی

دنوں سے اپنے کمرے دور ہے۔
 پلانے، علیزے، سدرہ، سمیرا سب اس کے لیے
 کتنے پریشان ہوں گے اور ان سب سے بڑھ کر وہ
 جتنی اذیت سمجھ رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

اس ایک ہفتے میں ایک آدمی جو اسے کھانا پینے کی
 غرض سے کمرے میں آتا اور کھانا رکھ کر چلا جاتا۔ وہ
 کھانا جسے مجبوراً کھانے کے بعد وہ بے ہوشی کی حالت
 میں چلی جاتی اور جب ہوش میں آتی تو کمرے کا دروازہ
 بجانے لگتی کہ شاید کوئی سمجھو ہو جائے اور پلانے اسے
 قید سے چھڑالیں۔



اس وقت وہ ریلوے کے چیرمین بیٹھا سکرٹ کے کش
 لے رہا تھا۔ جب کسی نے دروازہ بچایا اور اندر داخل
 ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر آنے والے کی طرف

ہو تو مل پر بکھر گئی۔

چلی گئیں۔ کہتے ہوئے اس نے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے آفس میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے پی۔ اے سے لگے دن کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا اور جھکے جھکے انداز میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور اپنا فون اٹھا کر نمبر ملائے لگا۔ اس نے اپنے قریب کھڑی پی۔ اے کو جانے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔
”ہیلو!“ دوسری طرف وہ غٹوگی میں بولا۔ شاید ابھی سو رہا تھا۔
”السلام علیکم فراز۔!“ اس کی آواز سنتے ہی وہ بولا۔

جانے اس کی زندگی میں اور کتنی مشکلات آتا باقی تھیں۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ سب کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت ہی دیکھی تھی۔ مہاتو اسے دکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ صرف میرا ساہ گور علیزے کی مہاتو تھی۔ وہ جب بھی علیزے یا ساہ کو بیمار کر رہی ہو تھی تو وہ حسرت، بھرنی نظروں سے انہیں دیکھتی رہتی اگر وہ ساہ یا بہنوں سے کسی کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتی تو وہ انہیں اٹھا کر کمرے میں لے جاتیں یا اسے ڈانٹ دیتیں۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی پیلا کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاگ۔ مہاتو اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی اجازت کبھی نہیں دی تھی۔ جب سب کھانا کھا لیتے تب وہ بچا ہوا کھانا اسے دے دیتیں۔ اس کو اسٹور روم میں سلاتیں اور ساہ کے پرانے کپڑے اسے پہننے کے لیے دیتیں۔

”ہیلو یو لویار۔“ وہ اس کے سلام کا جواب دے بے بغیر بے زاری سے بولا۔
”فراز! میں نے تم سے پوچھا تھا کہ۔“
”اب کہہ بھی چکو شاہ میر۔ مجھے رپر ہو رہی ہے۔“ وہ اس کی بات کٹتے ہوئے بولا۔
”فراز! تم ابھی تک آفس نہیں گئے۔“
”اے پلیز شاہ میر میں تمہارا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ دانت پیس کر بولا تو وہ ایک گہری سانس لے کر وہ گیا۔
”تم نے فون کیوں کیا تھا؟“
”ہیلو، تم سے پوچھا تھا کہ انہی کا کچھ پتہ چلا۔ لیکچرنگلی میں کلام میں اتنا بڑی تھا کہ ہماری اس حوالے سے بات ہی نہیں ہو سکی۔“ اس نے پوچھا۔
”نہیں شاہ میر! ابھی تک اس کے بارے میں کوئی انفارمیشن نہیں ملی۔ جیسے ہی کوئی ہنر یا چلا میں تمہیں انفارم کروں گا۔ اب پلیز مجھے بار بار فون کر کے تنگ مت کرنا۔“ اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
”اے۔۔۔ اے! دس، سل۔۔۔ دس سل ہو گئے، تمہیں دیکھے تم سے ملے۔ میں صرف تمہارے لیے یہاں آیا اور تم۔۔۔ تم کہاں چلی گئیں ابھی۔ تم کہاں

یا اکثر بیرون ملک ہوتے۔ میں نے گزر جاتے اسے ان کے انتظار میں کیونکہ جب وہ گھر میں ہوتے تب وہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



اپنی شعل مارچ 2015

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

کھل کر سانس لیتی تھی۔ ان کے ساتھ وقت گزارتی۔
ان کی موجودگی میں ممال سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔
اور پاپا کو اس نے کبھی ممال کے بارے کے بارے
میں کچھ نہیں بتایا۔ بتانے کا فائدہ بھی کیا ہوتا۔ گھر کا
ماحول خراب ہوتا اور پاپا کے جانے کے بعد ممال کا رویہ
پور خراب ہوتا سو اس نے کبھی پاپا کو کچھ بھی بتانے کی
کوشش نہیں کی۔

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی گزرے ہوئے گل کی
پادوں میں کھوئی تھی کہ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔
اور وہی آدمی اندر داخل ہوا۔

کمانا محل پر رکھ کر۔ وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ بول
اٹھی۔

”سنو۔“ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔
”یہ سب کس نے کروایا ہے؟“ اس کے سوال کے
جواب میں اس آدمی نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا
اور واپس مڑ گیا۔

”ارے رگو۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“
اس کے دوبارہ پکارنے پر وہ آدمی پھر مڑا اور بولا۔
”میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینے کا پابند
نہیں ہوں۔“ اتنا کہ کہہ وہاں سے چلا گیا اور وہ خالی
خالی نظروں سے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔



”تمہیں بتا ہے علیزے۔! جب میں حویلی میں
تھی تھی۔ تو مجھے کبھی کسی چیز کی شنشن نہیں ہوتی تھی
کہ مجھے ہوم ورک کون کروائے گا۔ پشٹے ملے گا یا
نہیں۔ میں اسکول وقت پر کیسے پہنچوں گی۔ میرے
کچھ بھی کرنے سے پہلے شاہ میری ساری پر اہلیوز
سولو کر دیتا۔ ہوم ورک کروانے میں مدد کرتا تھا۔ پشٹے
فضیلت مملی بنا دیتیں۔ وہ بہت کیرنگ تھا۔“

شاہ میرا نام لہوں پر آتے ہی اس کی آنکھیں جھک
اٹھتیں اور ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھر
جاتی اور علیزے کبھی دیر تک کی بات دے۔ اس کے
چہرے پر آتے جاتے خوب صورت رنگوں کو دیکھتی

رہتی۔
”علیزے! تمہیں بتا ہے۔ فضیلت مملی مجھ سے
بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں بالکل باری ڈول
لگتی ہوں۔ اس عید پر انہوں نے میرے لیے اتنا پیارا
باری ڈولس بھیجا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک نیا
منظر روشن ہوا۔ جہاں وہ بہت پر جوش انداز میں اسے وہ
چیزیں دکھا رہی تھی۔ جو توڑی دیر پہلے اسے اتنی ماموں
اسے دے کر گئے تھے۔

”علیزے! میں شاہ میر کو بہت مس کھوں گی۔ کیا
اب ہم دونوں کبھی نہیں ملیں گے۔“ وہ بہت مصوم
انداز سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”علیزے۔! یہ وہ کھویہ مجھے شاہ میر نے دیا ہے۔
اسے فریڈ شپ بینڈ کہتے ہیں۔ جب تک یہ میرے
پاس رہے گا۔ ہم اچھے دوست رہیں گے۔“ وہ
مسکراتے ہوئے بولی۔

تیل ڈور کی آواز پر علیزے اپنے خیالوں سے
چوگی۔ رائیہ اور انیس کی باتیں اس کے خیالوں کو ذہن
سے جھٹکتے ہوئے۔ اس نے سر خم کر سارہ کی طرف
دیکھا۔ جو مڑے سے نیوی دیکھنے میں مصروف تھی۔
”سارہ! تمہیں شالی نہیں دے رہا یا ہر تیل ہو رہی
ہے۔“ علیزے بولی۔

”تو۔“ دہلا پروا کی سے نیوی دیکھتے ہوئے بولی۔
”سارہ۔! علیزے نے اسے گھور کر دیکھا۔

”لو ہو۔ علیزے! اگر تمہیں اتنی براہیم ہو رہی
ہے تو اٹھ کر دیکھ لو۔ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہی
ہو۔“ وہ تنک کر بولی۔ اسی اثنا میں دوبارہ تیل بجی۔

علیزے نے السوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
اور پھر اسے مفلون چہرہ کو اور پھر میسا کمی کا سارا الٹی اٹھ
کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی دروازے تک آئی۔
اور دروازہ کھولا۔

سامنے ہی پاپا کھڑے تھے۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو
گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔

”السلام علیکم پاپا! وہ رُجوش انداز میں بولی۔
”وعلیکم السلام بیٹا۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔“

بکھر گئی۔ اس نے کال ملائی اور فون کلن سے لگا لیا۔
 ”السلام علیکم میڈم! ایسی ہیں آپ۔“
 ”وعلیکم السلام میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”کیا ہوا مس احمد! کیا کوئی غلطی ہو گئی ہم سے۔“ وہ مسکراہٹ دہاتے ہوئے بولا اور پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گیا۔
 ”کہہ تو ایسے رہے ہو کہ جیسے تم نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔“

”ارے میڈم! آپ کھل کر بات کریں ناں کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ جب وہ سگریٹ نکال رہا تھا۔
 ”بات تو صاف ہے۔ تم نے اپنا کام تو نکھو لیا۔ اب ہمارا کام کب کرو گے۔“ وہ دھنا کر بولی۔

”میڈم آپ کو اندازہ نہیں ہے یہ کلام کتنا مشکل ہے۔ تھوڑا وقت لگے گا۔ مگر ان شاء اللہ ہو جائے گا۔“ وہ لائسنس سے سگریٹ چلاتے ہوئے بولا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ ٹل مٹل سے کام نہیں چلے گا۔“

”اوکے میں کچھ کرتا ہوں۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

”ہوں۔ جو کرنا ہے جلدی کرو۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“ کہتے ہوئے انہوں نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔

اس نے فون کلن سے ہٹا کر ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر اسے ٹیبل پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔



آج وہ پھر کھڑکی کے پاس کھڑی۔ سامنے نظر آتے درخت کی ٹنٹی پر بے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھ رہی تھی جو اپنی چونچ میں خوراک کا ٹکڑا دبائے باری باری اپنے بچوں کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ یہ کھڑکی اس کمرے

آپ کا پڑاؤں۔“
 ”پلیا پلیز یہ کہہ کر مجھے شرمندہ مت کریں۔“ وہ ان کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں ہی دی لائن میں داخل ہوئے۔ سارا لب وہاں پر نہیں تھی وہ ان کے ہمراہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

”اور سائیں پاپا! انیہ کا کچھ بتا چلا۔“ اس کے سوال پر وہ خاموش ہو گئی۔ ان کے کندھے جھک گئے اور چہرے پر پریشانی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے۔

”نہیں بیٹا انیہ کا کچھ بتا نہیں چلا۔ جانے کہاں چلی گئی ہے۔“ کچھلے ایک مہینے سے بالکلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں۔ مگر اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔“ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”پلیا آپ پلیز سٹیشن مت لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ علیحدے نے کہا۔“

”کیسے ٹھیک ہو جائے گا علیحدے لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ اوپر سے تمہاری ہانا کارویہ اس طرح کہتے ہوئے وہ مت بے بس لگے۔

”پلیا پلیز۔ آپ ممائی باتوں کو دل پر مت نیا کریں آپ کو تو ان کی عادت کا پتا ہے ناں۔ وہ تو شروع سے ہی ایسی ہیں اور رہی بات لوگوں کی تو آپ ان کی بھی پروا مت کیا کریں۔ ان کا تو کام ہے باتیں بنانا۔“

علیحدے کی بات پر انہوں نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنی اس نرم دل بیٹی کو دیکھا۔

”چائے بناؤں آپ کے لیے؟“ ان کا موڈ بہتر دیکھ کر وہ پھر بولی۔

”ہاں ضرور۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو وہ جیسا بھی کا سمارالے کراٹھ کھڑی ہوئی۔



وہ اپنے آفس میں داخل ہو رہا تھا جب اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے موبائل آن کر کے اسکرین کی جانب دیکھا۔ جہاں مس احمد کا نام جھمکا رہا تھا۔ اس نے کل کٹ دی۔ ان کی کافی مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک کھنسی مسکراہٹ

موسمی سے انداز میں بولا۔
 ”کیا وہ کام انہی کے حوالے سے تھا؟“ انہوں نے
 کہا۔
 ”جی ہاں۔“ وہ مختصراً بولا۔
 ”شہ میرا انہی چھلے ایک ماہ سے گنہ رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ بولا۔
 ”شہ میرا! میری بہت غور سے سنو۔“
 ”پاپا پلیز۔ میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا
 چاہتا۔“ وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”دیکھو بیٹا۔ ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ مگر انہی کا کچھ
 پتا نہیں چلا۔ وہ کہاں ہے۔ کیسی ہے۔ کس محل میں
 ہے۔ شیر نے اسے ڈھونڈنے کی سرٹوڑ کو پیش کی مگر
 نیچہ تمہارے سامنے ہے۔ میرے خیال میں تمہارے
 لیے بہتر یہی ہے کہ تم انہی کو بھول جاؤ۔“ ان کی آخری
 بات پر شاہ میر نے چونک کر حیرانی سے اپنے باپ کی
 جانب کھل۔

”پاپا! انہی آپ کی اکلوتی بہن کی اکلوتی نشتالی ہے،
 اور آپ کے اکلوتے بیٹے کی محبت ہے۔ یہ آپ جیسے
 بھول گئے۔“ وہ رشتی سے بولا۔
 ”مگر بیٹا۔“

”پاپا! پلیز۔ میں اب مزید کچھ نہیں سنا چاہتا۔ یہ
 سب بھول لے کہ آپ بھی تین بیٹیوں کے باپ ہیں اگر
 اللہ نہ کرے۔ گل نہیں، قاتلہ گل یا ماٹھ گل کے
 ساتھ ایسا کچھ ہوا ہوتا تو کیا آپ تب بھی بھی کہتے کہ
 بھول جاؤ۔“

”شٹ اپ شاہ میر۔“ وہ فحش سے بولے۔
 ”تلی ایم سو ری پاپا! مگر آپ کے رویے نے مجھے
 بہت ہاوس کیا ہے۔“ لہذا کہ کرن کمرے سے نکل
 گیا۔

پھر اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ وہ سلت سلت
 کی گئی جب ایک دن سر قرضی ہاسٹل اور ارضی ہاسٹل
 آئے۔ انہوں نے پاپا سے اسے حویلی ساتھ لے جانے

میں اس کی واحد تفریح تھی۔
 چھلے ایک مہینے میں وہ اتنی ہار مدھکی تھی۔ اتنی ہار
 ٹوٹ چکی تھی کہ باوجود تکلیف اور اذیت کے اب اس
 کے آنسو ہی نہیں نکلتے تھے۔ وہ ایک ہار پھر ماضی کی
 یادوں میں کھو گئی۔

پاپا کے علاوہ اگر اس کی ذات میں کسی کو دلچسپی تھی تو
 وہ علیزے تھی۔ وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ مگر
 اپنے انداز و اطوار سے وہ اس سے بڑی لگتی تھی۔ پاپا
 کے بعد ایک وہی تھی جو اس کا خیال کرتی۔ اس کے
 ساتھ کھیلتی۔ اس کے ساتھ وقت گزارتی۔ ماما بھی
 علیزے کو کچھ نہ کہتیں۔

علیزے ماما کی سگی لولہ ہونے کے باوجود ان سے
 دور تھی۔ سوجہ اس کا معمولی صورت اور مفلوج چہرہ ہونا
 تھا۔

وہ مزاج میں پوری اپنے باپ کا پرتو تھی۔ حساس اور
 خیال رکھنے والی جبکہ سارا اور میری دونوں خوب صورتی
 اور عادات کے لحاظ سے ماما جیسے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ ماما علیزے کو پیار نہیں کرتی
 تھیں وہ جیسی بھی تھی بہن کی لولہ تھی۔ وہ اسے پیار
 بھی کرتی تھیں۔ اس کی ہر ضرورت بھی پوری کرتیں۔
 بس یہ علیزے ہی تھی جو ان سے کھلی کھلی رہتی تھی،
 اس کے اسی رویے نے انہیں اس سے دور کر دیا۔

علیزے کی زندگی کا محور وہ لولہ تھی یا پھر اس کی
 کتابیں اور علیزے کا سارا ہونا اس کے لیے بہت
 بڑی بات تھی۔

 ”پاپا! فراز کہاں ہے؟“ وہ ابھی تھوڑی دور پہلے ہی
 کراچی سے واپس آیا تھا اور سب سے ملنے کے بعد وہ
 ان کے پاس چلا آیا۔

”وہ آفس میں ہے۔ آج ضروری میٹنگ تھی اس
 کی۔“ وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔
 ”ویسے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“
 ”وہ ایک کام کا کہا تھا اسے وہی پوچھنا تھا۔“ وہ

سارے ٹھکے کیسے تیار ہو جائیں گی۔ اس سے اپنی اس بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ کتنی بدلتی ہوئی تھی۔
اس نے پیلا سے التجا کی کہ وہ یہاں نہیں رہتا چاہتی۔ پیلا اسے حویلی واپس بھیج دیں۔ شیر صاحب نے انکار کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ خود بھی کئی پریشان ہو گئے اور بالآخر انہوں نے اسے حویلی جانے کی اجازت دے دی۔ اور یوں وہ دوبارہ حویلی آ گئی۔ اپنی دنیا میں گپے پونڈر لینڈ میں جہاں سارے رشتے محبت اور پیار سے بھرے تھے۔



”فراز! ایسے کا کچھ بنا چلا۔“ وہ اس وقت فراز کے کمرے میں موجود تھا۔
اس کی بات پر فراز پہلو بدلتا کر رہ گیا۔
”آں۔ نہیں۔ ابھی تک تو کچھ بنا نہیں چلا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ میں جلد تمہیں اچھی خبر سناؤں گا۔“
”فراز۔ مجھے ایسا کیلنگ رہا ہے کہ تم ایسے کو ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو۔“ وہ مفلوک انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
”شاہ میر۔! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا اور تم یہ مت بھولو کہ اس کا بھٹ سے بھی کوئی رشتہ ہے۔ میری کزن ہے۔ مجھے مت الوسوس ہو رہا ہے تمہاری سمجھ پر۔“ وہ اسے ٹھکے کنٹینر نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
”کئی ایم سوری فراز بلیر ایسے مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم ریلویری سوری۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔
”اس اوکے۔“ وہ بولا۔
”اور سناؤ۔ بزنس کیسا جا رہا ہے۔ سنا ہے تم نے اپنی ٹیکسٹی کھولی ہے۔“ فراز نے مفلوکو کا رخ دوسری جانب موڑا۔
”ہاں کھول توئی ہے۔ مگر پینٹل کرنا تو ڈراما مشکل ہو رہا ہے۔ کلام کا پریشر زیادہ ہے۔“ وہ کھوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

کی بات کی سیلابان گئے اور وہ ان کے ہمراہ حویلی آ گئی۔
یہاں اس کی توقع کے برعکس سب نے پرچوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔ فضیلت مملانی سیکرڈ مملانی اور ان کے بچوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب نے اسے بہت پیار دیا۔ آخر وہ ان کی اکلوتی مندر کی بیٹی تھی۔ سب سے بڑے ارتقشی ماموں تھے۔ ان کی بیوی سیکرڈ مملانی ان کے پانچ بچے سب سے بڑے عمر مملانی پھر عظیم اس کے بعد فراز اور آخر میں زر گل۔ جبکہ مرتقشی ماموں اور فضیلت مملانی کے چار بچے تھے۔
سب سے بڑی کاملہ گل۔ پھر شاہ میر اور آخر میں عائشہ گل اور گل نمین۔

وہ جلد ہی ان سب سے کھل مل گئی۔ اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ خان دلہا کی بہنوں (لڑکیوں) کا تھا جو وطن اس نے حویلی میں گزارے وہ اس کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔
اس کی سب سے زیادہ دوستی شاہ میر سے تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ اپنی چیزیں کھلونے اس کے ساتھ شیئر کرتا۔
اسے پتا بھی نہ چلا کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں اور پیلا اسے لینے آگئے واپس جانے کا سن کر وہ بہت لاس ہو گئی تھی مگر کیا کرتی۔ جانا تو تھا ہی دل پر پھر رکھ کر وہ واپس آ گئی۔ وہ وہاں سے آنے کے بعد بہت بدلتی گئی۔ بات بات پر حویلی کے کینوں کا ذکر کرتی رہتی۔ علیحدے تو اس کا شاہ میر تھ من سن کر تک آچکی تھی۔ ہر وقت وہ اس کی باتیں کرتی رہتی۔
”شاہ میر کو گاجر کا حلہ بہت پسند ہے۔ چاکلیٹ نہیں کھاتا۔ اسے بلو کمر پسند ہے۔ اس کے زیادہ دوست نہیں ہیں۔ اسے انگلش سویڈ بہت پسند ہیں۔“ حیرت تو تب ہوئی جب پیلا نے اسے بتایا کہ وہ لگے ہفتے واپس کویت جا رہے ہیں تو وہ کتنی دیر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
تب زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ پیلا کو ماما کے نام سے پکارے میں بتایا۔ اس نے ان سے ڈھیر

”کوئی بات نہیں۔ شروع شروع میں براہلہز ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فرزانے کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

”اچھا میں چلتا ہوں رات کلتی ہو گئی ہے۔ تم بھی آرام کرو۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میری تو خود کھڑی نہیں آ رہا شاہ میر پٹنا ایش کیا کراہت پریشان ہوں۔ انیہ کا ابھی تک کچھ بتا نہیں چلا۔ اگر یہ گنڈھنگ کا کیس ہے تو ابھی تک کسی گنڈھنگ کا فون کیا نہیں آیا؟“ شیر صاحب اس وقت لی وی لاؤج میں بیٹھے فون پر شاہ میر سے بات کر رہے تھے۔ وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔

”پولیس میں رپورٹ بھی درج کروائی ہے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔“ لی وی لاؤج کے پاس سے گزرتی سعدیہ بیگم ایک دم ٹھٹک کر رک گئیں۔

”اوکے۔ ٹھیک سے بعد میں بات کرتے ہیں۔“ سعدیہ بیگم کو اندر آتا دیکھ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے شیر۔ تم یہ مان کیوں نہیں لیجے کہ انیہ کا اغوا نہیں ہوا بلکہ۔“ وہ متنی خیزی سے بات لوجوری پھوڑ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”تم کتنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ ان کے لفظوں پر فور کرتے ہوئے بولے۔

”میں کون سی پٹیلیاں بچھوا رہی ہوں۔ صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ اگر اس کا اغوا ہوتا تو کوئی تو آپ سے رابطہ کرتا۔ مگر مینہ ہو گیا ہے۔ انیہ کا کچھ بتا نہیں کہ کہاں ہے۔ اب اللہ جانے اس کا اغوا ہوا بھی ہے کہ نہیں۔“

وہ حیرانی سے بیوی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”دیکھو سعدیہ! تم نے جو کہتا ہے۔ صاف کہو۔“

”کہنا کیا ہے۔“ اب کہنے کو بچا ہی کیا ہے شیر صاحب! انیہ کا اغوا نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انیہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

”سعدیہ۔! شٹ اپ۔ جیسٹ شٹ اپ! تمہیں شرم نہیں آئی میری بیٹی کے بارے میں اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔“ وہ غصے سے بولے۔

”چلانے یا مجھے چپ کرانے سے بات ختم نہیں ہو جائے گی شیر صاحب! یہ میں نہیں سارا زنا کہہ رہا ہے۔ بس ایک آپ ہی اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔“ وہ بھی غصے سے بولیں۔

”اس سے پہلے کہ میں کچھ کر بیٹھوں تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ وہ درشتی سے بولے اور وہ اونہ کرتی وہاں سے چلی گئیں۔

اور پھر وہ تین سال اس نے حویلی کی خوب صورت فضاؤں میں گزارے۔ صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں پیلا کے کہنے پر وہ کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاتی۔

مرغضی مائوں نے اسے شاہ میر کا محل محل وغیرہ کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ ان کے ساتھ اسکول جاتی۔

شاہ میر بہت اچھا تھا۔ اگر اسے ہومورک کرنے میں کوئی براہم ہوتی تو وہ اس کی مدد کرتا۔ اگر وہ لوگ کوئی کیم کھیلتے تو وہ ہمیشہ شاہ میر کی طرف سے کھیلتی۔

اور پھر ایک دن پیلا اسے لینے آگئے۔ وہ مدد طلب نظروں سے مرغضی مائوں کو دیکھنے لگی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر انہوں نے پیلا سے بات کی کہ وہ انیہ کو مستقل یہیں رہنے دیں۔

ان کی بات سن کر وہ غصے میں آگئے اور اسے زبردستی وہاں سے لے آئے۔ اور اس کے بعد اس کے لاکھ متیں کرنے کے باوجود انہوں نے اسے وہاں جانے کی اجازت نہ دی۔

”بس شاہ میر بہت ہو گیا۔ اب کی بار میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ محل میں تمہارے پیلا کے گھر جا رہی ہوں۔ تمہارے لیے ان کی بیٹی زر محل کا ہاتھ مانگتے۔“

ان کی بات پر وہ جو صوفے پر بیٹھا موبائل پر مسیج

کرنے میں مصروف تھا۔ ایک دم سیدھا ہوا۔
 ”ہم ایسے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے زر گل سے
 شادی نہیں کرنی ہے۔“

”بس شاہ میرا ہمت ہو گیا۔ آخر کب تک تم انیس
 کے نام پر بیٹھے رہو گے۔ جس کا پچھلے دو مہینوں سے
 کچھ بتائیں بے لورویسے بھی جب تمہاری شادی ہو
 جائے گی میں تو دیکھتا تم جلد ہی انیس کو بھی بھلا دو گے۔“
 ان کی بات سن کر وہ حیرت سے اپنی ہاں کا چوڑا کھتا رہا۔
 ”ہم۔۔۔ اہم از کم مجھے آپ سے تو یہ امید نہیں
 تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا کہ ساری دنیا بھی
 میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ تو آپ میرا ساتھ نہیں
 چھوڑیں گی۔“

وہ افسوس سے انیس دیکھا، ہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔
 ”شاہ میر۔ شاہ میر بیٹا! میری بات تو سنو۔ شاہ
 میر۔“ وہ پیچھے سے تو اڑیں دیتی رہ گئیں۔

”تمہاری ماں نے بتایا کہ تم نے زر گل سے شادی
 سے انکار کر دیا ہے۔“ رات کے کھانے پر اس کی
 ملاقات پیلا سے ہوئی اور انہوں نے یہ بات پھینک دی۔
 اس نے سر اٹھا کر ہاں کی طرف دیکھا جنہوں نے اسے
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہم اس بارے میں بعد میں بات کر سکتے ہیں۔“ وہ
 بولیں تو مرطبی خان نے اپنی بیوی کی طرف گھور کر
 دیکھا۔

”تم خاموش رہو۔ ہم اپنے بیٹے سے مخاطب ہیں،
 اب تم بتاؤ۔ تم نے اسے رشتے سے انکار کیوں کیا۔ کیا
 کسی ہے زر گل میں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے
 بولے۔

”میری بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس
 میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اسے مجھ سے بہتر مل سکتا
 ہے۔“

”مگر تم کیوں نہیں۔ تم میں بھی کوئی کمی نہیں
 ہے۔“

”مگر میں اس سے محبت نہیں کرتا۔“ اس نے حواز
 پیش کیا۔

”یہ معقول جواب نہیں۔“
 ”میں انیس سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے میں
 زر گل سے شادی نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔

”نہیں کیا لگتا ہے کہ میں اپنے بڑے بھائی کو انکار
 کروں گا ہرگز نہیں۔ تمہارے انکار کرنے سے قاطع
 کا رشتہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس
 نے قاطع کو دیکھا جو سر تھکائے بیٹھی تھی۔ اپنا نام سن
 کر کھانا اُدھورا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

”تو آپ انکار نہیں کریں گے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں ہرگز نہیں۔“ وہ ہشدرہری سے بولے۔
 ”ٹھیک ہے تو پھر آپ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو دیں
 گے۔“ انکا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ہلکا بکا سے جاتے
 دیکھتے رہے۔

”دیکھا۔ کس طرح بد تمیزی کر کے گیا ہے میرے
 ساتھ یہ۔ یہ تمہاری پرورش کا نتیجہ ہے۔ اب کیا منہ
 دکھاؤں گا اپنے بھائی کو۔“

قاتلہ گل کی حتمنا خان کے ساتھ بچپن سے
 نسبت طے تھی۔ شاہ میر اور زر گل کے رشتے کا شوشا
 انیس کی گمشدگی کے بعد چھوڑا گیا اور اس بات پر وہ
 یوگلا کر رہ گیا۔ پیلا کو راضی کرنا مشکل تھا۔ مگر وہ یہ جانتا
 تھا کہ ایسا ابا خاں سے سمجھ دار ہیں۔ بات کو سنبھال لیں
 گے اور ہوا جس کی انہوں نے کوئی لاش نہیں بتایا اور
 بات ختم کر دی۔

وہ رات دیر تک لیپ لاپ پر کام کرتا رہا۔ کام ختم
 کرنے کے بعد وہ جیسے ہی لائٹ آف کرنے کے لیے
 اٹھا۔ تو اس کی نظر کمرے کے باہر والے منظر پر پڑی۔
 لان میں شاید کوئی ٹھل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر
 دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ اس وقت کیوں جاگ رہی
 ہے۔

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ
 بیڑھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔ نیچے والے پورشن میں بھی
 اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ لالی کاروان کھول کر باہر نکل آیا
 اور آہستہ آہستہ قدم اٹھا تا اس تک آیا۔ وہ اسے دیکھ
 کر جو تک گئی۔

اقرا بھابی (مہر کی بیوی) کچھ پرانی البھڑ لے وہاں آئیں۔

”کل نین یہ کچھ البھڑ لے ہیں مجھے اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے۔“ انہوں نے شاہ میر سے کچھ فاصلے پر بیٹھی گل نین سے کہا۔

”ہاں یہ میری البھڑ ہیں۔ میں ہی رکھ کر بھول گئی تھی۔“ وہ بولی۔

”تو کیا میں یہ دیکھ سکتی ہوں۔“ بھابی نے کہا۔
”ہاں کیوں نہیں“ لائیں میں آپ کو دکھاتی ہوں۔“ وہ لن کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور تصویریں دکھانے لگی۔

”یہ دیکھیں۔ یہ ہم سب بچپن میں یہ عمر بھائی زر گل کا طرہ گل نے فراز کاٹھی سے گل عثمان بھائی اور۔۔۔ یہ میں۔“ وہ پر جوش انداز میں انہیں تصویریں دکھا رہی تھی۔

”اس میں شاہ میر کی کوئی تصویر نہیں ہے۔“ اقرا بھابی نے کہا۔

”نہیں۔ انہیں تصویریں کھینچنا سخت ناپسند ہے۔“ وہ شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولی۔ جو بظاہر سچ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی توجہ انہیں کی طرف تھی۔

”ارے یہ وہی لڑکی ہے میں جو میری شادی پر آئی تھی۔“ اقرا بھابی پر جوش انداز میں بولیں۔

”ہاں یہ وہی ہے۔“ گل نین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا نام تھا اس کا۔“ انہوں نے پوچھا۔
”انیہ۔ انیہ نام ہے اس کا۔ میری مرحوم پھوپھی کی بیٹی ہے۔“ وہ بولی۔

”لن کی باتوں کو وہ خوبی سن رہا تھا۔“
”تو یہ اب آئی کیوں نہیں؟“ انہوں نے کہا۔

”ہاں۔ اس کے بعد پھر انیہ اور فراز بھائی کا کسی بات کو لے کر جھگڑا ہو گیا۔ پھر اس کے اگلے دن۔“

”کیا کہا تم نے انیہ اور فراز کا جھگڑا۔“ وہ ابھی بہت پوری بھی نہ کر پائی تھی کہ شاہ میر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

”لو۔ آ۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے کہ اتنی رات کولان میں کیا کر رہی ہو؟“ وہ بولا۔

”مجھے نین نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے باہر چلی آئی۔“ وہ آسٹھلی سے بولی۔

”وہ کھو زر گل اُرت بہت ہو چکی ہے۔ تمہیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اسے جانے کا اشارہ کرتے وہ مڑا۔ جب ہی وہ بولا۔

”آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا؟“ اس کی بات سن کر وہ چونک کر بیٹھا۔

”میں تمہیں جو اب وہ نہیں ہوں۔“ اس نے ٹٹاہ چرائی۔

”مگر مجھے جواب چاہیے۔ ایسی کیا کمی ہے مجھ میں جس کی وجہ سے آپ نے مجھے ٹھکرا دیا۔“ اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”تم میں کوئی کمی نہیں ہے زر گل! کمی تو مجھ میں ہے۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”لور میں جو آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اس کا کیا۔“

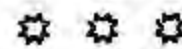
”وہ ایک طرف ہے تم ہنڈیاتی ہو رہی ہو۔“

”اور جو محبت آپ انیہ سے کرتے ہیں وہ ایک طرف نہیں ہے کیا۔ کیا انیہ آپ سے محبت کرتی ہے؟ اس نے تو پچھلے دس سال سے آپ کو نہیں دیکھا۔ اسے تو شاید آپ یاد بھی نہیں ہوں گے۔“

”زر گل اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”سجائی سے منہ موڑ لینے سے سچ بدل نہیں جاتا۔“

”زر گل۔! یہاں سے جاؤ۔“ وہ زور سے بولا اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ لور وہ سر پکڑ کر وہاں پر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔



وہی۔ وی لاؤنج میں بیٹھائی۔ وی دیکھ رہا تھا جب

”فہم۔۔۔ بھائی۔“
”گل نین! مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔“

”بھائی۔۔۔ میں۔“

”گل نین! تار گلہا ایک۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔“

”شاہ میر! آرام سے۔۔۔ بچی کو ڈراؤ تو مت۔“ اقرار

بھابھی نے کہا تو بڈرا پیار سے بولا۔

”پلیز بتاؤ مجھے۔ ان دونوں کا جھگڑا کیوں ہوا تھا۔“

”بھائی۔! میں۔ مجھے نہیں پتا۔ وہ نہ تو جب

میں اپنے آپنی کے کمرے میں جا رہی تھی تو کمرے سے

فراز بھائی کی اونچا بولنے کی تو آوازیں آ رہی تھیں۔“ وہ

چنگچکاتے ہوئے بولی۔

”کچھ یاد ہے نہ آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے۔“

اس نے پوچھا۔

”نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان پر غصہ ہونے

کے بعد وہ چلے گئے مگر۔۔۔ انہی آپنی بہت دیر تک روٹی

رہیں پھر اگلے دن ہی وہ واپس چلی گئیں۔“

بہت سی باتیں ایسی تھیں جو ابھی بھی بس کی

نظروں سے اوجھل تھیں اور ان سب سوالوں کے

جواب صرف ایک شخص سے مل سکتے تھے۔

وہ پر سوچ انداز میں وہاں سے نکل گیا۔



اسے بار تھا بلانے اس کے حویلی جانے پر پابندی لگا

دی تھی۔ اگر وہ لفظی سے بھی حویلی جانے کا نام لیتی تو وہ

غصے میں آجاتے۔

پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ان کے سامنے حویلی

جانے کا نام نہیں لیتی۔ مگر حویلی کے مکین ابھی بھی اس

کے دل میں زندہ تھے۔ وہ علیحدے سے ہر وقت حویلی

کی باتیں کرتی رہتی جس میں زیادہ ذکر شاہ میر کا ہی

ہو۔ سو وقت کا کام تھا گزرنا سو گزرنا گیا۔

جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تب ایک دن ارنلڈ

ماسوں چلے آئے۔ پلا بھی ان دنوں کویت سے آئے

ہوئے تھے۔ اپنے بڑے بیٹے عمر کی شادی کا کارڈ لے

کر آئے تھے۔ انہوں نے پلا کو شادی کی دعوت دی اور

انہیں اس بات پر بھٹک کر رہی کہ وہ انہی کو پھر وہاں

کے لیے حویلی لے جائیں۔ خلاف توقع وہ مان گئے۔

اس دن اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سلمان بیک

کر کے وہ ماسوں کے ساتھ حویلی آگئی۔ اس کی آمد کا

سن کر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ عیاش کی طرح سب

لوگ اس سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ سب سے

ملی سوائے اس شخص کے جس سے ملنے کی خواہش میں

وہ یہاں تک آئی تھی۔ جب شام تک وہ اسے کہیں

نظر نہ آیا تو عائشہ گل سے پوچھ بیٹھی۔

”عائشہ۔! یہ شاہ میر نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں

ہے وہ۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔

”وہ یہاں پر ہے ہی نہیں تو نظر کیسے آئے گا۔“ وہ

کپڑے الماری میں سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ کیا مطلب یہاں نہیں ہے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ تو بڑھائی کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہے۔“

”اچھا کب۔“ وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی

تھی۔

”تمہیں نہیں پتا؟“ عائشہ گل حیران ہوئی۔

”نہیں تو۔“

”اچھا۔“ عائشہ چپ ہو گئی۔

”مگر اسے شادی پہ تو اتنا چاہیے تھا۔“ وہ پھر بولی۔

”ہاں اتنا تو چاہیے تھا مگر کیا کرے وہ بھی مجبور ہے۔

اسے چھٹی نہیں ملی۔“

اگر اسے پتا ہوتا کہ تم آ رہی ہو تو پھلا تکیں لگانا

ہوا آتا۔“ وہ شرارت سے بولی تو انہی نے حیرانی سے

اسے دیکھا۔

”تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔“ وہ کٹھن زہو گئی۔

”نہیں۔ اس ایسے ہی۔ اللہ تمہیں نظریہ سے

بچائے۔“ وہ اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

اور پھر اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی۔ جیسے تیسے

کر کے شادی ختم ہوئی اور اس نے جانے کا ارادہ کیا۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ اگلے دن واپس جا رہی تھی۔

پھر اپنے کمرے میں بیٹنگ کرنے میں مصروف تھی کہ

اچانک دروازہ کھلا اور فراز اندر آیا۔ اور جو کچھ اس نے

کہا۔ اس نے اس کی ذات کے پرچے اڑا دیے۔
کتنی دیر بے حس و حرکت اس دروازے کی جانب
دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔
اور اس کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی خان
پاؤس دواہ نہیں آئے گی۔ اور آج کے بعد اس کا اس
فصل سے رشتہ ختم۔



آج پھر وہ کڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ جب وہی
کوئی دوسرا کھانا لے کر آیا۔ کھانا کھل پر رکھ کر وہ
واپس جانے کو مزلی تھا کہ وہ بول اٹھی۔
”یہ سب فراز نے کروایا ہے میں؟“

اس کی بات سن کر وہ کالور حیرت سے اس نے اس
کی جانب دیکھا۔ اس آدمی کے اس طرح دیکھنے سے
اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ایک طنز
مسکراہٹ اس کے چہرے پر بیکھر گئی۔
”ایک بات کہوں بیلا۔ انسان کو لگتا خود غرض بھی
نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا خوف دل سے نکال
دے۔“

”اس سے جا کر کہہ دو تا میں اس سے نہیں ڈرتی اور
جو وہ چاہتا ہے میں وہ ہرگز نہیں ہونے دلاؤ گی۔“ کہتے
ہوئے وہ رو پڑی۔

”تم نے میری زندگی برباد کر دی فراز۔ میں تمہیں
کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ گل خان اس لڑکی کو
دوتا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔



وہ بہت غصے میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔
فراز سامنے ہی صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا
تھا۔ اسے دیکھ کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ
ڈسٹ بن میں پھینکی۔

”ارے شاہ میرا تم کیسے ہو یار۔“ وہ اس سے ملنے
کے لیے آگے بڑھا ہی تھا جب شاہ میر نے اس کے سینے
پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے پرے دھکیلا۔
”اب یہ کہیں ہے فراز۔“ وہ رشتی سے بولا۔

”مجھے ابھی کچھ پتا نہیں چلا جیسے ہی کچھ پتا۔“
”چنانچہ۔“ اس نے ایک زوردار چھڑا اس کے
منہ پر رسید کیا۔

”شاہ۔ شاہ میرا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا
وہ کہاں ہے۔“ وہ اپنا گل سلاتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو تم نے دو سال پہلے اسے ایسا کیا کہا تھا جس
کی وجہ سے وہ وہاں سے چلی گئی۔“ وہ غصے سے بولا۔
”نہ۔ کب میں۔ میری تو اس سے کوئی بات
نہیں ہوئی۔“

”فراز۔! دو سال پہلے تم اس کے ساتھ کس بات
پر لڑے تھے۔“ وہ غصے سے ایک ایک لفظ چراتے
ہوئے بولا۔

”وہ کچھ شاہ میرا تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔
میری اور انہی کی ایسی کوئی سیڑھی بات نہیں ہوئی۔“ وہ
پھر بولا۔

”میری ایک بات مکن کھول کر سن لو فراز۔! جس
دن مجھے پتا چلا کہ انہی کی گشدری کے پیچھے تمہارا ہاتھ
ہے تو یاد رکھنا مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

وہ اسے متنبہ کرنا لائے قدموں واپس مڑ گیا۔ اس
کے فون کی لائپنگی اس نے ہنسا کیے فون اٹھالیا۔
”بیلا۔“

”فراز! دو مہینے ہو گئے ہیں میرا کلام نہیں ہوا۔ تم کر
کیا رہے ہو؟“ ریسو کرتے ہی وہ دوسری طرف سے
بولیں۔

”کچھ نہیں۔“
”یہ کیا بات ہوئی فراز۔! دو مہینے ہو گئے اور میرا کلام۔“

”ارے بھائو میں کیا تمہارا کلام اور میں اتنے
برے طریقے سے چسپس گیا ہوں اور تمہیں اپنے کام
کی بڑی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا اگر میں پکڑا گیا ہوں تو
چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔“ لگتا کہ اس نے غصے
سے فون بند کر دیا۔

”آپ نے بلایا صاحب! گل خان کمرے میں
داخل ہوتے ہوئے بولا۔ فراز جو کرسی سے ٹیک لگائے

آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اسی وقت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں مجھے تم سے کچھ کام تھا۔“

”جی کہتے صاحب! وہ سو بانداز میں بولا۔“

”وہ فارم ہاؤس والی لڑکی ہے۔“

”جی صاحب۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اسے رات کو فیض کے کچھ لوگ لینے آئیں گے۔ ان کے حوالے کرو۔“

گل خان اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ فیض کو

اچھی طرح جانتا تھا فرازا اکثر اس کے ساتھ جوا کھیلتا تھا۔

اور انیہ کو اس کے حوالے کرنے کا مطلب تھا۔

”کیا ہوا گل خان! کہاں کھو گئے بھی۔“

”صاحب! میں سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی کو فیض کے

حوالے میرا مطلب ہے۔“

”لو بیو گل خان! اپنی زندگی عزیز ہے کہ نہیں اور

تمہیں اس سے کیا میں لڑکی کو فیض کے حوالے کروں

کسی اور کے تم اپنے کام سے کام رکھو اور جتنا کہا ہے

انتاہی کرو۔“ وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

”جی۔ صاحب۔“ وہ بولا۔

”اب جاؤ یہاں سے۔“ اس کے کہتے ہی وہ وہاں

سے چلا گیا۔

رات کے دس بجے کے قریب گاڑی فارم ہاؤس

کے پاس آ کر رکی۔ گاڑی سے چار آدمی برآمد ہوئے جو

شکل اور حلیے سے ہی بد معاش نظر آتے تھے۔ ان

چاروں کا رخ فارم ہاؤس کی طرف تھا۔

گل خان انہیں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ

نکالا اور فون ملانے لگا۔ مگر مطلوبہ نمبر سے جواب

موصول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آدمی اب فارم ہاؤس کے

اندرو داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کی نظر

گل خان پر پڑی۔

”او بڑھے! لڑکی کہاں ہے۔“ ان میں سے ایک

آدمی انتہائی بد تمیزی سے بولا۔ گل خان نے چاروں ناچار

سامنے کمرے کی جانب اشارہ کیا اور سر جھکا لیا۔

وہ چاروں کمرے کی جانب بڑھے۔ وہ جو گھنٹوں میں

سروے بیٹھی تھی ایک دم ہڑبوا کر اٹھ بیٹھی اور سامنے

کا منظر دیکھ کر سن ہو گئی۔ اب اس سے بڑی لذت اور

دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تو تم اس حد تک گر

گئے فرازا۔ دل ہی دل میں بولا۔

”ارے واہ ایہ لڑکی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔“ ان میں

سے ایک آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ جبکہ ان تینوں نے

زور دار تہقہ لگایا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ

اگلے قدم پیچھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے ہاتھ لگاتا۔ انیہ نے اسے

نور کا دکھایا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پاس رکھی ٹیبل پر جاگرا

جس کا کوتا اس کے سر پر لگا۔ موقع دیکھ کر وہ دو ازانے

کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ ان میں سے ایک نے

اسے بازو سے پکڑ کر روکا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے

منہ پر رسید کرتے ہوئے اسے بیڈ پر پھینک دیا۔ جبکہ وہ

آدمی پہلے والے کو اٹھا رہے تھے۔ اس آدمی نے پہلے

اپنے سر سے گرتے خون لور پھر بیڈ پر گری انیہ کو دکھا

اور پھر غصے سے خود کو چھڑاتا ہوا انیہ کی جانب چلا۔

”سہلی مجھے مارتی ہے۔ مجھ پر حملہ کرتی ہے کہہنی۔“

اس نے ایک دو تین کہتے ہی تھپڑ اس کے منہ پر

مارے اور اسے باطن سے پکڑ کر سامنے دیوار پر

دے مارا۔ وہ ایک دم زمین پر گری اس کے سر سے

خون بہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی جانب

بڑھتا۔ دو ازانہ کھلا اور وہ ولید کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

اس نے ہولنی قہقہے کیا کمرے میں پھیل گئی۔ وہ سب

بھاگ گئے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ تب

تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے سر سے خون

بہ رہا تھا اور چہرے پر جا بجا پھنٹوں کے نشان تھے۔

اس کا ہونٹ بھی پھٹ چکا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر

غصہ عود کر آیا اور وہ اس شخص کی جانب بڑھا۔ جسے

اندر آتے ہوئے اس نے انیہ کی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔

اور آگے بڑھ کر اس نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ

دے مارا۔

”تمہی ہمت کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی۔“ کہتے

ہوئے۔ اس نے دو تین تھپڑ اور رسید کیے۔

شکر سے تم نے ہمیں اس قاتل سمجھا۔" ولید نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہارے لیے بستر لگا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں، میں لائق مج میں سو جاؤں گا۔ تم دونوں آرام کرو۔"

"اب مجھے شرمندہ مت کرو، شاہ میرا جانا ہوں، میرا گھر چھوٹا ہے مگر میرا دل بھونٹا نہیں ہے۔"

"ولید۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں، میں ایڈجسٹ کر لوں گا، تم جاؤ۔" حنا جابھی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ جانا تھا، ہلے نہ لانا نہیں ہے۔

ولید اس کے بچپن کا دوست تھا، وہ ڈاکٹر تھا۔ پچھلے سال ہی اس کی حنا سے شادی ہوئی تھی۔

دونوں اسلام آباد کے پوسٹ علاقے میں رہتے تھے۔ حنا اس کی کلاس فیلو تھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ انیہ کی جانب متوجہ ہوا۔ جو پرسکون تھی۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشان واضح تھے۔ سر پر نئی بندھی ہوئی تھی۔ ہونٹ سوچے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔

بے اختیار اس کی دل میں درد کی لہر اٹھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے اسے ہلکی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آٹھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اسی حالت میں صوفے پر لیٹا تھا۔ اس نے بیڈ پر لیٹی انیہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی حنا بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حنا۔۔۔ ولید کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ تو صبح ہی آپس چلے گئے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا۔ تم انیہ کا دھیان رکھنا اور اگر وہ تم سے کچھ بھی پوچھے تو بل ونگل اور اسے کہیں جانے بھی مت دینا۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب! میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

اس کا اچھے سے خیال رکھوں گی۔ مگر پہلے تم ہاشمہ کر لو۔

"شاہ میرا کل ڈاؤن اس وقت تمہیں اپنی کزن کو دکھانا چاہیے۔ اس کی حالت کلنی خراب ہے۔" کہتے ہوئے ولید نے اسے انیہ کی جانب متوجہ کیا۔ وہ وہاں انیہ کی جانب آیا اور اسے اٹھا کر باہر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر خود فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اس وقت کہاں لے کر جائے۔ اسے اس حالت میں نہ وہ اپنے گھر لے جاسکتا تھا اور نہ ہی انیہ کے گھر۔ شبیر انکل کو ہارٹ ایک ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں تھے اور سہیہ آئی پر وہ کسی صورت بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور گھر میں فراز کی موجودگی میں وہ انیہ کو نہیں لے جاسکتا تھا۔ ولید کا ہی گھر تھا جہاں وہ انیہ کو لے جاسکتا تھا۔ اس نے سوچا اور گاڑی اشارت کر دی۔

"حنا! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"لن شاہ اللہ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی تم فکر مت کرو۔" وہ اس کا معائنہ کرتے ہوئے بولے۔ اسی اثنا میں ولید چائے لے آیا۔

"تو بھائی! میرے ہاتھ کی گرام گرم چائے پیو۔" وہ بولا۔

"تھنک یو۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کپ لیا۔

"ویسے شاہ میرا تم نے بتایا نہیں یہ سب کیا کس نے؟" ولید نے پوچھا تو وہ اسے سب کچھ بتا چلا گیا۔

"اوما کی گاڑی مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ سب فراز نے کیا ہے۔" وہ اس کی بات سن کر حیرانی سے بولا۔

"ہوں۔ یقین تو مجھے بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ سچ ہے۔"

"مگر اس نے ایسا کیا کچھ؟" کب کی بار حنا بولی۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ ٹی ٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اچھا اب تم لوگ سو جاؤ، میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے۔" وہ بولا۔

"نو پراہم۔ ہمیں تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی۔"

جتائے کہا۔

”آئی ایم سوری جتا میں بیٹھ نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔“ اس کا کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اب اس کا رخ شہیر انکل کے گھر کی جانب تھا۔

دوسری تفل پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا میر تفل۔

”السلام علیکم! شاہ میر نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! آپ۔ شاہ میر ہیں میں؟“ وہ انداز لگاتے ہوئے بولا اس نے مسکرا کر ثبات میں سر ہلادیا۔

”آئیں۔“ اس نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ بائیں جانب چھوٹے سے لان میں ایک خوب صورت سی لڑکی ٹون پر باتیں کر رہی تھی وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی اس نے نظریں پھیر لیں۔ وہ سارہ تھی۔ وہ میر کے ہمرولہ چل رہی تھی اسے اس میں آ گیا۔

”دیکھ لیں گے آپ چائے یا کافی۔“ اس نے پوچھا۔

”نوتھینکس۔ میں کچھ نہیں لوں گا۔ شہیر انکل کی طبیعت کیسی ہے۔“ اس نے اسے منع کرتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ میر بھائی! پاپا تو ابھی تک ہسپتال میں ہی ہیں!“ اس نے جواب دیا۔ ”میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی تو وہ کہہ رہے تھے کہ اس ہفتے تک ڈسچارج کر دیں گے۔“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”اور انہی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟“ اس نے پوچھا۔ شاہ میر ایک دم گڑبڑا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے شہیر انکل کو بتائے مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا

علیڈے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ کب آئے۔“ اس نے آتے ہی کتنے سوال کر دیے۔

”وعلیکم السلام! میں بالکل ٹھیک ہوں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔“

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میر مجھ سے پوچھ چکا ہے۔“ اس نے رکھلی سے جواب دیا۔

”ارے ایسے کیسے چلے گا۔ میر! جاؤ فریڈ سے کہو جائے گا۔“ علیڈے نے میر سے کہا تو وہ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود چلا گیا۔

”اور سنا میں انہی کا کچھ پتا چلا؟“ اس کے لگے سوال نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ علیڈے کو بتائے یا نہیں۔ کیا اس پر بھروسہ کرنا ٹھیک ہو گا۔ شاید نہیں۔ مجھے انکل کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا اور علیڈے کی جانب دیکھا۔

”نہیں۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔ کل دیر ہو گئی ہے۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے چائے تو پیتے جائیں۔“ وہ بولی۔

”نہیں علیڈے پھر کبھی۔ مجھے انکل سے ملنا تھا۔“ وہ کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھا۔ لان میں وہی لڑکی ابھی بھی موجود تھی۔ اس نے جاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی پیلا کی کل آگئی۔ اس نے کل ایڈ کر کے ہوئے فون کھن سے لگایا۔

”السلام علیکم پیلا۔“ اس نے کہا مگر انہوں نے جو کچھ کہا اسے سن کر وہ کھٹکتے میں آ گیا۔

”مگر پیلا نہیں تو۔“ وہ حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”اچھا آپ فون رکھیے۔ میں ابھی حویلی آ رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور اگنیشن میں چالی گھمائی۔

حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی بی بی لاؤنج تھا۔ جہاں سب موجود تھے۔ پیلا، نانا، نانی، منجمن، عمر، زر گل، گل نین، عائشہ گل۔ سب وہیں تھے سوائے فراز کے اور اسے ہوتا بھی نہیں چاہیے تھا۔

اسی اثنا میں سب کی نظر اس پر پڑی۔ وہ اندر آتے ہوئے ڈر اسما مسکرایا۔ مگر ان کے دیکھنے کے انداز میں

کچھ ایسا تھا جو اسے کھٹکا وہ سب عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔
 ”کیا ہوا؟“ آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ وہ حیرانی سے بولا۔
 سب سے پہلے آیا ابا آگے بڑھے۔ ”انیہ۔ کہاں ہے شاہ میر؟“ ان کی بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔
 ”ہاں۔ کیا ابا! میں آپ کو بتانے ہی والا تھا۔ وہ فرانس۔“

جس کی آنکھیں محبت سے لہریں تھیں۔
 ”شاہ میر! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ ہاں یا نہیں۔“ وہ دوبارہ کراخت لہجے میں بولے۔ ان کی تو ازب پر اس نے رخ موڑ کر تکیا ابا کو دیکھا اور بولا۔
 ”ہاں۔ وہ میرے پاس ہے۔“ اس کا اچھا ہی کہنا تھا کہ ایک زوردار پھپھڑاس کے منہ پر زور اور پھپھڑانے والے تکیا نہیں بلکہ پایا تھے۔ تو انہیں بھی اس پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف وہ بات لور کیا ہو سکتی ہے۔

”میرے بیٹے کا ہم بیچ میں مت لو۔ جتنا پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ وہ اس کی بات کٹ کر درستی سے بولے۔ وہ حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو غصے کے مارے رخ پڑ چکا تھا۔ انہوں نے پہلے کبھی اس سے اس طرح سے بات نہیں کی تھی۔
 ”شاہ میر! انیہ کہاں ہے؟“ اسے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ غصے سے بولے۔
 ”تایا ابا۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ فرانس۔“

”شرم نہیں آتی اتنی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے مجھے نہیں بتا تھا کہ تم اتنے بے غیرت ہو گئے ہو۔ ارے شاہی کہنی تھی تو مجھ سے کہتے یہ اس طرح کی گھٹیا حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ کچھ نہیں بولا حیرت سے باپ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا ان کی آنکھوں میں بدگمانی، غصہ، نفرت ان کے اثرات کی پوچھاڑنے اس کی ذات کے پرچے اڑا دیے تھے۔

”جو اس بند کرو اپنی۔ سیدھا سیدھا جواب دو۔“
 ایک بار پھر اس کی بات کٹ کر بولے۔
 ”تایا ابا فرانسے انیہ۔“
 ”شاہ میر! انیہ تمہارے پاس ہے یا نہیں۔“
 لورچی تو ازب میں بولے۔
 ”تایا ابا۔۔۔“
 ”ہاں یا نہیں۔“ وہ اور غصے سے چلائے۔
 انہیں دیکھنے کے بجائے شاہ میر نے رخ موڑ کر اپنی بہنوں کو دیکھا جو خوف زدہ سی کھڑی۔ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی نظروں پر پڑی جن کی آنکھوں میں خوف تھا اور یقین بھی۔

”ارے یہ سب کرنے سے پہلے کم از کم میرے مرنے کا انتظار تو کیا ہوتا۔“ وہ پھر غصے سے بولے۔ ان کی بات پر اس نے بولنے کی کوشش کی۔
 ”پاپا۔۔۔ ایسے تو مت کہیں۔ یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ کہتے ہوئے وہ رو نہ لگا۔
 ”پاپا! یہ سب فرانسے کیا ہے۔ اس نے اس نے انیہ کو۔“ ایک اور پھپھڑاس کے چہرے پر پڑا لیکن اس بار تکیا ابا نے اسے مارا۔
 ”بس کرو شاہ میر! اپنے کراوت چھپانے کے لئے تم میرے بیٹے پر الزام کیوں لگا رہے ہو۔“ وہ غصے سے بولے۔

اس کے کانوں میں تو ازب کو تھی۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ جو بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک رخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔ مشکل وقت میں سارے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں دوست رشتے دار حتیٰ کہ بھائی، بہن اور باپ بھی کھمبے۔ ماں کبھی اپنی اولاد کو نہیں چھوڑتی۔ اس نے دوبارہ ماں کو دیکھا۔

”نہیں تایا ابا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں یہ سب فرانس نے کیا ہے۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ پاپا آپ میری بات کا یقین۔“
 ”بس۔۔۔ پاپا نے ایک دم کہل۔“
 ”بس کرو شاہ میر! اور کتنا کرو گے۔ میں باقاعی ہوش

”تم دفع کیوں نہیں ہو رہے یہاں سے۔“ وہ غصے میں اس کی جانب بڑھے اور اسے باہر کی جانب دھکیلتے گئے۔

”خدا کے لیے ایسا مت کریں۔“ وہ ان کے ساتھ کھینچی چلی گئیں۔
 ”ارے ہٹو تم۔“ انہوں نے اپنا پاؤں جھٹکاتو وہ ایک طرف گریں۔

”ہاں۔!“ وہ تڑپ کر ان کی طرف بڑھا اور انہیں سارا دے کر اٹھایا اور انہیں اپنے گلے سے لگا لیا۔
 ”نہیں شاہ میرا تم کہیں نہیں جا رہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے میں۔ میں کہیں نہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ پھر سے رونے لگیں۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں خود سے الگ کیا۔ ایک نظر خاموش کھڑے باقی سب کی طرف دیکھا۔

”اب جاؤ یہاں سے۔“ تاپا لہانے آگے بیٹھ کر باہر کی جانب دھکا دیا۔ دوسرے ہی لمبے میں وہ گھر سے باہر تھلا۔

تاپا لہانے دووازے کی چوکھٹ پر بیٹھے شاہ میر پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور پھر دوواڑہ بند کر لیا اور اسے لگا جیسے اس کی سانسیں رک گئیں۔

کتی تسالی سے انہوں نے اسے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔ کتی تسالی سے خود سے الگ کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسی وقت اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے فون جیب سے نکالا۔

”شیر انکل کلنگ۔“ اسکرین پر جلم لگا رہا تھا۔ امید کی کرن نظر آئی۔ شاید وہ اس کی بات سن لیں۔ شاید وہ اس کا یقین کریں۔ اس نے لیس کاٹن دیا کرن لہان سے لگایا۔

”اسلام علیکم انکل۔“
 ”شاہ میرا! یہ کہاں ہے؟“ ان کا سوال سن کر اسے یہ امید بھی ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔
 ”شاہ میرا! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے

وہ اس سے تمہیں اپنی جائیداد لو سے عاقب کرتا ہوں۔ آج سے تمہارا ہم سے۔ اور اس گھر کے ہر فرد سے رشتہ ختم۔“

ان کی بات سن کر کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے بے چینی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ یہ وہی باپ تھا جو اس سے محبت کا دوا کرتا تھا۔ جس نے اسے چلنا سکھایا تھا۔ آج اسی نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی سب کچھ کھینچ لیا۔ وہ حواس باختہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہوش مل کو آیا۔ باقی سب تماشائی بنے کھڑے تھے۔

وہ بھائی ہوئی اس کے قریب آئیں اور بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔ جیسے ابھی وہ جھاگ جائے گا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہوش میں تو ہیں آپ! چٹا ہے یہ ہمارا۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھلے پڑیں۔

”تم۔۔۔ دفع ہو جاؤ اس گھر سے۔“ آجندہ اپنی شکل مت دکھانا مجھے۔“ وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ چٹا ہے ہمارا۔“ وہ پھر بولیں۔ جبکہ وہ خاموشی سے بت بنا کھڑا تھا۔

”نصیحت۔! تم سچ میں مت آؤ۔“ وہ غصے سے غرائے۔

”یہ دیکھیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرے ساتھ ایسے مت کریں۔ یہ میرا کلوتا پٹا ہے۔ خدا کے لیے ایسا مت کریں۔“ وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم مت کریں۔ میں آپ کے ہر پکڑتی ہوں۔“ کہتے ہوئے وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتی ان کے قدموں میں گر گئیں۔ شاہ میر نے حیرت سے اپنی ماں کو باپ کے قدموں میں گرے دیکھا۔

تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیوں کیا تم نے ایسا۔ بولو شاہ میر۔“
 وہ غصے سے بول رہے تھے۔
 ”شاہ میر! میں تمہیں اس کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”جائیں جو کرنا ہے کر لیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور ہاں۔ ہاں میں نے انہی کو اغوا کیا۔ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے۔“
 کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر سے چل پڑا۔
 کہتے ہیں اگر تکلیف کی آخری حد پار ہو جائے۔ تو اثر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتا کسی نے زوردار چیز اس کے سر پر ماری اور پھر پھوہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آخر میں اسے جس کا خیال آیا وہ انہی تھی۔



اس کی آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس کے پاس ولید بیٹھا مسکرا رہا تھا۔
 ”شکر ہے۔ تمہیں ہوش تو آیا۔ اب کیسا ٹیل کر رہے ہو۔“ ولید نے پوچھا۔ اس نے دھیرے سے انہماک میں سر ہلا دیا۔

”میں یہاں کیسے پہنچا۔“ کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا۔
 ”ایک ٹوی لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم اس سڑک پر پڑے ہوئے ملے ہو لوہو تمہارے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے تمہیں ہسپتال پہنچا دیا اور میری ایمر جی میں ہی ڈیوٹی تھی۔“
 بھلا ہوا اس ٹوی کا اگر وہ تمہیں بروقت ہسپتال نہ پہنچاتا تو زیادہ خون بہنے کی وجہ سے تم کو مے میں جاسکتے تھے مگر اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔“ ولید نے کہا۔

”وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔“
 ”ارے شاہ میر! بیٹھے رہو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ولید نے کہا۔
 ”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“

”شاہ میر! میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں پھر گھر چلیں گے۔“ وہ باہر نکل گیا۔ تو شاہ میر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس کے سامنے دن کے سارے منظر آ رہے تھے۔ شبیر انکل کے گھر جانا اس کے بعد پاپا کا فون آنا، تایا کی باتیں پاپا کا رویہ ہاں کے آنسو اسے سب یاد آتا جا رہا تھا۔

اور پھر پھر کیا ہوا تھا۔ شبیر انکل کی کل۔ اس کے بعد کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری تھی اور پھوہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر مگر کون شخص کون تھا؟
 وہ سوچ رہا تھا۔ ایک دم اس کے دل میں جھماکا ہوا۔ فرانس۔ اہل۔ فرانس۔ سے کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس نے سچی سے سوچا۔ اسی وقت ولید کمرے میں آیا۔

”چلو۔“ اس نے اس کے پاس آکر کہا۔ وہ ایک دم اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ ”اول۔ ہاں۔ چلو۔“ اس نے کہا۔

”شاہ میر۔ ایک بات پوچھوں۔“ ولید اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں پوچھو۔“
 ”تمہیں کیا ہوا تھا۔ جو تم اس طرح سڑک پر پڑے تھے۔“ اس نے پوچھا تو شاہ میر نے ایک گہرا سانس لے کر اسے ساری بات بتا دی۔ سوائے خان ہاؤس (حویلی) میں ہوئے جھڑے کے۔
 ”یہ سب کیا کس نے تھا؟“ ساری بات سننے کے بعد وہ بولا۔

”مجھے نہیں پتا کہ یہ سب کس نے کیا۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
 ”کون ہو سکتا ہے۔“ ولید سوچ میں پڑ گیا۔
 ”چھوڑو ان باتوں کو خوشی کی بات یہ ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا۔
 ”کوئی سیریس بات تو نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات کو
 نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”شاید نہیں۔“ وہ ابوسبی سے بولی۔ وہ اٹھا اور اس
 کے کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا
 تھا۔ اس نے لائٹ گن کی۔ بیڈ خالی تھا۔ اس نے
 کمرے میں چاندوں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک کونے
 میں دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دے بیٹھی
 تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر حنا لور ولید کو دیکھا جو
 دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ اور پھر وہاں سرخ نمونہ
 کر اتنی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ ابھی بھی اسی انداز میں
 بیٹھی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا۔ اس کے پاس
 گھٹنوں کے بل بیٹھا اور آہستگی سے بولا۔
 ”انیہ! اس کی آواز پر اس نے سر سے سر
 اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑے ہوئے
 تھے۔
 ”انیہ۔! میں۔ میں۔“ اس نے اس کے بال
 پیچھے کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا کہ وہ بولی۔
 ”میرے قریب مت آؤ۔“ وہ اسے اپنے سے دور
 کرتے ہوئے بولی۔

”انیہ۔! میں۔“
 ”میں کتنی دردناک چلے جا رہی ہوں۔“ وہ اسے اپنے سے دور
 دھکے سے بولی۔

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس
 کی آنکھوں میں۔ خوف۔ ڈر۔ بے بسی۔ وہ خاموشی
 سے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
 حنا لور ولید بھی اس کے پیچھے چلے آئے۔ صوفے پر آ
 کر بیٹھ گیا۔ لور اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

”حنا! اسے کیا ہو گیا؟ وہ کیوں ایسے ری ایکٹ کر
 رہی ہے؟“ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی در
 آئی۔

”شاہ میر۔! پلیز سنبھالو خود کو۔ وہ بالکل ٹھیک ہے

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ولید اس کے معاملے میں لڑا
 پڑے۔ اس سے اسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہاں
 سے واپس آتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں
 سے بہت دور چلا جائے گا۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس کا سامنا حنا سے ہوا۔
 وہ انہوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ابھی کل صبح کی بات ہے ہم کہہ کر گئے تھے میں
 شام تک آ جاؤں گا۔ شام تک گھر آنے کے بجائے
 ہسپتال پہنچ گئے اور اب یہ ہاتھ اٹھا کر آگئے ہو شاپاش
 ہے لڑکے۔“ وہ بولی تو وہ اس کی بات پر مسکرایا اور
 سامنے سر نے بر آ کر بیٹھ گیا۔

”اب بیٹو۔! کیا کھاؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں بھابھی! مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ نفی
 میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہں یہ بھابھی کس کو بولا۔! وہ سہل ہو گئے ہیں
 ہماری شادی کو مگر تم نے بھی مجھے بھابھی بلانے کا
 تکلف نہیں کیا۔ اب ایسا کیا ہو گیا جو تم تکلف میں پڑ
 رہے ہو۔ میں حنا ہی ٹھیک ہوں۔ میں تمہارے لیے
 جوس لے کر آئی ہوں۔ اگر خیرے دکھائے ہیں تو جو
 سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ وہ کہتے ہوئے بچن کی جانب
 بڑھی۔

”ویسے بیوی! تم سے برا سے بھی کوئی نہیں۔“ ولید
 آہستگی سے بولا۔ مگر وہ سن چکی تھی۔

”آپ چپ رہیں تو بہتر ہے۔“ وہ غصے سے کہتی
 بچن کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے جوس لے آئی
 اس نے ہاتھوں پر اس کے لیے جوس پی لیا۔

”حنا! انیہ کیسی ہے۔“ شاہ میر نے پوچھا اس کی
 بات پر ولید نے حنا کو لور حنا نے ولید کو دیکھا۔

”کیا ہوا! سب ٹھیک تو ہے۔“ وہ پریشان ہوا۔
 ”شاہ میر! کچھ جو کئی۔۔۔۔۔۔“ وہ گڑبلائی۔

”وہ کچھ حنا جو کہتا ہے، کھل کر کہو۔“ وہ چونکا۔
 ”شاہ میر۔! وہ بہت ڈر رہا ہے۔ میرا مطلب

ہے وہ اچھا محسوس نہیں کر رہی مگر تم پریشان نہ ہو۔

اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر وہ بولی۔

”تو پھر وہ ایسے لی ہو کیوں کر رہی ہے۔“
 ”شاہ میرا بچھلے دولہ میں اس کے ساتھ جو بھی حادثات ہوئے مگر کی وجہ سے وہ سنبھل نہیں پاری۔ اس لیے وہ ڈپریشن میں ہے سر پر چوٹ کی وجہ سے وہ کالی پاتیں بھول بھی چکی ہے۔ اسے تھوڑا وقت دے گا جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ حنا اسے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”اب بیٹو! جا کر آرام کرو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔“ اس نے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔



”ہو مئی نیند پوری۔“ ولید کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”شاہ میرا پرسوں رات تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔“ ولید کی بات پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کیا ہوا تھا۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کندھے اچکا کر بولا۔

”مئی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ اب کی بار وہ خاموش رہا۔

”انسوس ہو رہا ہے مجھے تم پر مجھے اس قاتل نہیں سمجھا تم نے۔“ وہ انسوس سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”ختمیس کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔“ جبکہ شاہ میر بیڈ کی چادر پر نظرس گاڑے خاموش بیٹھا تھا۔
 ”اب کچھ منہ سے پھونو گے بھی کہ نہیں۔“ وہ اسے ڈٹتے ہوئے بولا۔

اس کے کہنے پر شاہ میر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ساری بات سن کر ولید کتنی دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔
 ”شاہ میر! تم بہت بہت مت ولے ہو۔ اگر خدا نخواستہ میرے ساتھ۔“ ولید نے جملہ لہجہ اور اچھوڑ دیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت حنا کی آواز آئی۔

”ان ہو میں تو بھول ہی گیا۔ حنا نے کھانا لگا دیا ہے۔ جلدی سے فریش ہو کر نیچے آ جاؤ۔ میں بھی نیچے جا رہا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ لوہر آ جائے۔“ حنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا جبکہ شاہ میر اس روم کی جانب بڑھ گیا۔
 ”اسیے کیسی ہے۔“ شاہ میر نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ حنا نے ایک نظروں پر کو دیکھا اور پھر بولی۔
 ”ابھی تک کسی ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”شاہ میر! تمہارے پی اے کا فون آیا تھا۔ تم سو رہے تھے اس لیے میں نے ریپو کر لیا۔“ وہ اس وقت لاؤنج میں بیٹھی۔ وی دیکھ رہا تھا۔ جب ولید نے کہا تو وہ سیدھا ہوا۔

”کیا کہا اس نے؟“
 ”کچھ خاص نہیں کہہ رہا تھا کہ تم سے بات کروا دوں مگر تم تو سو رہے تھے تو اس نے کہا وہ بعد میں فون کرے گا۔“ ولید نے تفصیل سے جواب دیا۔
 شاہ میر نے فون اٹھایا اور اپنے پی اے کو کل ملائی۔

”ہیلو! السلام علیکم انعام صاحب! دو سری طرف سے فون اٹھاتے ہی شاہ میر نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ اسے بتایا۔ اس نے اسے شکاڈ کر دیا۔

”تو آپ نے آخری کسز بھی پوری کر ہی لی ہیں۔“ وہ فون بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

”شاہ میر! کیا ہوا۔“ اسے اپنی پیشہ دیکھ کر بولا۔
 ”پاپا نے مجھے اپنی ساری جائیداد لوٹے۔ پھوٹل کروا ہے اور صرف یہی نہیں میری ذاتی پر اپنی سے بھی اپنے شیئرز لوٹیں لے لیے ہیں۔“ شاہ میر نے بتایا۔
 ”لوہائی گاڑا! تو بہت برا ہوا۔“ ولید نے کہا۔
 ”وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”میں بیٹا ہوں ان کا وہ اتنی آسانی سے مجھے خود سے الگ کیسے کر سکتے ہیں؟“
 جبکہ ولید اسے دیکھ کر کہہ گیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتا تھا۔



”اس کے بعد کیا۔۔۔ شاہ میر۔“ ولید نے پوچھا۔
 ”اس کے بعد وہ فیصلہ کرے گی کہ اسے میرے
 ساتھ رہنا ہے یا۔۔۔ واپس جانا ہے۔“ وہ کنزور لہجے میں
 بولا۔

”اور اگر اس نے کہا کہ اسے واپس جانا ہے تو تم کیا
 کرو گے شاہ میر۔؟ اتنی آسانی سے اسے جانے دو
 گے جیسے تم نے اپنے سب کچھ کھو دیا۔“
 ولید حیرت سے بولا۔

”ہوں۔۔۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے
 بولا۔

”ایک بات پوچھوں شاہ میر۔“
 ”ہاں پوچھو۔“ وہ اس کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔
 ”تم نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کیا
 تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔“ وہ بولا۔
 ”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں یہ
 سب اس لیے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم
 میری وجہ سے کوئی تکلیف اٹھاؤ۔ اور اگر میں تمہیں
 بتا دیتا تو کیا تم مجھے جانے دیتے اور وہی بات اعتبار کی تو
 اگر مجھے تم پر اعتبار نہ ہوتا تو اب بھی نہ بتاتا۔“
 وہ مسکرا کر بولا۔



اس سب کے بعد اس نے کبھی خان ہاؤس (خولی)
 جانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی خان ہاؤس کے
 زمینوں کا دوبارہ ذکر کیا۔ پہلے پہل تو علیحدے نے
 کرپنے کی کوشش کی مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔
 وقت کا کام تھا کنزور تالور وہ کنزور رہا تھا۔
 لن دونوں مہاکے بھائی دلاور کے چکران کے گھر کچھ
 زیادہ ہی لگ رہے تھے۔ دلاور مہا (مہدی) کا چھوٹا
 بھائی تھا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی بیوی کی وفات
 ہو گئی تھی۔ اسے مہاکے تئیر بھی عیب لگ رہے تھے
 اور دلاور کا گھر آتا بھی کھنگ رہا تھا۔ شروع میں تو اس
 نے نظر انداز کیا مگر وہ اپنی حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس
 نے مہا سے بات کی۔

”شیر انکل بھی ایک وطن میں آرہے ہیں۔“ اس
 نے کہا۔

”تو اب کیا ہو گا؟“ ولید اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے
 بولا۔

”ہونا کیا ہے۔۔۔ وہ آئیں گے انیہ کے کيس کی
 دوبارہ انکوائری ہوگی۔ میرے خلاف پرچہ کئے گئے۔“ وہ
 کندھے اچکا کر بولا۔

”تو پھر تم کیا کرو گے؟“ ولید پریشانی سے بولا۔
 ”مجھے جو کرنا تھا وہ میں کرچکا ہوں۔“ وہ اطمینان
 سے بولا۔

”مطلب تم کیا کرچکے ہو؟“
 ”میں اگلے ہفتے تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ وہ
 آرام سے بولا۔

”کہاں؟“ ولید حیران ہوا۔
 ”بہت دور۔“ وہ بولا۔

”شاہ میر! دیکھو پسلیاں مت بھواؤ! مجھے بتاؤ
 تمہارے دلغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم کہاں جا رہے
 ہو؟“ ولید اب کی بار کچھ غصے سے بولا۔
 ”میں روس جا رہا ہوں۔“ ولید کو شاک لگا۔
 ”کیا۔۔۔ کیا روس؟“

”ہاں۔۔۔ میں اور انیہ۔“ وہ اطمینان سے بولا۔
 ”مجھے اندازہ تھا کہ شیر انکل سب سے پہلے

میرے خلاف پرچہ کروائیں گے۔ اس لیے میں نے
 پہلے ہی اپنی فیکٹری بیچ کر اس سے ملنے والے پیسے اپنے
 اکاؤنٹ میں جمع کروائے اور جانے کی تیاری کی۔
 ظاہر سی بات ہے میں اس ملک کے کسی بھی کونے
 میں چلا جاؤں وہ لوگ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے
 میں نے ہاسکو جانے کا فیصلہ کیا۔ اور انیہ۔۔۔ اسے میں
 اب کھونا نہیں چاہتا اور میں اس کا علاج وہاں کے کسی
 ایجنٹ سے لیکچر سٹ سے کرواؤں گا۔ جیسے امید ہے کہ
 ان شاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر۔۔۔ پھر میں
 اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا۔ اس کے بعد۔۔۔
 ساری تفصیل اس کے گوش گزار تے ہوئے وہ
 ایک دم رک گیا۔

”تم میرے بھائی کی نسبت پر شک کر رہی ہو۔“ اس کی بات سن کر وہ بھڑک اٹھی۔
 ”میں نے ایسا کب کہا۔“ وہ اکتا کر بولی۔
 ”تو پھر تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟“ وہ اسے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ان کی حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں اور اگر انہوں نے دوبارہ میرے ساتھ کوئی بد تمیزی کی تو میں پیلا سے شکایت کر دوں گی۔“ وہ بھی غصے سے ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے ماما سے اس طرح بات کی تھی۔ ورنہ وہ بہت آرام سے بات کرتی تھی۔ اس کے بعد نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اب پہلو والی اینی نہیں تھی بہت بدل چکی تھی۔

”شاہ میرا اینی کا دھیان رکھنا۔ تم جانتے ہو میں۔ وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے اور وہاں اس کے سامنے فی الحال تم اپنی شناخت چھپا کر رکھو۔“ وہ اسے ہدایات دیتے ہوئے بولی۔

”وہ کیسے؟“ وہ حیران ہوا۔

”میں بتاتی ہوں۔ آج سے تمہارا نام عسور ہے۔“
 ”اس کی بات سن کر وہ مزید حیران ہوا۔
 ”عسور یہ کیسا نام ہوا ہے۔“ وہ ٹاک سکوز کر بولا۔
 ”تکو مت اور دھیان رہے، وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اس کی نظروں میں ہم سب فراز کے آوی ہیں۔“ حتانے کہا۔

”ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ اسے کسی بھی قسم کے اسٹریس یا شاک سے دور رکھا جائے۔“ حتانے کہا۔
 ”اور اگر اسے پتا چل گیا کہ تم ہی شاہ میر ہو۔ تو اسے شاک نہیں ہارٹ اٹیک آئے گا۔“ وہ بولی۔

”خدا کا خوف کرو حتا! ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ وہ کالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”ارے تم لوگ کیا بحث کیے جا رہے ہو۔ فلائٹ کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔“ اسی وقت ولیدتی۔ وی لاؤنچ میں

داخل ہوا۔
 ”ہاں، ہاں بس اب چلو! یہ تمہاری بیوی داغ کھائے جا رہی ہے میرا۔“ کہتے ہوئے وہ ولید کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

وہاں پہنچتے ہی شاہ میر نے ولید کو فون کر کے اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔ وہ دونوں ایک فلیٹ میں تھے جو شاہ میر کے ایک دوست حیدر کا تھا۔

انہیں یہاں آئے مینہ گزر گیا تھا اس نے ایک بہت اچھے سائیکازسٹ سے اینی کے سیشن کروائے جس کی وجہ سے وہ کافی بہتر ہو گئی تھی۔
 اینی کی حالت سنبھلتے دیکھ کر اس کی توجہ کام کی جانب ہو گئی تھی۔

اس کی آنکھ صبح نو بجے کے قریب کھلی۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر لاؤنچ میں آ گیا۔ سامنے ہی اینی (مڈل ٹیبلٹ) کی تیاری کر رہی تھی۔ جبکہ اینی وہیں اس کے قریب کم صدمہ بھی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہو؟“ وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تمہارے چہرے سے تو میں لگ رہا۔“ وہ اسے بولنے پر آکسار ہا تھا۔

”کیوں انسان کی شکل پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں اور ویسے ہی اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے کہ میں جیوں یا مریں۔“ وہ چیخ کر بولی اور ہیر پھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے بے ہوشی سے بیٹھ گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اسے بیٹھ کرواؤ بنا۔“ اسے ہدایت دے کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ ہر نفسیاری ہو رہی تھی۔

حیدر اس کا یونیورسٹی فرینڈ تھا۔ امریکہ میں دونوں نے ایک ساتھ پڑھائی کی تھی۔ اپنے پیلا کی ذلت کے بعد اس نے اپنے پیلا کا لیڈر گارمنٹس کا کاروبار سنبھال

لیا جو کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ شاہ میر اس کی ٹیکٹری میں شجر کی پوست پر تھلا وہ یہ کلمہ لکھنا چاہتا تھا۔ انیہ آہستہ آہستہ کافی بہتر ہو گئی تھی اور شاید نارمل بھی ہو رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ جڑ جاتی اور اسے خوب تنگ کرتی اکثر وہ خود کو اس کے آگے بے بس محسوس کرتا۔

انہیں یہاں آئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ شاہ میر اس وقت گھر پر نہیں تھا اور... انتہا اپنا کلمہ ختم کرنے کے بعد سامنے صوفے پر سو رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے اس کے پاس رکھا فون اٹھایا اور اسے کمرے میں لے آئی اس نے نمبر یاد کرنے کی کوشش کی پھر کلپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیا اور فون کلن سے لگایا وہ سری طرف تکل جاری تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے فون کلن سے ہٹا کر کل ڈس کنیکٹ کی اور کچھ سوچتے ہوئے نمبر ڈائل کیا۔

مگر اسے سخت باؤسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کا نمبر بند ہے اور گھروالے نمبر پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔ اسی وقت اسے انتہائی آواز آئی شاید وہ جاگ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے فون ہنجن میں جا کر رکھ دیا۔



وہ جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو ارسلان پریشانی سے... اُدھر۔ اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ ”کیا ہوا ارسلان کچھ تو بولو۔“ اس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”آئی ایم فنشلڈ شاہ میر! آئی ایم فنشلڈ! میں ختم ہو گیا شاہ میر! ختم“ کہتے ہوئے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”ارسلان پلیز مجھے بتاؤ کیا ہوا؟“ اسے یوں دیکھ کر وہ پھر بولا۔

”میرے روی پارٹنرفون نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اس نے مجھے لیڈر جھکٹس کا ایک بڑا آرڈر دیا۔ اور کہا کہ اس کی مارکیٹ میں بہت زیادہ ڈیمانڈ ہے اور یہ بھی کہ میٹرنل وہوے گا اور میٹرنل کی ڈیل رقم وصول کرے گا اور جھکٹس کی فروخت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس نے میٹرنل کی رقم مجھ سے پہلے وصول

کی اور آہستہ آہستہ اپنے شیئرز بھی۔ مگر جب جھکٹس تیار کر کے میں نے مارکیٹس کے بندوں سے اس کی ڈیلنگ کی تو پتا چلا کہ اس کی مارکیٹ ویلیو زیرو ہے۔“

کہتے ہوئے وہ پھر سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ تو بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔“ شاہ میر افسوس سے بولا۔

”ارسلان! اگر روس میں اس کی ڈیمانڈ زیرو ہے تو پھر کون سا ملک ہے جو اس کی ڈیمانڈ کرے گا۔“

”جرمنی! امریکا اور شاید ایران۔ لوہائی گلابی خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔“ وہ مسکرایا۔

”مگر اس کے لیے انویسٹر کی ضرورت ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ تو شاہ میر نے اپنی جیب سے کیس بک نکالی۔

”کتنا چاہیے؟“ اس کی بات پر ارسلان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”شاہ میر! وہ لشکر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ شاہ میر مسکرا رہا تھا۔

”اب یونمی دیکھتا رہے گا کیا کچھ منہ سے پھوٹے گا بھی۔“ اسے یونمی سکتے میں دیکھ کر شاہ میر نے کلمہ تو وہ مسکرا دیا۔

شاہ میر کے فن ممالک میں اچھے تعلقات تھے وہاں کے مصوف بزنس میں اس سے واقف تھے۔ سو اس معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ارسلان ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔ اس کے بعد شاہ میر اس کی کمپنی میں 40 لاکھ ڈالر ہو گیا۔ اس سے اس کے آگے بڑھنے کے چانسز زیادہ ہو گئے۔

انیہ کے مزاج میں بھی کچھ ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی انہیں یہاں آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ صبح جب انیہ سو رہی ہوئی تو شاہ میر کام پر چلا جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ انیہ کو اس کی مصروفیات کے بارے میں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس میں کوئی دلچسپی تھی۔

رات میں وہی۔ وی لاقونج میں بیٹھائی۔ وی دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انیہ بھی وہاں آئی۔ اس کے ہاتھ

”شاہ میر سے تعلق۔
نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
انک کہی۔

”مگر وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے اس نے
زر گل کو ٹھکرا دیا اور یہی بہت فراز کو ہضم نہیں ہوگی۔
شاید اس لیے اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا۔“ اس
حوالے سے شاہ میر کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔
”ارے ہاڑ میں جائے شاہ میر یہ سب اس کی وجہ
سے ہوا ہے۔ شادی نہیں کر لیتا زر گل سے۔“
وہ غصے سے بولی۔

”مگر وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“ وہ بے اختیار بولا۔
تو وہ خاموش رہی۔
”کیا تم اس سے محبت نہیں کرتیں؟“ اس نے کوئی
جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔



اتوار کا دن تھا۔ آج وہ فارغ تھا۔ صبح دیر سے اٹھنے
کے بعد اس نے بھرپور بیٹھ کیا اور اخبار لے کر بیٹھ
گیا۔ اسی وقت انہی اس کے پاس آئی۔
”عصو! میں چھ ماہ سے اس چار دیواری میں بند
ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے پلیز تھوڑی دیر کے لیے
مجھے باہر لے چلو۔“ وہ تپتی نظروں سے اسے دیکھتے
ہوئے بولی۔ کتنی دیر تک اسے دیکھا رہا پھر بولا۔
”تم تیار ہو جاؤ۔ میں باہر تمہارا انتظار کر رہا
ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی وہ تیار ہو کر آئی اور اس کے ہمراہ
چل پڑی۔ باہر کئی گھنٹہ تھی۔
دوس کا صدیوں پرانا تاریخی و ثقافتی مرکز اس کی
عظمتوں کا ایندھا مارک اس کے تعمیراتی حسن کا نام نہاد
ریڈ اسکوائر ان کے سامنے تھا۔ وہ دونوں اسٹیشن کی
عمارت میں داخل ہوئے۔ کوشش کر جا کر اس نے دو کارڈ
لیے۔ اور انہیں خود کار گزر گاہ کی مشینوں سے مس
کیا۔ ٹھک کی آواز گونجی وہ زمین کے اندر والے
حصے پر پہنچے اینڈر گراؤنڈ دنیا نے اپنی خوب صورتی اور

میں دو کافی کے گک تھے۔ اس نے ایک گک اس کی
جانب بوجھایا۔ اس نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے
خاموشی سے گک لے لیا۔
”شاہ میر کو بھی انگلش فلمیں پسند تھیں۔“ اس
نے سوچا کبھی کبھی اسے اس شخص میں شاہ میر کی
شاہت نظر آتی تھی اور اس کے سامنے والے صوفے
پر آکر بیٹھ گئی۔
”کیسے ہو۔“ اس کے جملے نے اسے مزید حیران کر
دیا۔

”ٹھیک۔“ اس نے جواب دیا۔
”ہوں۔“ پھر وہ کچھ نہ بولی اور سامنے بیوی دیکھنے
لگی۔
”تم مجھے کب آزاد کرو گے؟“ تقریباً پانچ منٹ بعد
اس کی آواز لائن میں گونجی۔ اس نے بیوی سے نظر
ہٹا کر اسے دیکھا۔

”فی الحال تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
اس نے کہا۔
”تم نے آخر مجھے قید کر کے کیوں رکھا ہے؟“ وہ پھر
سے بولی۔

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“
”مگر مجھے جواب چاہیے۔“ وہ غصے سے بولی۔
”آخر کیوں تم نے میری زندگی جین کی ہوئی
ہے۔“ کہتے ہوئے وہ لانے لگی۔ ”مجھے اپنے گھر جانا
ہے۔“

”میں نہیں بھیج سکتا۔“ شاہ میر نے کہا۔
”مگر کیوں۔“ وہ بولی۔

”کیونکہ فراز یہ نہیں چاہتا جب تک زر گل کی
شادی نہیں ہو جاتی۔“ اس کے ذہن میں جو آیا اس
نے بول دیا۔

”زر گل فراز کی بہن مگر اس کی شادی سے میرا کیا
تعلق ہے۔“ وہ چونکی۔
”تعلق ہے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کی شادی
سے نہیں مگر شاہ میر سے تو ہے۔“ اس کے جومندہ میں
آیا اس نے کہہ دیا۔

کشلوگی سے حیران کر دیا۔ "وائیں ہائیں بھری ریل کی
نشاں اور اس پر بھرا آسمان جسے حیرت سے دیکھتے
ہوئے بے اختیار رائے کے منہ سے نکلا۔ "واؤ۔"
کیا یہ تعمیر کا کوئی ظلم تھا یا رنگ و مدفن کا کمال
جیسے صحرائیں چمکتی رت دریا کا گمان دے۔
غار کے ایک پہلے سے چمک چمک کرتی کئی رنگوں
کی گاڑیاں گزر گئیں۔

وہ اسٹیشن سے باہر آگئے۔ زیر زمین دنیا سے باہر
آسمان نکھرا ہوا تھا۔ دھوپ روشن تھی۔ سڑکوں کی
کشلوگی، پختلی، سیاہی اور اطراف میں کھڑی بلند و بالا
عماروں کا عجب دیدہ بہ متاثر کرتا تھا۔

زیر زمین ایک اور راستے سے وہ اسے الیکٹریٹر
گارڈن کے وسطی حصے میں لے آیا۔ جہاں ریڈ اسکوائر
تھا۔ باغ کی ہریالی اور آنگنی نے اسے بہت متاثر کیا۔
سانے کزملین کی سرخ دیوار دور تک جاتی نظر آ رہی
تھی۔ گھاس کی خوب صورت ڈھلوانی پلٹ کے آگے
کرمیلن کی دیوار نے جیسے اسے مسحور کر دیا۔

"یہ سب کتنا خوب صورت ہے۔" انہی کے منہ
سے نکلا۔

"ہاں ہے تو۔" وہ بولا۔

"ہاسکو کے تاریخی ورثوں میں اس کی خوب صورتی اور
دنیا کے بڑے شہروں میں اس کا شمار ہونے کی وجہ سے
اسے بالعموم تیسرا روم کہا جاتا ہے۔ روم "اسٹینول"
لین اور ٹوکیو کی طرح یہ بھی پہاڑیوں میں گہرا ہے اور
وہ بھی سلامت پر۔" شاہ میر نے بتایا۔

آج اس نے اسے بہت سیر کروائی۔ ریڈ اسکوائر
سینٹ پارسل دیوار کرمیلن اور لینن کا مقبولہ تھک
کر الیکٹریٹر گارڈن کے ایک خالی حصے میں آکر بیٹھ
گئے۔ شام کے سائے گرے ہو رہے تھے اور وہ صبح باہر
بچے سے پہلے تھے۔

"مزا آیا؟" شاہ میر نے پوچھا۔

"بہت بہت زیادہ۔" وہ ہر جوش انداز میں بولی۔

"چلیں۔" شاہ میر نے کہا۔

"نہیں مجھ میں اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔"

وہ ہزاری سے بولی۔

"کچھ کھاؤ گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے انہماک میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے
پھر چلو یہاں کچھ ہی فاصلے پر ریستورنٹ ہے وہاں سے
ابھی میل کھاتے ہیں۔" شاہ میر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی
اس کے ہمراہ چل پڑی۔ کھانا آرڈر کرتے ہوئے انہی
نے نوٹر سے کہا۔

"وہ چاکلیٹ شیک۔"

"تو لوٹی دن چاکلیٹ شیک۔" وہ فوراً بولا تو انہی

نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تھیس چاکلیٹ شیک نہیں پسند۔"

"نہیں مجھے چاکلیٹ بالکل پسند نہیں ہے۔" اس

نے کہا تو انہی نے جو کئی "شہ میر کو بھی چاکلیٹ نہیں پسند

تھی۔ اس کے اندر سے گوازا آئی۔ اس نے عہد کو

دیکھا جو بڑی دلچسپی سے لوہرا دھو کھ رہا تھا۔



ان دنوں وہ بہت خوش تھا۔ اپنی محنت کے ثمر بونے

پر وہ پھر سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہا۔ زندگی کے

اس نازک موڑ پر اسے ماں باپ کی کئی بہت محسوس

ہوئی۔ اس سب میں حیدر نے اس کا بہت ساتھ دیا۔

بہت جلد اس نے وہاں قدم جمالے۔ وہ حیدر کے قلیٹ

سے ایک گھر میں شفٹ ہو گیا تھا مگر اسے امید تھی کہ

وہ بہت جلد اپنا گھر بھی بنائے گا۔ مگر یہاں نہیں پاکستان۔

آج پھر اپنا کامیاباں اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ

مہال لے کر کمرے میں آئی اور جلدی جلدی پلپا کا

نمبر ڈائل کیا۔ لن کی سم بند تھی۔ اس نے گھر کے نمبر

پر فون کیا۔ تیسری بیل پر فون اٹھایا گیا۔

"ہیلو!" یہ مہال کی گوازا تھی۔

"ہیلو!" وہ دوبارہ بولیں۔ مگر وہ خاموش رہی۔

"ہیلو مہال! میں۔ میں انہی بات کر رہی ہوں۔" اس

نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ سری طرف

خاموشی چھائی رہی۔ پھر بولیں۔

”تم۔ اب کیوں فون کیا ہے تم نے۔ سارے زمانے میں ہماری بے عزتی کروا کر مل نہیں بھرا تمہارا خیوارجو آئندہ میں فون کیلے تو۔“

”م! میری بات۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ وہ کتنی دیر فون دیکھتی رہی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

پچھلے کچھ بلوے وہ عصر سے اسی لیے طریقے سے بات کر رہی تھی کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ پلایا ٹیلیڈے سے رابطہ کر سکے۔ اور عصر سے اپنا پاسپورٹ حاصل کر سکے مگر ممما کی باتوں نے اس کی اندرون پرانی پھیرویا۔

”کیا۔“

”تم پاکستان واپس جا رہی ہو۔“ اس نے بتایا۔ ہا نہیں اس کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ وہ ٹھیک سے مسکرا بھی نہ سکی۔

”کب؟“ اس نے پوچھا۔

”بس کچھ دنوں تک۔“

”تمہارے پاس کا کام ہو گیا۔“ اس نے کہا تو شاہ میر پہلے چونکا پھر سنبھل کر بولا۔

”ہوں۔ ہوں۔“

”تو شاہ میر نے شادی کر لی۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ کہہ نہیں سکا۔

”ہوں۔ اس کی شادی کے چکر میں میری زندگی بہلا ہو گئی۔“ اس نے بمشکل اپنے آنسو روکے اور تقریباً بھانگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔



اس کے بعد اس نے کبھی دوبارہ فون کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ان حالات سے گھوما کر چکی تھی۔ اور عصر کی علوی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس نے اس کے لیے رات کا کھانا بنایا بریانی بخش کٹلس زمین سلاوا اور گاجر کا حلوہ اس کے آنے پر اس نے کھانا ٹیبل پر لگایا۔ اس نے باری باری ہر چیز چھی مگر جیسے ہی اس کی نظر گاجر کے حلوے پر پڑی تو بولا۔

”اوہ گاجر کا حلوہ۔ مجھے بہت پسند ہے۔“ وہ بہت شوق سے کھانے لگا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا شاہ میر! وہ اپنے آفس میں تھا اور حنا سے اسکا ٹپ بہت کر رہا تھا۔“

”مجھے جو ٹھیک لگا وہ میں نے کیا۔ میں اب اسے مزید دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں آج گھر جاؤں گا اور اسے کچھ صحیح بتاؤں گا۔“

”اگر وہ حقیقت کو قبول کر لیتی ہے تو ٹھیک ہے! نہیں تو اس کی مرضی۔“ وہ بولا۔

”عصر! یہ فٹ کٹلس بھی لوتیں۔“ انیہ نے اسے فٹ کٹلس کی جانب متوجہ کیا۔

”نہیں میں صرف یہی لوں گا۔ مجھے گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے۔“ اس نے کہا وہ چونکی۔ گاجر کا حلوہ تو شاہ میر کو بھی پسند ہے۔ اولی ہوں میں کیوں ہر بات پر شاہ میر اور عصر کا موازنہ کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ میری منظر ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ سوچتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور کھانے کی جانب متوجہ ہوئی۔



”شاہ میر! تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ وہ محبت ہے تمہاری۔ تم اتنی اسالی سے اسے جانے دو گے جسے پانے کے لیے تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔“

”تو اور کیا کروں میں حنا۔ ساری عمر اسے دھوکے میں رکھوں صرف اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اس سب میں اس کا کیا قصور ہے اسے کس چیز کی مزا مل رہی ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”انیہ! تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“ وہ بی وی بولا۔

لاؤنج میں بیٹھی بی بی سوی دیکھ رہی تھی۔ جب شاہ میر چلا آیا۔ اس نے رخ موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے

”تو پچھلے پانچ ماہ سے تم کیا کر رہے ہو؟ کیوں نہیں بتایا اسے سب کچھ۔“ حنا بھی غصے سے بولی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”شاہ میرم پہلے بھی غلط تھے۔ اور اب بھی غلط ہو۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ دوس جیسے آزاد ملک میں اس نے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“

تم جانتے ہو اس نے ان پانچ ماہ میں ایسی کوئی حرکت کیوں نہیں کی۔ کیونکہ وہ تم سے متاثر تھی۔ وہ تمہاری طرف تھنہنی چلی آتی ہے یہ جانے بنا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس سے وہ محبت کرتی ہے۔“

”تباہی چلی گئی۔“

”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ بعد میں بت کرتے ہیں۔“ اتنا کہہ کر اسے بولنے کا موقع دے بغیر اس نے لپٹا بند کر دیا۔



”انیس۔! میں آج تمہاری نکلتی کنفرم کروا دوں گا اور ہاں یہ رکھ لو آج مارکیٹ چلی جاؤ۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں لے جائے گا۔“

کتے ہوئے شاہ میر نے اس کے ہاتھوں میں پیسے تھمائے۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ بولی تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”دو تین دن میں تم پاکستان چلی جاؤ گی کیا پاسکو کی یادوں کو نہیں سمیٹو گی۔“ شاہ میر نے کہا تو وہ کتنی دیر اس شخص کا چہرہ دیکھتی رہی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ کہہ دے مجھے کیس نہیں جانا۔

وہ جا چکا تھا۔ وہ بھی ڈرائیور کے ساتھ ریڈ اسکو اتر آ گئی۔ اور کئی دیر اور اُدھر گھومتی رہی کہ اس کی نظر سامنے دکان پر پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ وہیں چلی آئی۔

اس نے وہاں سے عصیر کے لیے بلیو کلر کی شرٹ لی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے بلیو کلر بہت پسند ہے۔ اس نے اس کے لیے کافی چیزیں لیں وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے کبھی نہ بھولے۔ بے منت کے بعد وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر شاپ سے باہر نکلی سامنے سے آنے والی لڑکی سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھوں سے شاہنگ

بھاگ کرے۔“ وہ آئی ایم سوری۔“ وہ لڑکی بھی نیچے بیٹھ کر اس کی پلپ کرنے لگی۔

”اٹس اوکے۔“

انیس نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انیس۔۔۔ اپنا نام سن کر وہ چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔



وہ اپنے آفس میں بیٹھا انیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حنا تھیک کہتی ہے کم از کم مجھے ایک بار تو کوشش کرنی چاہیے۔ میں اسے اتنی آسانی سے کیسے جانے دے سکتا ہوں۔ کیا میں اس کے بغیر رہا ہوں گا۔ محبت کرنا ہوں میں اس سے۔ میں آج اس سے بات ضرور کروں گا پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

گھر میں سنانا چھایا ہوا تھا۔ وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہو آئی۔ وہی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے اس نے لائٹ آن کی۔ وہی لاؤنج روشنی میں نما گیا۔ تب ہی اس کی نظر صوفے پر بیٹھی انیس پر پڑی وہ منہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”اوہ۔۔۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔“ اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ چونکا۔

”ہوں۔ تو کیسا رہا آج کا دن۔“ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا۔

”بہت اچھا شاہ میر۔“ وہ سر اٹھا کر بولی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں اور ناک بھی لال تھی۔ وہ چونکا اس کا چہرہ دیکھ کر اور نہ ہی اس کی لفظوں میں کھلی کڑواہٹ محسوس کر کے بلکہ۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر۔ وہ کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھا رہا۔

”چپ کیوں ہو گئے شاہ میر۔“ وہ نفرت سے اسے

وہ اس وقت اسٹیزنڈر گارڈن سے ایف ہو رہی تھی۔ جہاں پہلی مرتبہ شاہ میر کے ساتھ آئی تھی۔ وہ نور و شور سے بڑے لگی۔ آہستہ پروردہ جوئی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں کوئی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ میں صرف اتنا کروں گا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

”میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ زندگی مجھ سے تنگ آگئی ہے۔ شاید اس لیے مجھ سے میری بیٹی کی وجوہات رفتہ رفتہ چھین رہی ہیں۔ میں پچھلے ایک سال سے ایک ٹاگرہ گناہ کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ جو میری ذات پر ایک دھبہ ہے۔ اب ایک بار پھر میرے اپنوں نے ہی میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔“

خیر تم جانا چاہتی ہو جوت۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر میں اتنا ضرور کروں گا کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے ایک سال پہلے بھی یہاں سے ہی الفاظ کہہ رکھے۔ انہوں نے تو یقین نہیں کیا۔ مگر مجھے تم سے امید ہے۔“

انیس ایک دفعہ پھر کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ کچھ نہیں کیا۔ ”وہ کھڑا ہوا واپس کے لیے مزائی تھا۔ جب وہ بولا۔“

”پسند کرنے لگی تھی میں تمہیں۔ تم سے دور جانے کا تصور بھی مجھے مشکل لگا تھا۔ مگر میں اب کیا کروں شاہ میر! ایک شخص جس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا اور ایک وہ جس کی کشش نے اپنی جانب کھینچی تھی۔ ایک وہ جو اپنا ہو کر بھی اجنبی تھا اور ایک وہ جو اجنبی ہو کر بھی اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ تم نے مجھے کہیں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ تم کون ہو۔ شاہ میر کہہ دو! میری زندگی کا مذاق بنا دیا ہے تم نے یہ کیسی محبت ہے تمہاری جس نے مجھے محض ایک کٹھن پہلی بنا دیا ہے۔“

دیکھتے ہوئے بولی۔ جبکہ اس کی مجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”یہ کیا بولے گا اب۔۔۔ اس کا بھائی! تو پھوٹ چکا ہے۔“ ایک اور تو اس کے کاتوں سے ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”زر گل۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ہاں۔ شاہ میر! زر گل بمقول انیہ کے تم سے میری شادی ہو رہی ہے۔“ وہ طنز آمیز میں بولی۔

”تمہیں پتا ہے شاہ میر! جس دن پہلا اور چاہو نے تم پر انیہ کی کڈھننگ (خواب) کا الزام لگایا تھا۔ اس دن مجھے لگا کہ شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ انیہ کی کڈھننگ کے پیچھے تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہو گا۔ مگر نہیں شاہ میر! میں غلط تھی۔ وہ تم ہی تھے جس نے انیہ کی کڈھننگ کروائی اور سارا الزام میرے بھائی پر لگانے کی کوشش کی۔ انیہ کو یقین دلانے میں کامیاب بھی ہو گئے کہ سب کچھ فراز نے کیا ہے اور اسے یہاں لے آئے۔ تاکہ اسے حقیقت کا پتا نہ چل سکے۔ تم جیسا شخص چاہے جانے کے قاتل ہی نہیں۔“

وہ ایک ایک لفظ نہایت صبر اور حقارت سے بول رہی تھی۔ اور وہ ایک دفعہ پھر خاموش تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے انیہ کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی۔ اس نے نظر جھکا لیا۔ انیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں مجھے چاہیٹ بالکل پسند نہیں ہے۔“ آسٹریزیوں کی صورت میں اس کے چہرے پر پھسل رہے تھے۔

”واؤ گاجر کا طبقہ مجھے بہت پسند ہے۔“ ”بلو گلر تو میرا لیورٹ ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور پھر ہلکتے ہوئے باہر چلی گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر اس کی جانب لڑکھانے سے اتنی آسانی سے کہنے جانے دے سکتا تھا اور زر گل تمام شائی بنی انیس دیکھ رہی تھی۔ اسٹیزنڈر گارڈن گھر کے قریب تھا اسے یقین تھا وہ وہیں ہوگی۔

اس قید کی صورت میں ذلت اور رسوائی کی صورت میں:



ایرپورٹ سے وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس نے ابھی تک گھر میں سے کسی کو بھی فون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لب جانے سب لوگ اسے دیکھ کر کیسے رے ایکٹ کرتے ہیں۔

ٹیکسی گھر کے سامنے آ کر رکی۔ وہ اپنے سالن سمیت نیچے اتری۔ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور تیل بجائی۔ علیزے نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔

”کن۔ انیس۔ تم۔“ وہ حیرانی سے بولی۔
 ”ہاں میں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
 ”تک۔ تم۔“

”علیزے! کیا مجھے اب اندر بھی نہیں آنے دو گی؟“
 وہ اس کی بات کٹ کر بولی۔

”اں۔ ہاں آ جاؤ۔“ اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر آئی اور ایک بھر پور نظر گھر پر ڈالی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ سر جھٹک کر وہ اس کے ہمرالاقہ میں چلی آئی۔

وہاں سب موجود تھے۔ سارہ، سمیر، ماما۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی۔ داخل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انیس انیس حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سب سے پہلے ماما انھیں اور اس کی جانب بڑھیں۔ وہ بہت گنور لگ رہی تھیں۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی سفید لکڑی کی شلوار قبض پہننے بہت پریشان اور ویران لگ رہی تھیں۔

اسے لگا کہ اسے اس کی لورڈ جیکوے کر گھر سے نکال دیں گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اس کے قریب آ کر بولیں۔

”کہاں۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔؟“ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

شاہ میر نے مڑ کر ایک نظر انیسے کو دیکھا اور پھر شکستہ قدموں سے وہاں سے ہٹ گیا۔ آج کی رات ان پر بھاری تھی۔ دونوں نے آن جہت کچھ کھو دیا تھا۔

لور پھر وہ چلی گئی۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکا۔ آج اس کے پاس جینے کی آخری وجہ بھی ختم ہو گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر اس کے لیے سب سے سوال یہ ہو رہا تھا۔

وہ نے کس گناہ کی سزا کٹ رہا تھا؟ انیسے سے محبت کے جرم کی۔

اسے فراز سے بچانے کے جرم کی۔ یا پھر اس کا علاج کرانے اور دنیا کی نظموں سے بچانے کے لیے اسکول لے کر جرم کی۔ ان سوالوں کا جواب جاننے کے لیے یہ جانا ضروری تھا کہ فراز نے انیسے کو قید کیوں کیا۔ لور اس رات انیسے اور فراز کے درمیان کیا جھگڑا ہوا تھا۔



اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس دن وہ مارکیٹ گئی تھی۔ کچھ ضروری چیزیں لینے وہاں ہی کے لیے گاڑی کے پاس آئی تو دروازہ کھلا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ گاڑی لاک کر کے گئی تھی۔ حیران پریشان ہوئی وہ گاڑی میں آ بیٹھی تو اسی وقت کسی نے اس کے منہ پر دھال رکھ دیا۔ اس نے دھال ہٹانا چاہا مگر گرفت کافی مضبوط تھی۔ وہ اپنے حواس کھو رہی تھی۔ سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے خود کو اس چار دیواری کے درمیان پایا۔ پہلے تو وہ بہت رولی۔ خوف نہ بھی تھی لور پریشان بھی۔ مگر آہستہ آہستہ اس سب کی عادی ہو گئی۔ اسے یہ جانے والے کھیلنے میں موجود نیند کی گولیاں اسے ان کا علوی بتا رہی تھیں۔

یہاں سے اس کا امتحان شروع ہوا۔ ممبرانہ ذلت دکھانے کے حقیقی معنی اسے اس دن پہا چلے۔

ماہنامہ شعاع مارچ 2015

مسلل روئے جاری تھی۔
 ”انیہ۔ تم کہاں تھیں۔ تم کیوں چلی گئیں؟“
 علیزے بولی۔
 ”میں۔ میں کہاں تھی علیزے۔ مجھے خود نہیں
 پتا۔“
 ”صاف صاف کہو انیہ! تم کہاں تھیں؟“ علیزے نے پھر پوچھا۔
 ”قید میں۔“ وہ بولی۔
 ”قید۔ کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔“ انیہ نے
 رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر۔ اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔
 وہ اسے سب کچھ بتائی چلی گئی۔ اور وہ حیرت سے اسے
 دیکھ رہی تھی۔ ساری باتیں سننے کے بعد وہ بولی۔
 ”انیہ تمہیں واقعی لگتا ہے کہ شاہ میرے تمہیں
 کٹھنپ کر لیا تھا۔“
 ”مجھے لگتا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے علیزے!“

”مگر۔“
 ”پلیز میں اب اس بارے میں مزید بات نہیں کرنا
 چاہتی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تو وہ سر ہلا کر اٹھ
 کھڑی ہوئی۔
 ”ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔“ وہ جانے ہی لگی تھی
 کہ انیہ بولے۔
 ”علیزے! تمہارا لپاؤں۔“ علیزے نے مسکرا کر
 اسے دیکھا اور بولی۔
 ”ہاں اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لپاؤں نے آپریشن کروا دیا
 تھا۔“ وہ بولی۔ انیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ
 بہت بدل گئی تھی۔ اس کے لمبے بال اب شانوں پر
 جمبول رہے تھے۔ چہرہ بھی گھرا ہوا تھا۔ وہ کافی اچھی
 لگ رہی تھی۔



وہ جب سے آئی تھی۔ اس گھر کے افراد کے رویے
 دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ میر جو اس سے بات کرتا بھی
 گوارا نہیں کیا کرتا تھا۔ اب روز اس کا حال چال پوچھتا

”یوں لو کہاں تھیں تم۔؟ اور۔ اگر چلی گئی تھیں تو
 اب کیا لینے آئی ہو؟“ وہ روئے لگیں۔ انیہ حیران
 پریشان انہیں دیکھ رہی تھی۔
 ”جاؤ انیہ! لو لپس چلی جاؤ۔ جہاں سے آئی ہو۔ اس
 گھر میں اب تمہارا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ سو تیلے بن
 بھائی۔ سو تنی ماں۔“ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں
 بولیں۔ ان کی بات پر انیہ چوکی اور ابا دھر ابا دھر نظریں
 دوڑا میں علیزے سارا سمیر۔ سب۔
 ”لپا۔ لپا کہاں ہیں۔“ وہ بولی۔ اس کی آنکھوں
 میں کیا کچھ نہ تھا۔ خوف حیرت پریشانی خدشے۔
 ”تم نے بہت دیر کر دی انیہ۔ بہت دیر کر دی۔“
 مہا بولیں۔ تو وہ اپنے خدشات کی نئی کرنی ان کی طرف
 متوجہ ہوئی۔

”مہا! لپا۔ لپا کہاں ہیں؟ وہ۔ وہ ٹھیک تو ہیں
 ہیں۔“ اسے ہی اغاظ گہور لگ رہے تھے۔ ”مہا
 آپ کچھ بول گئیں نہیں رہیں۔“ وہ روئے لگی۔
 ”انیہ! لپا کی ڈنٹہ ہو گئی ہے۔“ جواب علیزے کی
 طرف سے آیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل
 گئی۔ وہ ساکت نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔
 ”ایسا۔ نہیں ہو سکتا۔ تم تم سب جھوٹ بول
 رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا
 سکتے ہیں۔“ وہ نئی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔
 ”انیہ۔“ علیزے چیختی انیہ بے ہوش ہو گئی
 تھی۔

”لپا چلے گئے۔ پچھلے ہفتے لن کی ڈنٹہ ہوئی۔ اپنے
 آخری گھوموں میں انہوں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ ہر
 وقت لن کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی۔ مجھے انیہ سے
 ملو اور۔ مگر۔ تم۔“ اس نے بات اور صوری چھوڑ دی۔
 ”انیہ۔ تمہیں اس بات کا لگہ تھا نہیں کہ مہا تم
 سے پیار نہیں کرتے۔ مجھے یہ تو پتا نہیں کہ وہ تم سے
 پیار کرتی ہیں یا نہیں۔ مگر یہ ضرور پتا ہے کہ لپا تم سے
 بہت پیار کرتے تھے۔ ہم سب سے زیادہ۔ وہ
 تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔“ وہ اسے بتا رہی تھی
 اور وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور

کے گزر جانے۔ یہ سب انہی کے لیے حیران کن تھا۔
شاید سارہ نے ماما کو بتایا ہوگا۔ سوچتی۔



اس دن بھی وہ بی۔ وی لاؤنچ میں بیٹھی بی۔ وی دیکھ رہی تھی جب ماما بی۔ وی لاؤنچ میں داخل ہوئے اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا اور اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔
”انیہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

بولیں۔
”جی کہیں۔“ انہی ان کی جانب متوجہ ہوئی۔
”وہ بات دراصل یہ ہے کہ دللاور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ وہ کتنی دیر کچھ بول نہیں سکی۔ بس حیرانی سے انہیں دیکھتی تھی۔

”دیکھو انہی! انکار مت کرنا میں اب مزید تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ جب سے تم آئی ہو۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں بتا رہے ہیں۔ بستر یگی ہے کہ تم شادی کر لو۔“ وہ بولیں۔
”مگر ماما! میں دللاور سے شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ دے پوئے غصے سے بولی۔

”تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔
”پتا نہیں مگر میں دللاور سے شادی کسی صورت نہیں کروں گی۔“ وہ غصے سے کتے بولیں سے چلی گئی۔



جس دن سے اس نے ماما کو دللاور سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ گھر میں سب کا رویہ اس کے ساتھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اس سے کھنوا کھنوا کرتا ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتا اور ماما تو اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتیں دللاور کا آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتی رہی۔ مگر پھر ہلڈے کے روپے میں بھی تبدیلی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔
”دیکھو انہی! مجھے نہیں لگتا کہ ماما غلط کہہ رہی ہیں۔ تمہیں شادی کرنی چاہیے۔ تمہیں اس وقت کسی مضبوط سارے کی ضرورت ہے۔“ ہلڈے اسے

گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اور ماما بھی اس سے بہت اچھے طریقے سے بات کرتیں۔ اس سے باتیں کرتیں اور بن باتوں میں پلپلا کاڑھتی ہوئی۔ ہلڈے تو اس کے ہر غم کی ساکھی تھی۔ اس کی سب سے پیاری بہن۔

بس سارا کا برتاؤ کچھ عجیب سا تھا۔ اگر وہ اسے پلانے کی کوشش کرتی۔ تو جواب دینے کے بجائے۔ تنہا بھری نظروں سے اسے دیکھتی۔ یا پھر ایسا جواب دیتی کہ وہ اپنا سامنے لے کر رہ جاتی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر لان کو دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چونک کر پیچھون کھلے۔ دللاور تھا۔

”آپ کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟“ وہ غصے سے بولی۔ اندر ہی اندر وہ کھلے۔ رہی تھی۔

”ارے میری جان! میں تو تم سے ملنے آیا ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے۔ تمہارے آنے کا پتا چلا تو وہ نہیں سکا۔ دل کے ہاتھوں مجبور کر آ گیا۔“ وہ کیننگی سے اسے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔ انہی کو گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

”رہ جو جاؤ یہاں سے ذلیل انسان۔“ وہ غصے سے بولی۔ اس نے سرائھا کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تو وہ ان کھلا اور سارہ اندر داخل ہوئی۔

”ماموں! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ بولی۔
”ہاں۔۔۔۔۔ میں انہی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولا۔ جبکہ انہی حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو مل لیا۔ اب چلیں۔“ سارہ نے کہا۔
”ہاں تم چلو میں آتا ہوں۔“ دللاور نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

”ماموں میں آپ سے کہہ رہی ہوں میں کہ نیچے چلیں۔“ اب کے سارہ غصے سے بولی۔ تو وہ پہلے حیران ہوا پھر ایک نظر اس پر ڈالنا چلا گیا۔ سارہ بھی وہاں سے چلی گئی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

اس دن کے بعد دللاور کا آنا جانا مزید بند ہو گیا تھا۔ مگر وہ پہلے کی طرح اسے تنگ نہیں کرتا۔ بلکہ نظر انداز کر

تسے بعد چاہے مولاوی وہ وہاں رہا۔۔۔
 کرتے ہوئے ہوئی۔
 ”مما! میں۔ میں دلاور سے شادی کے لیے تیار
 ہوں۔“ ”مما! علیزے، سارا، میر سب حیرت سے
 اسے دیکھ رہے تھے۔ ماما کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔
 ”تم۔ تم۔ تم کبھی کہہ رہی ہو۔“ وہ حیرت اور خوشی کے
 طے طے تاثرات سے بولیں۔
 ”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ علیزے
 اور میر بھی مسکرائیں۔
 ”تھیک پوینٹا اتنی خوش کر دیا ہے تم نے میر۔“
 وہ بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس آکر بولیں اور اسے
 گلے سے لگا لیا۔

سب ہی خوش لگ رہے تھے مگر۔ سارا عجیب
 نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز اس کو
 کھٹک رہا تھا۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے غور
 سے اسے دیکھا مگر نظریں چرائیں۔
 ”ہیہ! میرے کمرے میں آنا مجھے تم سے ضروری
 بات کرنی ہے۔“ وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ جب
 ماما نے کہا تو اس نے دھڑے سے اثبات میں سر ہلادیا
 اور ان کے ساتھ کمرے میں آگئی۔
 ”جی۔“ وہ بولی۔

”اوکوھر میرے پاس آکر بیٹھو۔“ انہوں نے بیڑی کی
 طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیڑی پر آکر بیٹھ گئی۔
 ”میں نے تمہیں بتانا تھا کہ میں اگلے جمعہ کو تمہارا
 اور دلاور کا نکاح کر رہی ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض۔“
 ”اگلے جمعہ۔“ وہ حیرت کی۔ ”مما! اتنی جلدی میرا
 مطلب ہے کہ ابھی پلپا کی ٹیٹی ہوئے سمینہ ہوا اور
 آپ۔“ وہ حیرانی سے بولی۔
 ”پھر ایسا کرتے ہیں کہ اگلے مہینے کی پانچ تاریخ رکھ
 لیتے ہیں۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہاں؟“
 وہ بولیں۔
 ”تھیک ہے ماما جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے سر
 جھٹکا اور باہر آگئی۔
 شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں گوکہ سلوکی

جسمانے ہوئے ہوئی۔
 ”علیزے! ماما صرف شادی کی بات نہیں۔ بلکہ
 دلاور سے شادی کی بات کر رہی ہیں۔“ ”ہیہ دلاور پر دلاور
 دیتے ہوئے ہوئی۔
 ”تو؟“ علیزے نے کہا۔
 ”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔“ ”ہیہ نے اسے
 گھور کر دیکھا۔
 ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی
 ہوں۔“
 ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں دلاور سے شادی
 بربز نہیں کروں گی۔“ ”ہیہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے
 بولی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے ایہ! کہ تمہارے لیے رشتوں
 کی لائن کئی ہوئی ہے۔ جس پر انگلی رکھو گی وہ
 تمہارے نصیب میں لکھ دیا جائے گا۔ نہیں ایہ! اس
 داغ کا کیا جو تمہارے دامن پر لگا ہے۔ اسے کیسے
 صاف کرو گی۔ کیا جواب دو گی جانے کو ایک سال کہاں
 گزار کر آئی ہو۔ کون دے گا تمہاری پائی کا ثبوت۔
 معاف کرنا ایہ! اگر کسی سچ ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ
 تمہیں دلاور جیسا شخص مل رہا ہے۔

ہمارے معاشرے میں تو ایک رات کی عتاب ہوئی
 لڑکی کو کوئی قہقہہ نہیں کرنا تم تو پھر۔“ کہتے ہوئے وہ
 چپ ہو گئی۔ جبکہ ایہ اس کی باتیں سن کر ششدر رہ
 گئی۔ علیزے وہاں سے ہٹ گئی۔
 وہ بیڑی پر بیٹھ گئی۔ یہ علیزے کیا کہہ گئی تھی اسے
 کیا کچھ غلط کہا۔ شاید۔ نہیں سب کچھ ٹھیک ہی تو
 کہہ کر گئی ہے۔ آئینہ دکھا کر گئی ہے مجھے۔ مگر مجھے
 اب کیا کرنا چاہیے۔ دلاور سے شادی۔ اسے اللہ میں
 کیا کرے۔ دلاور سے شادی نہیں کروں گی تو ماما کے
 پیور دیکھ کر لگتا ہے مجھے گھر سے نکال دیں گی۔ اف۔
 کیا کروں۔ آگے کتوں ہے اور پیچھے کھالی۔
 اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر خلاف توقع وہ بھی موجود
 تھی۔ سب نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر خاموش
 رہے۔

وہ طنز کر رہی ہے یا پوچھ رہی ہے۔
 ”نہیں اور اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں
 مزید اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“
 انیہ سختی سے بولی۔

”مطلب تم نے... تم نے اسے چھوڑ دیا؟“
 بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
 ”تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔“ حنا صدمے سے بولی۔

”یہ سوال تم نے اس سے کیوں نہیں پوچھا کہ اس
 نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میری زندگی کا مذاق بنا
 دیا ہے اس نے اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں اس
 کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔“ وہ غصے سے وائٹ
 پیس کر بولی۔ حنا نے السوس سے اسے دیکھا۔

”اس نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ بلکہ
 تمہاری وجہ سے اس کا سب کچھ واؤپر لگ گیا۔ سب
 کچھ کھو دیا ہے۔ اس نے گھر رشتے نہیں پاپ بہن
 سب کچھ۔ تم اسے ہلیم نہیں کر سکتیں۔“
 ”تو تم اس کی وکالت کرنے آئی ہو۔“ انیہ لاپرواہی
 سے بولی۔

”میں اس کی وکالت کرنے نہیں آئی انیہ! تمہیں
 تھوہر کا وہ سراخ دکھانے آئی ہوں۔ جو ابھی بھی
 تمہاری نظروں سے لوجھل ہے۔“
 ”میں سب کچھ جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”کیا جانتی ہو؟“ حنا نے پوچھا۔
 ”یہی کہ میری کنڈہ بند (خواتین) سے لے کر ماسکو
 تک کے سفر کے پیچھے شاہ میر کا ہاتھ تھا۔“ وہ بولی۔
 حنا کو اس بے وقوف لڑکی کی باتیں سن کر السوس
 ہول

”کچھ نہیں جانتیں تم کچھ بھی نہیں۔“
 ”انیہ! وہ شاہ میر تھا جس نے تمہیں فرار کے چنل
 سے بچایا۔“ اس کی بات پر انیہ نے سر اٹھا کر حنا کو
 دیکھا۔ وہ ششدر رہی۔
 ”نہیں۔ تم۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ فرار۔
 نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم شاہ میر کو

سے ہو رہی تھی پھر بھی کچھ انتظام تو کرنا تھے۔ آج
 علیزے اسے زبردستی بازار لے کر آئی تھی اور اب
 پچھلے تین گھنٹے سے وہ بازار میں خوار ہو رہے تھے۔
 ”علیزے! بس بھی کرو۔ میں بہت تھک گئی
 ہوں۔“ انیہ جھکے جھکے انداز میں بولی۔

”ارے ابھی سے ہی تھک گئیں۔ ابھی کلنی
 شاپنگ رہتی ہے۔“ علیزے حیرت سے اسے دیکھتے
 ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں اب مزید نہیں چل سکتی۔ بہت
 تھک گئی ہوں اور مجھے بھوک بھی بہت لگی ہے۔“
 انیہ جھکے جھکے انداز میں بولی۔

”اچھا پھر ایسا کرو۔ وہ سامنے والے ریٹورنٹ
 میں جا کر بیٹھو اور کھانا آرڈر کرو۔ میں پلاٹی کے کام پختا کر
 آئی ہوں۔“ علیزے نے کہتے ہوئے سامنے
 ریٹورنٹ کی جانب اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ تم پلاٹی کی شاپنگ کر
 کے آجاؤ۔“ انیہ نے اٹھتے ہی سر ہلاتے ہوئے کہا
 اور ریٹورنٹ کی جانب بڑھ گئی۔

وہ ایک کونے والی میز پر آکر بیٹھ گئی۔ ریٹورنٹ
 میں زیادہ لوگ نہیں تھے اس نے سوچا علیزے
 آئے گی تو کھانا آرڈر کر دے گی۔ وہ اپنے موبائل کی
 جانب متوجہ ہوئی اور بلاوجہ ہی اس کے ہٹن پریس
 کرنے لگی۔

”کیسی ہو انیہ؟“ کواز پر اس نے حیرت سے سر اٹھا
 کر دیکھا وہ حنا تھی۔

”میں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ گڑبڑائی۔
 ”اور ستاؤ تمہیں کیسے؟ ماسکو سے کب واپس آئیں؟“
 وہ بے تکلفی سے اس کے سامنے والی میز پر آکر بیٹھ
 گئی۔

”بڑا بھلا مہینہ ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”شاہ میر بھی آیا ہے؟“ وہ پر جوش انداز میں بولی۔
 ”کیوں کیا اسے آنا چاہیے تھا؟“ وہ طنزیہ انداز میں
 بولی۔
 ”تو وہ نہیں آیا۔“ حنا نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی کہ

پھنس چکا تھا۔ اسی لیے وہ تمہیں لے کر اسکو چلا گیا۔
 ”اس نے مجھے پاپا کے حوالے کیوں نہیں کیا اور پیلا
 کوئی کیوں نہیں بتایا۔“ انہی نے پوچھا۔

”شاہ میر نے تمہیں تمہارے پیلا کے حوالے اس
 لیے نہیں کیا کہ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اور
 انہیں سچ اس لیے نہیں بتا سکا کہ وہ ہسپتال میں تھے۔
 بعد میں تمہاری طرح انہوں نے بھی اسے صفائی
 دینے کا موقع نہیں دیا۔“ حنا نے کہا۔ انہی خاموش
 رہی۔

”اب بتاؤ کیا تمہیں ابھی بھی لگتا ہے کہ شاہ میر
 غلط تھا۔“ حنا نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی در
 آئی۔

”زرگل نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ وہ کہتی تھی کہ
 شاہ میر مجھے اسکو اس لیے لے کر گیا کہ مجھے سچائی کا پتا نہ
 چل سکے کہ شاہ میر نے مجھے۔“ وہ رو دی۔

”سچائی یہ ہے کہ تمہاری کڈنہنگ کا ذمہ وار فراز
 ہے اور شاہ میر تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا اس لیے
 یہاں سے لے گیا۔ مگر وہ جانتے ہوئے یہ کہہ کر گیا تھا۔
 کہ جس دن تمہاری حالت ٹھیک ہو گئی۔ وہ تمہیں
 سب کچھ بتا دے گا اور پھر فیصلہ تمہارا ہو گا۔ اس کے
 ساتھ رہنا چاہو گی تو ٹھیک ذر نہ وہ تمہیں دلہن بھیج
 دے گا۔“

”اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ شاہ میر ہے
 عصو نہیں۔“

”اسے لگا تم ابھی ٹھیک نہیں ہو بعد میں بتائے گا۔
 شاید اس کی غلطی یہی تھی اسے بتانا چاہیے تھا۔ ویسے
 وہ بتانے والا تھا۔ مگر زرگل نے سب کچھ خراب کر
 دیا۔“ حنا نے جواب دیا۔

انہی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اسی وقت
 اسے سامنے سے ہلڈے آئی نظر آئی۔ اس نے
 جلدی سے آنسو پونچھے۔

”سواری انہی آئے میں تھوڑی دیر۔“ بولتے
 ہوئے اچانک ہلڈے کی نظر حنا پر پڑی۔ اس نے

بچانے کے لیے فراز پر الزام لگا رہی ہو۔ مجھے بھی یہی لگا
 تھا۔ مگر پھر زرگل۔“

”یہ مت بھولو کہ زرگل فراز کی بہن ہے انہی۔“
 حنا اس کی بات کٹ کر بولی۔

”میں بھی یہ کیسے بھول جاؤں کہ تم شاہ میر کی
 دوست ہو۔“ وہ دوبارہ بولی۔ حنا نے اس کی طرف دیکھا
 اور پھر خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی۔

”دیکھو انہی! اس وقت میں شاہ میر کی دوست ہونے
 کے ثبوتے نہیں انسانیت کے ثبوتے تمہارے بھلے کے
 لیے کہہ رہی ہوں انہی! شاہ میر نے تمہیں فراز کے
 چنگل سے چھڑایا۔ مجھے نہیں پتا کہ فراز نے ایسا کیوں
 کیا۔ شاہ میر کا کہنا ہے کہ تم ابھی طرح جانتی ہو کہ فراز
 نے ایسا کیوں کیا۔“ انہی نے نظر میں حرالیں۔

”اس رات وہ تمہیں ہمارے گھر لایا تمہاری
 حالت بہت خراب تھی۔ جو باہر بات تمہارے ساتھ
 ہوئے ان کی وجہ سے تم کافی زخمی تھیں۔ ان ہی دنوں
 شاہ میر کے والدین نے شاہ میر کو گھر سے نکال دیا۔ جانتی
 ہو کیوں۔“ حنا نے رک کر اس سے پوچھا۔

”کیوں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ شاہ میر تمہیں بھگا
 کر لے گیا ہے۔ اسے جائیداد سے عاق کر دیا گیا اور گھر
 کے دوروازے ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گئے۔“

”یہ سب کس نے بتایا ماموں کو۔“ وہ بولی۔

”تم بہتر جانتی ہو۔“ حنا لطفدی سانس خارج کرتے
 ہوئے بولی۔

”فراز۔“ انہی کے منہ سے نکلا حنا نے کندھے
 اچکائے۔

”شاید۔“

”اس کے بعد وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگا۔ اوپر سے
 تمہارے رویے نے بھی اس کو پریشان کر دیا اور رہی
 سہی کسر تمہارے پیلانے پوری کر دی۔ انہوں نے بھی

تمہاری کڈنہنگ کا ذمہ وار شاہ میر کو ٹھہرایا۔ شاہ میر

جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس میں شاہ میر کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے کالوں میں شاہ میر کی آواز گونجی۔
 ”انیہ! میں ایک دلہہ پھر کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ کچھ نہیں کیا۔“ اس کا ٹوٹا ہوا لہجہ اسے آج بھی یاد تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گریں۔

”میں نے تمہیں کھو دیا۔۔۔ میں بہت بری ہوں شاہ میر مجھے صاف کر دو۔ میں بہت بری ہوں۔“ وہ رو رہی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ جو اس کی بات سنتا یا اس کے آنسو پونچھتا۔



آج اس کا نکاح تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن۔ نکاح کا جوڑا زیورات سب کچھ بیڈ پر بکھرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مندی بھی لگ چکی تھی اور خلاف توقع اس کی مندی کا رنگ بھی کافی تیز تھا۔ جسے دیکھ کر وہ مٹی سے مسکر لئی۔

اس وقت وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد مہمانوں نے آجانا تھا اور اس کا نکاح ہو جانا تھا۔ مگر کیا وہ اس نکاح کے لیے دل سے راضی ہے؟ کیا وہ اور جیسے شخص کے ساتھ گزارا کر سکے گی؟ مگر یہ سب اس نے پہلے کیل نہیں سوچا۔

وہ دلاور سے نکاح کرتی تھی۔ اس کے ساتھ سمجھوتا بھی کرتی تھی۔ مگر کاش تھا اسے اس دن نہ ملی ہوگی۔ اسے اس ساری چال سے ناواقف ہی رہنے دیتی۔ اب کیا سچ جاننے کے بعد وہ یہ نکاح کر سکے گی؟ کتنی دیر سوچوں کے تسلسل میں کونے کونے رہنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ کام تھوڑا مشکل تھا۔ مگر اس سے اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ سکتی تھی۔

”علیٰ زے! نکاح کا وقت ہونے والا ہے۔ جاؤ دیکھو انیہ تیار ہوئی کہ نہیں۔ تھوڑی دیر تک مہمانوں نے بھی آجانا ہے۔“ ممانے علیٰ زے سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلائی ہوئی انیہ کے کمرے کی جانب چل دی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھنک کر رہی۔

سوالیہ نظروں سے انیہ کی جانب دیکھا۔
 ”یہ۔۔۔ یہ میری کالج ٹیلو ہے۔ ابھی اتفاقاً ملاقات ہوئی ہے۔“ انیہ نے بات بتائی۔ حنا تھوڑی حیران ہوئی۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ علیٰ زے نے اسے سلام کیا۔
 ”اچھا انیہ! اب میں چلتی ہوں۔“ حنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انیہ! اپنی فرینڈ کو اپنے نکاح پر انوائٹ نہیں کرو گی۔“ علیٰ زے نے اچانک کہا تو حنا نے چونک کر انیہ کو دیکھا۔ انیہ خاموش رہی۔
 ”انیہ۔۔۔ کا نکاح۔“ وہ ابھی تک حیران تھی۔

”ہاں۔۔۔ ہر سول انیہ کا نکاح ہے۔ ایک سالہ سی تقریب ہے گھر میں۔ آپ بھی ضرور آئیے گا۔“ علیٰ زے نے خوش دلی سے کہا۔ حنا نے انیہ کی طرف دیکھا۔ وہ ساٹھ چوبیسے کھڑی تھی۔ شاید اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”اچھا میں چلتی ہوں۔“ حنا کہہ کر چل گئی۔

علیٰ زے اب اس کی جانب متوجہ ہوئی۔
 ”ارے تم نے ابھی تک کھانا آرڈر نہیں کیا۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”علیٰ زے! مجھے بھوک نہیں ہے۔ کلنی دیر ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ انیہ بولی۔

”ہائیں! ابھی کھنڈ پہلے تو تم نے بھوک کا شور مچایا ہوا تھا۔“ علیٰ زے حیران ہوئی۔
 ”تم چل رہی ہو یا میں اکیلی چلی جاؤں؟“
 ”چلے جاتے ہیں۔ اب کھانا تو کھاؤ۔“ علیٰ زے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے تم یہاں بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ میں جا رہی ہوں۔“ انیہ غصے سے کہتی دروازے کی جانب بڑھی۔
 علیٰ زے اسے جاتے دیکھ کر اس کی جانب نہیں گھرا۔ گھر آتے ہی وہ اپنے کمرے بند ہو گئی۔ اس کا سر درد سے پھنسا رہا تھا۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ حنا کی باتوں نے اسے حیران پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ تو

نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔
 انہی نے انہیں دیکھا اور پھر نظریں پھیر لیں۔
 ”کیا کہا تم نے۔ یہ نکاح نہیں کرو گی۔“
 ”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”ممانے پوری قوت سے ایک زوردار پھٹراس کے منہ پر جڑوا۔ علیزے تمہاری بنی کھڑی تھی۔ وہ لڑکھائی مگر بروقت سنبھل گئی۔“
 ”ایک دفعہ پھر کہنا گیا کہا تم نے۔“ وہ اسے سیدھا کر کے سمجھو ڈالتے ہوئے بولیں۔ ”جان سے ماروں گی اگر دوبارہ یہ الفاظ تمہاری زبان پر آئے۔“
 ”تو مار دوں مجھے کوئی پروا نہیں۔“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”دیکھو انہی۔ یہ بے وقتانہ باتیں بند کرو۔ میری بچی! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ایسے مت کرو۔ کیا۔ کیا۔ کیا۔“
 دلاور نے ہنسنے کہا۔ ”اگر اس نے کوئی غلطی کی ہے تو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مگر پلیز ایسے صبر وقت پر انکار مت کرو۔“ وہ اسے بچھارتے ہوئے بولیں۔
 انہی لن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے ان پر ترس آیا تھا۔ مگر نہیں۔ وہ کنوڑ پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سوال تھا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھ پر آپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے آپ کو کہہ دیا۔ مجھے یہ نکاح نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔“ وہ بولی۔

وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ پھٹر کے لن پر ایک سنہن سوار تھا۔ انہی مار کھا رہی تھی اور وہ اسے بری طرح سے پیٹ رہی تھیں۔ علیزے کو ہوش آیا تو وہ دوڑتی ہوئی لن کے پاس آئی اور ممانے کو بمشکل اس سے الگ کیا۔

”ممانے۔ پلیز بس کریں۔“ انہی روٹی، سسکتی سامنے دیوار سے جا لگی تھی۔ اسی وقت دلاور اندر داخل ہوا۔
 ”کیا ہوا آپلی۔ کیا بات ہے۔“ وہ بولا اور پھر اس کی نظروں دیوار کے ساتھ لگی روٹی ہوئی انہی پر پڑی۔ اس کے گالوں پر چھینٹوں کے نشان واضح تھے۔ ہونٹ سے خون بہ رہا تھا۔

نکاح کا جوڑا زمین پر پڑا تھا۔ اور پورے کارپٹ پر زیورات لورچے ٹیاں بکھری پڑی تھیں۔
 اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور نظریں لوہراوہر کھما کر انہی کو ڈھونڈا۔ وہ سامنے ہی صوفے پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر علیزے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس نے اسے جو نکال دیا۔
 ”اوپہ! یہ سب کیا ہے۔ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں۔ اور یہ کپڑے اس طرح کیوں پھینک لیے۔“

علیزے اپنے خدشہ کی نفی کرتی زمین سے چھریں اٹھاتے ہوئے بولی۔ انہی خاموش رہی۔

”انہی! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ علیزے نے کپڑے اٹھا کر بیڈ پر رکھے اور اس کے پاس آ کر بولی۔

”مجھے یہ نکاح نہیں کرنا علیزے۔“ اس کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اسے لگا کہ شاید اس نے کچھ غلط سنا ہے۔

”کیا۔ کیا کہا تم نے؟“ علیزے نے کہا۔
 ”مجھے یہ نکاح نہیں کرنا۔“ اب کی بار وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”تم۔ تمہارا دلغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو تم۔“ علیزے نے اسے سمجھو ڈکر کھڑا کیا۔

”انہی! ممانوں کے آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں تمہارا نکاح ہو جاتا ہے اور تم۔“
 علیزے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہی کے منہ پر پھٹوے مارے۔
 ”جسٹ اسٹاپ اٹ علیزے! مجھے تمہاری کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ مجھے یہ نکاح نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔“ وہ خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

اسی وقت ممانے میں داخل ہوئیں۔
 ”ممانے۔“ علیزے نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے

”ہمت کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی۔“ شاہ میر
 غصے سے بولا۔
 ”تیری تو میں۔“ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ کرتا۔
 ”مما آگے بڑھیں اور دلاور کو پیچھے کیل۔
 ”ایک منٹ دلاور آتم یہاں سے جاؤ۔“
 ”آہی ایسے۔“
 ”دلاور! میں تم سے کہہ رہی ہوں نہ جاؤ یہاں
 سے۔“ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا جب سعدیہ تنگ پھر
 بولیں۔ وہ گہرے سانس لیتا نظرت بھری لگا ہوں سے
 شاہ میر کو دیکھتا ہوا بولا۔
 ”مجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا۔“ کتا وہاں سے چلا
 گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماما اس کی جانب متوجہ
 ہوئیں۔
 ”ہاں باب تمہاؤ۔ کیا چاہتے ہو۔“
 ”انیہ کو چھوڑ دوں۔“ وہ بولا۔ اس کی بات پر انہوں
 نے انیہ کی طرف دیکھا جو سانس کے ساتھ کھڑی رو رہی
 تھی۔ اور سانس سے چپ کو رہی تھی۔
 ”اگر میں نہ مانوں تو۔“ ماما نے کہا۔
 ”تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور بھی ہمت سے
 راستے ہیں اپنی بات منوانے کے۔“ شاہ میر کندھے
 اچکا کر بولا۔
 ”مثلاً۔“ وہ تھوڑا حیران ہوئیں۔ تو شاہ میر طنز
 مسکرایا۔
 ”میں کہتا تو نہیں چاہتا کہ آپ مجھے مجبور کر رہی
 ہیں۔ اب ظاہر ہی بات ہے کہ رٹ پکھری کے چکر
 کاٹنا تو آپ پسند نہیں کریں گی نکل۔“ شاہ میر نے معنی
 خیزی سے کہا۔ تو وہ جو نکلیں۔ وہ اس کی باتوں کا مطلب
 سمجھ چکی تھیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔
 ”چلو ٹھیک ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر ٹول کر لیتے
 ہیں۔“ شاہ میر نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ پھر کندھے
 اچکا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے سامنے
 صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 ”میں انیہ کو اس طرح تمہارے ساتھ کیسے جانے
 دلاں۔ تمہیں اس سے نکاح کرنا پڑے گا۔“

”ہونا کیا ہے، بے غیرت نکاح سے انکار کر رہی
 ہے۔“ ماما غصے سے ہاتھ پونے بولیں۔ اور سامنے
 صوفے پر جھکے جھکے انداز میں بیٹھ گئیں۔
 ”کیوں اب کیا مسئلہ ہے اسے۔“ غصے سے اس
 کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”اللہ جانے اب کیا چاہتی ہے یہ لڑکی۔“ ماما پھر
 بڑھائیں۔
 ”ایک بات کن کھول کر من لو انیہ! نکاح ہو گا اور
 آج اسی وقت ہو گا۔ چاہے اس میں تمہاری مرضی
 شامل ہو یا نہ ہو۔“ وہ اسے خبردار کرنے والے انداز
 میں بولا۔
 اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ اپنے آنسو پونچھتی
 ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”تو ٹھیک ہے جو کرنا ہے کر لو۔ میں بھی دیکھتی ہوں
 کہ یہ نکاح میری مرضی کے بغیر کیسے ہوتا ہے۔“
 ”میری موافقی کو مت لگا دو انیہ۔“ وہ انگلی اٹھا کر
 بولا۔
 ”ایک لڑکی پر اپنی موافقی کا رعب ڈالنا سو کی
 بددوری نہیں بن سکتی ہے اور تم جیسے سچ انسان۔“
 وہ ابھی بات پوری نہ کر سکی تھی کہ اس نے ایک
 زوردار پھنسا اس کے منہ پر بار اور اسے زور کا دکھایا۔
 وہ لڑکھڑا کر کرنے ہی والی تھی کہ کسی نے اسے
 تھام لیا۔ وہ زور سے اس کے سینے سے ٹکرائی۔
 اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کی نظر ساتھ
 کھڑی سانس پر پڑی اور پھر وہ چونکی اس نے سر اٹھا کر
 دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ۔۔۔ وہ اور کوئی نہیں شاہ میر
 تھا۔
 ”شاہ میر۔“ انیہ بنا پلکیں جھپکے اس کی طرف دیکھ
 رہی تھی۔
 شاہ میر نے دیکھا اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا
 کر اس کے ہونٹ کے کنارے پر لگا خون صاف کیل۔ وہ
 بے اختیار رونے لگی۔ اس نے اس کے آنسو صاف
 کیے اور خود سے الگ کیا اور آگے بڑھ کے ایک زوردار
 ٹھپوڑا اور کے منہ پر دے مارا۔

لن کی ہلت سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ کمرے کے سارے نفوس حیران رہ گئے۔ انیہ نے سر اٹھا کر شاہ میر کو دیکھا اور شاہ میر نے انیہ کو۔

”نہیں۔ یہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں۔“ سب سے پہلے علیزے کو ہوش آیا۔ وہ بیانی انداز میں چچی۔ لب حیران ہونے کی باری انیہ کی تھی۔

”مما! آپ سب کچھ جانتے ہو جیسے ایسا کسے کر سکتی ہیں۔ نہیں۔ میں انیہ کو کبھی شاہ میر کا ہونے نہیں دلا لی۔ کبھی نہیں۔“

”افرت، بھری نظروں سے انیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ جبکہ انیہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مما! انیہ اور شاہ میر کبھی نہیں۔ اگر اتنے پارہ پیلنے کے باوجود بھی۔“ نفوس میری جانب متوجہ نہیں ہو سکتی تھیں اسے انیہ کا بھی نہیں ہونے دلا لی۔ ”وہا گلوں کی طرح بول رہی تھی۔ اور انیہ نے تواتر کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

علیزے۔! یہ اس کی وہ ہم راز دوست جیسی۔ من جس سے اس نے سگی بہنوں سے زیادہ پیار کیا۔ اس پر بھروسا کیا۔ اس پر اعتبار کیا اور آن جو ہی اس کی خوشیوں کے سچ کا سب سے بڑا گائمانی تھی۔

”میں انیہ سے ابھی اور اسی وقت نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔ تو علیزے ایک دم حیر ہو گئی۔ وہ بے چینی سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھی پھر تقریباً ”بھائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔“ ماما بھی حیران رہ گئیں۔ پھر بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ سیر۔ سیر!“ کہتے ہوئے انہوں نے میر کو آواز لگائی لن کی تو اس نے ہی وہ دھاڑا چلا آیا۔

”جی ماما۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں جو قائل دی تھی وہ لے آؤ۔“ انہوں نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا تا وہیں مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قائل کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ ”یہ لیں۔“ اس نے قائل ماما کی جانب بڑھائی۔ انہوں نے قائل تمام لی۔ شاہ میر ابھی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں تم دونوں کا نکاح ابھی اور اسی وقت کروا دوں گی اور عزت سے انیہ کو تمہارے ساتھ رخصت کروں گی۔ مگر۔“ وہ رگیں اور انیہ کی طرف دیکھا وہ بھی ابھی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”انیہ کو لن پیچہ ز پر سائن کرنے ہوں گے۔“ انہوں نے قائل بھیل پر رکھی۔

”کیا ہے ان پیچہ زس؟“ شاہ میر نے پوچھا۔ ”شیر نے اپنی ساری جائیداد اپنی وصیت میں انیہ کے نام کی تھی۔ بس انیہ کو ان پیچہ ز پر سائن کرنے ہیں۔“

”لن پیچہ ز میں کیا لکھا ہے۔“ شاہ میر نے اپنا سوال دہرایا۔

”یہی کہ انیہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کرتی ہے۔“ انہوں نے اپنا آخری موہو پیچہ لکھا۔ ”مما! آپ ایسے کیوں کر رہی ہیں۔“ اب کی بار ساد بولی۔

”انمانہ بندر کھوسا۔“ ماما نے اسے ڈپٹا۔ ”نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ شاہ میر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

انیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ماما کے پاس آکر قائل چھٹی اور چین کھول کر پانگلوں کی طرح دھڑا دھڑ سائن کرنے لگی۔

”انیہ۔“ شاہ میر بولا۔ مگر وہ سائن کر چکی تھی۔ سائن کرنے کے بعد اس نے قائل ماما کی گود میں چھٹی۔

”یہ لیں کر لے سائن۔ اتنے پارہ پیلنے سے اچھا تھا کہ آپ مجھے ایک دفعہ کہیں تو میں بھی انکار نہ کرتی۔ اس طرح میرا مذاق تو نہ بناتا تھا۔ آپ کی وجہ سے میری زندگی برباد ہو جاتی۔ یہی مقصد تھا میں میری دلاور سے شادی کروانے کا۔“ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میں نکاح کا بندوبست کرتی ہوں۔“ کتا کہہ کر ماما کمرے سے نکل گئیں۔ ساد بھی وہیں سے ہٹ گئی۔ ”تمہیں سائن نہیں کرنے چاہیے تھے۔“ شاہ میر

”میری بھی تمہارے ہارے میں یہی رائے ہے۔ تم بروقت اسی چیز کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لیے میں بھی تمہاری چیز کو سمجھ نہ سکی۔ خیر وہ جیسی بھی ہے، میری بہن ہے۔“ سارا افسروگی سے بولی۔

”لب کہاں ہے۔“ انیہ نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہے، نام متا رہی ہے اپنی ہار کا۔“ سارا ناگ بھوں چڑھا کر بولی۔

”اور ولاد۔“

”وہ۔۔۔ وہ تو چلے گئے۔ ان کا کام جو ہو گیا۔“ سارا نے کہا۔

”کام۔۔۔ کیا کام۔“ وہ بولی۔

”انہیں تم سے زیادہ تمہاری برابری میں اثر سٹ تھا۔ وہ ماما کے نام ہو گئی۔ سمجھوان کا کام ہو گیا۔“

”ایک بات پوچھوں سارا۔“ کچھ یاد آنے پر وہ بولی۔

”ہاں پوچھو۔“ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”شاہ میر کو تم نے فون کیا تھا؟“ اس کی بات من کر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”ہاں میں نے فون کیا تھا۔“

”تم، تو یا نا مانو انیہ! سارا تم سے بہت پار کرتی ہے۔“ وہ اس کے گالوں پر چٹکی کھٹکتے ہوئے بولی۔ انیہ کے لیوں پر مسکراہٹ کھڑی۔

سب سے پہلے کے بعد وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھے ہی شاہ میر نے گاڑی اشارت کر دی تمام راستے گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے پارکنگ سٹاٹ میں پارک کی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی رہی۔ لفٹ کے ذریعے وہ تیسرے فلور پر پہنچے۔ وہ اسے ایک شاندار کمرے میں لے آیا۔

”ہم کچھ دن بیس رکیں گے۔ پھر واپس باسکو چلے جائیں گے۔“ اس نے کہا۔ انیہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔

”تم پہنچ کر لو۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر وہ واش روم میں گھس گیا۔ انیہ نے لفٹ کی

بولی۔

”مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے شاہ میر! جو میری زندگی برباد کرنے کی وجہ بنے۔ ساری فسلو کی جڑیہ دولت ہی تو تھی۔“ وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولی۔

جبکہ شاہ میر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

پھر سب کچھ افراتفری کے عالم میں ہوا۔ سارا نے اسے جلدی سے تیار کر دیا۔ ریڈ اور سلور کلر کا خوب صورت فرائگ اس پر کٹائی جاتا تھا۔ ہلکے پھلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

نکلنا ہوا اور وہ انیہ شہیر احمد سے انیہ شاہ میر مرتضیٰ بن گئی۔ نکلنا میں شاہیر ان کے بزرگ بھی شامل تھے۔ نکلنا کے بعد وہ سارا کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

جب سارا نے اسے پکارا۔

”انیہ! کیا سوچ رہی ہو۔“ وہ اس کے کپڑے لوہ ضروری سامان پیک کر رہی تھی۔ ایسی کچھ دیر بعد ہی اس کی رخصتی ہوتی تھی۔

”علیٰ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا سارا؟“

وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”وہ ایسی ہی ہے انیہ! خود غرض، مطلب پرست اور خالص۔“ سارا بولی۔

”نہیں سارا! وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ میری دوست، میری بہن۔ میرے سکھ دکھ کی سا مگی۔“ کہتے ہوئے اس کا گلا رندہ گیا۔

”تم واقعی میں اتنی بھولی ہو یا ناک کر رہی ہو۔“ سارا اس کی طرف جیسے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں انیہ! اٹھلی تمہاری نہیں ہے۔ تم بہت سادہ ہو۔ علیٰ نے کی چالاکیوں کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکیں۔ وہ شروع سے ہی تم سے حسد کرتی تھی۔“ سارا نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”خیر سمجھ تو میں کبھی تمہیں بھی نہیں سکی۔“ انیہ نے سارا سے کہا۔

وہ یوں۔ فون ابھی بھی بج رہا تھا۔ اب وہ فون کی جانب متوجہ ہوا اور لیس کاٹن پریس کرنا پالکونی کی طرف چلا گیا۔ جبکہ انیہ کی آنکھوں میں نمی درنگی۔

شام میں ولید اور حنا آئے۔ شاہ میر نے انہیں فون کر کے بلایا تھا اور اپنے اور انیہ کے نکاح کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ کچھ ناراض بھی تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ دونوں ہوٹل میں رہ رہے ہیں۔ شاہ میر نے بات سنبھال لی۔ وہ لوگ رات کا کھانا کھانے کے بعد چلے گئے۔

شاہ میر کا رویہ اس کے ساتھ ویسے کاویسا ہی تھا۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتا اور اس سے کھپا کھپا رہتا اور اکثر اسے ڈانٹ بھی دیتا۔ انیہ کے لیے اس کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔

اگلے دن شام کی فلائٹ سے اسے لور انیہ کو پاسکو چلے جانا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سوچا ہاں سے مل لے۔ اس نے ہاں کو فون کیا اور گھر کے قریبی ریستورنٹ میں ملنے کو کہا۔

انیہ دیکھ کر وہ ساکت رہ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکی تھیں۔

اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں نمی لور ہوٹلوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شاہ میر بھی آگے بڑھ کر ان سے گرم جوشی سے ملا۔

”کیسی ہیں آپ۔“

”جہمیں دیکھ لیا ہے ہاں تو ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

شاہ میر نے انہیں بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ”مجھے تو کہیں سے بھی ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”کیا کروں بیٹا! بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

”اپنا خیال رکھا کریں اپنے لیے نہ سہی میرے لیے ہی سہی۔“ وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے

سانس بھری پھر آہستہ آہستہ چلتی ڈور تک نبھل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور اپنے زیورات اتارنے لگی۔ کپڑے سمجھ کر کے وہ جیسے ہی باہر آئی۔ وہ ڈور تک نبھل کے سامنے کھڑا تو لیے سے اپنے ہاں تنگ کر رہا تھا۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ڈر اوپر ہو جائے گی تم سو جائو۔“ کتنی کہہ کر اس نے تو لیا صوفے پر پھینکا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر چلا گیا۔ انیہ خالی خالی نظروں سے سامنے دروازے کو دیکھتی رہی۔ ہاں سے وہ گیا تھا۔

شام کی پہلی رات ایسا کیا کام آن پڑا کہ بندہ اپنی دلہن کی بھی پروا نہ کرے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

ان ہی سوچوں کے تسلسل میں کھوئے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے ہاتھی نہ چلا۔ صبح چھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور بیڈ پر پڑا وہ پٹا جلدی سے گلے میں ڈالا۔ اس کی نظر سامنے صوفے پر پڑی۔ وہ صوفے پر سو رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اترتی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس چلی آئی۔

وہ سو رہا تھا۔ سوتے ہوئے وہ اسے اتنا اچھا لگا کہ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ وہ کافی دیر تک کئی ہاندھے اسے دیکھتی رہی۔

اسی وقت نبھل برور کھا شاہ میر کا فون بجنے لگا۔ اس نے گردن تھما کر نبھل برور کھا فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر ٹیٹا کا نام جھلکا رہا تھا۔ انیہ کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ لیس کاٹن پریس کرتی۔ کسی نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھینا۔ انیہ نے رخ موڑ کر دیکھا۔ شاہ میر غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے موبائل کو ہاتھ لگانے کی۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ہا۔۔۔ میں۔“

”جسٹ شٹ اپ! آئندہ میرے فون کو ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔“

”جلدی سے تیار ہو جاؤ میں تمہیں سارہ کے پاس
چھوڑ دوں۔ دو گھنٹے بعد پھر وہیں سے ایئر پورٹ چلیں
گے۔“ شاہ میر نے کہا تو وہ لہکتے میں سر ہلاتے ہوئے
تیار ہونے لگی۔

”اے بابا کے گھر کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ
خاموشی سے اندر آگئی۔ سارہ اسے لان میں ہی مل گئی

”اور سائیں گھر میں سب کیسے ہیں۔“ شاہ میر نے
پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔ قاطرہ کی چھ مہینے پہلے شادی کی
ہے۔ عائشہ کی بھی منگنی ملے ہو گئی ہے۔“

”ابھی۔! ایسی ہو۔ کب آئیں شاہ میر بھائی کے
ساتھ آئی ہو۔ کہاں ہیں وہ؟“ اس نے اس سے ملنے
ہی کئی سوال کر ڈالے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ آئی
ہوں۔ وہ چلے گئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر تک آئیں
گے۔“ انہی نے رسوائیت سے جواب دیا۔

”بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“ اب وہ اسے اوپر سے
بچے تک دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ میرے سے مسکرائی۔
”آؤ اندر چلے ہیں۔“ وہ اسے اندر لے آئی۔ ملاؤنج

”اور بیلا۔“ شاہ میر نے پوچھا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ پہلے کی طرح نہیں رہے۔ حساب
وہ کافی کمزور ہو گئے ہیں۔“ وہ انسو کی سے بولیں۔

”خیر تمہارا انہی کیسی ہے۔“ انہوں نے ننگو کارخ
اس کی جانب موڑا۔

”ٹھیک ہے۔ وہ میں نے پچھلے جسے نکاح کر لیا۔“
اس نے کہا تو فضیلت تب تک ہلکا ہوا گئیں۔

”تم نے۔ نکاح کر لیا اور مجھے اب بتا رہے ہو۔“
وہ بولیں۔

”حالات ہی ایسے ہو گئے تھے میں کیا کرتا۔“ وہ
بولتا۔

”اب تم آگئی ہو میں تو آج میں تمہیں نہیں جانے
داں گی۔“ سارہ جھک کر بولی۔

”نہیں سارہ! میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔“
دیکھیں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”آج شام چھ بجے کی ملائٹ ہے ہماری۔“ انہی نے
دو میرے سے کہا۔

”تم جا رہی ہو؟“ سارہ نے یقینی سے بولی۔

”ہاں۔“ انہی نے کہا۔ اسی وقت ممانی دی ملاؤنج
میں داخل ہوئیں اور اسے دیکھ کر خشکیں۔

”السلام علیکم! انہی نے کہا۔

”وعلیکم السلام! وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولیں۔

”کیسی ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

”پہلے سے مت اچھی۔“ وہ طنز سے انداز میں بولی۔

”شاہ میر نہیں آیا۔“ وہ دوبارہ بولیں۔

”جیسے وہ یہاں آنا پسند نہیں کریں۔“ انہی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھا کر جانا۔ میں چلتی ہوں۔“

”کیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔“ وہ نا اچھی سے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

جواب میں شاہ میر نے ساری بات ان کے گوش
گزار کر دی۔

”اب کہاں ہے وہ۔“ ساری بات سننے کے بعد
بولیں۔

”ہوٹل میں ہے کل چلے جائیں گے۔“ شاہ میر
نے کہا۔

”اس کا خیال رکھنا شاہ میر۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔
کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

”میں کچھ کھانے کو منگوا آتا ہوں۔“ شاہ میر کہہ کر
اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے آنسو روکنے کی
کوشش کر رہی ہیں۔ آج وہ ایک سال وہاں تین دن
بعد ملا تھا۔ اگلی دفعہ پتا نہیں کب ملے گا یا شاید ملے گا
بھی یا نہیں۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے جلدی جلدی پتنگ کی۔

الگ کرنے کے لیے۔ مگر نہیں کہہ سکتی تھی۔ مجھے معاف کر دو انیہ! میں بہت گرجتی تھی۔" علیزے روتے ہوئے کہتا۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی علیزے کبھی نہیں۔" انیہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی اور علیزے کو بو نہی روٹا چھوڑ کر باہر آئی۔

تھوڑی دیر بعد شاہ میر آ گیا اور وہ سارہ سے مل کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

"ارے اتنی جلدی کیا ہے۔ شاہ میر بھائی کو اندر تو آئے دو۔" سارہ نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو دیکھ کر کہا۔ شاہ میر مسکراتے ہوئے باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ انیہ فوراً بولی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ چلتے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"انیہ! ہم ماما کی باتوں کا برا مت مانو، وہ تو ایسے ہی"

"سارہ پلیز۔ میں اب اس بارے میں مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ شاہ میر نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔

"چلیں۔" وہ شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے گاڑی اشارت کر دی۔

"کیا بات ہے، پریشان لگ رہی ہو؟" انیہ کے اثرات ہی ایسے تھے کہ وہ پوچھتا نہ رہتا۔

"ماما نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔ شاہ میر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

چلتے ہوئے بھی وہ اسے علیزے کے بارے میں نہیں بتا سکی۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔ شاہ میر نے گاڑی ایک سائڈ پر روکی اور اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیا بات ہے انیہ۔" وہ اس کی طرف مڑ کر بولا۔ "کچھ نہیں۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"انیہ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

وہ اس کے رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ شاہ میر آئے دلاؤ گا۔" میں جا رہی ہوں۔" انیہ نے کہا۔ وہ ایک نظر اس پر ڈالتی وہاں سے چلی گئیں۔

"میں ذرا علیزے سے مل لوں۔" انیہ سارہ سے کہتی علیزے کے کمرے کی جانب بڑھی جبکہ سارہ رنگ بھری نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کمرے کی بلاٹ آن کی۔ کمرہ روشنیوں سے نما گیا۔ علیزے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"بلاٹ آف کرو، سارہ اب مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی۔" وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔

"آنکھیں کھولو علیزے! مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔" اس کی بات سن کر علیزے نے آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ کتنی دیر وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔

"انیہ! وہ بولی۔

سرخ اور پیلے رنگ کا خوب صورت سوٹ زیب تن کیے ایسے لیے رہی۔ لٹھی پیل اپنے کندھے پر ڈال رکھے تھے۔ بلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ علیزے کو اس سے حسد محسوس ہوا۔

"انیہ شاہ میر مرتضیٰ۔" انیہ اس کے پاس آ کر بولی۔

"تو تم نے اسے پا ہی لیا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میں نے اسے نہیں پایا، اللہ نے اسے میری قسمت میں لکھ دیا تھا۔" انیہ اب اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا علیزے۔" انیہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"تو میں کیا کرتی محبت کرنے لگی تھی میں شاہ میر سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ میں محبت کو شش کی تم دونوں کو ایک دوسرے سے

فریش ہو کر باہر آئی تو کچن کا رخ کیا۔ جلدی جلدی
ناشتہ تیار کیا۔ سب کچھ تیار کرنے کے بعد وہ کمرے
میں واپس آئی۔ وہ دونوں ابھی تک مزے سے سو رہے
تھے۔

”شہا میرا حیدر اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔“ وہ اونچی
آواز میں بولی۔

”حیدر! بیٹا اٹھ جاؤ اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ
اب حیدر کو اٹھا رہی تھی۔ وہ کسسا تاہوا اٹھ بیٹھا۔

”شہا! اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔“ ما
آپ کے کپڑے نکالتی ہیں۔“

وہ اسے بیڈ سے نیچے اٹار کر دواش روم کی جانب
دھکیلتے ہوئے بولی۔

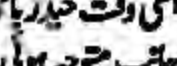
”شہا میرا اب آپ بھی اٹھ جائیں ورنہ آفس کے
لیے دیر ہو جائیے گی۔“ وہ الماری سے کپڑے نکل کر
صوفے پر رکھتی اب اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ اور
آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”شہا میرا آپ لیٹ ہو رہے ہیں۔ اٹھ جائیں۔“ وہ
اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی۔ وہ کسصلیا اور
آکھیں مسلا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”دل تو کر رہا ہے آج چھٹی کر لوں۔“ وہ اس کا ہاتھ
پکڑتے ہوئے بولا۔

”ابھی بتاتی ہوں آپ کو جلدی سے تیار ہو جائیں۔
میں ناشتہ میبل پر لگاتی ہوں۔“ وہ خود کو اس سے چھڑائی
اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت حیدر ہاتھ روم سے باہر
نکلا۔ انہی اس کی جانب متوجہ ہوئی اور اسے جلدی
جلدی تیار کرنے لگی۔

اسے تیار کر کے وہ ڈائننگ روم میں لے آئی اور
ناشتہ میبل پر لگانے لگی۔ ساتی دیر میں شاہ میر بھی وہاں آ
گیا اور آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔



رات کے کھانے کے بعد جب وہ کچن صاف کر کے
کمرے میں واپس آئی تو شاہ میر جاگ رہا تھا۔

”آپ ابھی تک سوئے نہیں۔“ انہی اندر آتے

”آج وہ گھر بہت اجنبی لگ رہا تھا اور اس گھر کے افراد
ایسے ملے جیسے میرا ان سے کوئی رشتہ ہی نہیں۔“ وہ
کہتے ہوئے رو دی۔

شاہ میر نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف
کیے۔ ”کیا کرتی ہو لڑکی! بد رو کر آکھیں سچا لیتی ہو۔“

وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
”آپ تو مجھ سے ناراض تھے ہیں۔“ وہ اسے حیرت
سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں مراب نہیں ہوں۔“ وہ مسکراہٹ دباتے
ہوئے بولا۔

”اور جو رویہ پچھلے ایک ہفتے سے میرے ساتھ تھا۔
اس کا کیا۔“ وہ ٹھکی سے بولی۔

”وہ۔۔۔ تم نے پورا ایک سہل میرا ناک میں دم کیے
رکھا۔ اب میرا بھی تو تنگ کرنا ہوتا ہے۔“

وہ اس کے چہرے پر جمو لٹی لٹ کو کانوں کے پیچھے
اڑتے ہوئے بولا۔

”لیٹ ہو رہے ہیں۔“ وہ دیر سے بولی۔
”کیا۔“ وہ چونکا۔

”ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ وہ زور سے بولی۔ وہ
سیدھا ہو کر بیٹھا۔ انہی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے
رخ کھڑکی کی جانب موڑا۔



دسمبر کی ایک خوب صورت صبح تھی۔ سفید روئی
جیسے ہلاؤں کی اوٹ سے آج خلاف توقع سورج چمک
رہا تھا اور ماسکو کی برف کو پگھلانے کی ناکام کوشش کر رہا
تھا۔

سائیڈ میبل پر رکھا الارم بج چکا تھا۔ بجنے کا اعلان کر
رہا تھا۔ انہی نے ہاتھ بوجھا کر الارم بند کیا اور جمہی
لتی اٹھ بیٹھی اس نے ایک مسکراتی نظر اپنے دائیں
طرف سوئے شاہ میر اور حیدر پر ڈالی وہ نوبل سوتے
ہوئے بہت کیوٹ لگ رہے تھے۔ ان سے نظریں ہٹا
کر وہ بیڈ سے اترتی۔

میر شہزادہ گیل۔
 ”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔“ وہ اس کے
 سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جبکہ شاہ میر گری سوچ
 میں گم تھا۔



ڈور بیل کی تواز پر ڈسٹنگ کرتے اس کے ہاتھ
 رک گئے انہی نے دروازے کی طرف دیکھا۔
 پارہنچ رہے تھے۔ شاہ میر اس لور حیدر اسکول گیا
 ہوا تھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ سوچتے ہوئے اس
 نے دروازہ کھولا۔ سامنے کور پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس
 نے ایک لیٹر اس کی طرف پھرایا۔ اس نے ابھی
 نظروں سے لیٹر لیا اور اس کے لیے ہوئے پیر پر سامن
 کر کے اندر آگئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے لیٹر
 کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ اور پاکستان کی سرگلی تھی۔
 بے چینی سے لفافہ چاک کر کے خط باہر نکالا اور اسے
 کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

ڈیر انیہ!
 کیسی ہو؟ امید ہے کہ تم شاہ میر کے ساتھ اچھی
 زندگی بسر کر رہی ہو گی۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے
 تمہارے گھر کا ایڈریس کیسے ملا لور میں نے یہ خط
 تمہیں کیوں بھیجا؟

تو میں بتائے دیتی ہوں کہ میں نے حنا کے ذریعے یہ
 ایڈریس حاصل کیا۔ گزشتہ روز وہ مجھے کلینک میں ملی
 تھی۔ میں تمہیں فون بائی میل بھی کر سکتی تھی مگر
 مجھے بھی درست لگا۔

انیہ! میں نے یہ خط تمہیں یہ جاننے کے لیے لکھا
 ہے کہ انیہ تمہاری بیوی کی سب سے بڑی کتاب گار
 میں ہو۔ وہ میں ہی تھی جس نے تمہیں اغوا کر لیا۔ وہ
 میں ہی تھی جس نے تمہیں برباد کرنے ہی کوئی کسر
 نہیں چھوڑی۔

مجھے نہیں پتا سب سن کر تم بھی مجھے معاف کرو گی
 بھی کہ نہیں اس سب میں فراز کا کوئی قصور نہیں تھا۔
 میں نے اسے مجبور کیا تھا۔ وہ سارا کو پسند کرتا تھا۔ میں

بولی۔
 ”میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر
 بولا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔
 ”کیوں کوئی خاص بات تھی۔“

”نہیں بس یونہی تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا
 تھا۔“ وہ اکتا ہوا اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس
 کی اس حرکت پر وہ دیر سے سے مسکرا دی۔ وہ اکثر
 ایسے ہی کرتا تھا۔

”انیہ تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔“ کچھ یاد آنے
 پر بولا۔

”پوچھیں۔“ وہ اسی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ
 چلاتے ہوئے سن انداز میں بولی۔

”یاد ہے جب تم عمر کی شادی پر حویلی گئی تھیں۔“
 شاہ میر نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں۔“ وہ دیر سے سے مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کو دیکھنے آپ سے ملنے کی امید لے کر۔“ وہ
 کھل کر مسکرائی۔ مگر شاہ میر ابھی نظروں سے اسے
 دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں تو وہاں نہیں تھا۔“
 ”جانتی ہوں بد قسمتی سے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”انیہ! فراز نے تم سے کیا کہا تھا۔“ شاہ میر کی اگلی
 بات سن کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس کے
 تاثرات دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ انیہ خاموشی سے اس کا
 چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”انیہ! اجنا اس دن تمہاری فراز سے کیا بات ہوئی
 تھی۔“

”شاہ میر! فراز نے کہا تھا کہ میں۔ میں تمہاری
 زندگی سے چلی جاؤں۔ کیونکہ وہ اپنی بہن کی خوشیاں
 چاہتا ہے۔ زرد گل شاہ میر کو پسند کرتی ہے لور اگر میں
 نے اس کی بات نہ مانی تو وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ تمہیں مار دے
 گا۔“ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

”تم نے اس کی کون سی بات نہ مانی۔“ تھوڑی دیر
 بعد بولا۔

”میں کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔“ شاہ

علیٰ زے شبیر
خط پڑھنے کے بعد انہی خالی خالی نظروں سے
سامنے دیکھنے لگی۔ دل ٹوٹا، رونادھونایا اس کے لیے
کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر آج اتنے سال بعد وہ پھر
وہیں آکر کھڑی ہو گئی جس جدھر سے وہ چلی گئی۔ اس کی
آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ قطرو۔

مواصل کی آواز پر اس کے کام کرتے ہاتھ رک
گئے اس نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈسٹنگ
کے کپڑے پر ڈالی اور دوسری نظروں پر پھر کپڑے صوفے
پر رکھ کر فون کی جانب متوجہ ہوئی۔ اسکرین پر حاکام
جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے بس کاٹن دہاتے ہوئے فون کلن
سے لگایا۔

”ہیلو حاک! وہ فون لے کر صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
دوسری طرف جو کچھ حاک نے اسے کہا اس کے رونے
کڑے ہو گئے۔

فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ کتنی
دیر وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر
جلدی سے زمین سے مواصل اٹھایا اور شاہ میر کو فون
ملا یا، جوڑی پر بعد فون اٹھایا گیا۔

”ہیلو انیہ! وہ دوسری طرف سے شاہ میر بولا۔
”شاہ میر! اس کی کواڑ سن کر اس کی آنکھوں
میں نمی اور آنی اور ٹھارندہ گیا۔

”انیہ! کیا ہوا۔“ وہ گہرا گیا۔
”شاہ میر! آپ کہاں ہیں۔“ وہ اس کے سوال کو نظر
انداز کرتے ہوئے بولی۔

”آفس میں۔“ وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔
”شاہ میر! آپ جہاں بھی ہیں پلیز جلدی مگر
آئیں۔“

”انیہ مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔“ وہ پرسٹن لہجے میں
بولا۔

”شاہ میر! آپ گھر آئیں پھر بات کرتے ہیں۔“ انکا
کہہ کر انیہ نے فون بند کر دیا۔

وہ ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ گاڑی

نے اسے بلیک میل کیا کہ اگر وہ میرا یہ کام نہیں کرے
گا تو میں اسے سارہ کی نظروں سے گرانے میں کوئی کسر
نہیں چھوڑوں گی اور دوسری طرف یہ اس کی بہن کی
زندگی کا سوال تھا۔ اگر تم شاہ میر کی جان چھوڑ دیتیں تو
زر گل آسانی سے شاہ میر سے شادی کر لیتی۔

چارو ناچار وہ مان گیا۔ تمہارے اغوا کے بعد میرا کام
ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں تمہیں مار ڈالنا چاہتی تھی۔

اور جب یہ بات فراز کو بتا چلی تو وہ ڈر گیا اس نے کہا کہ وہ
شاہ میر کو سبقت دے گا۔ لیکن ہی دونوں شاہ میر کو اس پر
شک ہوئے لگا اور میرے مجبور کرنے پر اس نے
تمہیں بچا دیا۔

انیہ! میں جانتی ہوں یہ سب سن کر تمہیں مجھ سے
نظرت محسوس ہو رہی ہوگی۔ اور ہونی بھی چاہیے میں
بہت بری ہوں۔ میں نے خود کو پس منظر میں چھپا کر
میں احمدین کر فراز کا استعمال کیا۔

اور آج میں اپنے کیے کی سزا بگڑ رہی ہوں۔ مجھے
بلڈ کینسر ہے اور میں جانتی ہوں مجھے تب تک موت
نہیں آئے گی جب تک تم مجھے معاف نہیں کر گئی۔
کرنا بھی مت میں بہت بری ہوں۔ مجھے سزا ملنی

چاہیے۔
مگر قرآن! انیہ! اس کو معاف کر دو۔ اس کا قصور
صرف اتنا ہے کہ وہ میری بلیک میلنگ میں آ گیا۔ مجھے

نہیں پتا کہ تمہیں سارہ نے فراز کے بارے میں بتایا کہ
نہیں۔ وہ فراز کو پسند کرتی تھی۔ مگر اپنے کام میں
کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے فراز کے پرانے
الٹوڑ کے سارے قصے سارہ کے آگے رکھ دیے۔

اور ہاں اس راست میں نے ہی شاہ میر کو غنڈوں سے
پٹا لیا تھا۔

انیہ! میری تم سے ایک التجا ہے کہ انیہ پلیز صرف
ایک دفعہ واپس آؤ۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملنا
میں۔ میں جب تم سے معافی مانگوں تو تم مجھے دھتکار دو
میں دھاڑیں مار کر روؤں مگر تم مجھے معاف نہ کرو۔
میں اس لائق نہیں کہ مجھے معاف کیا جاسکے۔

نقط

لاک کر کے وہ دروازے تک آیا۔ دروازہ اوہ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی وہی لاؤنج خالی تھا۔ وہ اوہراوہر نظریں دوڑاتا کرے میں آیا۔

سامنے ہی انیہ سوٹ کیس میں اناری سے کپڑے نکال کر رکھ رہی تھی۔

”انیہ۔ یہ۔ یہ کیا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ حیرت سے چیروں کا جائزہ لیتا اس تک آیا۔

”ہم نہیں صرف آپ جا رہے ہیں۔“ وہ کپڑے تہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔

”کہاں۔“ وہ ناگھنے والے انداز میں بولا۔

”پاکستان۔“ وہ سکون سے بولی۔

”پاکستان۔“ حیرت سے بولا۔

”مگر کہاں۔“

”شاہ میرا موموں جان کی نبیحت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”کیوں کیا ہوا۔“ وہ پریشانی سے بولا۔

”فلاج کا انیک ہوا ہے۔“ اس کی بات سن کر وہ کتنی دیر خاموش رہا۔

”شاہ میرا پلیر وہ آپ کے پاپا ہیں ان کی حالت اتنی خراب ہے کیا آپ ان کا حال پوچھنے بھی نہیں

جائیں گے؟“ وہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔

کتنی دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھا رہا۔ انیہ نے اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر بیک بیک کہا۔

”تو تم اور حیدر۔ میرا مطلب ہے تم لوگ بھی چلو؟“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”چلے تو جلتے مگر۔ ایمر جنسی میں مجھے شام کی فلائٹ میں صرف ایک سیٹ ملی ہے۔ میں نے سوچا۔

آپ چلے جائیں۔ کیونکہ آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ اور رہی بات میری اور حیدر کی تو دو تین

دن تک ہم بھی آجائیں گے۔“ وہ اسے ساری تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

شاہ میرے لبات میں سر ہلا دیا۔

ایرپورٹ پر اسے ولید ریویو کرنے آیا۔ اس سے

ملنے کے بعد وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

”ہوں۔ اب جتاؤ گھر چلنا۔ یہاں پہلے ہسپتال۔“ ولید نے پوچھا۔

”ہسپتال۔“ شاہ میرا سنجیدگی سے بولا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ ہسپتال کے سامنے تھے۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے اور قدم پر بھائے۔ ولید نے ایک نظر شاہ میرا پر ڈالا وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے تھے۔“

”کچھ خاص نہیں۔ پاپا کی حالت کے بارے میں اور گھروالوں کے رویے کے بارے میں۔“ کتے ہوئے وہ

مڑا تو سامنے تپا لبا کھڑے تھے۔ ان کی نظر بھی اس پر پڑی مگر شاید پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے ہی اماں کھڑی تھیں۔ وہاں تک آیا۔

”شاہ میرا!“ کتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئیں۔ زر گل، عائشہ، طاہرہ، عمر، عثمان، تپا،

تانی سب حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اماں اس کے گلے لگی بے آواز رہی تھیں۔ شاہ

میرے انہیں خود سے الگ کیا اور ان کے آنسو صاف کیے۔

”پاپا۔ ک۔ کہاں ہیں۔“ وہ انک کر بولا۔ اماں نے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ شاہ میرے سر ہلا دیا۔

اور اپنی آنکھوں میں در آنے والی نمی صاف کر کے آگے بڑھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں پڑے وجود پر پڑی۔

”آٹھ سال۔ آٹھ سال کا عمر۔ کم نہیں ہوا اتنا اور ضد کی جنگ اب کنزور پڑی تھی۔“

آہٹ محسوس کر کے پاپا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ کافی کنزور اور تار لگ رہے تھے۔ چہرے پر غمناک مٹاری تھی۔

شاہ میرا ان کے پاس کھڑا حیدر کی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”ش۔ شاہ۔ میرا۔“ انہوں نے بمشکل بولنے کی کوشش کی۔

”پاپا! وہ میرے سے رندھی تو ازش بولا۔
 لن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شاہ میرے
 ہاتھ آگے بڑھا کر ان کے آنسو صاف کیے اور لن کے
 پاس اسٹبل پر بیٹھ گیا۔

وہ کافی دیر اسپتال میں رہا۔ لیاں، عائشہ، فاطمہ کے
 علاوہ اس نے کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کی کوشش
 نہیں کی۔

ڈاکٹر سے ملنے کے بعد وہ ولید کے ہمراہ اس کے گھر
 چلا گیا۔ حویلی جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حنا
 نے اس کا پوچھنا استقبال کیا۔ کھانے کے بعد وہ آرام
 کی غرض سے کمرے میں جا کر سو گیا۔

اگلے دن بھی وہ اسپتال میں رہا۔ بس ماں، بہنوں
 کے ساتھ رہتا۔ پاپا تو اپنی بیماری کے باعث بات نہیں
 کراتے۔ البتہ جب شاہ میرے لن کی بیماری کی وجہ
 پوچھی تو انہاں نے بتایا کہ

”انہیں فراز نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا کہ جو کچھ
 بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں پھر اس کے
 بعد وہ اندر ہی اندر کھلتے لگے اور آج وہ اس حال کو پہنچ
 گئے ہیں۔“ ماں سے نظریں ہٹا کر اس نے سامنے
 سوتے اپنے باپ پر ڈالیں۔

”سب کچھ جاننے کے بعد انہیں بس یہی فکر
 کھائے جا رہی تھی کہ تمہارا سامنا کیسے کریں گے۔“
 جواب اب عائشہ نے دیا۔ اس نے مڑ کر عائشہ کو
 دیکھا۔

فاطمہ، عائشہ، ان دونوں کی شلوی ہو چکی تھی۔
 فاطمہ کے تین، عائشہ کے دو بچے تھے جبکہ گل عین کی
 منگنی ہوئی تھی۔

”شاہ میر جو کچھ بھی ہوا۔ اس کے ذمہ دار ہم سب
 ہیں۔ پلیز ہمیں معاف کر دو۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی
 ہے ہم سے۔ ہم نے تمہارے اور انہی کے ساتھ بالکل
 اچھا نہیں کیا۔“ لیا ابا ہاتھ جوڑے اس کے سامنے
 گھڑے تھے۔ شاہ میر بے اختیار اٹھ کر لن کے پاس آیا

اور ان کے ہنڈھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔
 ”تایا ابا پلیز ایہ سب کر کے مجھے شرمندہ نہ
 کریں۔“ کتے ہوئے خود پر قابو پاتا وہاں سے ہٹ
 گیا۔

انیہ اور حیدر بھی پاکستان پہنچ چکے تھے اور آج پاپا
 نے ڈسچارج ہو جانا تھا۔ وہ انیہ اور حیدر کو لے کر
 اسپتال گیا۔ تھا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ جب وہ انیہ اور
 حیدر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ سب حیرت سے
 انہیں دیکھ رہے تھے۔

”السلام علیکم! انیہ نے برا حکم انداز میں سب کو
 سلام کیا۔ تایا، تائی، عمر بھائی، عثمان، فاطمہ، عائشہ وہ
 سب سے مل رہی تھی۔

”لہاں ایہ حیدر ہے آپ کا پوتہ۔“ شاہ میر حیدر کو
 لن سے ملواتے ہوئے بولا۔ فضیلت بیگم نے
 مسکراتے ہوئے اسے پیار کیا۔ اب انیہ اور شاہ میر پاپا
 کی جانب متوجہ ہوئے۔

”ناموں۔ انیہ آگے بڑھ کر ان کے گلے جا لگی۔
 ”پاپا! یہ کون ہیں۔“ حیدر شاہ میر کا باندہلا کر پاپا کی
 جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شاہ میر نے ایک نظر اپنے باپ کو اور پھر انیہ کی
 جانب دیکھا۔

”تھامیں مل پاپا۔“ حیدر ایک دفعہ بھر بولا۔
 ”بیٹا! یہ آپ کے دواوا ابو ہیں۔“ شاہ میر نے کہا۔
 ”واؤ گریڈ فلور۔“ وہ مزے سے بولا۔ پاپا آگے
 بڑھے اور حیدر کو پیار کیا۔

”کیا آپ اب ہمارے ساتھ رہیں گے۔ جس طرح
 اسد، سعد کے گریڈ فلور ان کے ساتھ رہتے ہیں۔“ وہ
 معصومانہ انداز میں بولا۔ انیہ نے اسے خاموش رہنے کا
 اشارہ کیا اور شاہ میر کی طرف دیکھا۔

”ش۔ ش۔ شاہ میر۔“ پاپا کی آواز سن کر وہ ان کی
 طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ لن

کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔

”تاہم ناراض ہو۔“ وہ اٹک اٹک کر بولے۔

”بالکل نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی ساری ناراضی اگلے شکوے سب اڑ چھو گئے۔

”تو پھر گ۔ مگر چلو۔“ انہوں نے ہشکل جملہ کھل کیا۔ شاہ میر نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں۔ ابھی نہیں۔“ اس کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئے۔

”بعد میں آئیں گا۔“ انہیں یوں دیکھ کر وہ فوراً بولا۔

”بے شک۔“ ان کی آنکھوں میں جگنو اتر گئے۔

”نیک۔“ وہ مسکرا کر رال اور باقی سب سے مل کر انہی کے ہمراہ وہاں سے واپس آ گیا۔

”ابھی اتم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ وہ اس وقت ٹی وی لائن میں بیٹھی میگزین الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ جب حائل نے معنی خیزی سے کہا۔

”مجھ سے ملنے۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”ہاں۔“ حائل نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون آیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ڈراٹنگ روم میں ہے جاؤ دیکھ لو۔“ وہ کندھے اچکا کر کہتی وہاں سے چلی گئی تو انہی اٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور قدم ڈراٹنگ روم کی جانب بڑھاتے جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔

وہ علیحدے تھی اور جس حال میں تھی انہی نے بے اختیار نظریں چرائیں۔ لیٹن کے سوٹ میں اس کا جسم ڈھانچہ لگ رہا تھا گندی رنگت کل سیاہ ہو گئی تھی اس کے سر پر زخموں کے نشان تھے اور چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔

”کیسی ہو۔“ علیحدے نے پہل کی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہی کئی دیر بعد بولی۔

”تم بھی سوچ رہی ہو گی تل کہ میں اب یہاں کیا لینے آئی ہوں؟“ اس کی بات پر انہی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”بہت بوجھ ہے مجھ پر انہی لہو ہلکا کرنے آئی ہوں۔“ وہ رندھی آواز میں بولی۔

”میں جانتی ہوں انہی! میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا۔ وہ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ تمہیں لذت، تکلیف دی۔ میں نے تمہارا اعتماد توڑا۔ تمہارا دل دکھایا۔ میں نے وہ کیا۔ جو ایک دشمن بھی نہیں کرتا۔“

”پلیز علیحدے! اب پرانی باتیں مت دہراؤ ان سب کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔“

انہی سنجیدگی سے بولی۔

”اتنی آسانی سے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں اتنی آسانی سے۔“ لٹا کہہ کر انہی چپ ہو گئی۔

”سما کی لذت ہو گئی ہے انہی۔“ اس کی بات پر انہی چونک کر مڑی اور کئی دیر اسے دیکھتی رہی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے۔ علیحدے نے کچھ کفذات ٹھیل پر رکھے۔

”یہ برائیاں کے کفذات تمہاری لذت۔“ لٹا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

وہ تین دن بعد ماہ کا فلان آیا۔ وہ انہیں گھر آنے کا کہہ رہی تھیں۔

وہ تینوں حویلی کے گیٹ کے سامنے تھے۔ شاہ میر نے ہارن دیا۔ چونک کر اٹھ اٹھا ہوا گیا اور گیٹ کھولا۔ شاہ میر نے گاڑی پورچ میں روکی وہ انہی اور حیدر گاڑی سے نکلے۔

اب وہ تینوں داخلی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہی دروازہ تھا۔ جہاں سے کبھی اسے دھکے دے کر نکالا گیا تھا۔ تب کسی نے اس کی بات نہیں سنی

تھی۔
 نیوی لائن میں سب لوگ موجود تھے اور اسے ہی
 دیکھ رہے تھے۔

اس دن بھی تو یہ سب ہی مل کر اس کا تماشا دیکھ
 رہے تھے۔ دل سے ہوک اٹھی۔ ایک پل کے لیے
 اس کو دل چاہا کہ یہاں سے ہٹا جائے۔ وہ اندر داخل
 ہوا تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ شاہ میر
 حیرت سے حویلی کو دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ ویسے گاویسا
 تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ شاید وہ بدل گیا تھا۔ اس نے
 سوچا۔ سب نے ان کا بہت اچھے طریقے سے استقبال
 کیا۔ ان سب میں فراز نہیں تھا اس نے عائشہ سے
 پوچھا۔

”عائشہ! فراز۔“ اس نے اس بیٹھی عائشہ کا
 کندھا ہلایا۔ جو حیدر کو بھرا کر رہی تھی۔

”جب شاہ میر نے انہی کو فراز اور اس کے ساتھیوں
 کے چنگل سے بچایا تو فراز نے ڈر کے مارے گھر والوں
 کے سامنے سارا الزام شاہ میر پر لگادیا۔

اپنے حقد میں کامیاب نہ ہونے کی صورت میں
 علیحدگی نے سارا غصہ فراز پر نکالا اور سارہ کو اس سے
 بدگمان کر دیا۔ سارہ نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ
 دن بعد وہی سسی کسر گل خان نے نکل دی۔ اس نے
 سب کچھ بتایا اور ابو کو بتا دیا۔

انہوں نے اسے گھر سے نکل دیا اور فراز اس کے
 دل میں جلنے کیا آیا وہ بجانے کہاں چلا گیا اس کے
 بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔“

آج خان ہاؤس کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ پوری
 حویلی دکن کی طرح تھی تھی۔ دونوں ماسوں پر جوش
 انداز میں اوجھروا کر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے
 تھے عثمان، عمر، رحمان (عائشہ کے شوہر) انتظام
 سنبھال رہے تھے۔ لان میں مندی کی رسم تھی۔
 گانے اونچی آواز میں بج رہے تھے۔ لڑکیوں کو بھولک بجا
 رہی تھیں۔ آج گل نین کی شادی تھی۔

”عائشہ گل! انہی کہاں ہے۔“ وہ اس وقت بیک
 شلوار ٹیسی میں بلبوس تھا۔ عائشہ نے ایک نظر اپنے

بھائی پر ڈال کر اسے مسکرائی۔
 ”اپنے کمرے میں ہے۔“ وہ فوراً کمرے کی جانب
 بڑھا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک
 دم ٹھنکا۔

لائٹ پنک کمر کے شرارے پر مل کر کی ٹیسی
 جس پر خوب صورت کام تھا۔ سب تن کیسے۔ اپنے لیے
 سیاہ بال اپنی پشت پر پھیلائے، ہلکے میک اپ میں وہ
 بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسے اپنی نظروں
 کے حصار میں لیتا آگے بڑھا۔

”تمہارا کیا کر رہی ہو؟“
 ”میں۔ تیار ہو رہی تھی۔“ وہ اپنے کانوں میں
 جھمکے ڈالتے ہوئے بولی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر اس
 کے ہاتھ سے جھمکا لیا اور اس کے قریب آیا۔ انہی
 سٹیپل۔

”میں کر رہی گی۔“ وہ منمنائی۔ شاہ میر نے جھمکا اس
 کے گلن میں ڈالا۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ وہ دھیرے
 سے بولا۔

”شاہ میر۔“ انہی اپنے آپ کو چمکاتے ہوئے
 بولی۔

”اور۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”ورنہ رو رہی ہے۔“ اس کی ہات پر اس نے سٹیپل کر
 بیڈ پر لیٹی ورنہ کو دکھا۔ انہی مسکرائی ہوئی۔ ورنہ کی
 جانب لپکی اور اسے اپنی گود میں بھر لیا۔

”پاپا اگر آپ کو ماما سے فرمت مل گئی ہے تو پلیز
 نیچے آجائیں۔ دادا ابو بلا رہے ہیں۔“ حیدر کمرے میں
 داخل ہوتے ہوئے بولا۔ شاہ میر نے حیرت سے انہی کو
 دیکھا۔

”میں آتا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔
 ”اوکے ماما میں ورنہ کو لے جاؤں۔“ حیدر نے
 معصومیت سے کہا۔

”ہاں یہ لو۔“ اس نے ورنہ کو اس کی گود میں دیا تو وہ
 اسے لے کر باہر نکل گیا۔

”اب آپ بھی جائیں۔ ماما بلا رہے ہیں۔“

تمہ "شاہ میر وہاں سے چلا گیا۔ زرگل دھندلی نظروں سے اے جانے دیکھ رہی تھی۔
 سامنے ہی شاہ میر انیسے سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ پاس ہی حیدر وردہ کو پار کر رہا تھا۔ زرگل نے رشک بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ یہی وہ انیسے چاہے جانے کے لائق تھا۔

انیسے نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔
 "تم بہت بری ہو انیسے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔
 "جب بھی میں وہاں گئے لگتا ہوں تو تم ہمیشہ میرا موڈ خراب کر دیتی ہو۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"پلیز شاہ میر آپ جائیں۔ ساموں۔"
 "خاموش۔ بالکل خاموش۔" وہ اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور زرگل اندر داخل ہوئی۔ انیسے کڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔

"اے سوری۔" آئی ایم ریٹی سوری۔" وہ شرمندہ ہوئی۔ جبکہ شاہ میر نے غصے سے اسے دیکھا۔
 "آؤ زرگل۔" انیسے اسے گھورتی زرگل کی جانب متوجہ ہوئی۔

"وہ۔۔۔ وردہ نیچے رو رہی ہے اور امی کہہ رہی ہیں پھولوں کے زیور کھل رکھے ہیں۔" اس نے کہا۔
 "ہاں وہ فرج میں رکھے ہیں۔ تم لے لے۔" اس نے کہا۔
 وردہ کو دیکھ لوں "کتنے ہوئے انیسے پاہر کھل گئی۔ جبکہ زرگل جھجکتے ہوئے بیڈ روم کی جانب بڑھی۔
 وہ پھول لے کر جانے ہی لگی تھی کہ شاہ میر نے اسے روکا۔

"زرگل! تم نے شادی سے انکار کیوں کیا؟"
 پچھلے ہفتے زرگل کا رشتہ آیا تھا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ یہ سب اسے انیسے نے بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ شاہ میر زرگل سے بات کرے اور اسے شادی کے لیے رضامند کرے۔

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ رندھی تو اس میں بولی۔

"زرگل! شادی کر لو۔ یہ ایک دوست اپنی دوست سے کہہ رہا ہے۔" زرگل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 بیک کمر کی شلووار قمیص میں وہ بہت زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو زرگل، فراز کی وجہ سے تمہارا پلے ہی بہت پریشان ہیں ایسے میں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

500/-	آحد ہاں	بہا ناول
750/-	ماحت عینی	زردھوم
500/-	رضانہ رضوان	زندگی اک روشنی
200/-	رضانہ رضوان	خوشبو کا کوئی گھر نہیں
500/-	شازیہ چوہدری	شہرول کے دروازے
250/-	شازیہ چوہدری	تیرے نام کی شہرت
450/-	آسیہ مرزا	دل ایک شہزادوں
500/-	فاطمہ مختار	آنکھوں کا شہر
600/-	فاطمہ مختار	بہول بھالیاں تیری گلیاں
250/-	فاطمہ مختار	بھلاں دے دنگ کالے
300/-	فاطمہ مختار	بھگیاں بھگیاں
200/-	فراز مزج	بھیاں سے گھرت
350/-	آسیہ ذاتی	دل سے لاشعور لایا
200/-	آسیہ ذاتی	کھرا ہا کیمیا خواب
250/-	فوزیہ یاسین	دھم دھم جی سیماں سے
200/-	شری سید	ملاں کا چاند
500/-	الٹاں آفریدی	رنگ خوشبو ناول

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
 32216381

دلالت

— ۹ —

نور اور آخری قیامت

موت کی سائیس نہیں ہوا کرتی پھر بھی وہ زندگی کی لو پھونک مار کر بجا رہنے کا اختیار بحکم خدا اپنے اختیار میں رکھتی ہے۔

اس کے شہر پر یہ پھونکیں تیز آندھیوں کی طرح چلیں اور افواں جبارہ ہمارا کرنے والا کے ہاتھوں اس نے اپنے قلعے کو چھان سمیت مندم ہوتے دکھا۔

اور پھر یوں چشمہ اندھ پوش ہوئیں۔ ساعتیں منزل شہر میں۔ اور وہاں نے ماتم زلف کی جو کھنٹیں جا تھیں۔

”سراور مرزا۔“ زندگی ہو لفظ ہے۔

سیکوریٹی فورس نے امرتہ کی طرف یکدم بلخاری اور وہ اس کے گرد اپنی ڈینٹس شیلڈز لیے دائرے میں کھڑے ہو گئے اور وہ سرے کچھ کھڑے کچھ کھنٹوں پر

یوں جیسے امیر شہر چپن بری کھڑا ہوا اور زہر بچھے نیندوں نے اس کے شہر کی زندہ سانسیوں کو مال کیفیت کی طرح لوٹا شروع کر دیا ہو۔

”مگر حیات۔“ پر آگ کے کولے برسائے جانے لگے اور خاتمے کی راگھ آگ کی پتوں میں دیکھنی کھنٹیں ہو۔

”امیر شہر سڑک پر اپنا جہاں تھے دیکھ رہا ہے۔“



پوزیشن لیے ریڈی گولیاں فائر کرنے لگے جبکہ وہ اس طرف ایسے استہوار رہا جیسے اب وقت آخر تک یہ ہی حکم اس پر مقرر تھا۔

شوریک دم دھماکوں کی صورت پھٹا۔ انسانی ہستی کے گولے نے کشش کا قتل الٹ دیا اور برازیلہ اسٹیڈیم زمین سے پہلے اٹھا اور پھر ہر چیز اپنی حد بندی سے نکل جانے کے لیے اپنی حدود کی تاقربان ہوئی اور عمارتیں اور لوگ بے وزن ہونے لگے۔ پھول اور درخت۔ جمیلیں اور آبشاریں۔ سبزے اور خطے کہ زمین سے اٹھنے لگے۔ بیماریاں اور نفس۔ لاپتیلیں اور فاختاں۔ خوشبوئیں اور میوے بھی پیچھے نہ رہے۔

”اور اے ابن الوقت! کن دو لفظوں کی حقیقت مجھ پر اب کھلی۔“

”مر“ یار کا ہونا اور ”مرن“ اس کا نہ ہونا۔

اپنے ہی جسم کے جلنے کی ٹیڑھا نسل اس کے منتھوں میں گھسنے لگی۔ حرکت کرنے کے لیے جو طاقت درکار تھی وہ اس کے دائرہ اختیار میں نہ تھی۔ کامل ”دورا“ یا سہلی اس طرف اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ اس طرف سامنے امرد کے پاس تھے جو شدت تکلیف میں ہوگی یا تکلیف سے میرا ہو چکی ہوگی۔

الہام اس کے کانوں میں پھونکے مارنے لگے اور پیش گوئی کی زبانیں نکل آئیں۔

سائرن بجائی ایسولینس آئی۔ سیکورٹی فورس نے اب جیسے دینک دھاوا بول دیا اور سڑک سے جوم ایسے چھٹنے لگا جیسے وہ سب اسی ایک سانچے کے انتظار میں تھے جو عالیان پر گزر چکا تھا۔ پہلی کاپڑ پرواز کر رہے تھے ایسولینسز اور رضاکار تیزی سے حرکت میں آچکے تھے فورس سڑک پر اور اطراف میں جاں کی طرح پھیل گئی۔ دو الہکار دور سے عالیان پر بھلکتے ہوئے چلائے پھر ایک چلائے ہوئے اس کے قریب آیا اور جھک کر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا کر کھینٹنے لگا۔ ساتھ وہ تیز آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اتنی افراتفری میں اس نے ذرا کی ذرا رک کر جھک کر اسے دکھا اور

جو تک گیا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ اس نے پوچھا۔

ایسولینس اب جا رہی تھی۔ اور وہ اس کے قریب سے گزر گئی۔ منتھوں سے ہوا اس کے اندر اترنے لگی۔ امیر شمر نے اپنی ہتھیالیوں کو خالی پایا جیسے ابتدائے وقت سے اٹھا ہجر واصل کی دھرتی پر قیام گاہ بنا تا ابدت کی مشعلوں سے روشن ”شہر“ جڑ گیا۔

”تو امرد چلی گئی۔ یا جا رہی ہے۔ یا چلی جائے گی۔“

دل نے دھڑکنیں مستعار لیں انسانوں نے زندگی کو الہجائیہ صدا دی اور اس کے بچنے میں سیکورٹی الہکار نے اسے ایک محفوظ حصے کی طرف اچھل سادیا اور تیز آواز میں ایک سمت چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ سیکورٹی الہکار کے بتائے اشارے کے مخالف سمت بھاگا اور راستے میں آنے والے سیکورٹی الہکاروں کو

دھکیلا اور پھلا پھلا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سڑک سرخ تھی اور کلچ کی بوتلیں ٹوٹی ہوئی بکھری پڑی تھیں اور خون کے پھیننے کلچ پر جمع تھے۔ اس بار تین چار الہکار اس کی طرف لپکے کہ اسے اٹھا کر کیس پمپنگ دیں کہ وہ تیزی سے ان سے نکل آتا ہو اس جگہ پر جھک کر بیٹھ گیا اور خون پر اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

”اور سن اسے شہزادوں کی ملکہ! اس میں ذرا وقت نہ لگا اور میں تم ہو گیا اور تم ہی رہ گیا۔“

لور اس کے آنسو اس خون پر گرے جو امرد کا تھا۔ الہکاروں نے اسے کوئی ضدی عجیب و غریب حرکتیں کرنے والا فین سمجھ کر گردن بازو اور کار سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے دور لے جانے لگے۔



جب اسے ایسے سڑک سے دور لے جایا جا رہا تھا تو سائل نے پیچھے سے چلا کر اس کا نام لیا۔

”کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں کہاں تھے تم؟“

مرین آسمان کو اور یہ دکھنا ایسا دکھنا ہو گیا جیسے خدا تک جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔
 ”وہ زندہ ہے ناسائی؟“ فاطمے سے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اس نے کچھ وقت بہت جمع کرنے کے لیے لیا اور پھر پوچھا ایسے جیسے اس نے سر پر وہ قہل اٹھا رکھا ہو جس کے سب سے ہی چرخہ بچھ سکے ہوں اور صرف ایک ایسے جل رہا ہو جو بچھ جانے کے قریب ہی ہو۔

”آؤ اسپتال چلیں عالیان!“ سائی اس کے قریب آچکا تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کے بھیکے بھیکے گل صاف کر رہا تھا۔

”خدا کے لیے بتاؤ سائی!“
 ”اسے کچھ نہیں ہو گا عالیان!“ اس نے عالیان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر محبت سے ان پر دباؤ ڈال کر کہا جو کہنا ضروری تھا۔ پر امید رہنے کے لیے بہت ضروری۔
 ”اسے کچھ نہیں ہوا۔ یہ کہہ دو خدا کے لیے۔“

سائی اس کی طرف بھاگا آیا اور الٹکار کو اپنا یونیورسٹی کارڈ دکھایا۔ الٹکار نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور تیز تیز یہ کہہ کر چلا گیا کہ جلد سے جلد اپنی جائے رہائش کی طرف چلے جائیں۔ اس دوران عالیان سہم کر سائی کو دیکھ رہا تھا اور پھر وہ سائی سے الگ آگے تیز تیز چلنے لگا۔ سائی کے لیے عالیان کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔
 ”عالیان!“ سائی چلایا اور اس کے پیچھے لڑکا۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟“ اس کی طرف تیز چال میں بڑھتے ہوئے سائی نے ہانپ کر کہا۔ ان چند منٹوں کی بھاگ دوڑ میں وہ بری طرح سے تھک چکا تھا۔

”یہ اب مجھے بتائے گا کہ امرتھ کے ساتھ کیا ہوا؟“ عالیان بھانٹنے لگا۔ اس نے سوچا اور چاہا کہ بس اب وہ دنیا میں کہیں جا چھے کہ اسے معلوم ہو سکے اور نہ کوئی اسے بتا سکے کہ امرتھ میں گئی۔ وہ کبھی اس خبر کی بے پروائی نہیں کر سکے گا۔ وہ کبھی اس کی آنکھوں کے بند ہو جانے کو اپنی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا۔ کبھی نہیں۔

”عالیان تم اسپتال جا رہے ہو؟“ اس کے رد عمل سے عاجز سائی چلایا۔ اس کے کچھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ عالیان کر کیا رہا ہے۔ یا پھر یہ اپنا دائمی توازن کھو چکا ہے۔
 عالیان نے رفتار تیز کر دی۔ اپنے ہنڈے مافی توازن کی تصدیق کر دی۔ سائی نے جیسے بھانپ لیا۔ اس کا دل بھر آیا اور رندھی ہوئی توازن وہ چلایا۔
 ”اسٹریچ پر لے جاتے ہوئے اس نے تمہارا نام لیا تھا۔“

خود کو آگے لے جاتا، سڑک کو پیچھے چھوڑتا عالیان رک گیا۔ ہجوم، سیکورٹی فورس، اسٹیڈیم، انفراتفری، آنسو گیس، سب پیچھے رہ گئے تھے البتہ شور اپنی موجودگی کی گولٹھی ابھی بھی دے رہا تھا۔ سیکورٹی فورس کی گاڑیاں، ایسبولینس، فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔
 اس نے پلٹ کر سائی کو دیکھا، پھر شجر ستاروں سے

دوبلہ ہنس کا علاج کرنا

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

• ہنس کے ہنسنے سے روکنا اور نئے نئے ہنسوں کو روکنا
 • ہنسوں کو روکنا اور نئے ہنسوں کو روکنا
 • ہنسوں کو روکنا اور نئے ہنسوں کو روکنا

قیمت 90/- روپے

بڑی بوتلی 250/- روپے
 چھوٹی بوتلی 350/- روپے

32216361

اس نے اپنے ہاتھ چھڑوا کر سلتی کو شانوں سے تھام کر
چھوڑا۔

”پلیز کہہ دو۔“ کھڑے رہنے کی طاقت پھر سے
ختم ہونے لگی اور وہ کھڑے رہنے سے معذور ہو کر
جانے پر مجبور ہو گیا۔ سلتی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا اور
اس کے گل کو شفقت سے چھوا۔

”او عالمیان! ہم خدا سے دعا کریں۔“

تھوڑی دیر ان کے درمیان خاموشی رہی جیسے
انہونی کی چلاب پر کان بوجھنے جا رہے ہوں۔

”آہ۔ ہم امرد کے پاس چلیں۔“ سلتی نے کہا
جس پر عالمیان نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھنے کا یہ
انداز امید کی کرن کھوجنے جیسا تھا۔

کیا روم کے مصوروں نے ”عشق عیاں“ کے
ساتھ تھے بنائے اپنے شاہکاروں پر سیاہ دوات انڈیل
دیں، جبکہ اس کے وجد ان نے سنگ دلی کو آنکھوں پر
بٹھائے اور رحم دلی کو بالائے طاق رکھتے اپنے مرتب
سوالنامے میں سے پہلا سوال اس پر اٹھا اور وہ بلبل
اٹھا۔

”کیا الہامی اور بقی حکم کی بجا آوری کے لیے
رازداری اور پوشیدگی سے بچ پھرتے؟“ دو سرے نے
پہلے وجد ان کو بات دی۔

”نور کیا جلد و فرات میں جو اٹھانا اٹھا اور پریت کی
چوٹیاں سوگ میں اس لیے جھک آئیں کہ اتفاق نے
تمہاری دعاؤں کو الٹ دیا، کیونکہ انہوں نے ”بجریار“
کو مرتسم پایا۔ اور کیا سزا کے لیے تمہارا زندہ رہنا قائم
شرا اور مبارک ساعتوں کو بیشہ کے لیے رخصت
کر دیا گیا۔“

سلتی نے دیکھا کہ وہ سکتا جا رہا ہے جیسے مٹ
جانے کو ہے۔

”کیا ”بجریاراں“ پر رولوں سفید پارہیلی کشتیاں بس
ڈوب جانے کو ہوئیں، نور ”مشک آہو“ ”سک کافور“
”کافور“ ہوا۔



ہسپتال کے کوریدور میں کھڑے اس کی آنکھیں

ٹنک ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ کارل دیرا سلتی
اور پتی سب اس کے ارد گرد اس پاس کھڑے تھے۔
دیرا اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سلتا رہی
تھی۔ اس کے اپنے ہاتھ کنب رہے تھے اور وہ زندگی
میں پہلی بار کمزوری اور کم ہمتی کا شکار ہوئی تھی۔ ساری
انسانی طاقت ٹھیک اس جگہ بے بس ہو جاتی ہے جہاں
”ہوجا“ کا حکم لگ جاتا ہے۔

کارل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عالمیان سے ایسا
کیا کہے کہ وہ آرام سے کہیں بیٹھ جائے اور پالی کے دو
ٹھونٹ ہی لی لے دیوار کے ساتھ لگ کر وہ کب
تک ایسے ہی کھڑا رہتا چاہتا ہے جیسے ”آنے والوں“
اور ”جانے والوں“ کا راستہ روک لے گا۔

رات کے دو بجے کا وقت ہے۔ ان سب کو وہاں
کھڑے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ آپریشن ٹیبل پر
امرد کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ ورنی بول
کی دو ضربیں اس کے سر کے پچھلے حصے اور گردن سے
ذرا نیچے لگی تھیں۔ گولی اس کا بلیاں شانہ چھو کر گزری
تھی۔ وہ گولی اس کے دل اس کے سر اس کی آنکھ پر
لگتی، اگر بول کی ضرب سے وہ اپنا توازن کھو کر لڑکھڑانہ
بانی۔ چھو وہ ہیں مرجاتی۔

تھی ہی بار لڈی سر سادھنا، شارلٹ، مورمن فون
کر چکی تھیں، لیکن عالمیان نے کسی سے بھی بات
نہیں کی تھی۔ وہ بس خاموش کھڑا تھا۔ بچپن سے لے
کر اب تک کی زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم
رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا مارگرٹ کا انتظار
کر رہا ہے۔ مارگرٹ کو سکتے ہوئے من رہا ہے۔
کڈ سینٹر کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا رو رہا ہے۔ ملا
سر کے سینے سے لگا خود کو رونے سے روک رہا ہے۔ وہ
بتنا کچھ بھی دیکھ رہا تھا ان میں خود کو دکھوں میں گمراہی
دیکھ رہا تھا۔

پھر ان مناظر میں امرد آئی اور بار بار پلٹ کر آتی
رہی۔ خود پر اختیار رکھتے اس نے امرد کو آنکھوں
کے سامنے سے ہٹے نہیں دیا، کیونکہ اسے یہ خوش فہمی
لاجن ہوئی کہ ایسے وہ امرد کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور

یہ ایک خوش آئند عمل ہے۔ جبکہ اسی دوران جب جب اسے ملانار گریٹ نابوت میں آنکھیں بند کے نظر آئیں تو وہ سہم کر چونک چونک جاتا۔ اسے بد شکلوں جانتا اور فوراً نظر انداز کرتا۔

کابل اور ویرا کتنے ہی طریقوں سے ڈاکٹرز اور اسٹاف کی منت کر چکے تھے کہ انہیں دور سے امرجہ کو دیکھ لینے دیا جائے، لیکن انہیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ رات چار بجے کے قریب کابل دس منٹ کے لیے ایک سینئر ڈاکٹر کے آفس میں گیا اور صرف پانچ منٹ کی اجازت لے کر باہر آیا۔ عالیان کا ہاتھ پکڑ کر اسے آئی سی یو ڈیارٹمنٹ کے اندر کیا اور ایک نرس آگے اسے امرجہ کے کمرے کے سامنے شیشے کے اس طرف لے آئی۔

وہ امرجہ کو دیکھتا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی وہ یہ بہت کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا اور اسے اٹھانے کے لیے تیار بھی تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ کسی چلتے پھرتے انسان کو بے بسی سے زندگی اور موت کے بستر پر بے دیکھنا سب سے بدترین منظر ہوتا ہے۔ ایسے مناظر آئی تاب میں بے مثل ہوتے ہیں۔

اس نے ایک ہاتھ پھیلا کر شیشے پر رکھا اور پھر دوسرا دس انگلیوں کی جھریوں میں سے ایک جھری پر اپنی آنکھ رکھ دی اور دوسری آنکھ کو تین انگلیوں کی اوٹ میں بند ہی رکھا۔ نقشین اخرونی قد آدم آئینہ سے جو ارغوانی پوشاک میں بلبوس گھیر وار فرشی دامن کو گھنٹوں سے ذرا سا اوپر اٹھاتی امرجہ کو متکس کر رہا ہے شفاف روشنی گندم کی بالیوں کی طرح اس کے اوجھ گندھے بالوں میں جھوم رہی ہیں۔

ڈرٹین پریڈ سے پہلے وہ خواب دیکھتا تھا۔ زخموں میں جکزی اور مختلف مشینوں اور ٹیوبوں سے منسلک امرجہ کو اس نے دیکھا اور آنکھ بند کر لی۔ انگلی کی جھری سمیٹ لی، خواب کی کھڑکی کھول دی۔ "اس کے جوتے کا بکلا بند ہونے میں نہیں آ رہا اور اتنی گھیر وار پوشاک اسے الگ سے تنگ کر رہی ہے۔"

اس نے آنکھ کو کھولا اور اسے قطعاً نہیں سلا کہ وہ ٹھیک سے کام کرے۔ ایسے منظر کو دیکھنے کے لیے شفاف جینالی کی ضرورت بھی تھی بھلا۔

دونوں ہاتھوں سے اس نے گھنٹوں سے ارغوانی ریشم کو پکڑ کر اٹھا رکھا ہے اور وہ نیچے بیٹھ کر اس کے جوتے کا بکلا بند کر رہا ہے اور پھر سر اٹھا کر مسکرا کر اسے دیکھتا ہے۔

"تم سے اتنا سا کام بھی نہیں ہوتا؟" وہ کہہ رہا ہے۔ "مگر ہو جاتا تو تم یہ شرف کیسے حاصل کیا تے؟" آنکھیں تر بھی کر کے گردن کو لوہا سے ذرا اور اٹھا کر اس نے کہا۔

آنکھیں بند رکھے گردن سیدھی کیسے اس نے اب خاموش رہنا پسند کیا۔

اگر اسے اندر جانے کا موقع دیا جائے تو وہ آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور صرف ہاتھ سے چھو کر اسے محسوس کرے۔

تم نے یہ پینڈاٹ مجھ سے نہیں لیے تو میں نے یہاں باندھ دیے۔
"رک جاؤ۔"
"رک لو۔"

انگلیوں کی جھریاں اس نے پھر سمیٹ لیں اور اپنے جھکے ساروں اور بند آنکھوں اور اپنے اونچے قد کے ساتھ وہ ایک "دعا" میں ڈھلنے لگا۔

حزو توق کے گاؤں میں سفر جانے والوں کی بھیرت واپسی کے لیے چراغ دیپ محل میں رکھ دیے گئے اور پھر گاؤں بھر کی چونکیں چراغوں سے بج گئیں۔ اور اب وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کی لو میں دھیمی ہونے سے پہلے مسافر لوٹ آئیں گے۔ شیشے کی دیوار پر پھیلی ہتھیالیوں پر اس نے اپنا سر نکالا اور اس کا وجود "لو" میں بدلنے لگا اور دعا کے چراغوں میں جل جانے کو ہوا۔ جانے والوں کی راہ میں ایک ایک کر کے چراغ رکھے جانے لگے اور دور کھشاؤں کے جھوم کو چیرتی ان کی لو میں "عرش معلیٰ" پر سجدہ ریز ہونے کو بلانہ ہو میں۔

دعا میرا کلام ہے

اس پر میرا اختیار ہے۔

قبولیت اس کا "جمل" ہے۔

جو میرا خدا ہے جو میرا خدا ہے۔

اسے اب اس دعا سے ضروری کلام کوئی اور نہیں

تھا۔ اس کا ارتکاز بیرونی دنیا کی کوئی مداخلت نہیں توڑ

سکتی تھی۔

کارل نرس کے ساتھ آیا شاید نرس اسے شائستگی

سے کہہ کر اور اس کا شانہ ہلا ہلا کر تھک چکی تھی۔

کارل نے اسے شانوں سے تھلا اور باہر لے آیا۔ لیکن

دراصل وہ وہیں "سقام دعا" پر ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ کسی کو یہ

نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اپنی من پسند جگہ پر موجود ہونے

کے لیے وہاں ظاہراً موجود ہونا ضروری نہیں۔

کارل نے اسے ایک جگہ بٹھایا اور خود بھی ساتھ

بیٹھ گیا اور کتنی ہی دیر وہ اسے دکھاتا رہا شاید وہ پوچھتا

چاہتا تھا۔

"اتنی زیادہ محبت کرتے ہو تم امرجہ سے۔ اتنی کہ

مر رہے ہو اس کے لیے؟"

ذرا اور بیٹھے دیر اور سالی نے ایک دو سرے کی

طرف دیکھا۔ دیر اپنی ہتھیاریاں مسلتے لگی جو وہ نہیں

کیا کرتی تھی، لیکن اب وہ سب ہو گا جو پہلے کسی نہیں

ہوا تھا وہ اٹھ کر عالیان سے دور چلی گئی۔ اس کے لیے

مشکل تھا اسے ایسے دیکھنا کتنا کچھ زندگی میں ایک دم

سے مشکل ہو گیا تھا۔ جیسے گن گن کر سانس لینا۔

کوئی کارل سمیت ان سب سے پوچھتا اب تک کتنی

کتنی ہو چکی ہے۔

"سلو ہٹنا! کمرے کی کھڑکی کھول دو۔" نشست گاہ

میں بیٹھے انہوں نے کہا۔

"اتنی گھنٹہ میں؟"

"ہاں۔ کھول دو، بلکہ سب کھڑکیاں کھول دو۔"

"اب کو گھنٹہ لگ جائے گی۔"

"گھنٹہ لگ جائے کوئی غم نہ لگے۔" انہوں نے بڑی

دل گرفتاری سے کہا۔

دونوں کئی گھنٹوں سے خاموش نشست گاہ میں

بیٹھی تھیں۔ سلو ہٹنا نے اپنی عبادت کی تھی اور لیڈی

میر نے اپنی۔ اور دونوں نے ایک ہی انسان کے لیے

کتنی ہی دیر دعا میں کی تھیں۔ فون لائن کے پاس ہی

رکھے تھے اور جب کسی کوئی فون بجتا تھا تو دونوں ہی

اسے اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھیں۔

لیڈی میراچی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

آج بھیس بار بار صاف کرنے پر بھی خود بخود غم کیوں

ہو رہی ہیں اور ان کے ہاتھ پیر کیوں کلتے رہے ہیں۔

یہ سمجھ نہیں آ رہی۔ انہوں نے امرجہ کو فون کیا، لیکن

اس کا فون بند جا رہا تھا۔ انہوں نے خود ہی سوچ لیا کہ

بیچ دیکھ رہی ہوگی۔ موبائل کی چارجنگ ختم ہو چکی

ہوگی۔ چند گھنٹے انہوں نے مشکل سے گزارے۔ فون

پھر بھی بند ہی ملا۔ اٹھ کر نقل پڑھے دعا مانگی، لیکن دل

پر گہری ہوتی افسردگی کم نہیں ہوئی۔ بس ان کا دل

امرجہ میں ہی اٹکا تھا اور بس یہ ہی چاہت تھی کہ اس کی

آواز سن لیں۔ انہوں نے سلو ہٹنا کو فون کیا۔

"امرجہ فون نہیں اٹھا رہی تم دیر یا این کا نمبر دیا

سالی کا۔"

سادھنا جب ہو کر سوچنے لگی پھر کچھ دیر بعد بولی۔

"وہاں سلیٹرز کا مسئلہ ہے شاید۔ میں این لور ویرا کو

خود بھی فون کر رہی ہوں۔ کسی کا نمبر نہیں مل رہا۔ یہ

بچے پا کر جا کر لاہر ہوا ہو جائے ہیں۔ صوم پھر کرواپس

ہو مل آئیں گے تو خود ہی کر لیں گے۔" سلو ہٹنا نے

جھوٹ بولا۔

"بیچ تو کب کا ختم ہو چکا ہو گا۔"

"ہاں۔ پر سنا ہے بیچ کے بعد وہاں سڑکوں پر بڑا

مارچ ہوتا ہے۔ بیچ انگلینڈ جیت گیا ہے۔ تو

شاید۔" سادھنا کی زبان لڑکھڑاسی گئی۔

دنوا نے فون بند کر دیا۔ بی وی پر چلنے والی برازیلا

اسٹیڈیم میں ہونے والے تصادم کی چھوٹی سی خبر انہوں

لیتا، لیکن میں تو بے چارہ سا بوڑھا سا انسان ہوں۔
جلدی تھک جاتا ہوں۔“
آواز راست بنا کر آئی اور اسے چھو کر گزر گئی۔ وہ بارہ
پھر اس کے قریب سے گزری اور مٹ گئی۔ سڑکیں
ہمارے زینتی ٹکڑے، اجسام اور چیزیں اس کے
اطراف سے آریا ہونے لگیں۔

”مجھے دیر لگتے ہیں سپر اور روس کو تو تم جانتی ہی
ہوگی۔ میں اسی ملک کی سپر رگل ہوں۔ لیکن اس کا یہ
مطلب نہیں کہ تم مجھے دیویر کہو۔“

دیویر کی اشکال مختلف زاویوں میں بن کر بکھر گئیں۔
وہ سائیکل سے گر گئی ہے۔ ”تمہیں ہر حال میں
رہیں جیتی ہے، میری ایک ٹانگ ٹوٹ جائے یا تمہاری
دونوں۔“

زاویوں میں نئی اشکال نے اسے بھگا لیے جاتے
جل پر ہاتھ مارے، پر ہاتھ معلق ہی رہ گئے۔ سمت
نامعلوم کی طرف سفر جاری رہا۔ دیویر اکسین پیچھے رہ گئی۔
نئی اشکال بننے مٹنے لگیں۔ اس نے سالی کو دیکھا اور
کامل کے پاس سے گزری اور اسے ٹھنڈے برف سے
پانی میں ڈوبنے کا جن لیا، احساس ہوا، اس کا خون جم گیا
اور خاردار جل اس کے رخ گوشت میں گھسنے لگا۔ ٹھنڈ کا
احساس ہر طرف پھیل گیا۔ تکلیف حد سے سوا
ہو گئی۔ تیز روشنی اور گھپ تاریکی ہاتھ ملاتے اور
چھڑاتے رہے۔

وہ یونی میں کھڑی ایڑی کے بل کھوم رہی ہے۔
اس کے کانوں میں شرر بڑھ گیا، جیسے دھرتی پر موجود
سارے حشرات کرا رہے ہوں۔ اس کا سفر اور تیز
ہو گیا۔ دھڑا دھڑکنی اور گولے اس کی طرف اچھالے
گئے۔ کڑیوں نے اور پھرتیاں دکھائیں اور اس دوران
فرش سے اٹھتی عرش کی بلندیوں کو چھوئی ایک آواز
اس کی رخ حساسیت سے نگرانی اور خدا کی پہناہ میں اسے
جا سمیٹنے کو ہوئی۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہی ہے۔ کھرا رہی ہے۔
گر گئی ہے۔ خواب، در خیال، در خواب ہو گیا۔
آواز نے اس پار بلندیوں پر اور بلندیوں جمائیں اور

نے دیکھی نہیں تھی اور ان کے علاوہ گھر میں کسی کو
معلوم ہی نہیں تھا کہ امرجہ اس وقت برازیل میں
ہے۔ دونوں کے درمیان کے معاملات زیادہ تر دونوں
کے درمیان ہی رہتے تھے۔ وادا کو امرجہ کے علاوہ کسی
کی پروا نہیں ہوتی تھی اور امرجہ کو وادا کے علاوہ کسی
اور سے بات نہیں کرنی ہوتی تھی۔



مقام بے نام و نشان اور کھڑی کے سے جاہلوں میں
گمرنے کی کیفیت۔

خار و بار یک مار سے جاہلوں کو کاٹ کاٹ کر وہ عاجز
آچکی تھی۔ اندھیارے روشنی پر حملہ آور تھے اور
روشنی اندھیاروں سے پسپا۔ کبھی اس کے پیر سخت
زمن کو چھوتے اور کبھی وہ ڈگمگا جالی اور کبھی وہ بے
وزن شے کی طرح بے سمت تھرتی۔
لامرکل کی حالت تھی اور سز کا گمان۔

اس کے دونوں بازو بالخصوص بائیں بازو ایسے جل رہا
تھا جیسے وہاں دھکتے انگاریے رہا لیے گئے تھے۔ وہ تھک
پٹی تھی۔ اوب چکی تھی، لیکن جاں جیسے کاٹتے رہا
تھا۔ جتنی تیزی سے وہ کاٹی اتنی ہی تیزی سے وہ اور
نٹے چلے جاتے، جیسے لاکھوں کروڑوں کڑیوں کو وہاں
ٹانگ لگا کر بٹھا دیا گیا ہو۔ انہیں اس کی سزا کے لیے یہ
حکم دیا گیا ہو۔ اجالے سے منحرف اور تاریکی کے
وقار گولے اس پر دانے گئے اور اس کے سر کے پچھلے
حصے میں تکلیف اٹھی۔ نامعلوم اتھا گہرائیوں کے
دوسرے گولے بھی اس پر حاوی ہونے لگے۔ وقت کا
سلطان ”ابہام“ روپوشی سے نکل آیا۔

سب گنڈھ ہونے لگا اور جاہلوں نے یک دم اس کے
پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا اور اسے ایک سمت
ٹھینے لگے۔ اس کی ساری قوت ختم ہو گئی۔ اور خیال
عقل و ذہن سے ماورا ہو گیا۔ شبہات ابھرنے
لگیں۔ اشکال بننے لگیں اور اس کے راستے میں
آنے لگیں۔

”مگر میں جوان ہوتا تو تمہارے ساتھ کرکٹ کھیل

لے کہا ہو گا۔ پھر سے گہری نیند میں چلی گئی اور اگلی بار جب پلوں کے غلاف چلیوں سے اٹھائے تو بیڈ کے سامنے شیشے کی دیوار کے ار اسے کوئی کھڑا نظر آیا۔
 ”یہ کون ہے جو ایسے کھڑا ہے جیسے اس کا کوئی بیارا مر چکا ہے۔“

اسے یہ پہچاننے میں تھوڑا وقت لگا، کیونکہ وہ عالمیان تو تھا، لیکن عالمیان جیسا نہیں تھا تو یہ عالمیان ہے اور اس کا کون عزیز مر چکا ہے؟
 کیا بس۔ اگر وہ عزیز میں ہوں تو میں مر چکی ہوں یا دراصل اب ہی زندہ ہوئی ہوں اس نے سوت کو شش کی کہہ جاگی رہے، لیکن اس کا دل پھر سے سوتے لگا۔



اپنے دونوں ہاتھ اس نے شیشے پر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے اسے چھو رہا تھا۔ اسپتال کا اسٹاف اب اس سے عاجز آچکا تھا۔ وہ اسے آئی سی یو کے اس کمرے کی گلاس وال کے سامنے کھڑے رکھنے کے لیے مجبور ہو چکے تھے۔ وہ لڑکا تھک رہا تھا نہ ہٹ رہا تھا اور اس کے دوستوں نے بھی لن بر غیر معمولی دباؤ ڈال رکھا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکے کا دل کا کتنا تھا کہ آخر وہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی۔ اٹھ کر بیٹھ کیوں نہیں رہی۔ باتیں شائیں کیوں نہیں کر رہی اور اس کا یہ سوال بھی نہ سنا، ہم تھا کہ اتنا بڑا اسپتال جو ڈاکٹروں کی فوج سے بھرا پڑا ہے ایک ننھی سی لڑکی کو جلدی ٹھیک نہیں کیا رہا۔

ننھی سی لڑکی بیڈ پر لن سب سے انگ اکیلی لیٹی ہے۔ اس سب سے انجان کہ باہر کی دنیا میں لب کیا گیا ہو رہا ہے اور اس سے بھی انجان کہ اسے وہ کس کی دنیا مٹھی میں سمیٹے اسے کھڑا رکھے ہوئے ہے۔ یہ سزا اس نے اسے دی ہے یا اس نے خود اپنے لیے تجویز کی ہے۔

جس رات وہ ماما گرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا تھا تو دراصل وہ اس خوش فہمی میں بیٹھا تھا کہ ایسے اس کی ماما سے چھوڑ کر کیوں نہیں جائیں گی۔ پر

وہ عرش میں جائے کو ہوئی اور خط تقدیر سے کند تھر انٹ سے گزرتی صدائے ”آے خدا“ بلند سے بلند کرتی چلی گئی۔ بد نما دھاریوں سے آراستہ اور دلکشی سے انجان ”راہ بے ست“ پر ایک شیبہ بھری اور گزر گئی۔ وہ پھر ابھری اور مٹ گئی اور ایسا لاتعداد دیار ہوا۔

یہ کون ہے؟ خواب در خیال کی پسلی وہ بوجھ نہ سکی۔

شکل پھرتی، آواز پھر گونجی اور بد نما رگوں کی دھاریوں میں شفاف روشنی بصورت ”رضائے الہی“ آشیانہ فلک۔ مثل آفتاب طلوع ہونے کو ہوئی اور آخر کار وقت کی ملک ”رمز حقیقی“ نے آنکھیں کھول دیں۔

”مرحبا!“ شور برز گیا، آواز دب گئی، لیکن خواب در خیال کی پسلی اس نے بوجھ لی۔

”عالمیان!“ وہ بے بسی سے کراٹنے لگی اور شدت سے دونوں ہاتھ چلا کر جالوں کا جھٹکا چاک کر ڈالا۔ بد نما دھاریاں دائرے میں سمیٹنے لگیں اور دائرہ ”باب الاحیاء“ کی صورت اختیار کرنا چلا گیا۔

تاریکی نے نقاب اٹھایا۔
 چشمہ سیاہ نے چشمہ یار کو جا لیا۔
 جنت کا فرق خٹا چلا گیا۔

اسے ابن الوقت، آپل میں نے بوجھ لیا۔
 ”عرش معلنی“ پر کس دعائے جا سیدہ کیا۔
 آنکھ کھول کر وہ کھولے ہی رکھنے کی متحمل نہ ہو سکی۔

بہت دیر بعد جب اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہاں سامنے کوئی نہیں تھا۔ ایک نرس اور دو ڈاکٹرز اس کا چیک اپ کر رہے تھے۔ اس کی رپورٹس پڑھ رہے تھے۔ ڈسکس کر رہے تھے۔ اس کا پی پی چیک کرتے نرس نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کا کال جھنکا۔

”وقت تمہیں زندہ رکھے۔“ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں تم سے یہ کہہ دوں۔ وہ ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن صرف اس جملے کو ہی پہچان سکی اور اسے صرف یہ یاد رہ گیا کہ کس نے اسے یہ کہنے کے

وہاں سب خراب کاموں کی ذمہ دار تم ہو امرد! جب سالی آیا تو وہ سوئی جاگی کی تھی وہ اسے خاموشی سے دکھاتا رہا اور چلا گیا۔ این کے بعد پھر کارل آیا۔

”خدا تم سے پوچھے امرد۔ خود تو تم مزے سے بیڈ ریشی ہوئی ہو اور ہمیں تم نے باہر کھڑا کر رکھا ہے۔ باہر بیٹھنے کی جگہ تو بہت ہے، لیکن سونے کی نہیں اور میرے آس پاس کتنے ہی لوگ اپنی کھانے پینے کی چیزیں لیے کھوتے رہے اور میں نے کسی ایک پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا، بلکہ شرافت سے اپنے پیسوں سے لے کر کھاتا رہا، اگر تم چند اور گھنٹے اسی حالت میں رہیں تو مجھے خوف ہے کہ میں ایک فرشتہ صفت انسان بن جاؤں گا۔ مجھے فرشتہ بننے سے بچاؤ امرد!“

اور کھلتی بند ہوئی آنکھوں سے پریشان امرد ہیلی پار مسکرائی۔

”مگر تم فرشتے بن بھی گئے تو بھی فرشتوں کے شیطان ہی کہلائے جاؤ گے۔“ امرد نے سوچا۔

بہت لیاہ سوچنے کی اب ضرورت نہ رہی اور اس نے لیا کو فون کیا۔

”لیا، آپ ٹھیک کہتے تھے۔“ اس نے آواز میں گھبراؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ اس کے انداز سے چونک گئے۔ ”امرد ٹھیک سے نا؟“

”وہ ٹھیک ہو رہی ہے۔“

”تو تم کس بارے میں مجھے ٹھیک کہہ رہی ہو ویرا؟“

”کہ جو زیادہ عقل مند بنتے ہیں وہ کئی ایک ایسی بے وقوفی ضرور کر گزرتے ہیں جو ان کی ساری عقل و ذہانت پر قبضے لگاتی ہے۔“

”تو تم نے یہ بے وقوفی کی؟“ انہیں بات سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ وہ کس بے وقوفی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

”ہاں۔“ آواز کا گھبراؤ جاتا رہا اور اس کی آواز بھیگ گئی اور صرف اپنے باپ کے سامنے وہ رونے

وہ جلی گئیں۔ اتنا بڑا ہونے پر وہ اس کے سامنے اسی لیے کھڑے کہ وہ نہیں جانتیں کسے گی۔ مسئلہ پہلے بھی وہی تھا مسئلہ اب بھی وہی ہے۔ خوش فہمی کی نکل سب مجزے رونما کروانے کا دم بھرتی ہے اسے اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں اسے اس سے مطلب ہوتا ہے کیا ہونا چاہیے اور ضروری ہو جانا چاہیے۔

جب اکثر اس کا نفسی چیک اپ کر چکے تو وہ اندر صرف دو منٹ کے لیے جا رہا اور اس کے قریب جا کر اس کے راس ہاتھ کو آہستگی سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔

”خدا مجھ پر بہت مہربان ہے امرد۔ اور مجھے اس پر شک نہیں۔“

دو منٹ تک وہ اس کا ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ وہ آگے کھول نہیں پائی، لیکن ہمیشہ اس کی چاپ کی سنکر اس کی سماعت بازی لے گئی۔

”خدا مجھ پر بہت مہربان ہے امرد۔“

اس کے ہاتھ میں جو گرمی سرایت کر رہی تھی اور اس کے الفاظ میں جو ملامت تھی وہ لطیف رنگوں کی دھنک میں ڈھلتی اس کی ہتھیلی پر پھونٹیں اور اس کے پورے وجود پر بھر دھرتی شوق پتک پتک پھیل جانے کے سفر میں جھکا ہوئیں۔

”یار ہم۔ یار ہم۔“ کلام فارسی ریاضیوں کے ہجوم سے اٹھا۔

”اب دنیا میں کون سی نعمت اس کے بعد ہے جو مجھے عطا کی جائے گی۔“ اس نے سوچا۔

”یہ خواب ہے تو اس خواب کے نہ ٹوٹنے کی دعا ضرور کرنی چاہیے۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو اس حقیقت کے خواب نہ ہونے کی دعا میں بھی مجھ پر لازم ہے۔“

پتک پتک اور دقت گزر اور اس نے محسوس کیا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

”میں زندگی میں کبھی نہیں روئی اور تم نے مجھے رلا

لگی۔
 ”تمہیں خود کو مضبوط کرنا چاہیے۔“ جب وہ کالی
 دیر تک رو چکی تو انہوں نے کہا۔
 ”مجھے تکلیف اس بات سے ہے کہ میں انجان
 رہی اور مجھے انجان رکھا گیا۔“
 ”کیا تم اس سب پر تلخی سے آنسو بہاتے رہنا چاہتی
 ہو؟ اگر میں تمہیں جانتا ہوں تو شاید نہیں۔ دیر اس
 وقت تمہارا رد عمل ایک ایسے انسان کا سا ہونا چاہیے
 جو خود کو ایک طرف رکھ کر معاملات کو خوش اسلوبی سے
 سمجھنے کی طرف لے جاتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ
 تمہارے بارے میں یہ سوچا جائے کہ تم برف سی
 ٹھنڈی اور بے معنی ہو۔ تم میں جذبات کی وہ گرمی
 ہے ہی نہیں جس کی توقع ہم انسان ایک دوسرے سے
 کرتے ہیں۔“
 دیر اٹھ موٹی سے سختی رہی۔

نے مواصلاتی نظام ہلاک کر دیا ہے۔ دادا کو برازیل کا
 معلوم تھا نہ ہی برازیل کا۔ ان کے حکومتی معاملات
 کلا انہیں اپنے دل کا پتا تھا جس پر گھبراہٹ اور خوف
 طاری ہو، ہو جانا تھا۔ وہ سا دھنسا سے کئی بار کہہ چکے تھے
 کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اور جس وقت سا دھنسا کو
 یہ معلوم ہوا کہ امرتہ خطرے سے باہر ہے تو اس نے
 کہا۔
 ”سٹیڈیم میں چھوٹا سا ہنگامہ ہوا تھا لہذا کے
 درمیان۔ امرتہ ٹھوڑی سی زخمی ہو گئی ہے۔ خوف
 سے بے ہوش ہے۔“ اور اتنے جھوٹ کی آمیزش ہوا
 سچ سن کر بھی دلوا کو کھڑے رہنے کے لیے دیوار کا سہارا
 لیتا ہوا۔
 ”اور۔“
 ”امرتہ ٹھیک ہے وہ انہوں کے زیر اثر سو رہی
 ہے۔“

”تم نے ایک بار مذاق میں مجھ سے کہا کہ تم تجربات
 میں مجھ سے کہیں آگے نکل چکی ہو اور میں نے تم سے
 صرف اتنا کہا کہ انسان تجربات میں کیسا بھی ”آدم کل“
 کیوں نہ ہو جائے وہ کسی دوسرے انسان کے اندر کا
 بھید نہیں پاسکتا۔ مشکل سے چند ایک کا۔ ورنہ کسی
 کا بھی نہیں۔“ ان کی اس دوران عالیان سے ایک بار
 بات ہو چکی تھی اور یہ جاننے میں انہیں زیادہ وقت
 نہیں لگا کہ امرتہ جو دیر کی دوست ہے اور بقول دیر ”
 عالیان کی بھی دوست رہی ہے۔ وہ صرف دوست نہیں
 ہے۔“
 ”ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اور عالیان کا بھید امرتہ
 ہے۔“ اس بار وہ آواز سے روکنے لگی۔ اس لیے نہیں
 کہ اس پر بھید کھل گیا تھا صرف اس لیے کہ دیر سے
 کھلا تھا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم اب بھی جھوٹ بول
 رہی ہو۔“
 سا دھنسا جب کہ گئی۔ یہ سب جھوٹ وہ ان ہی کے
 لیے بول رہی تھی کہ وہ اتنی دور ہیں امرتہ سے زیادہ سچ
 ان کی جان پر برا صدمہ ثابت ہو گا۔
 دوسری طرف اسپتال میں موجود شاہ وزیر ماٹرنسٹی
 واپس جا چکا تھا۔ دیر کی رو سی تلفظ کی تیز انگش وادوا کو
 بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سالی کے چھوٹے
 چھوٹے ساہ۔ بلوں سے بھی وادوا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ تیز
 تیز اور مسلسل اور دیر لے جا رہے تھے جو سالی اور دیر
 کو سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔ دیر اور سالی کی جتنی بھی پار
 وادوا سے کبھی بات ہوئی تھی تو درمیان میں امرتہ نے
 مترجم کے فرائض انجام دیے تھے۔ وہ دونوں اشاروں
 سے انہیں پر سکون رہنے کے لیے کہہ رہے تھے۔
 لیکن سب بے کار جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی گیلی آکٹیں
 صاف کر رہے تھے اور ان سے ایک ہی بات کہہ رہے
 تھے۔ کہ انہیں فوراً ”امرتہ سے ملوایا جائے۔ سالی
 ٹیلیٹ عالیان کے پاس لایا۔“
 ”تم امرتہ کے دلوا سے بات کر لو، تمہیں اردو آتی

ہے۔ انہیں ہماری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“
آنکھیں مسل کر وہ ٹھہرے کر ایک پرسکون گوشے
میں بیٹھ گیا۔ گلے کو کھنکار کر تو آواز کو کچھ صاف کیا اور پھر
داوا کو سلام کیا اور کہا۔

”امردہ ٹھیک ہے۔ دوائیوں کے زیر اثر سوری
ہے۔ جلد ہی جاگ جائے گی۔ اسپتال کے روٹ سخت
ہیں، ہم ابھی اس کے پاس نہیں جاسکتے۔“ سہلی اسے
یہ ہی سب کہہ گیا تھا، گھنٹے کے لیے اور اس نے یہ ہی
کہہ دیا۔

داوا خاموش سے ہو گئے اور انہیں یہ معلوم کرنے
میں وقت نہ لگا کہ امردہ دراصل کتنی زخمی ہے جو
مخض اپنے انداز کو عام بنا کر یہ جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ
دوائیوں کے زیر اثر سوری ہے، وہ کس خاص غم پر
سوگ منانا لگتی ہو گئیں کا جاگا لگ رہا ہے۔

ایک ہی دکھ کو جھیلنے دو لوگ آمنے سامنے آ گئے۔
داوا کے خدشات کی تصدیق صرف عالیان کی طرف
دیکھ لینے سے ہی ہو گئی کہ امردہ کتنی زخمی ہو گئی ہوگی،
لیکن اب یہ جان کر بھی وہ ویسے زخمی نہیں ہوئے جیسے
کچھ دیر پہلے مختلف سوسوں کے ہاتھوں ہو رہے تھے۔
”وہ زخمی کیسے ہوئی؟ ایک دوسرے کو جب دو لوگ
خاموشی سے ٹکرم دے چکے تو داوا نے پوچھا۔“

”تو زخمی۔“ اس کی زبان لڑکھرائی اور داوا سے
اس کے اس تاثر میں جیسے غم کی تاب لانا محال ہو گیا۔
”مجھے یاد نہیں۔“ خود کو بے تاثر رکھتے اس نے
کہا۔

وہی پرانا المیہ کہ کون ہے جو ان لفظوں کی لوائیگی
کرنا چاہتا ہے جو اپنے کسی ہمارے کی تکلیف سے
لباب ہوں۔ داستان حیات کے ان بنوں کو تو کورا
رکھنے کو ہی جی چاہتا ہے۔

”یاد نہیں؟“ داوا نے خود کلاہی کی اور اب تک کی
زندگی کے تجربات ان کی مٹھی میں سمٹ آئے۔
نقطوں نے تصویر بنا ڈالی اور اس تصویر کو پوشیدہ رکھنے
پر انہوں نے خود اپنا ہی مہارت کیا۔

”امردہ نے تین دن کی گولیاں کھالی تھیں اور ان کے

دوست نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔“ پتا
نہیں۔ انہیں سب پتا تھا، لیکن ایسی تفصیلات کو دہرانا
ان کے لیے تکلیف دہ تھا۔

دنیا کے ایک حصے اور ہلا اور میں ایک شخص اپنے
کمرے میں موجود ہے۔ اور دنیا کے دوسرے حصے
کے اسپتال میں ایک دوسرا شخص موجود ہے۔ اور ان
دونوں اشخاص پر ایک نظر ڈال کر داوا نے جان لیا کہ
اسپتال میں ہمیشہ وہ شخص ان سے کہیں آگے کی بازی
لے گیا ہے۔ امردہ پر گزری تکلیف کو بھلاتے وہ اپنی
یا دداشت کھو بیٹھنا چاہتا ہے۔

ٹھیک اسی وقت سب سوال، ساری تشویش، سب
کاسب کچھ غیر ضروری ہو گیا۔ وہ جان گئے کہ اب اس
میں کیا شگ کیا جائے کہ وہ ایک ایسے انسان سے ہم
کلام ہیں جس کی آنکھوں میں احترام ہے اور الفاظ
میں رحم و دل۔ جو ان سے ہم کلام ہے تو ان کے زخموں
پر مرہم رکھ رہا ہے اور جس کی خاموشی سر لیا مناجات
ہے اور مزید انہوں نے سوچا کہ اب بھی اس وہم کو
کیونکر تحلیل نہ کر دیا جائے کہ وہ آدمیوں کے ہجوم میں
ایک انسان نہیں ہے بلکہ اس یقین کو کسی مستحیر
ہستی کی طرح گلے سے کیوں نہ لگا لیا جائے کہ اس
ہجوم تو میت میں وہی تو ایک انسان ہے۔

”تم عالیان ہو؟“ جان تو چلے تھے بس یہ سوال
اسے احترام دینے کے لیے پوچھا عالیان نے سر ہلایا۔
”امردہ ٹھیک ہے عالیان؟ اس پار انہوں نے یہ
پوچھا۔

”جی۔ اور وہ ٹھیک ہی رہے گی۔“ اس نے عجلت
پسندی سے کہا اور یہ خواب آسمانی فرشتوں کو سنانے
جیسا ہو گیا کہ دیکھو اگر کوئی اور ارادہ پاندھ رہے ہر تو سن
لو میں نے دعا کی ہے۔ میں نے سکار نہیں کی، لیکن
ہاں میں نے خدا کی ہاں کی علامتیں دیکھی ہیں۔ وہ انکار
نہیں کرتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے اور میں نے صبر کا یہ
پیغام ہاں کے ساتھ اترتے پایا ہے۔ اس کے اس
آخری رد عمل سے داوا کے اندر شفائیت بھر گئی اور اس
پیمانے کو جو ہر انسان کی طرح ان کے ہاتھ میں بھی تھا کو

انہوں نے ایک طرف رکھ دیا۔

یہ ایک انسان کی دوسرے انسان پر وارد ہونے کی واردات تھی اسے کسی پانے سے چاچتا اس عمل کی تذلیل ہوئی۔ داوانے زندگی میں پہلی بار اس جذبے کو قریب سے محسوس کیا کہ کیسا پیارا لگتا ہے کہ جو ہمیں پیارا ہو وہ کسی اور کو بھی اتنا ہی پیارا ہو۔ وہ اس احساس سے حاسد نہیں ہوئے اور اپنے اندر اترنے والی جانکاری کی روشنی کو انہوں نے بعد غل نہیں کیا۔



انچسٹریٹورشی کے ڈین اور انتظامیہ ان لوگوں سے مسائل رابطے میں تھے اور یونیورسٹی انتظامیہ سے دو لوگ برازیل ان سب کے پاس آئے تھے تاکہ ہر طرح کی سہولت کو ان کے لیے ممکن بنائیں۔ ڈین وقتے وقتے سے ان سے اس ڈیٹس لے رہے تھے۔ یونیورسٹی نے اپنے اٹھائیس طلباء کے زخمی ہونے کا تفصیلی اعلان کر دیا تھا۔ جن میں بیس معمولی سے زخمی ہوئے تھے اور آٹھ معمولی سے ذرا زیادہ اور ان آٹھ میں صرف امرتھی جیسے کوئی لگی تھی۔ امرتھی کے علاوہ باقی کے پانچ بھی اسپتال میں ہی ایڈمٹ تھے اور باقی کے باقی پانچ شہر واپس جا چکے تھے۔

حکومتی سطح پر ان سب کو وی کئی بی سولتیں دی جا رہی تھیں۔ حادثے کے نقصانات کیا کیا رہے اور فوائد کس کے حصے میں آئے۔ یہ پیچیدہ بحث لیوی اخبارات، سوشل میڈیا میں ہر طرف جاری تھی۔ حادثے کے چھ گھنٹے کے اندر اندر تفصیلات سامنے آئی تھیں۔ ساتھ فائر اسٹیڈیم کے باہر سڑک پر کیے گئے۔ اسٹیڈیم کے اندر اور باہر جو کچھ ہوا وہ سب پلان تھا۔ نشانہ غیر ملکیوں کو بنایا گیا کہ برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے خلاف طوفان کھڑا کیا جائے اور بالخصوص ڈیپس مشنر کو استعفیٰ کے قریب کیا جاسکے۔

حکومتی نمائندے بار بار ان اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے۔ اسی دوران ویرا اور کارل نے ایک پریس کانفرنس میں حصہ لیا اور پریس کانفرنس میں کارل نے

صحافیوں کو ایسے اپ ڈیٹ کیا کہ ایک صحافی نے دوسرے کے کان میں پوچھا۔
”یہ کسی بڑی سیاسی شخصیت کا ڈیرین تو نہیں کسی اور کو لے ہی نہیں دے رہا۔“
”ہاں کے بولتے کسی اور کے بولنے کی ضرورت رہ گئی ہے کیا؟“ وہ ہنسا۔

پریس کانفرنس کے بعد کارل نے چند ہی چھینلا کو انٹرویو بھی دیا اور جب امرتھی خطرے سے نکل آئی تو وہ ایک لائیو شو میں شریک ہوا اور تصلوم کا ایسا منظر کھینچا کہ سب نے جان لیا کہ کارل سے زیادہ اس تصلوم کا کوئی بھی شلڈ ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی سب بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک صرف وہ ذہین و حاضر دماغ انسان تھا جو اطراف کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس بے چارے نے اپنے سر اور جسم کے بلیکھے پر لاتعداد بوٹھیں کھائیں، لیکن کتنے ہی کمزور دل افراد کو بحفاظت تصلوم سے دور محفوظ کیا اور کتنے ہی گریے ہوؤں کو اٹھایا اور ایک ہاسک بننے قادر کرنے والے کے سر پر ہونسا مارا۔ آسو گیس اچھلنے والوں کو لاتیں ماریں اور کتنے ہی فتنہ سازوں کو اس نے کھینٹ کھینٹ کر سیکورٹی فورس کے حوالے کیا۔

اس کی گھر پر زخم آئے۔ اس کی کہنیاں چھل گئیں۔ اس کے سر سے خون نکلا، لیکن اس نے کسی زخم کی پروا نہ کی۔ ساتھ ہی اس نے چند ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا جو اس پورے تصلوم میں کہیں بھی نہیں ہوئی تھیں۔

ان سب کو اتنا کچھ بتاتے وہ انہیں یہ بتانا بھول گیا شاید کہ سچ شروع ہونے سے پہلے وہ خود ایسا ہنگامہ کروانے کا سوچ رہا تھا اور اس کی کتنی خواہش رہی تھی ایسے منظر کو براہ راست دیکھنے کی سچ تو اس نے کئی بار دیکھا تھا یہ سب تو نہیں دیکھا تھا۔

اگر برازیلیں یہ جان لیتے کہ جس پورے تصلوم کا وہ اکیلا ہیو ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے تو دراصل اس کی کلی زبان سے نکلے لفظ سچ ہو گئے اور برازیل اسٹیڈیم پر آفٹ نوٹ پڑی تو آفیشلی اسے ”کارل دی منحوس

مارا کا خطاب دے دیتے اور اس کے پاس پورٹ پر
Banned till after Death کا پتہ لگا

سے نکل آئے تھے جو امرتہ کو لے کر ان پر رہا تھا۔ یہ
اس رات کی بات ہے جس دن امرتہ کو روم میں شفقت
کروا گیا تھا۔

شو کے بعد اسے ماچسٹر سے اپنے پرو فیسر کا فون آیا۔
”میں نے اور میری بیوی نے زندگی میں پہلی بار
تمہاری حرکتوں کا مزہ لیا ہے۔ میں جتنے جتنے صوفے
سے گر گیا اور میری بیوی سینڈویچ کھاتے کھاتے ٹامی
(کٹا) کا کھن منہ میں لے بیٹھی۔ تم اتنی ہی کیوت تھے
بیشہ سے یا میری نظر کمزور رہی ہے؟“

جو اب میں کارل نے لیا قہقہہ لگایا۔ ”فسوس ہے
پر یہ ہی سچ ہے۔ آپ کی نظر ضرورت سے زیادہ کمزور
رہی ہے۔ ویسے ماچسٹر واپسی پر میں ٹامی کی خیریت
پوچھنے گھر آسکتا ہوں کیا۔ ساتھ ڈز بھی کر لیں
گئے۔“

پرو فیسر در تک جتنے رہے۔ ”آجانا ڈز کے لیے
ویسے ٹامی بالکل ٹھیک ٹھاکتے امید ہے تمہاری آمد
کے بعد بھی ٹھیک ہی رہے گا۔“



اسے روم میں شفقت کروا گیا تھا۔ ویرا اور سالی اس
کے ساتھ رہے۔ این ڈیرک، ڈائم، نوال اور ہانی یونی
فیلوز آتے جاتے رہے۔ ان سب کی رات کی فلائٹ
تھی جو واپس جا چکے تھے۔ ویڈیو کال سے اس کا حوالہ
پوچھتے رہے۔ ڈین اور انطا امیہ نے بھی اس سے بات
کی۔

کارل صبح سے اس کے پاس ہی تھا پھر وہ ہوٹل تیار
ہونے چلا گیا اسے اسٹوڈیو جانا تھا۔ جانے سے پہلے وہ
وقف سے امرتہ کو پھول دیتا رہا جو بقول سالی وہ امرتہ
سے گول کر کے لاتا رہا تھا۔

اس دوران عالیان کو نے میں رکھی کرسی پر خاموشی
سے بیٹھا رہا اور جب ویرا اور سالی بھی چلے گئے تو وہ اپنی
کرسی اس کے بیڈ کے قریب لے آیا۔ اس وقت تک
امرتہ سو چکی تھی۔ اس کے سر میں درد سے ٹیسپی
اٹھتی تھی اور اس کی آنکھیں بار بار بند ہو جاتی

دیتے۔
اس لائوشو میں اس کی دو ہونٹیں بھاری بھاری
کر کئی دوسرے چینلز سے کل پر کال کرنے لگے اور
اس نے تمہارا تمہارا وقت سب کو دے دیا اور ساتھ یہ
بھی بتا دیا کہ وہ ماچسٹر یونی کا اسٹوڈنٹ ہے اور اسٹوڈنٹ
لون جلد سے جلد اتارنا چاہتا ہے۔ (ان کی مدد سے) تو
یوں اشارات ٹی وی اور سوشل میڈیا میں وہ اتنی بار اور
ایسے آگیا کہ اگر کارل چاہتا تو آرام سے ماچسٹر میں
انٹیشن جیت سکتا تھا۔

گوئی امرتہ کو محمود کر مئی اور مشہور وہ ہو گیا۔
مزید یہ کہ ایک چینل نے اس تصادم کو باؤ کم کرنے
کے لیے ایک نیم مزاجیہ لائوشو پروگرام ترتیب دیا۔ جس
میں ہلکے ہلکے انداز سے یہ بتایا جائے والا تھا کہ اگر ایسی
صورت حال کا کوئی شکار ہو جائے تو اسے کس رد عمل
اور حاضر مافی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ تو کارل نے پچھ
پچی ”لا کا لڑکی“ انکل، ”آئی ایسی شعی ہر ایک کی جگہ
خود کو رکھ رکھ کر بتایا کہ کیا کیا ہو جانے پر کس کس
رد عمل کا اظہار کرنا ہے۔ پہلے وہ ایک تک چڑی فیشن
کی دلدادہ لڑکی بنا اور اس کے سر پر بوتل مادی ٹی اور
تک چڑی غریبی لڑکی جس طرح منہ بناتی پیش اور مارنے
والے کی طرف ناخن تیز کر لیتی تھی۔ اس نے شو میں
بیٹھے ناظرین کو ہنسنا کر مرنے کے قریب کر دیا۔
فلور پر گھڑا کارل رکا اور انگلی اٹھا کر نا کا اشارہ کمرے
میں دیکھ کر کرنے لگا اور بولا۔

”ایسے تو وہ آپ کے سر پر دو تین بوتلیں لور مار
دے گا۔ تو یہ رد عمل ٹھیک نہیں۔ شکر ادا کریں کہ
آپ کو صرف ایک بوتل بڑی سے آئے سر پر دونوں
ہاتھ رکھ کر اسٹینڈیم سے نکلنے کی کوشش کریں اور اپنے
ناخنوں کو ہتھیار سمجھنا چھوڑ دیں، اگر یہ ہتھیار ہوتے تو
فوج میں سپاہیوں کی جگہ ملیاں بھرتی ہوتیں۔“
قسموں کا طوفان ٹھمنے میں نہ آیا اور سالی کے
ہاتھ پٹنے کے قریب ہو گئے۔ وہ سب اس دباؤ

پوشاکوں میں لوگ سٹ سٹ آنے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں غالب ہیں اور آنکھوں میں شوق دید کی چاہ۔ ان کے گھروں کے اندر نقشین تھالوں کے تھل "شہری" سے سجائے رکھے گئے ہیں۔ کیونکہ اس نے ایک دم سے رنگ بکھیرنے کا قلم کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"میں ایک امرجہ۔"

اپنی ہستی تماشل کر کے رنگ دار مو قلم سے سجائی چلی گئی۔

"عشق۔ جس سنگھاسن پر بسرام ہے۔"

"میں اس سنگھاسن پر اس کے سنگ قابض ہوتی چلی گئی۔"

لفظوں کی فی الحال ضرورت باقی نہ رہی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سر جھکائے اب اس کی تھیلی کی پشت پر وہ رنگ بکھیر رہا تھا جو دنیا کی کسی دکان سے نہیں خریدے جاسکتے۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور اس کی اس مسکراہٹ کو جالیا جو اس کے کینوس کے محراب پر بکھری تھی اور ساتھ وہ بھی ایسے مسکرانے لگا جیسے زندگی میں کبھی اسے ایک کلتا بھی نہ چھبھا ہو دکھ کی تعریف اس نے صرف لغت میں پڑھی ہو۔

"عزیزہ توف کے گاؤں سے جانے والے سب ہی مسافر جہازوں کی لوٹیں دھیمی دھیمی ہونے سے پہلے لوٹ آئے ہیں۔ انتظار کو انہوں نے انتظار ہی رہنے دیا" فراق میں نہیں رہا۔"

"تم نے میرے ہاتھ پر کیا بنایا ہے؟" کتنے لمبے عرصے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ امرجہ نے پہلا سوال پوچھا۔

"خود کو۔" اس نے وہ جواب دیا جس کے بعد کسی اور سوال کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

"خود کو۔" اس نے انجلی خوشی سے کئی بار زیر لب اس جواب کو دہرایا اور جانتا کہ اس کے سوال کا اس سے خوب صورت جواب کوئی اور ہو نا تو کتابہ صورت ہوتا۔ اس نے خود کو اس کی دسترس میں دے دیا۔ خود کو اس میں رقم کر دیا۔

تھیں۔ انجکشن لگنے اور وہ ا کھانے کے ایک کھنٹے کے اندر اندر سے نیند آجاتی۔ نیند گہری نہیں ہوتی تھی۔ وہ درد سے سوئی جاتی رہتی تھی۔ اسے اپنے سیدھے خواب آتے اور وہ ڈر کر یا چونک کر جاگ جاتی۔ ساری دنیا سو جائے اور ہم کچھ حوالے جائیں۔ عالیان اس کیفیت میں تھا اور وہ امرجہ کو دیکھتے اس کی تصویریں چراہا تھا۔

دن نے شام کو آواز دی اور شام رات کے انتظار پر ختم ہوئی۔

وہ خاموشی سے اس کی تصویریں چراتا رہا۔ انیس من پسند وقت تک تکتا رہا اور پھر ان پر اپنا نام ثبت کرنا رہا۔ کون یہ اعتراض کر سکے گا اب کہ وہ اس کی ملکیت نہیں ہیں۔ اس نے ذرا دیر کو آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں کہ اسے سین سامنے پانے کے احساس کو پھر سے چھو سکے۔ پھر اس نے اس کی دائیں تھیلی کھولی اور اپنی انگلی سے اس کی تھیلی پر "عزیزہ" لکھنے لگا۔ پھر اس کی انگلی مو قلم (پیش) بن گئی اور وہ ایک تماشل گر (مصو ر) بنا چلا گیا۔

نانہ حل کے امرجہ عالیان نانہ قدم کے اوپری فیصلوں کے شہر میں آنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ سنگ جہاز مندم ہونے لگے اور شہر نے عروس ایلاد (خوب صورت شہر) کا بھیس بدلنا شروع کر دیا۔ چاندی کے گلاب پاشوں کے منہ کھول دیے گئے اور انہیں ان کے پیروں کے اطراف لڑکھڑایا گیا۔ عطریں گرو ہوں میں باادب ہو گئے اور گلاب کی پتیاں سرسے چٹیلے تھالوں سے چختے ان کے سروں سے فضا میں اچھالنے لگے۔

میں ایک تماشل گر۔

عزیزہ تمام کو اپنے موقع سے تصویر کامل میں رنگتا چلا گیا۔

"عشق۔ جس سنگھاسن پر بسرام ہے۔"

میں اس سنگھاسن پر قابض ہونا چلا گیا۔

فیصلوں پر مشعلیں روشن کر دی گئیں اور وہ پلیٹوں اور چوکھٹوں چھتوں اور شہ نشینوں میں نہیں اور پاکیزہ

جھاڑوں کو کناروں میں پھوسٹ رکھے چکے دیکھتے
سرخ و سبز یا ایک قہل پوشوں کو اتار لیا گیا اور تھاہوں کو
چھتوں اور شاہ کشینوں ڈھینوں اور چوکھوں میں تقسیم
ہو جانے لیا۔

امرد نے محسوس کیا کہ مسرت نغزی قبضے لگائی
اس کے وجود میں اہتمام سے سرایت کر رہی ہے اور
اس بار اس کا قیام عارضی نہیں ہوگا یقیناً نہیں
ہوگا۔

اس نے چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر بند سے کود جائے
اور کھڑکی سے باہر خود کو نکال کر پوری قوت سے چلا کر
پوچھے۔ ”کیا اس وقت دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش
قسمت انسان کوئی ہے؟“

”ہے۔ اچھا پھر یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس عالیان
ہے۔“
لیکن اس نے یہ سب نہیں کیا کیونکہ اسے کچھ اور
کرنا اور کہنا تھا۔

”تم نے تو کہا تھا میں تمہارے لیے مرچوں جیسی
ہوں۔ میں مر بھی جاؤں گی تو بھی تمہیں فرق نہیں
پڑے گا۔“ امرد اپنی ساری تکلیف بھول چکی تھی
لیکن حیرت انگیز طور پر اسے یہ سب اپنے نام کی طرح
یاد تھا۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے پچھنے حساب چکاتا
چاہتی تھی۔

لفظ گر چکے جیسے عالیان پھر سے نیم مرده سا ہو گیا اور
اواس سے بولا۔ ”ہاں مجھے صرف فرق ہی نہیں پڑا۔“
”تم ایک پرے انسان ہو۔“ امرد ذرا سا اٹھ کر
ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور یہ کرتے اس نے جان پوچھ کر
عالیان کی مدد نہیں کی۔

”بلاشبہ میں ایک برا انسان ہوں۔“ عالیان نے
بہت آرام سے من لیا۔
”تم انتہائی بد دلغ اور غصیلے انسان ہو۔“ پہلے جملے
سے امرد کی لہلی نہیں ہوئی۔

”ہاں۔ اور میں دیوانہ سا بھی ہوں۔“ عالیان نے
اس کی لہلی کرنی چاہی۔
”تم ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔“

”بالکل! اور میں بہت بد تمیز بھی ہوں۔“
”ہاں! تم نے ابھی تک بات کرنے کی تمیز نہیں
سیکھی۔ تم اتنے۔ کتنے سارے بڑے ہو گئے ہو لیکن
ابھی تک اتنا بد اساتذہ سو رہتے ہو تمہاری آنکھوں کی
ختمی بارود کی طرح محسوسات کے پر نچے اڑا رہی ہے۔“
”ہاں۔ بلاشبہ تم سچ کہہ رہی ہو۔“ اس نے کہا
جبکہ امرد کے ذخیرہ الفاظ پر وہ ہنسا چاہتا تھا۔
”تمہارا دل پتھر کا ہے۔“

”نہیں۔ میں سارے کا سارا ہی پتھر کا انسان
ہوں۔“

آگے امرد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور اسے کیا کیا
کہے۔ جو یونیورسٹی کی محراب میں اسے سیٹھے کھڑی
تھی۔ وہ اب اسے اس کی برائیاں گنوا رہی ہے اور اسے
بتا رہی ہے کہ وہ کس قدر برا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
عورت شکوے کا دس سرا نام ہے اور میں یہ کہتی ہوں کہ
محبوبہ شکوے کا سلا نام ہے۔“

”میں نے سنا کہ تم مجھے آواز میں دے رہے ہو اور
تمہاری آواز فرش سے عرش تک اٹھتی جاتی ہے۔“
عالیان کی برائیاں ختم ہو گئیں یا اس کی یادداشت
جاتی رہی۔ اگلی بات اس نے یہ کہی اور بے آواز رونے
لگی اور اسی رونے کے دوران اس نے فیصلہ کیا کہ
اسے عالیان کے ساتھ انتہائی سخت رویہ اپنانا چاہیے۔
کم سے کم اتنے وقت تک کے لیے جتنے وقت عالیان
نے اپنائے رکھا۔

”تم میرا ہاتھ چھو دو اور من بو نہیں کئی ساتوں تک تم
سب بات نہیں کر دوں گی۔“

اور عالیان جو بہت دل گرفتگی سے اسے روتے
ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ شاید وہ اسے ٹاپنہ
کرنے لگی ہے اس کی اس بات پر ہنس دیا۔

”ٹھیک ہے مت کرنا بات، لیکن صرف اتنا بتاؤ
امرد! میرے ساتھ تو رہو گی نا؟“
”نہیں۔“ امرد نے فوراً انکار کر دیا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر میں تمہارے ساتھ رہ
لوں گا۔“ امرد کی گیلی پلوں کو اس نے انگلی کی پور سے

شک کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ اس نے پہلے سے زیادہ سختی سے کہا۔
اور عالیان نے اسے اس کی لوا جانا اور اسے بیٹا ناچا ہوا
کہ اب دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں رہتی جہاں امرہ
اسے چھوڑ کر رہ سکے اور وہ اسے وہاں رہنے بھی دے۔
”میں اس بات پر قائم رہوں گی۔“ عالیان جواب
میں خاموش ہی رہا تو اس نے اسے یاد دلایا کہ ”نہیں“
کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ”نہیں ہی۔“

”عالیان پھر نہیں دیا۔“ اس بار نہیں کا مطلب
نہیں نہیں ہے امرہ ہوا بھی تو میں اس نہیں کو قبول
نہیں کروں گا۔“ اس نے اس کے ہاتھ کو اپنی دونوں
ہتھیالیوں کے درمیان نرمی سے رکھا۔

”سنو امرہ! میں نے ایک اچھی دعا مانگنا سیکھ لیا
میں نے جان لیا ہے کہ ہمیں کس ساعت میں
دیر تک قیام کرنا ہے کہ ہم اس ساعت کو جا لیں جو خدا
کی رضامندی سے لمبریز ہوئی ہوتی ہے کہ ہمیں ہماری
پسندیدہ نعمت عطا کر دی جاتی ہے۔ میں نے ان نعمتوں
کا شمار کرنا چاہا جو مجھے عطا کی گئیں۔ اور میں نے ملا کے
بعد تمہارا نام لیا۔ میں نے خدا کو یہ بتایا کہ اس کی سوانی
مجھ پر کیسے ظاہر ہوگی۔ (تمہاری صورت) یہ بھی سنو
امرہ کہ میں نے جان لیا ہے ہماروں کا جتنی قیام کے
کہتے ہیں۔ یہ ایک امرہ کا ایک عالیان کے پاس ہونے
کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ خوشنما تخلیقات کی
خوشنما کاراڑ کیا ہے یہ ایک امرہ اور ایک عالیان کا
ساتھ ہے۔

میں نے اس حقیقت کی تفصیلات پالیں کہ کوئی
چال کوئی پینزاکر نہیں کہ جو دل پر آزمایا جائے اور
یہ ہمارے اختیار میں رہے اور دنیا میں کوئی حکمت ایسی
نہیں جو اس میں داخل ہو جانے والے کو نکال یا ہر
کے اور یہ ممکن کر دکھائے کہ میرا جو حصہ تم میں
ہے وہ تم واپس کر سکو اور میرے پاس جتنی اوجھری
کھل تم ہو وہ میں تمہیں لوٹا سکوں اور ہم الگ الگ
زندگی گزار سکیں۔ ایسی حکمت ناپید ہیں امرہ! اور
ایسی حکمتیں ناپید ہی رہیں گی۔“ کہہ کر وہ رکا۔

ہشیرتی تقسیم کردی گئی اور چاندی کے سکے زمانہ
حال کے مہمانوں کے سروں کے اوپر سے اچھال دیے
گئے اور اب وہ اپنے سازندوں کی طرف لپک رہے
ہیں۔ ان سب کو ایک دعا تہ گیت گانا ہے اس متوقع
دہن کے لیے جس کے گل انار گلوں کو سرخی کے
لیے عازے کی ضرورت نہیں رہی۔

میری بے اعتنائی پر تمہارا شکوہ جائز ہے اور تمہاری
کم عقلی پر میرا، لیکن اب اگر ہم اس سب کو خوب
صورت بروں والا سرخ بھنا کر اڑا دیں گے تو ہمیں ان
تیلیوں کے پیچھے بھاگنے کا موقع مل جائے گا جو بے اعتنا
اور کم عقل نہیں اور جو خوش رنگ پھولوں پر قیام کرتی
ہیں اور معصوم لوگوں کو چھو کر گزرنا پسند کرتی ہیں۔“

کیا کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔ یقیناً ہاں۔ کیونکہ
آسمان سے اترتی کھٹکھٹاؤں کی صورت کھڑکی سے
کمرے میں اترنے لگی ہے اور ان کے سروں سے
گھوم کر دیواروں پر اسی تصویر میں ڈھل کر نقش ہو چکی
ہے جو تمہارا کرنے اس کی ہستی پر جاری ہے۔

”میں ہزاروں الفاظ جانتا ہوں۔ معنی بے معنی کئی
جملے بول سکتا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے امرہ! اپنا
دعا بیان کرنے کے لیے میرے پاس اچھے الفاظ ہیں نہ
پراثر جملے۔“

اب ابو علی ابن مقلاد کے شاگرد خطاط درس گاہ
کے سفید سنگی احاطے میں حوض کے اطراف قطار میں
بیٹھنے لگے ہیں۔ وہی جملہ جو مجھ پر وارو ہوا اور جس کے
متعلق میں نے اب جانا۔

درس گاہ کی کوچنی سفید کمریوں نے شفیق استادوں
کی طرح خطاطوں کی کمریوں کی اور پھر اسے تعویذ حب
صورت لکھ کر محراب حب کی چوکھٹ سے باندھ دیا۔
وہ بولتا گیا۔ سنگ بصری کی تختیاں خطاطوں نے تمام
پس اور جٹائے تعریف خدا ہوئے۔

”ایک پہلی اور آخری بات صرف اتنی ہے کہ پہلے
میں عالیان تھا۔ پھر میں تم ہو گیا اور اب میں تم ہی رہ
گیا امرہ!“ اس کی پہلی کو آ نکھیں تک لے گیا
اور۔

”پہلے میں نے بات شروع کی اور میں ختم کرنا معمول
 مگنی تھی اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں بات
 کہاں سے شروع کروں۔ امرجہ سے خود سے یا
 عالمیان سے؟“

”امرجہ۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”آپ اسے
 نہیں جانتے؟ میں بھی نہیں جانتی مگنی مجھے صرف یہ
 معلوم تھا کہ وہ میری دوست ہے۔ لیکن کچھ وقت
 گزرا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کی دوست نہیں
 تھی۔ اگر میں اس کی دوست ہوتی تو وہ مجھ سے وہ سب
 کہہ دیتی جو وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ بات
 جو اس نے آپریشن ٹیم میں جانے سے پہلے کہی تھی اس
 وقت جب وہ گر گئی تھی۔ جب میں اس کی طرف چلی تو
 میں نے دیکھا کہ وہ پوری شدت سے آنکھیں کھولے
 رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے گردن موڑ کر
 دیکھا تو وہ اتنی تکلیف میں بھی اس سمت دیکھنے کی
 کوشش کر رہی تھی جس سمت عالمیان گر چکا تھا۔ ایسی
 تکلیف وہ بے ہوشی میں وہ اسپتال آنے تک کئی بار
 چونک کر اٹھی اور اس نے صرف عالمیان کا نام لیا۔
 جتنی بار وہ چونک کر اٹھی اتنی ہی بار وہ اپنے زخموں
 سے زیادہ کسی اور ہی تکلیف میں تھی۔“

ویرا کی اور اس نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ وہ دیکھ
 سکتی تھی کہ جن لوگوں کو وہ اپنے اور عالمیان کے بارے
 میں بتا گئی تھی۔ انہیں امرجہ کے بارے میں جانتا کیسا
 لگ رہا تھا۔ ”شاک“ ویرا نے سر اٹھا کر گرنے کے
 قریب آنسوؤں کو آنکھوں کے اندر کرنا چاہا اور وہ
 آنکھوں کے اندر ٹھہرے دو سرے آنسوؤں کو بھی باہر
 لے آئے۔

”عالمیان۔ خوب صورت دلوں میں سے ایک کا
 مالک۔ وہ سڑک پر ایسے گر گیا جیسے گولی اسے لگی ہو۔
 سیدھی دلی پر۔“

وہ رکی اور کئی دیر تک رکی رہی۔ ”ایک ہی وقت
 میں دونوں مجھ پر آشکار ہو گئے۔ جب امرجہ آپریشن
 ٹیم میں تھی اور عالمیان سر جھکائے خاموش کھڑا تھا تو
 میں اس کے پاس گئی اور اس سے کہا۔“

”استو محترم کے اشارے پر صندلی قلمیں بلوری
 دو اتوں میں ڈبو کر عروس الخطوط اپنائے انہوں نے
 خطاطی کی ابتدا کی۔“

”محبت آسمانی فرمان ہے، نافرمانی کی اجازت
 نہیں۔“

سنگ بھری کی پیشانی پر انہوں نے لکھ دیا۔
 آنکھوں سے وہ انہیں ہونٹوں تک لے آیا۔

”محبت پرندہ پریت ہے پاتلی اس کا نشین نہیں۔“
 سنگ بھری کی دوسری سطر نقش کر دی گئی۔

پھر اس کے ہاتھ بروہا حرام بجالایا۔
 ”محبت مشک آہو ہے بھیجے میں قید نہیں۔“

تو تحریر کھل ہوئی۔ ”لوحِ حُب“ لکھ دی گئی۔
 شگرتی اور عوانی، مہزولانی سیاسی سے اب خطاط گل

کاری کرتے جاتے ہیں اور خدا وادہ کی تعریف بیان
 کرتے جاتے ہیں اور پھر دعا کی ابتدا کچھ یوں کرتے

ہیں۔
 ”لوحِ حُب“ کو خدا وقت کے ہاتھوں زندہ رکھے

زندہ رکھے۔ پر شباب رکھے۔ وقت کے زوال سے
 خدا سے بچائے رکھے۔ بجائے رکھے اور ”عرباب

حُب“ کی پیشانی پر روشن رکھے۔ یوں رکھے کہ ”روز
 ازل“ ”روز ابد“ سے جاوے۔



گہرائی سے۔ اونچائی سے۔ لوگ ہیں۔ پس منظر
 میں بچتے شہر کی جلتی روشنیاں ہیں۔ اور اس کے سر
 کے عین لو پر کئی سو کرسٹل لڑیوں کا چھتا ہے جو برقی
 ارتعاش سے ایسے حرکت میں ہے جیسے مشرقی حسینہ
 بے خودی میں اپنا آپٹل دھیمی ہوا کے سپرد کر رہی ہو۔

”مشرق حسینہ امرجہ۔“
 مقام کو چھائی پر ہے اور وہ ٹانگ کے سامنے ہے۔

”نہ دیر۔“
 اس نے بچتے شہر کی جلتی روشنیوں کو دیکھا اور اس

کی آنکھیں اواسیوں کے پانیوں سے چمکنے لگیں اور
 گلے کو کھٹکھٹا رہے بنا بولنا شروع کیا۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اتنی جلدی بے ہوش نہ ہوئی اگر اس کے سر پر ضرب نہ لگتی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گرنے لگے۔ ایک جوان مرد دو رہا تھا۔ ٹھیک کر رہا تھا، ایک مرد اگر اپنی ماں بیوی بیٹی کی تکلیف پر رو رہتا ہے تو وہ ہلندہ پانگ ان سے اپنی محبت کا اقرار کرتا ہے کہ کہہ کر وہ ہر افسردگی کی بانت پر نظر آنے لگی۔

جب عالیان ایک بار امرد کو دیکھ آیا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ”تم ایک اچھے اداکار ہو عالیان اور امرد بھی۔ تم امرد کے علاوہ دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہنے کی اداکاری کرتے رہے اور دنیا کے ہر انسان کے ہوتے امرد کو جلتے دیکھ تم ساری اداکاری بھول گئے۔ تم دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہ سکتے ہو لیکن زندہ تم امرد کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ میرے ساتھ تعلق بھانے کی تمہاری کوشش اچھی تھی۔“

”تمہارے دل میں میں نے اپنا احترام کھو دیا ویرا۔“ اس نے ایسی شرمندگی سے کہا کہ میرے دل میں اس کا احترام اور بڑھ گیا اور میں نے کہا۔ ”ہاں ایسا ضرور ہو جاتا اگر تم نے کبھی مجھ سے کہا ہو تاکہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم نے ہمیشہ کہا کہ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور اس پر تم ابھی بھی قائم ہو گے اب تم پہلی فرصت میں امرد کو بتانا کہ اگر تم دونوں میں میرے کی گنجائش نکل سکتی تو عالیان پر از ملا اسٹیجیم میں دیوانہ وار اس کے لیے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ اس بار تم اسے زیادہ یقین سے بتانا زیادہ وقت لینا اور اس کا ہاتھ پکڑ لینا کہ وہ انکار کر کے کہیں جانہ سکے اور وہ انکار نہیں کرے گی۔ میں نے بے ہوشی میں اسے تمہارا نام بڑھواتے سنا ہے۔“ پس منظر کی ساری روشنیاں بجھ گئیں۔

”میں بے خوف ہی تھی۔ یہ سب نہیں جان سکتی اور اب مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جب میں یہ کہانی اپنے پوتے پوتیوں کو سنائوں گی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کیا وہ اپنی گزند نام کو برا کہیں گے؟“

اس نے کیلے گال صاف کیے۔ ”وہ سمجھ دار بنے ہوں گے وہ اپنی گزند نام کی اعلا تھری پر فخر کریں گے۔“ سالی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ اچھو کر پٹی۔“ لوگ تم کو ایسے سمجھتے۔ وہ شنیاں بھادی گئیں۔ کہانی سناری لگی۔ وہ ہوش کے پلغ کے اندھیرے گوشے میں اکیلی کھڑی تھی۔

سالی ان ہی کے ہوش شفٹ ہو چکا تھا اور ایک کھٹنے کی نیند بھی لے چکا تھا۔ پھر جیسے وہ بہت بے چین سا ہو کر اٹھا۔ اسے یاد آیا جب وہ سویا تھا تو بہت خوش تھا کیونکہ ”الیہ داستان“ ”طریہ“ ”ہو چکی تھی۔ تو پھر وہ ایسے ہڑبڑا کر کیوں اٹھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اتنے سال ہو گئے تھے اسے سالی بنے اب لوگ اس کے پاس نہیں آیا کرتے تھے تو وہ کہاں کہاں کی سمت مزجانا تھا اور کتنا تھا۔ ”سنو شاید تمہیں میری ضرورت ہے۔“

وہ اٹھا اور دوسری منزل پر آیا دو ازے پر دستک دی کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسپتال امرد کے پاس نہ چلی گئی ہو اسے فون کیا، لیکن اس کا فون بند تھا۔ کاؤنٹر پر آکر پوچھا انہوں نے ایک بار کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ بار گیا وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ خود ہی اسے ڈھونڈتا رہا اور پھر اسے اندھیرے گوشے میں کھڑے پاس کرتے دیکھا۔ وہ خود ہی اتنی گن تھی کہ وہ عین اس کے پیچھے کھڑا ہو کر سب سننے لگا اور اسے خبر نہیں ہوئی۔

اس نے ویرا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں لے آیا دونوں نیچے کارپٹ پر دیوار سے کمر جوڑ کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

”میں جانتا ہوں تم دکھی ہو؟“ بات سالی نے شروع کی۔

”ہاں بہت دکھی ہوں سالی۔ اس لیے کہ میں سمجھ نہیں پاتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے جھجھکتا یہ ہی لگا کہ امرد عالیان کو دوست کی حیثیت کے علاوہ پسند نہیں

سالی پوری جان سے چسنے لگا۔ ”تم مذاق میں ایسا کہہ سکتی ہو لیکن حقیقت میں ایسا کبھی نہ ہوتا۔“
 ”مگر میری اور عالیان کی شادی ہو جاتی تو ایسا ہی ہوتا۔“ وہ اپنی ہتھیاریاں مسکنے لگی اور ایسا کرتے وہ ایسی بچی لگنے لگی، جس کی ساری گڑیاں چرلی گئی ہوں اور ان کے کپڑے جلا دیے گئے ہوں۔

سالی نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”عالیان اس مشرقی لڑکی کا پرنس تھا۔ تمہارا پرنس چارمنگ تو کہیں اور تمہارے انتظار میں ہو گا۔“

”ہاں بس اب یہ ہی کام رہ گیا ہے۔ سب کام چھوڑ کر اس پرنس چارمنگ کو ڈھونڈنے پھرنا یا اس کے انتظار میں بیٹھ جانا۔ میں ایک پلنگ اتنی بڑی لڑکی ہوں۔ وی لیڈی ویرا“ مجھے تم ان فیملی لہلہ سے نہیں بھلا سکتے۔“ وہ چرکی۔

”فیملی لہلہ ہماری حقیقی زندگیوں سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتیں ویرا۔“

جہاں ایک ویرا ہے، ایک سالی، ایک کارل، دو امرہ عالیان۔ کیا کسی فیملی میں یہ سب ہوں گے؟ ہمارے پاس دکھ ہیں۔ ملنا، پھڑنا، رونا، مسکرانا، گر جانا، اٹھ کر کھڑے ہونا۔ یہ سب ہے، کہیں کم، کہیں زیادہ۔ شان، دارمحل، قیمتی بلوسات، آرائش زندگی، مہیل کود، مسکرائشیں، خوب صورتی اور نغمے ہی زندگی کو فیملی ٹیل نہیں بناتے۔ زندگی کو فیملی ٹیل ہماری سوچ بنانی ہے۔ پرنس چارمنگ وہ نہیں جو ایک بڑی سلطنت کا شہزادہ ہے یا جو بہت خوب صورت ہے۔ پرنس چارمنگ ہر وہ انسان ہے جو ایک شفاف دل کا مالک ہے جو بلا امتیاز انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ میں تم، عالیان امرہ، کارل ہم سب۔

یہ زندگی تب بھی فیملی ٹیل سے زیادہ خوب صورت ہے جب ہر ساعت ہمیں فضا میں بسی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ آسمان شان دار محل کی چھت لگتا ہے اور زمین مٹھلیں قالین جو ہر نئے قدم پر ایک نئے رنگ میں ڈھلتا ہے۔“

ویرا نے سالی کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اسے

کرتی اور عالیان۔ سالی ایسا ہی تو ہوتا ہے ایک بریک اپ کے بعد کچھ وقت لگا اور سب ٹھیک۔ میں امریکہ سے واپس آئی تو امرہ مجھے بدلی ہوئی ملی، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دادا ایسے لڑکے سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟ تو اس نے کہا۔ مجھے اس سب سے دلچسپی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ویرا نے تاسف بھرا انداز اپنایا۔

”کیا میں ایک بری لڑکی ہوں سالی؟“ دل برداشتی اپنے عروج پر نظر آنے لگی۔

”تم نے یہ کیوں سوچا؟“ سالی کو جیسے دلی صدمہ ملا۔

”جانتی نہیں۔“ اس نے خود گلہ می کے انداز سے کہا۔

”کچھ باتوں کے ہو جانے میں ہمارا اختیار نہیں ہوتا

ویرا۔ ان کے ہونے اور نہ ہونے پر۔ ایک اچھا ذرا بیور

اگر حادثہ کروے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ برا ہے

اس کا مطلب ہے کہ سڑک گاڑی اور کچھ دوسرے

حوالے مل کر حادثے کے اسباب پیدا کئے۔

مجھے نور برے واقعات کے اسباب بنتے ہیں ویرا۔“

”عالیان کو خود کو پاگل بنانے کی کیا ضرورت تھی

سالی، تم نے نہ کھا وہ کیسے اس کا نام لے لے کر بھاگتا پھر

رہا تھا۔“

”اس نے خود کو پاگل نہیں بنایا ویرا۔ بس شاید اس

پر ویر سے اور اک ہوا۔“

دونوں تھوڑی خاموشی سے اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی

سوچ کو سوچتے رہے۔

”تو گرینڈ ما نے اعلا طہنی کا مظاہرہ کیا۔“ سالی نے

ہنس کر ایک نئی بات شروع کی۔

ویرا زور سا ہنس دی۔ ”مگر نہ کرتی تو امرہ روسیوں

کے بارے میں اپنے پوتے پوتیوں کو کیا بتاتی کہ وہ

خود غرض ہوتے ہیں اور ہماری جگہوں پر قابض

ہو جاتے ہیں۔ وہ خود روس آتی نہ اپنی پوتی کو بھی آنے

دیتی، بلکہ روس کے بارے میں نیوی وی پر کوئی خبر چل رہی

ہوتی تو وہ جیتل بدل دیتی اور سوچی روس دنیا کے نقشے پر

ہو تھی نہ تو کتنا اچھا ہوتا۔“

پہلا پاس تو کئی بار آئے۔
 ”یہ کیسا حادثہ تھا مس اخروٹ! جو تمہیں برا بھلا
 میں پیش آیا اور تمہیں ٹھیک کر گیا؟“ انہوں نے
 سنجیدگی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔
 ”مس اخروٹ جواب میں صرف مسکرا دی۔
 ”تو برا بھلا نے تمہیں بدل دیا؟“
 ”شاید۔“ وہ اور مسکرا دی۔

اس دوران کارل نے اس کے لیے لائی جانے والی
 چاکلیٹیں اور کوکیز کو سعادت مندی سے اپنے پاس
 محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ سائی نے امرتہ کو بتایا کہ اس
 نے سب سے کہا ہے کہ پھول لے جانے کے بجائے وہ
 چاکلیٹ لے جائیں کیونکہ امرتہ کو چاکلیٹ مست پسند
 ہے۔ تپ اور ایک ایسا انسان جس کے شانے پر گولی لگی
 ہو اسے ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو ضرور ہی مہیا
 کر دینی چاہئیں۔

ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں سے ایک بھی امرتہ
 کے منہ میں نہ گئی البتہ ہل میں کارل نے اپنے کمرے
 کی حفاظت چوری پروف کر دی۔

جب وہ گھر آئی تو اس کے کمرے کو دیراً سادھنا اور
 ابن نے مل کر مختلف پوشیز، ٹارٹوز اور دھاواؤں سے سجا
 رکھا تھا۔ دیواروں پر ان سب کی مختلف موصموں پر لی
 جانے والی تصویریں لگی تھیں اور یونی فیلوز کے پیمائش
 کارڈز کی صورت دیواروں سے جمول رہے تھے۔

یونیورسٹی نے اسے آفیشل لیوے دی تھی۔ اس
 کے لیگنر کا کارڈ کیے جا رہے تھے اور اسے گھرتے تھے
 سائی ایک بار ضرور اس کے پاس آتا۔ کافی پی کر چلا
 جاتا۔ عالمیان یونیورسٹی سے پہلے تری اور جب کے بعد اتنی
 بار اس سے مل جاتا کہ لگتا وہ اسی اسپائیڈر مین ہے۔
 عمارتیں پھلانگتا آتا جاتا ہے۔

کارل اپنی الٹی سیدھی تصویریں سمجھ سمجھ کر اسے
 بھیجتا رہتا کہ ”خوب صورت انسان کو دیکھنے سے انسان
 جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔“

وہ اب تک فون پر ہی دوا سے بات کرتی رہی تھی
 اور اسے حیرت یہ ہوئی تھی کہ دوا نے ایک بار بھی

خاصی سے منتی رہی اور منتی منتی سو گئی۔ سائی نے
 اسے ایسے سوتے دکھا تو چاہا کہ آج کی پوری رات
 اسے اس انسان کے لیے دعا میں کرتے گزار دینی
 چاہیے اور وہ زرب دعا یہ نظموں کو ایسے دہرانے لگا
 کہ وہ تیند سے جاگ نہ جائے، لیکن تیند میں ہی من
 بھی لے۔

”دیرا۔“ موت سی برف میں کھلتے اکلوتے پھول
 کی طرح وہ اس احساس کو خاطر میں نہ لائی کہ خزاں میں
 وہ ”اکیلی بہار“ ہے۔

میری کہانی کے یہ دو کردار۔

طلوع آفتاب سے۔

دوستی میں حرف خاص سے۔

مشالوں میں ”پر مشل“ سے۔



برازیل سے وہ وی آئی بی سیٹ سے ماچسٹر میں آئی
 جہاں اسے علاج کے لیے ڈاکٹروں کی اگل ہدایات تک
 رہنا تھا۔ سارے اخراجات برازیلین حکومت اٹھاری
 تھی۔ وہ اسے مکمل صحت یاب کر کے بھیجنا چاہتی
 تھی۔ لیکن اسے ماچسٹر آنے کی جلدی تھی۔ اس کی
 وجہ سے اس کے ساتھ رہنے والوں کی تعلیم کا نقصان
 ہو رہا تھا۔ وہ سب لوگ ویک اینڈ کا سوچ کر سوچ دیکھنے
 گئے تھے۔ ابن ڈیرک وغیرہ پہلے ہی واپس آ چکے تھے۔
 کارل دیرا سائی، عالمیان اس کے ساتھ تھے۔ کارل کا تو
 ویسے بھی برازیل میں ہی وی پر مستقبل کافی روشن ہو گیا
 تھا۔ اسے تو چند اور دن وہاں رکنے پر اعتراض نہیں
 تھا۔

سادھنا اور لیڈی مررا پورٹ سے اس کے ساتھ
 اسپتال گئے اور اسپتال میں اس کے پروفیسرز، کلاس
 فیلوز، یونی فیلوز آکر ملے رہے۔ سٹریٹ بھی اس کے
 لیے پھول لے کر آئی۔ ڈیرک تو برازیل میں بھی کئی بار
 اس سے مل چکا تھا اور دائم وغیرہ کا گروپ اور بانا شہری
 للی سب وہاں بھی اس سے مل گئے تھے اور یہاں بھی
 آتے رہے۔ اسٹور کا مینجر اس کے کوکیز اور اس کا

نہیں کہا تاکہ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ ششل گاک آپکی اور اٹھ کر بیٹھنے لگی جبکہ اب بھی اٹھنے سے اس کے سر میں لمبیں اٹھتی تھیں اور اس کا پایاں شانہ درد کرتا تھا اور اکثر وہ کئی کئی گھنٹے حملی کاشکار رہتی تھی اور اچانک ہی اسے تیز بخار ہو جاتا تھا تو واوا پہلی بار اسے دیکھ کر بات کرنے لگے کیونکہ اس نے خود ہی کہا تھا کہ وہ انہیں دیکھنا چاہتی ہے۔

”اب مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”ایسے ہی لینڈ بھڑک اٹھے اور لڑتے لڑتے مجھ پر گر گئے۔“ وہ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر زخم کے نشانات اب کچھ مندمل اور قابل برواشت ہو گئے تھے۔ سر کو اس نے دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کیونکہ پچھلے حصے میں لگی بیڈن ج سائن سے ذرا سی نظر آتی اور گردن کی بھی۔

”بس۔۔۔ واوا نے بہت آرام سے پوچھا۔

”جی۔۔۔ جو جھوٹ سا دھماکا ہوا تھا وہ اب تک اسے ہی آگے لے کر چلتی رہی تھی۔

”تمہارے بس اتنے معمولی سے زخمی ہونے پر ویرا کارل، سائل اور عالیان اتنے پریشان ہو گئے تھے؟“

”وہ مجھے ہوش نہیں آ رہا تھا اس لیے میرے سر پر چوٹ آئی تھی۔ بس خوف زدہ ہو گئی تھی بہت بہت زیادہ۔“

ماچسٹر کے اسپتال میں جب وہ آئی تو اس نے یہ بتایا کہ وہ گھر آچکی ہے، جب وہ گھر آچکی تو وہ یہ بتانے لگی کہ وہ یونی جانے لگی ہے اور واوا نے ایک بھی پار اس سے کوئی سوال یا حکم نہیں کیا، جو وہ کہتی وہ سن لیتے اور اسے صحت مندی اور زندگی کی سلامتی کی دعا میں دیتے رہتے۔

”جب میں نے باری باری ویرا سائل اور پھر عالیان کو دیکھا تو مجھے جیسے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی اور مجھے لگا کہ وہ مجھ بے چارے بوڑھے پر ترس کھا رہے ہیں۔ مجھے صدے سے بچانا چاہتے ہیں۔ میں نے شہسوار کی مدولی۔ وہ ایک پرمکا لکھا سمجھ دار انسان ہے اس نے کچھ وقت لگایا انٹرنیٹ پر اور اسے

معلوم ہوا کہ تصادم میں کل تین لوگوں کو گولیاں لگی ہیں اور ان تین میں سے ایک ماچسٹر یونیورسٹیوں کی اسٹوڈنٹ ہے۔ پھر اس نے یونیورسٹی انتظامیہ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا گیا کہ وہ ایک اسٹوڈنٹ امرتہ واجد ہے۔ تم نے مجھ سے جھوٹ اس لیے بولا کہ میں ایک بوڑھا انسان ہوں۔ ایسی خبر سن کر مجھے کچھ ہونہ جاتے سا دھماکا لے کر سائی تک سب مجھ سے چھاتے رہے۔ یہ ایک اچھی حکمت عملی تھی مجھ بوڑھی جان کے لیے امرتہ۔ لیکن میں انجانا کے درد کاشکار ان ہی دنوں ہوا۔ جانتی ہو کس لیے؟ صرف اس لیے کہ تم نے خود کو خود مرجانے دیا۔ تم نے اپنی جان کی بروا نہیں کی۔ تم نے خود کو اہم نہیں جانا۔ تمہیں بہانہ مل گیا مرنے کا۔ تم نے چاہا کہ تم مرجاؤ، تم نے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے اپنی کمزوری ظاہر کی بہت اور طاقت نہیں۔“

”یہ غلط ہے۔“

”یہ غلط ہے۔ ہوتا اگر تم ٹھیک رہتیں، تم موت کی باتیں کرتی تھیں۔ میں نے اپنا پاسپورٹ ایمر جنسی ویزے کے لیے بھیجا، لیکن مجھے ویزا نہیں ملا۔ میں وہاں آتا اور تم سے پوچھتا امرتہ کہ کیا زندگی ایسی بے کار ہے کہ اسے موت کے حوالے کر دیا جائے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ ایک ماروٹھا واوا اور بس۔“

”تم ساری دنیا سے بھڑ بھول سکتی ہو، مجھ سے نہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

”تم مرنا چاہتی تھیں؟“

”ہاں!“ اس نے اعتراف کر لیا۔ ”میں نے خود کو مارنا نہیں چاہا تھا، لیکن وہ سب جب وہاں ہوا تو میں نے دعا کی تھی کہ کاش میں مرجاؤں۔ کیونکہ میں خود کشی نہیں کر سکتی تھی اور طبی عمر تک خود کو گھسیٹ نہیں سکتی تھی۔ میں بظاہر بھاگتی رہی خود کو بچانے کے لیے لیکن اندر ہی اندر میں یہ خواہش کرتی لگی کہ میں زندہ نہ رہوں۔“

”مجھے مرنا دینے کے لیے یہ بتانے کے لیے کہ

بھی سمجھتی رہی، لیکن یہ سب بہت پرانی باتیں ہیں۔ پھر میں نے عالیان کے لیے تم سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔“

ویرا اہنس دی۔ ”عالیان کے لیے تم ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیتیں۔ یہ صرف تم ہی کر سکتی ہو اور میں ان جذبات کی قدر کرنے پر مجبور ہوں۔“

”تم دکھ اور تکلیف سے گزریں؟“ بہت مشکل سے امرجہ یہ پوچھ پائی۔

”ہاں میں گزری امرجہ! لیکن اس سے بہت کم جس سے تم گزریں، میں تم دونوں سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔ تم صرف عالیان کی ہی نہیں ہو اور عالیان صرف تمہارا ہی نہیں ہے اور یہ حسد و رشک سے کہیں آگے کے جذبات ہیں۔“ لے لے گل سے اس کے گل رگڑ کر ویرا چلی گئی۔ یہ صبح کا وقت ہے اور وہ یونی جانے سے پہلے اس سے مل کر جاتی ہے۔

”ٹھیک ہے۔ وہ عالیان کے ساتھ آگے نکل آتی ہے، لیکن اب اگر وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھتی ہے تو جانتی ہے کہ پیچھے کتنی توڑ پھوڑ کرتی آئی ہے اور اس توڑ پھوڑ میں سب سے زیادہ نقصان میں ویرا ہی ہے۔“ انسان اپنے عمل میں کتنا ہی کھرا کیوں نہ ہو، کبھی نہ کہیں وہ اتنا پست ضرور ہو جاتا ہے کہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتا۔ ویرا کی صورت یہ پستی سے یاد رکھنی ہوگی۔



اگلے دن جب اس کی فلائٹ تھی پاکستان کی تو رات کو سوتے میں غیر معمولی آوازوں کے ارتعاش سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دن بھر اس کی عالیان سے بات نہیں ہو سکی تھی اور وہ بڑی دل کرتی سے سوئی تھی کہ وہ اسے بھول گیا، آخر بھول گیا۔

وہ چند دنوں سے کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ اس سے کھڑے کھڑے مل جاتا اور ملتا مہر کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا۔ اس کے سلمان کو اس نے سنی خیزی سے دیکھا اور کوئی بھرو نہیں کیا اور اسے یہ سب برا

اگر ہم زندہ لوگوں کی قدر نہیں کرتے تو وہ مر کر اپنی قدر بڑھوا لیتے ہیں۔“

وہ خاموش رہی، کیونکہ یہ ہی سچ تھا۔ وہ عالیان اور دادا دونوں کو مر کر دکھانا چاہتی تھی اور اس لیے بھی کہ اسے زندہ رہنے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

”پاکستان آجاؤ۔“

”یہاں نہیں ہو سکتا۔“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”پھر چلی جانا، میں تمہاری دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں، تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دادا کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آپ مجھے واپس نہیں آئے دیں گے؟“

”ایک نمازی سے وعدہ لے لو۔“ دادا نے بہت پر یقین انداز سے کہا۔

”ٹھیک ہے، پھر مجھے وعدہ دے دیں۔“ اس نے بہت دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔

اس کے پاس دس چھٹیاں تھیں، وہ ان چھٹیوں میں جا کر واپس آ سکتی تھی۔ اس نے اپنا ٹکٹ بک کر والیا اور ویرا کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

”تم لیو پر ہو، میں نہیں۔“ ویرا نے اس کے گل پر چنگلی لی۔

”چند دنوں کی بات ہے، تمہیں یونی سے نکل نہیں دیا جائے گا۔“

ویرا اور زیادہ ہنسنے لگی، لیکن شرارت سے۔ ”میں تمہارا یہاں انتظار کروں گی، بلکہ ہم سب کریں گے۔“

”میں ایک خود غرض لڑکی ہوں نا ویرا؟“ عالیان کے ساتھ وہ آگے ایسے بڑھی جیسے اس پر صرف اس کا حق تھا۔ اور خود غرضی سے بھی اس نے ویرا کے بارے میں نہیں سوچا اور اب وہ اتنے دنوں سے ویرا سے بات کرنا چاہ رہی تھی، لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔

”تمہارے کمرے میں رکھا وہ اب ہم میں نے دیکھ لیا ہے، جس میں میری تصویر پر تم نے لکھا ہے۔ دوستی کی تعریف کے لیے ویرا کا نام لکھی ہے، اگر تم خود غرض ہو، تو اپنے اب ہم میں جگہ جگہ مجھے محفوظ نہ کرتیں۔“

”میں تم سے حسد کرتی رہی اور تمہیں اپنا دشمن

لگا۔ وہ جا رہی ہے اور اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا۔ یعنی محبت پھر سے کم ہونے لگی۔ دونوں کے درمیان متوجع ضروری باتیں ایک طرف ہی رہ گئیں اور کیوں رہ گئیں وہ سوچتی ہی رہ گئی۔

تورات کے پہلے پھر اس کی آنکھ کھلی اور اسے سمجھ نہیں آئی کہ اتنی ٹھنڈ میں سادھنا نے اس کے کمرے کی کھڑکی آخر کس لیے کھول دی کہ وہ جو برا بھلا میں گولی سے نہیں مری وہ یہاں ٹھنڈ سے مر جائے۔ جب وہ سوئی تھی تو کھڑکی بند تھی۔ اب کھلی تھی اور ٹھنڈی ہوا انہرمت سے اندر آ رہی تھی اور ساتھ اپنے سنگ بچھ اور بھی لا رہی تھی۔

یہ ننھی ننھی چھوٹی بڑی گھنٹیوں کے ہوا کے دوش پر بجنے کی آواز سن گئیں۔ وہ زیر لب ہنسی۔ یہ میرا خواب ہے۔ نہیں تو پھر آگے بڑھنا چاہیے۔ وہ کھڑکی تک آئی۔

دھند میں لپٹے درخت برشل کاک کی سرسبز دیوار پر لگی لائٹ ایسے بڑی تھی کہ وہ آدھا اندھیرے میں تھا اور آدھا نیم روشنی میں اور جو نیم روشنی میں تھا۔ وہ رنگ برنگی اشکال میں جموتے کارڈوں سے سجاتا تھا اور وہ اس دوشیزہ کی طرح مسکرائی جیسے اس کا کم شدہ جوتا مل چکا تھا۔

حال ماضی کے درخت کی شاخوں پر فتح ہونے پہ منتہم ہے۔ تو شہزادے نے جان لیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور احوال دیکھ کر کھلی گئی ہے۔ اس نے گرم کوٹ پہنا۔ وہاں میں ہاتھ سے منظر کو گردن پر منڈیر۔ اسے پائیں ہاتھ سے کام کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ مشکل رفع ہو گئی تھی۔ دراصل سارے ہی دروازے کے اسپتال میں ہی رفع ہو گئے تھے۔

اس نے ہر رات درخت پر جموتے پھیلات کو بڑھنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ دعا کیا کرتی تھی کہ حقیقت میں نہ سہی خواب میں سہی اس کا یہ خواب پورا ہو جائے۔ خواب پورا نہیں ہوا۔ خواب نکل کر حقیقت میں بدل گیا۔

وہ بیوی دروازے سے باہر آئی اور گھوم کر اپنے

کمرے کے سامنے لگے درخت کی طرف آئی اور ذرا دور کھڑی ہو کر درخت کو دیکھتی رہی دیکھتی ہی رہی۔ "یہ میرا خواب ہی ہے ہاں بس۔ ضرور میرا خواب ہی ہے۔" وہ بیڑائی۔ پھیلات مختلف و گلش رنگوں کے رہنوں سے بندھے جمول رہے تھے۔ اس پاس کی دوسری شاخوں پر مختلف آرائشی فیتے اپنی اہمیت اپنی خوب صورتی سے بوجھا رہے تھے اور زمین پر موجود درخت الوسی ٹپلے کا "شاہ" بنا تاج پوشی کے لیے قائم کھڑا تھا۔

بست دیر تک کھڑے رہنے کے بعد وہ درخت کے پاس آئی اور ہاتھ بوجھا کر کئی شاخوں کو ایک ساتھ لہرا ڈالا اور گھنٹیوں نے رات بے کی بٹیں۔ ساری دھنیں اپنے اندر سمو کر ان پر سے اپنا اختیار اٹھا ڈالا۔ "ماضی مٹ چکا ہے۔"

وقت نے پرانے سکوں سے آراستہ اپنا تھل الٹ ڈالا اور صرف ایک "تاج" سکے سے خود کو سجا ڈالا۔ "عالیان!" سکے پر کند نام اس نے امرد کی طرف اچھال دیا۔ جو پیشانی سے لوہے کی گید۔

"امرد!" اسی سکے پر کند وہ سرانام اس نے عالیان کی طرف اچھال دیا جو پیشانی کے نیچے اس کی آنکھوں میں دمک اٹھا۔ وہ اندھیرے حصے کی طرف کھڑا تھا۔ امرد اس کی موجودگی سے انجان تھی۔ اس کا خیال تھا اسے امرد کو درخت تک لانے کے لیے بہت تردد کرنا پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب صرف گزر چکے وقت کا حصہ ہی بنے رہتا چاہتا تھا۔ گھنٹیاں فانوسی رآگوں پر اجاڑ داری رکھتی سرستی میں جموتے لگیں۔

"جو خواب حقیقت ہو جاتے ہیں۔ وہ خواب ہر ساعت تیا کریں۔" وہ دم بخود کھڑا سوچنے لگا۔ وہ جو وہ گھنٹے اس درخت کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ اسے بھی یہ یقین ہونے لگا کہ اس بار پھر سے یہ خواب ہی ہے۔ اندھیرے سے روشنی کی طرف اس نے قدم بڑھائے۔

اب گھنٹیاں سوز کے حکم کی بجا آوری کرتیں

”محرم“ کے کانوں میں سرگوشیاں عیاں کرنے کو لگیں اور پس منظر میں جس اللہ رکھار حمان کی رازونیا زکرتی دھنیں پریم پرست کے سرگم پر دل دھننے ”محو اظہار“ ہو گئیں۔

رات کے ذروں نے قطاریں پاندھ لیں اور روشنی کی لکیروں پھیلا جڑیاں بن گئیں۔ ہلکی ہوائن دونوں کے پیل اڑا رہی تھی اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنی منولیں طے کر رہے تھے۔ امردہ کا خیال تھا اس مہیج لڑی کو کارل سائی اور اس نے مل کر سچایا اور جھنے گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ہوا کے سنگ جھولتے ایک پیغام کو پکڑ کر پڑھنے لگی۔

”میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“

دلگہریب خوشی کے احساسات امردہ کے دل پر نازل سے ہونے لگے۔ وہ سر اپنی ہم بڑھنے لگی۔

”تم ایک جاگد گر ہو امردہ۔“ امردہ یوں مسکرا دی جیسے اس کی بات چرائی گئی۔

”جب تم نے رونا شروع کیا تو میرا دل چہا میں بھی تمہارے ساتھ مل کر روؤں کیونکہ وہ ایک جیسے لوگوں کو ایک ہی جگہ بندہ کر دینے کا اس سے اچھا موقع اور کب تک اسٹوڈنٹ پارٹی پرانگہ۔“

امردہ نے قہقہہ لگایا اور ذرا سا ڈر گئی کیونکہ درخت کے اندھیرے حصے میں چھپا کھڑا عالیان نکل کر سامنے آیا تھا۔

”اوپ۔ تم یہاں ہو؟“

”تو مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟ اس نے ہاتھ بلند کیا اور اس کے سر پر جھولتے پیٹلات سے بندھی گھنٹیاں لہراؤ لیں اور مستبر آسمان اور زرخیز زمین نے بڑی محبت سے اپنی ساعتوں کے پٹ ان مترنم آوازوں پر وا کیے۔

”جہاں عتاب رہنے کے لیے تم موجود رہتے ہو۔“ اسے یاد آیا وہ اس سے ناراض تھی۔

وہ محبت کے ٹھہرے احساس سے اسے دیکھتا رہا۔

”تو یہ ناراض ہونا صرف اپنا حق سمجھتی ہے۔“

”میں نے ان پیغامات کو جلا ڈالا تھا میری یادداشت اچھی ہے میں نے انہیں چند راتیں اور چند دن لگا کر پھر

سے لکھا۔“ وہ اپنے عتاب رہنے کی وجہ بتا رہا تھا لیکن نامکمل وہ امردہ سے چھپا رہا تھا کہ وہ اصل بھد شوق کن مصروفیات میں غلط رہا تھا۔

”تمہارے باتوں کی تو کیں تمہاری آنکھوں کو پریشان کر رہی ہیں۔ کیا میں تمہاری آنکھوں کو اس پریشانی سے بچاؤں؟ اس نے منڈب انداز سے پوچھا اور جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کی آنکھوں کو پریشانی سے بچایا۔

اپنی پریشانی پر اس کی آنکھوں کا لمس محسوس کرتے وہ ذرا سا اچھے ہوئی اور سر اٹھا کر پیغام پڑھنے لگی۔

اس نے ایک چلا کی کی گئی وہ سری زبوں میں کافی پیغامات لکھے تھے تاکہ امردہ اس سے ان کے مطلب پوچھے۔ دو دن تک ہل میں وہ مختلف ہال

مہیشن گئے کمروں کی طرف بھاگتا رہا اور وہ زیر لب ہنس کر اسے لکھ لکھ کر دیتے رہے تھے۔ جبکہ کارل اور

سائی اس کے کندھوں پر چڑھنے لکھنے والوں کو آنکھ مارتے رہے تھے تو اگر چند پیغامات کو امردہ کو گل کرتی تو

اسے معلوم ہو تاکہ جس کا مطلب عالیان مجھے اجازت دو میں آخ آخ کی تکرار پر لہرائی تمہاری تاک کو

پکڑ لوں۔ بتا رہا تھا تو اس کا اصل مطلب کارل کی آنکھ اور ہاتھوں کے اشاروں پر کچھ نہ نکلا۔

”کیا تم نے ٹھیک سے تاک پوچھنا سیکھ لیا۔ نہیں۔ یعنی ابھی بھی تم آئس کریم چاکلیٹ کے ساتھ

بہتی تاک۔ آخ۔ ان۔ گندی۔“

اور چینی جملہ جس کا مطلب عالیان تم ایک اچھی لڑکی ہو بلکہ تم میں کئی اچھی لڑکیاں چھپی ہیں بتا رہا تھا تو

اصل میں وہ۔

”تم ایک پٹاخہ لڑکی ہو بلکہ تم میں کئی بڑے بڑے پٹاخے پھوٹ بڑنے کو ہیں۔“ تھا۔

اور جیلانی جملے کا اصل ترجمہ ”خدا کے لیے اپنے ایشین فلک کو سنبھالنا سیکھ لو“ تو می پونی اس سے ابھ کر

زخمی ہو چکی ہے اور جو تو می پنی ہے وہ زخمی ہونے کے لیے قطار میں کھڑی ہے۔ تھا اور مصری جملے کا۔

”خدا کا شکر ہے ہمارا ماچسٹرو بننے سے بچ گیا۔“

اسے یاد آیا کہ زندگی بھی کن کن مراحل کو پہنچتی ہے۔
 سچائے کھڑی ہے۔ جو پیچھے رہ گیا تھا فی الحال وہ اب
 آگے آنے والا تھا۔ لیکن اس نے پہلے والی غلطی دوبارہ
 نہیں کی۔ اس نے ہاتھ بلند کیا اور گفتنیوں کو لہرا ڈالا اور
 وہ در تک قبولیت کے زیر اثر خوشی سے جیتی رہیں۔
 وہ کھڑی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی وہ بیٹھا اس کی
 مسکراہٹ پر غار ہو رہا تھا۔

”محبت پر فرمان غالب آگیا اور فراق کو رخصت کی
 اجازت دے دی گئی۔ کیونکہ تامل کرنے ”محبت“ کو
 ”من“ کر کے ”محرّم“ بنا دیا۔“
 اب تکرار کی ضرورت رہی نہ انکار کی حاجت۔

وہ لاہور آئی اور یہ دیکھ کر مت خوش ہوئی کہ گھر
 ایسے سجایا تھا جیسے کوئی اہم شخصیت آ رہی ہو۔ اس کا نیا
 کمرہ بے انتہا خوب صورت سجایا گیا تھا لیکن وہ کمرہ اس
 نے حوا کو ہی دے دیا اور خود اپنے اور دادا کے کمرے

میں ہی رہی۔
 وانیہ کی ممکن نوٹس کی خبر تو اسے ماچسٹر میں ہی
 معارف ہو چکی تھی واپس آکر اندازہ ہوا کہ خاندان سے
 تعلقات بھی برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔

سب گھر والوں کو اس کے زخمی ہونے کے بارے
 میں دادا نے بتا دیا تھا گولی لگنے کا نہیں۔ دادا اکیلے ہی
 اسے ایئر پورٹ لینے آئے تھے اور وہ کبھی نہیں کیوں
 کیوں کہ انہیں اسے گلے لگا کر بہت رونا تھا۔ اسے
 سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیوں اتنا رو رہے ہیں اب
 ہی تو وہ ٹھیک ہوئی تھی۔ اسے دادا کی ہر حرکت مشکوک
 لگ رہی تھی بلکہ اسے دادا سے ہی ڈر لگ رہا تھا۔

یہ اتنا وقت اس کے دور رہنے کا اثر تھا یا زخمی ہونے
 کا۔ دادی اور اماں اس کے ساتھ گھر کا ”کلوٹاؤنڈ“ والا
 سلوک کر رہی تھیں۔ اس کے آنے کے تین گھنٹے کے
 اندر اندر ہی ایک جنگ چھڑی حوا، علی اور وانیہ کے
 درمیان اور وانیہ سب چیزیں لے کر اپنے کمرے میں
 قلعہ بند ہو گئی ان تینوں نے اس کا سامان کھول کر خود

اور کو رہن جملہ جو عالیان نے مجھ پر شکر لازم ہے۔
 لکھنے کے لیے کہا تھا تو دراصل وہ کچھ یوں لکھا گیا تھا۔
 ”ہم بھی ماچسٹر کی پیداوار اپنی ایک امرت لہور پر
 اتاریں گے“ انہیں بھی معلوم ہون میں ستارے اور
 رات میں سورج کیسے دکھتے ہیں پھر کیا وہ شکر ادا
 کیا نہیں گے؟“

اگلا جملہ اطالوی میں لکھا تھا اور آخر کار وہ اس پیغام
 تک پہنچ ہی گئی تھی۔

”یہ کیا لکھا ہے؟“ اس نے لکھنے والے سے رابطہ
 کیا۔

وہ مسکرایا اسے دیکھا جھکا اور ایک گھنٹے کو نیک کر
 زمین پر بیٹھ گیا اور اس کو لایا ہا تھا پکڑ لیا۔

”اس کا مطلب ہے میرے سامنے جھک کر میرا
 ہاتھ تھام لو۔“

”جھک سہ“ کی مگر گاہوں کی رائی بنی وہ لہرا سی
 مٹتی۔

”مٹتے چھوٹے سے جملے کا اتنا بڑا مطلب؟“

”ہاں۔ جیسے ایک امرت کا مطلب سارا عالیان۔“
 اس نے کاملیت لیے کہا۔

اب اس کے آگے دو سرا پیغام تھا جو فریج میں تھا
 اس نے کن اکھیوں سے عالیان کو دیکھا اور مطلب
 پوچھنے کی غلطی نہیں کی بلکہ اس نے مطلب بتانے
 کی جلدی ضرور کی۔

”اس کا مطلب ہے میرا وہ سرا ہاتھ بھی تھام لو۔“

بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اس کا وہ سرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

اس بار اس کی ہنسی اتنی دیر تک گونجتی رہی کہ وہ
 سیف الملوک پر اترتی پریوں کی آنکھوں کی چمک بن
 گئی۔ ”گور ایک پیغام جو میں نے لکھا ہی نہیں وہ میں
 تمہیں سناتا ہوں“ اس کا انداز بانسری ہو گیا اور الفاظ
 ”راہ گل ارغون“ کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔

”ججھ سے شادی کرو گی امرت؟“ سوال پھر سے
 دہرایا گیا اس بار دونوں ہاتھ تھام کر اور سب کچھ جان
 کر۔

امرت کا پورا وجود ہی ایک خوف میں سمٹ آیا اور

ہی سب کچھ نکال لیا تھا میں کھٹے بھی پتا نہیں وہ کیسے رکے رہے۔

اب حملو دانیہ کو دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دے رہا تھا اور دانیہ یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ تو پیدائشی بہری ہے اور گوئی بھی۔ خیر مزید چند کھٹے لڑنے کے بعد آخر کار وہ طے کیا کہ کیا کس کا ہے۔

اسے آئے ایک دن بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سنا دواوی اور اماں کسی فیملی کو گھر بلانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے بہت آرام سے خود کو دواوی میں مگر البتہ (ڈرامہ) اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اس سے تو چلا بھی نہیں جا رہا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ بات کرنا ہی بھول جاتی ہے۔

داوا البتہ زیر لب ہنسے جسے دیکھ کر اس نے سوچا۔
”یہ اپنا شہسوار تیار کر کے بیٹھے ہیں ایک دو شہسوار دواوی اور اماں کے پاس بھی ہیں۔“

اس نے اور عالیان نے کھن سب معاملات پر ایسی بات نہیں کی تھی۔ امرجہ نے اس لیے کہ ”تی الخمل وہ کچھ بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے تھوڑا وقت چاہیے تھا اور عقل مندانہ حکمت عملی اپناتی تھی۔ وہ یہ سب واپس جا کر کرنا چاہتی تھی۔ معاملات ظاہر سے ویسے ہی دیکھتے تھے جیسے پہلے تھے فرق صرف یہ تھا کہ اب عالیان اس کے ساتھ تھا پہلے تو اسے دواوا کو منانا تھا۔

عالیان نے اسے بتایا تھا کہ دواوا کی اور اس کی بات ہوتی رہی ہے اور امرجہ نے یہی سوچا کہ جیسی صورت حال چل رہی تھی۔ دواوا کسی سے بھی بات تو کر ہی سکتے تھے۔ عالیان سے بھی۔ اور یہ اسے کوئی ایسی بڑی بات نہیں لگتی تھی۔

”تم سے ملنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ جس بستر پر وہ معذور ہونے کا ڈرامہ کیے دراز تھی وہاں اس کے پاس اس کا ہاتھ پکڑ کر دواوا نے کہا۔

”لیکن میں تو چل بھی نہیں سکتی۔ کیسے ملوں گی؟ آپ بھول رہے ہیں برازیلا میں مجھے گولی لگی تھی۔ گولی بگھتے ہیں آپ؟“ وہ بڑی گھٹن زدہ سی نظر آنے لگی۔

”ہاں! گولی مطلب گولی ہی۔“ دواوا نے
”تو گولی کھانا کوئی آسان ہے اتنی تکلیف رہتی ہے میرے شانے میں اور چلتی ہوں تو بری طرح سے چکر آتے ہیں۔ ماچسٹر سے لاہور میں صرف آپ کے لیے آئی ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ٹھیک ہو گئی ہوں مجھے بیماری سمجھا جائے دواوا۔“
”وہ بیمار کے کمرے میں آجائیں گے۔“ دواوا اس کے انداز سے مظلوظ ہوئے۔

”ہو سکتا ہے اس وقت میں سو رہی ہوں۔“ وہ نیم دراز ہو گئی۔

”جب تم جاگ رہی ہو گی وہ تب آئیں گے۔“
”میرے کمرے سے دواویوں کی بو آتی ہے مجھ میں سے بھی۔ ایسے موقع پر سادھنا کہتی ہے ”چھی چھی۔“ برا منہ بنانے میں اس نے سب بروں کو مات دے دی۔“

”ہی ہی۔ ایسے موقع پر دواوا یہ کرتے ہیں۔“ دواوا کہتی ہی دیر بہتے ہی رہے۔
”تو میں ان مہمانوں کو انکار کروں کہ تم نہیں ملنا چاہتیں؟“

”بالکل! پھر کبھی سہی (وہ کبھی جو کبھی نہیں آئے گی)۔“

”پھر کب؟ تم ماچسٹر چلی جاؤ گی، ہٹل کاک میں لیڈی مہر کے پاس وہاں وہ تم سے تمہارا ہاتھ تو نہیں ہاتھیں گی نا؟“

اس نے چونکنے میں وقت لیا کیوں کہ بات دیر سے سمجھی۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”نہیں امرجہ! اب مذاق نہیں۔“ انہوں نے افسردگی ملی سنجیدگی سے کہا۔

”سنو میری بیماری ماچسٹر سے دو خوب صورت لوگ لیڈی مہر اور ان کا بیٹا عالیان آج صبح لاہور آ گئے ہیں اور اس وقت ہوٹل میں ہیں اور ابھی میں ان کے ساتھ چائے پی کر آ رہا ہوں اور کچھ ہی دیر میں مجھے ان کے پاس واپس جانا ہے، کھل دن میں عالیان ہمارے گھر آئے گا۔“

امرد کے دیکھنے اور سننے کے انداز میں بے یقینی تھی۔
 ”آپ کیا کر رہے ہیں دادا؟“ اس نے سہم کر پوچھا
 اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اس کے شانے میں تکلیف
 اٹھی اور بڑھنے لگی

”وہ سب جواب میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں۔
 مجھے تمہیں کچھ باتیں بتانی ہیں امرد! تم جانتی ہی ہو کہ
 میری ماں اس لیے مر گئی تھیں کہ انہیں سانپ نے
 کاٹ لیا تھا اور ان کا بروقت علاج نہیں ہو سکا تھا۔ ہم
 سب بس بھائی ان کے گرد جمع ہو کر رہے تھے اور
 میں دیکھ رہا تھا کہ جیسے موت ان کی سفیدی کو سیاہی میں
 بدل رہی ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے دردناک
 وقت تھا اور دو سرا دردناک وقت وہ تھا جب تم میرے
 سامنے بیٹھی رو رہی تھیں۔ امرد! تمہیں بھی سانپ
 نے کاٹ لیا تھا اور زہر تمہاری آنکھوں سے پھوٹ رہا
 تھا، سنگ پور تھا اور اس کا زہر تمہاری رگوں میں
 دوڑتا مجھے دکھانی دینے لگا تھا۔ تمہاری سورت کی
 سیاہی نے میری آنکھوں کا نور جذب کرنا شروع کر دیا
 اور میں جان گیا کہ بروقت علاج نہ ہو تو کون تمہیں
 مرنے سے بچا سکے گا۔ میں نے عالیان کے لیے لیڈی
 مر سے بات کرنا چاہی، لیکن مجھے ساوھتا نے بتایا کہ
 عالیان اور ویرا شادی کر رہے ہیں۔ میری غیرت نے
 گوارا نہ کیا کہ میں عالیان سے بات کروں، لیکن میں
 نے خدا کے حضور اپنی بات رکھ دی۔ تمہارا تریاق
 عالیان ہی ہے حقیقتاً“ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا
 جب میں نے براز ملا میں اس سے بات کی۔“

پہلی گفتگو کے بعد دو سری گفتگو بڑھ گھٹنے کے بعد
 ان کے درمیان ہوئی۔ دلوانے عالیان کو فون کیا تھا۔
 ”تمہیں بہت حیرت ہوگی میری بات سن کر، لیکن
 اگر تم یہ یقین رکھو کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تو میں یہ
 کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک دم سے تمہیں اپنے
 دل کے بہت قریب پایا ہے اتنا ہی قریب جتنی امرد۔“

ہے۔ میں ان احساسات کی قدر کرتا ہوں جن کے زیر
 اثر تم اس حالت میں نظر آ رہے ہو۔ میں ایک بوڑھا
 انسان ہوں میری سوچیں بھنگ بھنگ جالی ہیں، لیکن
 میری ایک سوچ تم پر آکر ٹھہر گئی ہے کہ میں نے تم جیسے
 انسان کے بارے میں امرد کی باتیں لاپرواہی اور غفر
 سے کیوں نہیں۔ میں نے اس بات کو معمولی کیوں
 جانا جب اس نے کہا کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔“

عالیان خاموشی سے سب سنتا رہا اور حقیقت یہ
 تھی کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ دنیا میں وہ
 اپنی عظمت کی دھاک کس کس پر بٹھا چکا ہے اسے
 صرف ایک ہی دکھ تھا کہ جو یہ بات اس کے لیے لکھے
 گئے اس نے وہ نہیں لیے اور جو ہاتھ اس سے چھوٹ
 گیا اس نے وہ مضبوطی سے پکڑ کیوں نہ لیا۔ اس وقت
 اس پر اپنی ذات کی ساری پستیاں اور خرابیاں عیاں
 ہو گئیں اور اس نے اپنی ساری بد صورتی دیکھ لی۔
 ”بھی کبھی ہم بوڑھے کچھ باتیں دیر سے سمجھتے
 ہیں۔“ دادا نے یہ آخری بات کی جو ایک ہچکچاہٹوں کا
 احساس لیے ہوئے تھی۔

”ہم نے مجھ سے کہا کہ انسانوں کے ہجوم میں
 تمہیں ایک ایسا انسان ملا جس کی آنکھ میں رحم دلی اور
 اخلاق میں نرمی ہے۔ میں یہ کیسے بھول گیا کہ ساری
 زندگی تم نے بے رحمی اور بد اخلاقی ہی دیکھی تھی تو
 اب اس کی اصل قدر دان تم ہی تو تھیں۔ تم نے کہا
 امرد تمہیں ہمیشہ اپنی قسمت پر رشک رہا جو عالیان کے
 ملنے سے رشک میں بدل گیا اور تم نے کہا امرد کہ
 مشرق ایک گنجان خطہ ہے فلسفیوں کے ان فلسفوں
 سے بھرا ہوا جن کے پینڈے میں لعصب ہوتا ہے اور
 کنارے پر منافقت۔“

تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی میں کئی راتیں اس
 سوچ کو لے کر جاگتا رہا کہ تم نے اتنی بڑی بات کیسے سیکھ
 لی۔ تم معاشرے کی جڑوں میں کب گھس گئیں اور
 کھری کھوٹی حقیقت کیسے اکھاڑا میں؟

تو تم واقعی میں بدل چکی تھیں مجھے پہلے اس سوچ نے پریشان رکھا پھر جب میرے دل سے خود ساختہ تعصب چھٹا تو مجھے تم پر فخر ہوا۔

ہاں امرد یعنی انسانیت میرا مطلب حسب نسب والا یعنی انسان ہی تھا اور میں بھی چاہتا تھا کہ تم ہم دو میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔ ”میرا“۔ یہ بھی میری کنارے کی منافقت۔ امرد ہمیں کچھ وقت لگتا ہے لیکن ہم اپنا آپ پاسی لیتے ہیں اور میں نے بھی اپنا کھرا کھوٹا پاسی لیا۔ تمہارے پاس تو کوئی انسانوں کو ناپنے کا آلہ نہیں تھا پھر بھی تم نے جان لیا کہ ”انسان“ ہونا کسے کہتے ہیں اور میں جس نے معاشرتی جنگل میں کئی عشرے اپنے پتوں سمیت گزارے میں کیسے چوک گیا۔ یہ بھی میرے ہنر کی منافقت۔ جس سے لگاؤ ہو جائے اس کے لیے ہم کائنات میں بھاگ دوڑ کر کے بہت سے لطفے اکٹھے کر لاتے ہیں کہ دیکھو بے مثال ہے ہم اسے اس آنکھ سے دیکھتے ہیں جو آنکھ دنیا کے پاس نہیں ہوتی جو ہمیں روشنی نظر آتی ہے وہ معاشرے کو اندھیرا دکھاتا ہے۔

اگر تم بے قصور ہوتے ہو تو قصور ہمارا بھی نہیں ہوتا۔ ہاں امرد ہمیں یہ مان رہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارا سر نچا نہیں ہونے دے گی اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے جیسے یہ غرور حاصل نہیں کپاتے کہ ہم نے اولاد کی خوشیوں کو نچا نہیں ہونے دیا۔

ایک دن میں بارگ میں بیٹھا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ایک بچہ پرندوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے پھر اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اسے بھی اڑنا ہے تو اس کے باپ نے اسے اپنی پشت پر پھیلا لیا اور اپنے بازو پھیلا کر اڑنے کے انداز میں بھاگنے لگا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے ایک بات بروقت سکھائی کہ میں تمہارے دو پر کیوں نہیں بن گیا کہ تم اڑ سکو، میں نے تمہیں موت کی طرف کیوں دھکیل دیا، میں نے تمہارے پر کاٹ کر تمہیں روایات میں کیوں جکڑ دیا۔ تمہارا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا تمہارے مقاصد فوت ہو گئے، تم بچھ گئیں۔ تو اب میں اپنا آپ تمہیں دیتا

ہوں میں تمہاری وہ ماں اور تمہارا وہ باپ جو انسان کے دور ہوتے ہیں کہ اگر اسے یہ دور نہ لگیں تو وہ بھی زندگی کے اتفاق پر نہیں اڑ سکتا تھا ہوں۔

تم نے اپنی حدیں نہیں پھیلائیں اور میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب میں تمہیں یہ نصیحت پھر کرتا ہوں ”چیزوں سے لاپرواہی برتو اور انہیں گم کرو، یعنی انسانوں کی پروا کرو اور انہیں گم نہ ہونے دو۔“

لیڈی مرنے خود فون کیا تھا مجھے تمہارے لیے میں نے بہت سے حساب کتاب لگا کر انہیں اور تمہیں یہاں بلایا ہے اور میں نے ہی انہیں کہا تھا کہ وہ اپنے آنے کے بارے میں تمہیں نہ بتائیں کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ تم انہیں منع کرو گی، تم واحد سے انہیں ڈراؤ گی اور پھر تم خود بھی نہ آئیں۔ کیوں کہ تم یہاں کی متوقع صورت حال کو سمجھتی ہو۔“

”بابا نہیں مانیں گے۔“ امرد ڈر رہی تھی۔
”وہ بعد کی باتیں ہیں اگر تمہارے شانے میں گولی کے اثرات کچھ کم ہو گئے ہیں تو لیڈی مرنے کے لیے کرو تیار کرو۔ وہ آج رات ہمارے گھر رہیں گی۔ ان کے آنے کی اطلاع میں نے تمہاری ماں اور دادی کو دے دی ہے۔“

شانے کی ساری تکلیف ختم ہو چکی تھی، لیکن نئی تکلیف اس کے دلغ میں اٹھی تھی۔ ”ہاں اور عالیان۔“ اس نے سوچ کر۔



پاک سرزمین کا چاند ہے
سرخ رخس روشن بیاب ہے
قرارداد کی یادگار ہے
”ماہور“ جو شر ہے مثل ہے
اس نے پیروں کی تالی ایسے بجائی جیسے جھمکو کوں میں
چھٹی کھڑی لڑکیوں کو ہنسانا چاہتا ہو اور وہ جھٹوں کی اوٹ
میں کھڑی واقعی نہیں بھی رہی ہوں۔
اس نے ہوٹل کی شاپ سے شلوار قمیص سوٹ
خرید کر پہن لیا تھا۔

”شلوار لیں مجھ پر سوٹ کر رہی ہے نا؟“ اس نے
 ماا سر سے پوچھا۔
 ”یہ بنی ہی تمہارے لیے ہے۔“ اس کی پیشانی چوم
 کر انہوں نے کہا۔

لیکن اس کو اطمینان یوں نہیں ہوا کہ وہ تو ماں ہیں
 ایسے ہی کہیں گی تو اس نے کمرے سے ہوٹل کے باہر
 تک ملنے والے ہوٹل کے اسٹاف سے پوچھا اور انہوں
 نے مسکراہٹیں بجا دیا کر کہا ”ہاں۔“
 پھر اس نے سوچا کہ وہ تو ہوٹل کا اسٹاف ہے اخلاق بھلا
 رہا۔ بے لاہور والوں سے پوچھنا چاہیے سچی وہی بولیں
 گے۔

تو اس نے سڑک پر ملنے والے دو چار ہمیں ”آٹھ
 دس لوگوں سے پوچھ لیا اور جواب میں اسے جو
 مسکراہٹیں ملیں وہ اسے بہت بھلی لگیں۔ اگر کوئی
 اسے دیوانہ شیوانہ سمجھ رہا تھا تو اس میں بھی خوش
 تھا۔ کیوں؟

کیوں کہ ”شہسواراں“۔ ”شہسواراں“ ہوتا ہے۔
 پھر امتیاز یوں مٹ جاتا ہے کہ ہر ایک کو گلے لگانے
 کو دل چاہتا ہے کہ یارو! ہلو! آج سے میں بھی
 لاہوری ہوں۔ مجھے مبارک یادیں ہیں بھی لاہوری
 ہو گیا ہوں۔ یہ پہلا شلوار لیں اب میرا بھی ہے۔
 کلاہ کسی کڑیل پنجابی کی طرح مجھ پر بھی نچے گا اور کھنی
 موچھوں کو ٹانوں میں بھی جان جاؤں گا۔ آہ جو کھیر کو
 انگلی سے چاٹتے ہو تو آج سے یہ انداز میرا بھی ہے
 اور ابھی میں نیا ہوں، لیکن جلد ہی میں چنگ کو ”بو“
 کرنا سیکھ جاؤں گا اور مجھے دیر نہیں لگے گی بان کو نہاری
 میں ڈبو ڈبو کر کھانے میں اور اس کا عادی ہونے میں کہ
 پھیری بوالے کیسی مزے مزے کی صدا میں لگایا کرتے
 ہیں اور ڈھول والے کیسی کیسی تھاپ پر ڈھول بجایا
 کرتے ہیں اور گول مگے والا کیسے بھر بھر کر کھنے کی
 چالیاں دیتا جاتا ہے اور آپ ہی بتائیں کیا میں بھی یہ
 نہیں کہوں گا کہ لو بھائی جی ڈیرے ”او میاں صاحب“
 دے تیرا بیترے۔ رادے ساتوں جان دے۔
 وہ ایویں مسکرا مسکرا کر سب کو دکھاتا جاتا پھر اس

نے فون نکال کر امرتھ کو کہا جس کی ابھی واوا سے گفتگو
 ختم ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل
 ہو رہا تھا کہ عالیان لاہور آچکا ہے۔

”مرثہ! لاہور میں یہ گیارہواں انسان ہے جس
 سے میں نے برف پاری کا پوچھا اور اس کا کہنا ہے کہ
 اتنی زیادہ برف پاری ہوئی ہے کہ ہمیں کئی مہینوں تک
 گھروں میں بند رہنا پڑتا ہے۔“
 امرتھ ہنس دی۔ ”اور؟“

”اور میں نے ایک خاتون سے پوچھا کہ امرتھ کہاں
 ملے گی تو وہ سہم گئیں اور الٹا مجھ سے پوچھا کیا۔ امرتھ
 واپس آئی اتنی مشکلوں سے تو اسے نکالا تھا لاہور
 سے۔ تم نے سب کو کتنا تنگ کر رکھا تھا یہاں امرتھ؟“
 ”جھوٹ۔ سارا لاہور مجھے نہیں جانتا۔“

”لیکن سارا لاہور اب مجھے ضرور جان جائے گا۔“
 خوشی اس کے انداز سے ایسے آشکار ہو رہی تھی جیسے
 اسے شہلاہور کی چالی پیش کر دی گئی ہو۔

”ضرور جان جائے گا تم اتنا چلا کر حویل رہے ہو۔“
 امرتھ نے اس کی خوشی محسوس کرلی۔

”میں چلا نہیں رہا میں خوش ہوں میں نے خوابوں
 میں ناہور کی سیر کی ہے ان سڑکوں پر تمہیں ڈھونڈنا رہا
 ہوں میں۔“

”مجھے ڈھونڈتے خود نہ گم ہو جانا لاہور میں اور یہ
 تمہارے پیچھے شور مٹا ہے۔“

”ہاں میں سفر کر رہا ہوں نا۔“ وہ اور چلا کر بولا۔
 ”تم کس طرف سفر کر رہے ہو، جو اتنا شور ہے؟“

”ڈیرا اور آگے ہے۔ میں کیسے پوچھوں کہ یہ کون
 سی سڑک ہے، ٹھہرو میں اس سچے سے پوچھتا ہوں۔“

”سچے سے؟ تمہارے ساتھ سچے کیا کر رہے ہیں؟“
 ”اسکول کے سچے ہیں میرے ساتھ بیٹھے ہیں

یار۔“
 ”تم بس بیٹھے ہو؟“

”نہیں۔ رکشے میں۔“
 ”کون سے رکشے میں؟“

”جس کے آگے پیچھے پانچ چھ لوگ بیٹھے ہیں۔“

”آف علیان۔! تم چاند گاڑی میں بیٹھ گئے؟“
 ”اسے چاند گاڑی کہتے ہیں۔ کیوشب میں اس
 چاند گاڑی کو ماچھسٹری سڑکوں پر دوڑتے ہوئے دیکھ رہا
 ہوں تم نہیں دیرا سالی اور کارل ڈرائیور ایک ساتھ
 کتنے ہی لوگ اور جہاں مرضی لے جاؤ۔“
 ”تم نے کہا پانچ بجے اس میں تین آگے اور تین
 پیچھے بیٹھے ہیں، مطلب تم کل تک بیٹھے ہو!؟“
 ”مرد کو اس کی طرف سے نئی فکر تھی۔
 ”ہم تک نہیں ہیں۔ ہم پانچ لوگ پیچھے آرام
 سے بیٹھے ہیں۔“
 ”پانچ لوگ؟“
 ”مرد چلا اٹھی۔

”ہاں! مرد۔ سیٹ پر ہم تین ہی ہیں دو بچے
 میرے دو گھنٹوں پر بیٹھے ہیں۔“
 ”کہتے ایک دم اس کی آہی نکلی۔ رکشہ اچھلا تھا اور
 اس کا سر صحت سے لگا تھا جو ویسے بھی صحت سے ہی
 لگا ہوا تھا اور وہ جھک کر بیٹھا ہوا تھا۔ بچے ہنسنے لگے۔
 موبائل اس کے ہاتھ سے سڑک پر جا گرا۔ بچوں نے
 شور ڈال کر رکشہ روک لیا اور بھاگ کر سڑک سے اس کا
 فون اٹھا کر لائے۔ اس نے آن کیا تو امرتہ کی کل آ رہی
 تھی۔

”فون کر گیا تھا۔“ وہ اپنا سر مسل رہا تھا جو ذرا زور
 سے لگ گیا تھا۔
 ”تم تو نہیں گے؟ تم کوئی ٹیکسی نہیں لے سکتے
 تھے؟“

”میں ٹیکسی میں ہی بیٹھ رہا تھا پھر مجھے یہ چاند گاڑی
 پسند آئی۔ ہو مل والوں نے مجھے سائیکل دے دی
 تھی پر مجھے تو راستے ہی نہیں آتے تو میں نے واپس
 کر دی۔ اگر تم سائیکل کے پیچھے بیٹھو اور مجھے راستے
 بتائی جاؤ تو میں لاہور گھوم لوں۔“

”مجھے خود راستے نہیں آتے۔ میں تمہیں اپنے ہی
 شہر میں ایسے گم کر دیتی کہ کوئی ہمیں ڈھونڈ نہ سکتا۔“
 ”اچھا۔ چلو آؤ پھر گم ہو جاؤ!؟“
 ”ہمارے علاوہ کسی کو نہ ملیں۔“
 ”ہم نہیں، لیکن اب تم ضرور گم ہو جاؤ گے۔“

”میں نقشہ لے کر نکلا ہوں تھی۔“
 ”یہ تمہاری یونیورسٹی نہیں ہے کہ تم نقشہ لے کر
 ہر جگہ چلے جاؤ۔“
 ”تم غلط ہو۔ میں امرتہ نہیں ہوں جو نقشہ ہاتھ
 میں لے کر بھی گم ہی ہوتا جاؤں۔“
 ”تم جا کہاں رہے ہو؟“

”تاریخی شہر کی تاریخی مسجد کی طرف اور سنو امرتہ!
 داوا کے روئے سے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ تم سے ملنے
 نہیں دس گئے۔ تم اپنے گھر کا ایڈریس مجھے دو، میں
 تمہارے گھر کی کھڑکی تک تو آئی جاؤں گا۔“
 ”یہ ماچھسٹری نہیں ہے ایسا ڈر مین کہ تم عمارتیں
 کودتے پھلاکتے یہاں وہاں آتے جاتے رہو یہاں ہم
 عمارتوں پر خاردار تاریں لگواتے ہیں اور فن میں کرنٹ
 چھوڑ دیتے ہیں۔“
 ”کیوں؟“

”تم جیسے ایسا ڈر مینوں کے لیے۔“
 ”کیوں لاہور میں دو میو نہیں ہوتے؟“
 ”ہوتے ہیں پر ساتھ جو لیٹ کے ابا جی بھی ہوتے
 ہیں۔“
 ”ہا۔ تم مجھے اپنے پیپا سے ڈرا رہی ہو۔ میں ڈرنے
 والا نہیں۔“

”تم ڈرو نہ ڈرو وہ تمہیں ڈرا دیں گے۔“
 ”میں تارپاکستان کے ایک طرف چاند گاڑی رکی تو اس
 نے سہیلی ملی اور اب ڈیٹ کر دی۔“

”سی ان مولن کار!؟“
 ”گنڈ چاند پر جا کر ہم پر پھر نہ پھینکتا۔“ شاہ ویز کا
 فوری کھنٹ آیا۔
 ”آتے ہوئے ایک لیتے آنا۔“ سالی نے کہا۔
 ”یہ تمہارے ساتھ بیٹھے بچے کیا کھا رہے ہیں؟“
 کارل کا بھوکا کھنٹ آیا۔

”یہ بچے ہوئے جتنے کھا رہے ہیں اور ایک زبان خدا
 کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ لاہور میں کوئی کارل نہیں اور
 علیان کارل جیسا بھوکا نہیں۔“
 علیان نے لکھا اور اس کے کھنٹ کو ہر اس ہل

پس مناسب الفاظ ہیں تاکہ اور کیا وہ ترش اور تلخ تو نہیں کہ سامنے موجود انسان کی مسکراہٹ پر بھاری پڑیں۔

”کیا اب ہم کچھ غور طلب باتیں کر لیں؟“ وہ کھانا کھا چکا تو دادا نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔

”میں نے تم سے یہاں آنے سے پہلے کہا کہ صرف ایک بار اگر تم اپنے والد کو اپنے ساتھ لا سکو تو میرے لیے آسانی رہے گی، بے شک پھر تم ان سے کبھی نہ ملنا، لیکن تم نے انکار کر دیا۔ اب میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ لیڈی مری تمہاری والدہ ہیں۔“

دادا اچھی طرح سے جانتے تھے کہ وہ بہت بڑی بات کر رہے ہیں اور واقعی وہ ایک بڑی بات ہی تھی، عالمیان کے چہرے کے رنگ ایک دم سے بدلے۔

”ماما میری ماما ہیں، لیکن ماما گرےٹ کی موجودگی کو چھوڑنا ان پر ظلم ہوگا، پھر میں وہ سراسر انسان ہوں گا جو ان کی تزیین کرے گا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں بلکہ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ معاملات کتنے بھی پیچیدہ کیوں نہ ہوں، آپ ماما گرےٹ کا تعارف مجھ سے پہلے امرت کے خاندان سے کروائیں۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر قہقہے سے کہا۔

”تم یہاں کے مسائل کو نہیں جانتے۔“
”شاید، لیکن اپنی خوشی کے لیے میں ماما کی عزت و تکریم کو کیسے کتر کر دوں۔“

”عالمیان! امرت کا باپ نہیں مانے گا۔“
عالمیان خاموش ہو گیا۔ جتنا شہناہ کھا چکا تھا وہ کڑوا ہو گیا۔

دادا کو بھی خاموش ہو جانا پڑا شاید انہوں نے اس کا دل دکھا دیا تھا۔ فون پر انہوں نے اس سے کئی باتیں کی تھیں، لیکن یہ بات وہ اسے سامنے بٹھا کر کرنا چاہتے تھے۔

”شاید تم یہ سوچتے ہو کہ واجد ایک جاہل انسان ہے، لیکن وہ جاہل نہیں ہے اس جیسے سب باپ جاہل

میٹ نے لانسک کیا جو بڑے سائنحات ہاتھ سے پکائے کھانوں، مہنگے، پزرا، سینڈویچز اور چھوٹے سائنحات کیڈی بسکٹ، چاکلیٹ کی گشدرگی سے گزر چکا تھا۔
”یعنی لاہور ایک نعمت سے محروم رہ گیا۔“ کارل نے کھنٹ کیا۔

”نہیں، ایک آفت سے محفوظ ہو گیا۔“ عالمیان نے جواب دیا۔



شاہی مسجد میں نماز عصر کے بعد وہ باہر نکلا اور اطراف میں گھومتا رہا اور کانڈ کی کون سے بھنے چنے نکال نکال کر کھاتا رہا پھر دادا سے آئے اور اپنے ساتھ گھمانے لگے لیڈی مری کو گھر چھوڑ آئے تھے۔

رات کا کھانا کھلانے وہ اسے نوڈ اسٹریٹ لے آئے تھے۔ دادا نے کھیر پہلے ہی منگوا کر رکھ لی تھی تاکہ اگر اسے زیادہ مرچیں لگیں تو وہ کھیر کھالے اور اتفاق سے وہ کھانے سے زیادہ کھیر کھا گیا اور اس کے کان اور ناک سس خ ہو گئی اور آنکھوں میں پانی تیرتا رہا۔

دادا اسے دیکھ کر ہنسنے لگے اور وہ خود بھی ہنسنے لگا اور اس دوران اگر کوئی کمزور بیٹائی والا بھی اسے دیکھتا تو رک کر ضرور کہتا ”بہت خوش ہو۔ خدا تمہاری خوشی کو نظریہ سے بچائے۔“

”ہو سکتا ہے تم یہ محسوس کر رہے ہو کہ تمہیں اچھے انداز سے خوش آمدید نہیں کہا گیا اور امرت کے خاندان کے نام پر صرف میں ہی تم سے مل رہا ہوں۔“

”میں نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔ میں نے یہاں اگر اجنبیت محسوس نہیں کی، خوش آمدید کہنے کا اس سے بہتر انداز لور کیا ہوگا۔“ اسے وہ سچے یاد آئے جو اس کے گفتگو پر بیٹھے تھے اور اپنے منہ کے ساتھ ساتھ اس کے منہ میں بھی چنے ڈال رہے تھے، جیسے وہ جان گئے تھے کہ کوئی پہلی بار ان کے دل سے آیا ہے اور مسلمان نوازی میں انہیں بھی اپنا حصہ ڈالنا ہے۔

دادا کو عالمیان کی بات اچھی لگی۔ انہوں نے سوچا کہ آگے جو وہ کہنے جا رہے ہیں اسے کہنے کے لیے ان کے

نہیں کرنا جن انسانوں سے زیادہ روایات کا احترام کیا جاتا ہے، اس نے اب جانا کہ ان روایات کا احترام ہی دراصل ان سے جڑے انسانوں کا احترام ہے۔ اگر ہم ”بہنوں کی عزت“ کی روایت کا احترام نہیں کریں گے تو ”چھوٹوں سے عزت“ کی وصولی ہمیں بھولنی پڑے گی۔ اور پھر ایسے انسانی معاشرے کا پھلنا پھولنا ایسا ہی ہو جائے گا جیسے درخت کا زمین کے بغیر نمودار ہونا یعنی ”مرد ہی نہ رہتا“

”مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی کہ تم نے امرہ کو اکسایا نہیں، زنہہ جس تیزی سے ترقی کر چکا ہے ایسے وقت میں یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوتی۔“

”میں کبھی ایسا نہ کہتا اور کرتا بھی تو امرہ نہ مانتی۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم کل گھر آ رہے ہو، تم ابھی صرف سب سے ملو گے، پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

داؤد کچھ زیادہ پر امید نہیں تھے۔

عالیان سمجھ سکتا تھا کہ ان کے لیے سب کتنا مشکل ہو رہا ہے کہ کھانے کے نام پر انہوں نے صرف چند ٹوالے ہی کھائے تھے۔



”تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے امرہ۔“

”شکریہ۔“ ان کے سونے سے پہلے وہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ امل اور داؤد نے اچھی میزبان ہونے کا ثبوت دیا تھا اور لیڈی مہر اور لنہ خواتین میں اچھی خاصی باتیں ہو چکی تھیں۔

”مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر۔“

وہ ہنسی۔ ”مجھے بھی اپنے گھر میں تمہیں چلنے پھرتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے، شارلٹ کا ہمیشہ سے یہ کہتا تھا کہ عالیاں میرا لاڈلا ہے اور اب اس نے مجھے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ خردوار جو امرہ کو آپ نے اپنی لاڈلی بنایا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ مجھے اپنی کمائیاں سنانا بند کر دے گی۔“

نہیں ہیں۔ بہت سے سمجھ دار لوگ اسے دقیانوسیت کہتے ہیں، لیکن دراصل یہ ہمارے حسب کتاب ہیں۔ سیدھے سیدھے حسب۔ کہ کھجور وہی ہے جو کھجور کے درخت پر لگے جو جھاڑی پر لگی ملے گی وہ کھجور نہیں ہوگی، ہم بنیاد کو دیکھتے ہیں عالیاں! سب دیکھتے ہیں۔ تم دنیا بھر کی ان بڑی درسگاہوں کی مثل ہی لے لو جو صرف قابل ذہین و فطین طلباء کو ہی داخلے دیتی ہیں جبکہ علم کے دروازے سب پر ہمہ وقت کھلے رہنے چاہیں تو معیار کے پیمانے ہر جگہ ہیں۔ صرف ہم پر ہی یہ الزام نہیں لگنا چاہیے کہ ہم قدامت پسند اور جاہل ہیں۔ ہم ایسے ہی ہیں۔ رہی معیار کی بات تو ہم انہیں بدل سکتے ہیں، اس میں متوازن کر سکتے ہیں اور بدلتے وقت کے تقاضوں کو دیکھتے انہیں چکر دار بنا سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں شادی دو لوگ نہیں دو خاندان کرتے ہیں اور اس شادی کو کامیاب بھی دونوں خاندان مل کر کرتے ہیں۔ ٹھیک سے کچھ رسومات اور اصول کھوکھلے اور بے بنیاد ہو چکے ہیں اور کچھ سرے سے ہی بے کار اور فضول ہیں، لیکن ہماری معاشرتی پرکھ ہمارے بہنوں کے تجربات پر ترتیب دی گئی ہے اور ان تجربات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ان تجربات کی روشنی میں کچھ نیچلے غلط بھی ہوئے ہوں گے، لیکن وہ سب ٹھیک کر دینے کی نیت سے کیے گئے ہوں گے۔

تم دنیا میں گھوم پھر کر دیکھ لو، تمہیں کوئی باب ایسا نہیں ملے گا جو اولاد کا برا چاہے مگر کوئی ماں ایسی نہیں ملے گی جس نے اپنی اولاد کی خوشیوں کے لیے کوشش نہ کی ہو۔ تو امرہ کا باب اس کا برا نہیں چاہے گا اور اس کی ماں اس کی خوشی سے حاسد نہیں ہوگی، لیکن کچھ خانے تو پر کرنے ہی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے چاک پر ڈھلا یہ ڈھانچہ اگر کہیں سے پوسیدہ اور بھر بھرا ہو بھی رہا ہے تو ہم پورے ڈھلچے کو منہدم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن مرمت ہم ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔ داؤد کہہ کر اسے دیکھنے لگے۔

اور عالیاں کو ایک بات اب سمجھ میں آئی کہ اس نے کس آسلی سے کہہ دیا تھا کہ اسے اس خطے کا سفر

اسے دیکھا۔ وہ میز پر کوئی کھانے کی ڈش رکھ رہی تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ تو اسے جانتی ہی نہیں۔ تم کون ہو اجنبی۔ کیا نام ہے بھلا تمہارا۔ پر کسی ہو۔ ہمارے دیس کیا لینے آئے ہو؟

عالیان اسے حیران دیکھا رہ گیا۔ ”یہ امردہ کو کیا ہوا؟“

لہجے جو امردہ اور دانیہ کے علاوہ سب نے ساتھ بیٹھ کر کیا کے بعد داوا نے عالیشان کو چلنے کا اشارہ کیا۔

یعنی یہ کیا؟ عالیشان نے منہ بسور لیا۔ اس نے تو امردہ کا کرا بھی نہیں دیکھا تھا نہ ٹیرس نہ کھڑکی نہ پورا گھر کہ وہ لاؤنج کے کس صوفے پر بیٹھ کر ٹیٹ کر رہی تھی اور کس بر سے سوتے میں لڑھک کر گر جاتی تھی۔ کس دیواری کس تصویر کو ٹانگتے اسٹول پھسل گیا تھا اور لان کے کس حصے میں وہ کرکٹ کھیلتی رہی ہے اور اس کے گھر کے آس پاس کے وہ کون سے گھر ہیں جن کی ڈور تیل بجا بجا کر وہ بھاتی رہی ہے اور وہ کون سا گھر ہے جس کی تیل بجاتے اسے الیکٹرک شاک لگا اور گھر میں وہ کون سی اونچائی ہے جس پر سے وہ سپرین بنی کوونے والی تھی اور وہ کون سی دیوار ہے جس پر اس نے اسکول کا ہوم ورک لکھ دیا تھا اور پیدلے میں اس کے کلن لہے اور پونیاں ڈھیلی کی گئی تھیں۔ اور وہ لکڑی کی الماری کہاں ہے جہاں وہ چھپ کر بیٹھ جایا کرتی تھی کہ گھر کے باہر ایک شیر آیا ہے اور وہ ہم سب کو کھا جائے گا بڑا سامنہ کھول کر بس غرپ کر جائے گا ہمیں سہا ہوتی۔

عالیان کو ہونٹ واہیں آنا پڑا اور رات کو داوا لیڈی مہر کو بھی ہونٹ چھوڑ گئے۔ انہوں نے امردہ کے رشتے کی بات کر دی تھی اور عالیشان کے لیے امردہ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔

واحد صاحب نے داوا کے اشارے پر ان سے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔ داوا کے علاوہ امردہ اور امردہ سے متعلق معلومات سب کو بہت کم تھیں۔ وہ بہت اوپر اور پر کی باتیں جانتے تھے جیسے انہیں یہ معلوم تھا کہ امردہ کی لینڈ لیڈی ایک بیوہ خاتون ہیں۔ انہوں نے

امردہ بننے لگی۔ ”پھر ایسا غضب نہ کیجئے گا۔“

”ہس نے جب تمہیں مورگن کی شاوی میں دیکھا تھا تو میرے کلن میں کہا تھا۔“ آپ کی بہو خود چل کر آپ کے گھر آئی ہے۔“

امردہ ہنس تو دی، لیکن خوف سے وہ ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پارہی تھی۔ دانیہ بھی ان کے ساتھ آکر بیٹھ گئی تو لیڈی مہر نے اس سے کہانی کی فرمائش کر دی۔ امردہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی اور داوا کا انتظار کرنے لگی۔

دانیہ کو گوسپ میں خاصی دلچسپی رہا کرتی تھی۔ اسی کا سہارا لے کر اس نے اپنی کلن کی لڑکیوں کی الٹی سیدھی کہانی بنا کر سنائی شروع کی۔ اور کہانی اتنی دلچسپ ثابت ہوئی کہ دس منٹ کے اندر امردہ لیڈی مہر سو گئیں۔

”دیکھا میری کہانی کا کمال؟“ دانیہ نے فخریہ کہا۔

”ہاں دیکھا، بوگس کہانیاں پر انہیں ایسے ہی نیند آجاتی ہے۔“

”تم چل رہی ہو۔“

”تمہاری خوش قسمتی کو جلا رہی ہوں۔“

لگے دن لہجے سے پہلے عالیشان داوا کے ساتھ گھر آیا اور کافی دیر تک حملہ مہلے پایا اور داوا کے نرغے میں بیٹھا رہا۔ اماں اور داوی سے بھی بات چیت ہو گئی اس کی کچھ دیر کو وہ ذرا اکیلا ہوا تو اس نے اپنی ایک سہیلی لی اور فخریہ اپنی بیٹ کر دی۔

”امردہ کے گھر لہجے کے لیے۔“

”تجوس امردہ نے کیا کیا بنایا ہے تمہارے لیے؟“

کارل کا فوری فون آیا۔

”ماچسٹر کے بھسنے کارل کا بھیجا پر ائم ڈش ہے۔“

”پھر تو ماچسٹر کے دوسرے بھسنے عالیشان کے کلن سینڈ پر ائم ڈش ہوں گے۔“

”ہا ہا ہا!“ وہ دل کھول کر ہنسا کیوں کہ آخر کار وہ امردہ کے گھر آچکا تھا، لیکن امردہ کیسے نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر ڈارائننگ روم سے حق ڈائننگ روم میں اس نے

پہلی بار مل رہے ہیں اور اتنی جلدی کیا ہے سستی یا نکاح کی۔ کچھ ہی مہینے ہیں نا ہم چلیں گے وہاں۔ پھر دیکھیں گے۔

”ٹھیک ہے ہم ماچھڑ چلیں گے لیکن تم صبر و تحمل سے میری چند باتیں سن لو۔“

واجد صاحب کی پیشانی پر پہلی بار شکن نمودار ہوئی۔ ”کیسی باتیں؟“

”عالیان مسلمان ہے اور بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”وہی تو آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ اچھا ہے؟“ وہ نے

”پتا چل جاتا ہے۔“ اس دلیل کو وہ کسی بھی دلیل سے بائیدار نہیں بنا سکتے تھے۔

”تم ایسے ایک بار ملنے سے نہیں پتا چلتا۔“

”میرا تجربہ اتنا ہو چکا ہے کہ۔“

”میرا تجربہ آپ جتنا نہیں ہوا۔ اور مجھے تجربہ نہیں تسلی کرنی ہے۔“

واجد نے ایسے گہرا سانس بھرا جیسے خود کو تسلی دیتے ہوں۔ ”دراصل خاتون میرا ایک بے اولاد بیوہ خاتون ہیں ان کے شوہر ڈاکٹر تھے۔ ان خاتون نے بچوں کی پرورش کے ایک پرائیویٹ ادارے سے دس بچے لے کر پالے، عالیان کے والد کا نام ولید البشو ہے اور وہ اس وقت ناروے میں ہے ولید البشو اور عالیان کی والدہ کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔“ وادا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس بات کو پہلے کریں اور کسے بعد میں۔ ذرا گھبرا سے گئے۔

”تو یہ خاتون عالیان کی خالہ ہیں؟ یا کوئی اور رشتے دار؟“ شکن گہری ہونے لگی۔

”یہ اس کی ماں ہیں پالا ہے اسے۔“ وادا شکن کی گہرائی بناپ سکتے تھے۔

واجد صاحب مت درپنک اپنے بناپ کی شکل دیکھتے رہے ان کی ساری خوشی کا نور ہو گئی جو عالیان سے مل کر ہوئی تھی۔

”یعنی عالیان بھی ان ہی دس بچوں میں سے ایک ہے جنہیں شیم خانے سے لے کر پالا ہے؟“ ان کا

نے دس بچے لے کر پالے ہیں اس کا اس میں علم نہیں تھا۔ انہیں پہلے اس بات پر حیرت تھی کہ امرت کے آتے ہی فوراً وہ کیوں آ رہی ہیں۔ ولوانے کہہ دیا کہ میں نے ہی بلایا ہے ان کا بیٹا ہے اس کے لیے وہ امرت کا ہاتھ مانگنا چاہتی ہیں۔

”امرت اسی گھر میں رہتی ہے جس میں یہ لڑکا رہتا ہے؟“ واید صاحب کا پہلا سوال یہ تھا۔

”نہیں لڑکا ہاشل میں رہتا ہے۔“

”اپنے گھر کے ہوتے ہاشل میں کیوں رہتا ہے؟“

”یہ خاتون مر جسامانی نقص کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو ستالی لڑکی ان کی دیکھ بھل کے لیے رہتی ہے اور امرت کی طرح کی چند دوسری لڑکیاں تو لڑکے کا گھر میں قیام انہیں مناسب نہیں لگا۔“

یہ عالیان کے گھر آنے سے پہلے کی باتیں تھیں جو وادانے وادی اماں اور واید صاحب کو بتائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیان سے مل لیں تو باقی باتیں بعد میں ہی ہوں۔ اور سب نے عالیان سے مل لیا اور الفاظ کے استعمال کے بغیر یہ بتا بھی دیا کہ انہیں عالیان سے مل کر کتنا اچھا لگا ہے تو وادانے باقی باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔

”آپ کہہ رہے تھے کہ امرت کے ہانڈو کیشن کے لیے آپ ماچھڑ چائیں گے تو اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔“

وادانے خود کو تیار کیا وہ اپنے بیٹے سے خوف نہ نہیں تھے لیکن وہ چاہتے تھے جو باتیں اب آگے نہ کرنے والے ہیں ان پر بھڑکنے کے بجائے تحمل سے جا دلہ خیال کیا جائے۔

”کیا تمہیں عالیان پسند نہیں آیا؟“

”آیا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں وہاں چلیں گے کچھ دیکھ بھل لیں گے۔“

”میں نے دیکھ بھل لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم دونوں کا نکاح کر دیں، شکنی کے حق میں نہیں ہوں۔“ ولوانے اپنی طرف سے بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

”آپ نے کہاں دیکھا بھلا ہے اسے۔ آپ تو خود

انداز بیٹ سا کیا غیر مذہب ہو گیا۔
”تیم خانہ نہیں بچوں کے“

”ایک ہی بات ہوئی تاہا باپ نے کیوں نہیں رکھا
اسے؟“ وہ عالیان سے ”اسے“ پر آگے فوراً کہ اب
نام لیتا گوارا نہیں۔

دلوانے جان لیا کہ کیسے وہ لڑکا جس سے واجد خوش
اخلاقی سے باتیں کرتا رہا تھا اب تنہی لور بد اخلاقی سے
زیر بحث لایا جانے والا ہے۔

”عالیان کی والدہ اس کے بچپن میں فوت ہو گئی
تھیں۔“ دلوانے محل سے کہا۔

”میں باپ کا پوچھ رہا ہوں بابا! وہ تنہی سے تیرا تواز
سے بولے۔

”باپ ایک لاپرواہ انسان ہے“ اسے اپنے بیٹے کی
کوئی پروا نہیں رہی۔“

”اور باقی کے رشتہ دار، نانا، نانی، خالہ، ماموں؟“
باپ کی بات کو انہوں نے نفی الجھل ایک طرف رکھا۔

”عالیان کی والدہ اپنے والدین کی اکلوی بیٹی تھیں
لور لن کے والدین ان کی شادی سے پہلے ہی وفات
پاگئے تھے۔“

”تو اس کی شادی کسی نے تو کی ہوگی تاویرد البشر
کے ساتھ۔ کوئی رشتہ دار۔ کوئی چچا کوئی ماموں، دادا،
ولوی، ماں باپ مرنے سے باقی خاندان تو نہیں مرجاتا
؟“

”ہمارے اور ان کے ماحول میں فرق ہے واجد۔“
”رشتوں میں تو فرق نہیں ہے۔ خونی رشتے تو ہر
جگہ ہوتے ہیں نا؟“

دادا کا حلق خشک ہو گیا تو ان کا فیصلہ ٹھیک تھا کہ ان
سب سوالوں کے لیے انہوں نے عالیان اور لیزٹی مہر کو
آگے نہیں کیا تھا۔

”بولیں نا؟ اور باپ نے کیوں نہیں رکھا اسے؟
آپ نے ہی منع کیا تھا مجھے کہ میں ان سے کچھ نہ
پوچھوں، میں یہی سمجھا کہ یہ امرجہ کی لینڈ لیزٹی کا بیٹا
ہے، چلیں یہاں تک میں نے قبول کر لیا۔ اب آگے؟
کیا کیا کہ رہے ہیں آپ؟“

”کہا تو ہے کچھ باپ ہوتے ہیں خدا رسل کو بھولنے
والے ہیں نے اپنی اولاد کی پروا نہیں کی اور ہمیں اس
سب سے کیا لڑکا اچھا ہے، اس کا مستقبل روشن
ہے۔“

”کوئی تو وجہ ہوگی جو اس نے اپنی اولاد کو بھی لڑکے کو
نہیں اپنایا، ہاں آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے، میں
ایک کاروباری انسان ہوں مجھے پاگل مت بنا میں،
امرجہ آپ کی لاڈلی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ
اسے اتنی آزادی دے دیں کہ وہ یہ سب کرے یہ لڑکا
اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے نا، اور یہ آپ کا اور
امرجہ کا چلایا کھیل ہے، امرجہ اپنی لینڈ لیزٹی کو اس کی
میں بنا کر لے آئی اور نہ وہ تیم خانہ میں ملنے والا اس کا
کوئی آگے نہ پیچھے، آزاد معاشرے کی پیداوار کسی کا
گنہگار۔“

”ہیسا کچھ نہیں ہے۔“ دلوانے بڑے غصے سے
کہا۔

”تو پھر کیا ہے؟“ وہ بھی چلائے۔ ”کیا چل رہا ہے
آپ کے لور امرجہ کے درمیان۔ بابا آپ نے اسے لاڈ
میں رکھا، ٹھیک ہے لیکن میں اس کا باپ ہوں، اس
کے لیے فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے، آپ نے اسے ماچھسٹر
بھیج دیا میں نے کچھ نہیں کہا لیکن اب۔“

”مبعد میں تم نے ہی کہا تھا کہ میرا فیصلہ ٹھیک تھا۔
یاد ہے؟ چند ماہ پہلے تم نے مجھ سے کہا کہ امرجہ کے
دیے پیسوں سے تمہارے کاروبار میں ایسے برکت
پڑی ہے کہ تم نے سارے قرض اتار دیے ہیں، ہر
اچھے فیصلے کے نتائج کچھ وقت گزارنے کے بعد ظاہر
ہوتے ہیں۔“

”یعنی آپ نے مجھے اندھا ہی سمجھ لیا تھا۔ جس کا آنا
نہ جاتا اسے آپ لور آپ کی لاڈلی گھر لے آئے۔ اچھی
ملی بھگت کی آپ دونوں نے۔“

”عالیان بہت اچھا لڑکا ہے واجد۔“
”اس کی پیشانی پر لکھا ہے؟“

”کیا سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

”ہاں سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا
ہے؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”پھر آپ مجھے سب کچھ بتائیں۔ کیا ہے یہ سب؟“

داوا نے سوچا کہ تو پھر انہیں وہی کرنا پڑے گا جو انہوں نے پیش بندی کے طور پر سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اور اب سب ہاتھ پائی ہو گا کیونکہ نہ بتانے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ واجد کا رویہ معجزہ ہی ہو گا جو بدلے گا۔

”عالیان کی والدہ ایک غیر مسلم عورت تھیں۔ انہوں نے ایک مسلمان سے شادی کی۔ ولید البشر نے عالیان کی والدہ کو دھوکا دیا اور چھوڑ کر چلا گیا۔ اور دوسری شادی کر لی۔ عالیان کی حقیقی ماں اور خاتون مہر ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔“

واجد کئی لمحے اپنے والد کی طرف دیکھتے رہے، انہیں یقین نہیں آیا کہ انہیں جو ابھی بتایا گیا ہے وہ ان کے باپ نے اتنی آسانی سے کہہ بھی دیا ہے۔

”آپ ایک غیر مسلم عورت کے بیٹے کے لیے امرد کے رشتے کے حق میں بحث کر رہے ہیں، مجھ سے لڑ رہے ہیں، مجھے اتنا کچھ سنا رہے ہیں، آپ نے انہیں گھری گھری آنے دیا؟“ اس بار وہ پوری قوت سے دھاڑے۔

تجربے کی آنکھ سے داوا یہ سب پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ ایسا ہی رویہ اور ایسے ہی سوال۔ یہی رد عمل۔ سب ٹھیک ویسا ہی ہو رہا تھا۔

داوا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کمرے میں ابل اور داوی آئیں کہ بات بڑھ نہ جائے۔ داوا نے تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”امرد میری ہے اور اس کے لیے فیصلہ بھی صرف مجھے ہی کرنے کا حق ہے، عالیان ایک اجماع کا ہے۔ مجھے اس کے ماضی یا خاندان سے کوئی سروکار نہیں، مجھے وہ پسند ہے اور میں امرد کی شادی اسی سے کروں گا۔“

”آپ کو لڑکا پسند ہے یا آپ کی لاڈلی اسے پسند کر لائی ہے؟“ واجد تیزی سے کہتے کمرے سے نکلے اور امرد کی طرف بڑھے۔

”ہاں لکھا ہوتا ہے، خاندان، باپ، دادا، شرافت رکھ رکھاؤ، حسب نسب، یہ ہوتی ہیں پیشانیوں کی لکھائی۔ ایک عورت کو اٹھالائے اس کی ماں بنا کر۔“

”ماں بنا کر نہیں وہ اس کی ماں ہیں واجد۔“

”سگی ماں تو نہیں ہیں نا پھر اور باقی کے بچے۔ وہ سب کون ہیں، یہ کیسا خاندان ہے، خاندان کا سربراہ، نہ آگے نہ پیچھے، ایک عورت اور اس کے دس بچے۔“

”تم ایک عظیم خاتون کی بے عزتی کر رہے ہو واجد!“ داوا نے دل دکھ سے کہا۔

”اب نے میری بے عزتی کی ہے ایسے لوگوں کو گھر بلا کر۔ کوئی ضرورت نہیں امرد کو واپس وہاں بھیجنے کی، بہت کر لی پرہائی میں نے غلطی کی جو اسے آپ کے حوالے کر دیا۔“

داوا استہزائیہ ہنس دیے، میرے حوالے اسے تم نے نہیں کیا تھا، میں نے، داوا سے سنبھالا تھا، تمہاری اور تمہارے خاندان کی جاہلانہ سوچ اور حرکتوں سے اسے بچائے رکھا۔ بیٹی بیٹی لگا رکھا ہے تم نے، تمہاری بیٹی تب ہوتی جب تم کسی اس کے دکھ میں شریک ہوتے ہو، کبھی پوچھے اس کے آنسو تم نے۔“

”اسے کھلایا، پلایا، جوان کیا۔ کیا کم کیا؟“

”کھلانا، پلانا ہی سب نہیں ہوتا۔ بڑا احسان جتنا ہے ہو کھلا پلا کر اولاد کو، اولاد کے پہلے حق صحبت کی لوائیگی کب کی تم نے۔ تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ چھپ کر رونے کے لیے وہ گھر کے کس کونے کی طرف بھاگتی تھی۔“

”ہاں میں ایک برا باپ ہوں۔ اب چپ کر جائیں، بس ساری بات ختم۔“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم سے رائے لی تھی، آخری فیصلہ میرا ہی ہو گا۔“

داوا نے ایسی سنجیدگی اور مضبوطی سے کہا کہ واجد صاحب رک کر انہیں دیکھنے لگے۔ دونوں داوا کے کمرے میں بیٹھے تھے جبکہ باہر سب لن کی آوازیں آسانی سے سن سکتے تھے۔ امرد وانیہ کے کمرے میں تھی اور وہاں سے با آسانی سب سن سکتی تھی۔

”مرد! انہوں نے چلا کر اسے بلایا۔“

”واحد! دادا ان کی طرف لپکے۔“

”تمہیں پڑھنے کے لیے بھیجا تھا یا یہ سب کرنے؟“ وہ وانیہ کے کمرے میں اس کے سر پر پہنچ گئے اور اسے بازو سے پکڑ کر بچھوڑا۔

دادا نے لپک کر انہیں امرت سے دور کیا۔ حملہ علیٰ وانیہ سب اسی کمرے میں آن موجود ہوئے تھے۔
”یہ جاہلوں والے طریقے نہ اپناؤ، محل سے میری بات سنو۔“

”آپ کا طریقہ ٹھیک ہے؟“ ان کی تیز آواز تیزی رہی۔

”کون ہے یہ امرت جسے تم یہاں ملائی ہو؟“

دادا نے ان کا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر کھینٹا اور بڑے جتنوں سے انہیں واپس اپنے کمرے میں لائے۔

امرت کمرے میں رونے لگی۔ یہ اس کی خوش گمانی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

”بیٹھ جاؤ واحد! خدا کے لیے تمہی انسان ہو جس نے ساری عمر کبھی اپنی اولاد کے پاس بیٹھ کر اسے نہیں سنا۔ تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ امرت یونیورسٹی میں کس مضمون کی طالبہ ہے اور تم اس کی زندگی کے فیصلے کے لیے ایسے بھڑک رہے ہو جیسے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہونے جا رہی ہے۔ تم جیسے ہی باپ ہوتے ہیں جن کی اولادیں گھٹ گھٹ کر رہتی اور مر رہی ہیں۔ تم اپنی اولادوں کی بے سکونی کے مسکن ہو جاؤ۔ زرا دیر کو اپنی بیٹی کے پاس بیٹھو اسے سنو اس کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھو وقت بدل رہا ہے، میں بے سہار آزادی کا قائل نہیں، لیکن ایسی پابندی کا قائل بھی نہیں کہ ایک انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جائے۔“

”مجھے یہ رشتہ پسند نہیں، بات ختم۔“ انداز اٹل تھا۔

جیسے چکنائی گلی پر ت پر سے پانی کا بغیر گیلایا کیے گزر جاتا۔
”کیوں؟“ سوال بے کار تھا پر انہوں نے پوچھ لیا۔

”بس نہیں، آپ نے سہوار کی بات کی تھی اس کے خاندان کو بلا لیں۔“
”تو تم نہیں مانو گے؟“

”کبھی نہیں، میں نے اپنی ناک نہیں کٹوانی، خاندان لوگ سب کیا کہیں گے ایک یتیم بے سہارا ایسے ویسے کو لڑکی پکڑا دی۔ جس کے خاندان کی خبر نہ دین کی۔“ غصہ تھا کہ انداز سے چھلک چھلک جاتا تھا۔
”اس کے مسلمان ہونے پر شک نہ کرو واحد! گناہ گار ہو گے۔“

”آپ اس کا دین تصدیق کروا کر آئے ہیں یا؟“ طنز سے اس کی آنکھیں سکتا گئیں۔

”میرے تمہارے دین تصدیق ہوئے ہیں؟ جو شخص سہل میں چند بار نماز پڑھتا ہے اور ساتوں بعد بھی کلام پاک کو کھول کر اس سے ہدایت نہیں لیتا، وہ دوسروں کے ایمان پر سوال اٹھا رہا ہے، اسے دوسروں کے دین کی فکر لاحق ہے۔“

”بابا! بس کرویں یہ فلسفے، بات ختم بس۔“
”وہ ٹھیک ہے واحد، بات ختم۔“ دادا نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر ملاں اور روادی کو اندر آنے کے لیے کہا اور جب آگئیں تو بہت محل سے کہا۔
”اس جگہ کو امرت کا عالیان کے ساتھ نکاح ہے،“

میں نے امام صاحب سے بات کر لی ہے۔“
تھوڑی دیر کو سب کے درمیان سکوت رہا۔
”یہ بچکانہ حرکتیں چھوڑ دوں بابا! سکوت ایسے ٹوٹا۔“

”بچکانہ ہو تمیں تو چھوڑو، واحد! خاندان کے کچھ سمجھو دار لوگوں سے بھی میں نے بات کر لی ہے۔“
”آپ نے ڈھنڈورا پیٹ دیا کیوں؟“

دادی اور اماں واحد کی آواز سے سم گئیں۔ جب سے امرت ماچھسٹری تھی اور دادا کی مدد سے کئی تھی تو سب پر اور اچھی طرح سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ

گھر میں بتاؤ بڑھتا گیا۔ دادا لڑی صبر کے پاس گئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا، لیکن عالیان کو کچھ نہیں بتایا۔

ایک بار باپا پھر امردہ کے پاس آئے۔
”تمہارے دادا تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں اس سے ان سے کہہ دو تمہیں منظور نہیں آجھے خاندان اور لڑکوں کی پاکستان میں کمی نہیں ہے۔“
امردہ خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”امر دہ! وہ چلائے۔
آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔
دادا ان دونوں کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔
”میرے لیے کچھ تو تمہاریاں پیدا کریں۔“ بہت دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

”جانتی ہو لوگ کتنی باتیں کریں گے؟“
”لوگ باتیں ہی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں“
میں اور تم بھی تو لوگ ہی ہیں ہم دونوں کبھی باز آئے باتیں کرنے سے۔ آج میں اور تم شروعات کرتے ہیں کل کو دنیا بھی چپ ہو جائے گی۔“ دادا نے بڑی آس سے کہا کہ شاید کچھ بہتری ہو جائے۔
”دنیا آپ کے اشاروں پر نہیں چلے گی۔“ وہ ہونہر کے انداز سے بولے۔

”مگر دنیا میرے اشاروں پر نہیں چلے گی تو میں بھی دنیا کے اشاروں پر نہیں چلوں گا“ امردہ کی خوشیاں تو میں ہرگز اس دنیا کی سیاست سے نہیں لکھوں گا۔“
”مجھے معلوم تھا یہی سب ہو گا۔“ باپا غصے سے چلے گئے تو دلوا اس کے پاس بیٹھ کر اسے چپ کروانے لگے۔

”اسی لیے میں نے تمہیں اور عالیان کو یہاں بلا دیا تھا۔ میں چاہتا تھا پچھڑا کر بھی تمہاری شادی کر سکتا تھا لیکن صرف یہی ایک بات میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارا باپ ہی کہہ دیتا کہ تم نے خود ہی شادی کر لی تھی اور میں تم پر بڑھ ڈالنے گیا تھا۔ خاندان کی کتنی ہی لڑکوں کو ان کے گھر والے پڑھنے کے لیے باہر نہ بھیجتے شاید۔ میں نے بہت سوچا ہے اس بارے میں اب

اس کی زندگی کے باقی فیصلے بھی انہیں ہی کرنے ہیں۔ جو چند رشتے ذاتی اور اہل تیار رکھ کر بیٹھی تھیں اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھیں کہ امردہ کے دادا کی تسلی ہوگی تو ہی بات آگے بڑھے گی۔ اور اب یہ وہ خواتین یہ بات بہت آرام سے سمجھ گئی تھیں کہ وہ عالیان میں کچھ دیکھ رہے ہیں تو ہی ایسے اس کے حق میں بول رہے ہیں۔ کیونکہ وہ دنیا میں آخری انسان بھی نہیں ہوں گے جو امردہ کا برا چاہیں گے۔

”سنو دا جد! زندگی میں صرف ایک بار اس کے دل کی بات اس کی خوشی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری بیٹی صرف اسی ایک لڑکے کے ساتھ خوش رہے گی تمہاری اجازت! تم ہے اس کے لیے۔“
”تو آپ بیان رہے ہیں کہ امردہ ہی لائی ہے اس لڑکے کو؟“

”واجب! میں تم سے نہیں جیت سکتا سوالوں اور جوابوں میں۔ تم ایک کھونٹے سے بندھے ہو، حرکت کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ آگے پیچھے کسی بھی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راضی ہی نہیں ضد انا“ اور حرا دھر کی بے کار باتیں یہ وہ۔ میں جانتا تھا تم کبھی نہیں مانو گے، کبھی نہیں۔ پھر بھی میں نے کوشش کی۔ اب بھی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ لیکن بہت سی باتیں بہت سارا وقت گزرنے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں اور تمہاری سمجھ کے لیے میں بہت سارے وقت کا انتظار کر سکتا۔ میں نے اپنا وقت و وقت نہیں بڑھ رکھا کہ اس وقت سے پہلے تک تمہیں راضی کرتا ہوں۔ امردہ عاقل و بالغ ہے۔ اس کی پسند اور فیصلے کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ تم اس کے باپ ہو لیکن اسے بڑا میں نے کیا۔ جو حق اس پر میرا ہے وہ تمہارا صرف اس لیے نہیں ہو سکتا کہ تم باپ ہو اس کے، تم امردہ کو نافرمان ہونے کی بددعا دے سکتے ہو لیکن یاد رکھنا فرمانی کی بددعا میں تب ہی لگا کرتی ہیں جب فرماں برداری سے فرائض ادا کیے گئے ہوں۔ اور فرائض میں پہلا فرض ”محبت“ کا ہے۔“



ایک آخری حل یہی ہے کہ تم خود جاؤ اور واحد کے پاس اور کوشش کر کے دیکھو شاید وہاں جائے۔
”مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تو میرے ساتھ۔“ اسے ساتھ لے کر وہ ان کے کمرے میں لائے۔ وہ دن سے وہ اسٹور نہیں جا رہے تھے مگر میں یہی سب چل رہا تھا۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے وہ ان کے قریب بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”مجھ پر وہ بوجھ نہ ڈالیں جو میں اٹھانہ سکوں بہت مشکل ہو جائے گا سب بچھ۔“
”میں تمہارا باپ ہوں کچھ تو میرا لحاظ کرو۔ تمہارا بھلائی سوچ رہا ہوں۔“

”میرے بچھے پہاں کہہ دیں۔“ اس نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

”یہ کبھی نہیں ہو گا امرد۔“ ان کا انکار انکار ہی رہا۔

ایسا سنجیدہ انکار سن کر وہ کتنی ہی دیر ان کے پاس بیٹھی رہتی رہتی اور سوچتی رہتی کہ تمہارا جو اس نے پہلے سوچا تھا جو ہو رہا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا اگر دلو اگر بھی نہ مانے تو یہ سب ناممکنات میں سے ہوتا۔

”جیسے کہ تمہاری بیٹی کا نکاح ہے واحد اب ہم ہمیشہ کے لیے اسے گھر سے رخصت کر دیں گے۔“ دادا نے کہا اور امرد کو لے کر کمرے میں آگئے۔

”یہ نکاح کبھی نہیں ہو گا دادا!“ امرد لور رونے لگی۔

”اگر یہ خدا کی طرف سے ہونا طے ہے تو ضرور ہو گا واحد نے مجھ سے کہا کہ اس رشتے کی صورت میں نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤں کسی بے دین اور بغیر باپ کے لڑکے کو لڑکی سونپ رہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے۔ میں خود بھی ڈر لگا جاتا ہوں پھر میری تسلی یوں ہو جاتی ہے کہ اس کی سرپرست خاتون مرچیں ہمارے بڑے کھتے ہیں جس کی بیٹی لیتی ہو اس کی ماں دیکھو اور جس کو بیٹی دیتی ہو اس کے باپ کو گور عالیان کا باپ ہے نہیں اور جو ماں ہے وہ اتنی عظیم ہے کہ

انہیں صرف ماں ہی نہیں سمجھا جا سکتا تو میں جو کبھی اسے ہی فصلے سے خوف نہ ہو جاتا ہوں اور ٹھوک میں گھر جاتا ہوں تو خاتون مہر کے بارے میں سوچ لیتا ہوں۔“

دادا نے بات میں شرم کی۔ وہ ایسے سنجیدہ اور چپ چپ سے ہو گئے تھے جیسے نئے سرے سے حساب کتاب کرتے ہوں۔

امرد نے جانا کہ یہ سب کیسا منجھال ہے لیڈی میرا ایک بار پھر گھر آئیں سہولت سے پلاٹے بات کرنے لیکن وہ خاموشی سے اٹھ گئے اور سب بے بس سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

دادا عالیان کو اسٹور لے گئے۔ وہ وہاں ان سے بات یا کسی اور رد عمل کا منتظر ہی رہا لیکن کوئی بات ہوئی نہ بد مزگی اور نہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی۔

دادا نے ایک ایک کر کے سب کو شیشیں کر ڈالیں اور سب ناکام رہیں اور آخر میں دونوں میں خاموشی تن گئی اور اس خاموشی نے گھر میں سب کو بے چین رکھا۔

ساری صورت حال کی عالیان کو خبر ہو چکی تھی اور وہ جان گیا تھا کہ امرد یہی چاہتی تھی کہ وہ اس سب کا سامنا کرے وہ افسردہ ہو گیا۔ پہاڑ سا پہاڑ تھا جو سر ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”تمہیں روہیوں اور روایتوں کے بارے میں ناپسندیدگی سے نہیں سوچنا چاہیے۔“ لیڈی مہرنے اسے سوچوں میں گم نہ کیا تو اسے اپنے سامنے بیٹھا لیا۔
”میں نے ایسا نہیں کیا۔“

”امرد کے دادا نے ہمیں ہر چیز کے بارے میں پہلے سے ہی خبردار کر دیا تھا۔ یہ سب ایسے ہی ہوتا تھا ہم سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں عالیان اور ہم اپنی اپنی جگہ سے دوسرے کو غلط کہہ رہے ہیں۔ تمہارے لیے امرد کے والد غلط ہیں ان کے لیے تم۔ اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن خبردار رہنا اور حقیقتاً اس سب کا سامنا کرنا دو الگ باتیں ہیں بلکہ۔“

”تو تمہارے لیے اس سوچ کی کوئی اہمیت نہیں جو میں اور امجدہ ان کے بارے میں رکھتے ہیں۔“
 عالیان شرمندہ ساہولہ۔ ”یہاں نہیں ہے۔“
 ”جیسے کہ تمہارا نکاح ہے۔“ دلوانے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”آپ نے کہا تھا آپ نے نکاح والی بات امجدہ کے پایا کو منانے کے لیے کی تھی۔“

”مجھے صرف اس کا رد عمل دیکھنا تھا۔ اور اس نکاح کو میں پہلے ہی طے کر چکا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا یہی سب ہو گا اگر واجد مان جاتا تو اور بات تھی۔“

”آپ یہ سب امجدہ کے لیے کر رہے ہیں؟“
 ”نہیں، صرف اس لیے ہی نہیں میں وہ کر رہا ہوں جو ٹھیک ہے اور جس میں کچھ غلط نہیں نہ تم نہ میں۔ اور نہ ہی اس ٹھیکے میں۔“

”مجھے نہیں لگتا یہ نکاح ہو گا، میں خوف زدہ ہوں۔“ اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اور دادا کے جلنے کے بعد دیر تک سالی سے باتیں کرتا رہا پھر کادل سے کی۔ اور امجدہ دیر اور ساہولہ سے ساری صورت حال پر رائے لیتی اور اصل تسلیاں لیتی رہی۔

دادا نے گھر میں قطعہ لگوا دیا اور یہ کام انہوں نے اس لیے کیا کہ واجد کا اکلاد عمل سامنے آجائے مگر کارڈ عمل یوں سامنے آیا کہ وہ خند کی گولیاں کھا کر سو گئے اور سونے سے پہلے دادا اور ان کے درمیان چند باتیں ہوئیں جن میں سے ایک بات پر وہ خاموش سے ہو گئے۔ جب دادا نے کہا کہ۔

”تمہاری بیٹی نے ایک بار خود کشی کی کوشش کی تھی اور مری نہیں تھی۔ اس بار وہ خود کشی نہیں کرے گی پھر بھی مر جائے گی۔ پھر تم اپنی ضد کی قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتے رہنا۔“

بات ایسی جان لیوا گونج کے ساتھ کی گئی کہ دل رو دینے کو ہو گیا۔

دادا امجدہ کے پاس آئے وہ سرگھنوں میں بیٹھے بیٹھی تھی۔

”میں نے دیزے کے لیے کاغذات جمع کروا دیے

میں ان کے اسٹور پر گیا تو سارا وقت خوف زدہ ہی رہا۔ میں نے خود کو معمولی اور کمتر محسوس کیا اور مجھے خوف بہت شدت سے لاحق رہا کہ وہ ملا کے بارے میں کچھ کہہ دیں گے۔ میں اسے اپنا سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ سب امجدہ کے اپنے ہیں۔ لیکن وہ مجھے کبھی اپنا نہیں بتائیں گے۔“

”وقت لگے گا اور سب ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا۔“

”سب غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”غلط ہو جائے تو بھی یہی سوچو کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مایوسی سے ہارنا نہیں چاہیے بلکہ مایوسی کو ہارنا چاہیے۔ امید بڑے کام کی چیز ہے اسے سنبھال کر رکھنا چاہیے۔“

”سب پر امید ہونے سے ہی تو نہیں ہوتا ملال!“

”ایک اچھی چیز امید اور ایک بری چیز ناامیدی میں سے اچھی والی کا انتخاب کر لینا چاہیے، بے شک یہ اپنے عمل میں کتنی ہی ست کیوں نہ ہو۔ یا یہ کتنا ہی انتظار کیوں نہ کروائے۔“

ساری اچھی باتیں ایک طرف لیکن عالیان اس تکلیف کو بری طرح سے جھیل رہا تھا کہ اسے پسند نہیں کیا گیا۔ وہ بار بار خود کو دیکھتا اور اپنے بارے میں سوچتا۔ اس کا اٹھوا تھی سی دیر میں ہی مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھ سا گیا اور اسے لگنے لگا کہ دنیا میں وہ اکیلا انسان ہے جو سب سے پیچھے اور سب سے زیادہ بے کار ہے۔ یہ بھی لگتا جیسے ولید البشو اس پر بلند بانگ قبضے لگا رہا ہو۔ اور اس کی طرف اشارے کر کر کے کہتا ہو ”دیکھی اپنی حیثیت دیکھ لو۔“

وہ خود کو مٹی سے بچاتا رہا لیکن کچھ مٹی اس میں چھلکنے ہی لگی دلوانے اسے دیکھا تو ان کا دل جیسے مٹی میں آ گیا۔

”تم وہ عظیم عورتوں کے بیٹے ہو عالیان۔ میرے دل میں تمہاری بہت قدر ہے۔“

”یہ دونوں عورتیں سب کے لیے عظیم کیوں نہیں ہیں؟“ اس نے امجدہ کے والد کا نام نہیں لیا۔

ہیں۔ جلد ہی میں بھی ماچسٹر آجاؤں گا اور مجھے یقین ہے واجد دانیہ اور باقی سب کو بھی آنے کی اجازت دے دے گا۔

”آپ کیا بات کر رہے ہیں دادا؟ وہ مجھے یہاں سے جانے دیں گے تب۔“

”امرد! اب اپنے باپ کی خاموشی کا احترام کرو۔ انسان قسمت کا کتنا بھی دشمن کیوں نہ ہو زندگی کی راہوں میں اسے چند کانٹے مل ہی جاتے ہیں۔ یہ نکاح جمعہ کرو گا ورنہ کبھی نہیں ہوگا۔“

”آپ نے نکاح کا فیصلہ ہی کیوں کیا دادا؟ سہل دو سہل شرعاً نہیں اب ایسا مل جائے گا۔“

”میری عمر دیکھو امرد! اتنا بوڑھا انسان جب سونے کے لیے آنکھ بند کرتا ہے تو وہ بھی سوچ کر کرتا ہے کہ اب یہ آنکھ قبر میں کھلے گی۔ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں اور واجد نہیں مل رہا۔ میں نہ ہوا تو کیا کر لوگی۔ اس نے اپنے ایک دوست کو گھر آنے کے لیے کہہ دیا تھا اپنے بیٹے کے لیے۔ میں نے کس جتن سے انہیں گھر آنے سے روکا میں ہی جانتا ہوں۔ یہ سب میری موجودگی میں ہو رہا ہے۔ اور کیا چاہتی ہو کیا ہو جائے؟“

”آپ اپنے مرنے کی باتیں ایسے بے رحمی سے کیوں کر رہے ہیں؟“ امرد ان سے پٹ گئی۔

”ہر انسان خود اگلے ہی مل زندگی سے پار جانے والا بھی یہی سوچتا ہے کہ موت کی بات کیا کرنی اور موت اسے آتی ہے۔ کیا موت آنے سے پہلے پوچھتی ہے کہ تم نے اپنی ساری ذمہ داریاں لو کر لیں تو اوپر میں تمہیں آلوں۔ اگر موت اسے پوچھتی تو دنیا کا کوئی کام ادھورا نہ رہ جلیا کرتا۔ اپنی ماں کے بعد میں نے تم سے محبت کی اور میں کبھی اس کی وجہ نہیں جان سکا۔ تمہارے معاملے میں میں بے اختیار ہوں۔ جو تکلیفیں میں نے تمہیں دیں میں انہیں بھلانے کے جتن کرتا رہتا ہوں۔“

”آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔“
”دی ہے۔ میں نے بھی دی ہے۔ اب دعا ہے کہ

خدا ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔“
امرد اور دادا ساری رات بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اس رات کی صبح کا امرد کو انتظار تھا۔ شدت سے وہ چاہتی تھی کہ صبح آتی روشن ہو کہ روٹنیاں اگلے وقتوں کے لیے محفوظ کر لیں جائیں۔



”کیا تمہاری یونیورسٹی میں سب عالمیان جیسے ہیں؟“ دانیہ پوچھ رہی تھی۔ وہ عالمیان اور دادا مل کر کچھ خریداری کرنے گئے تھے اور اسے زیادہ وقت عالمیان کے ساتھ گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔
”سب اپنے اپنے جیسے ہیں عالمیان جیسے نہیں۔“

”تمہیں عالمیان اچھا لگا؟“
”لفظ اچھا کٹنی چھوٹا ہے دادا اکثر کہا کرتے تھے کہ دیکھنا امرد کی قسمت تم سب سے بازی لے جائے گی اور تم بازی لے گئیں۔ دادا کی ساری دعا میں تمہیں ہی جا لگیں امرد ویسے دادا مجھے بھی کہتے رہتے ہیں کہ تم بھی انہیں بہت چاری ہوں اب دیکھتی ہوں کتنی دعا میں لگتی ہیں دادا کی مجھے۔“
امرد ہنسنے لگی۔

بلیا ناراض تھے حقیقت تھی نکاح کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی لیکن ایک اور حقیقت یہ تھی کہ وہ کھڑیاں گن رہی تھی۔ دو سری بڑی حقیقت یہ تھی کہ وہ خوش ہونا چاہتی تھی بہت زیادہ خوش بلکہ بلیا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کی خوشی آنے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتی۔ ایک منظر ہمارے اس کی نظروں کے سامنے گھومتا کہ پہانے پینٹل کپڑوں سے لگا رکھی ہے اور وہ اسے یہ کہہ رہے ہیں کہ ”عالمیان کو انکار کرو امرد۔ یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔“

ان دنوں میں اس نے کچھ کھایا نہیں وہ سو نہیں سکی اس کے سر میں لمبے دروہ رہا ہے اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی۔ زندگی ایک دم سے پھر سے ایسی

مے کو لیا تھا ہم امردے سے صرف اول سے سے
جار ہے ہو۔

”ممانے مجھے یہی کہا تھا کارل۔ تم نے مجھ سے کہا
جار ہے ہو تو امرد کو جیت کر لانا۔ یہاں جیت لانے والا
ماحول نہیں ہے۔ یہاں احرام سے طلب گار بننے کا
ماحول ہے۔ میں طلب گار بنا کھڑا ہوں گا اور میرے
ساتھ امرد کو کھڑا کر دیا جائے گا۔ اور اس سب میں
میں وقت کو آگے لے جانے کی بات نہیں کر سکتا اگر
ایسا کہا تو مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں نقصان میں رہوں گا۔
یہ امرد کے دادا کا فیصلہ ہے میں انکار نہیں کر سکتا۔“
کالی دیر وہ کارل سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے
امرد اور عالیان کی کہانی مانا کو سنائی وہ سو نہیں تو بھی
اسے سونے کا بہانہ نہیں مل سکا۔ اسے ڈر تھا کہ کچھ
ہو جائے گا۔ ابھی دادا آئیں گے اور اسے کچھ کہہ دیں
گے یا امرد روتے ہوئے فون کرے گی اور کہے گی
”عالیان واپس چلے جاؤ یہ شادی کبھی نہیں ہو سکے
گی۔“

”یہ شادی کبھی نہیں ہو سکے گی کیا؟ صرف اس لیے
کہ وہ خاندان میں شمولیت کے رائج اصولوں پر پورا
نہیں اترتا۔ اور اس لیے بھی کہ ہر خاندان میں داخلے
کے لیے اپنے راستے ہوتے ہیں اور امرد کے خاندان
میں داخلے کے راستے اس پر بند ہیں سوائے ایک دادا
کے اور امرد صرف دادا کی ہی جی نہیں ہے۔“

صبح ہو گئی اور اسے تب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ
اس صبح کو کیسے خوش آمدید کہے۔ اس نے وہ انگوٹھی
نکل کر ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ وہ ملانا مار کر سٹ کی تھی
اور ملانا اس لیے ساتھ لے آئی تھی کہ ہل ہو جانے
پر وہ امرد کو پتا دے گی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ کبھی
اس انگوٹھی کو امرد کے ہاتھ میں نہیں رکھ سکے گا۔

ہر خیال بے سکونی کے لہاڑے میں پٹ گیا اور اس
نے خالی پن کا احساس ہر طرف محسوس کیا اور تصور
میں بھی مشرقی دلہن اس کے پہلو میں آ کر کھڑی نہ
ہوئی۔ ”انکار“ کا احساس اس پر غالب رہا اور اس نے
خود کو زندگی کے صحراؤں میں جھکتے پایا اور اس نے

چھیدہ لئے ملی جو جی س نہ ہو سکے جسے لولی س
کر ہی نہ سکے۔

”دادا کی ساری حکمت عملی دھری کی دھری رہ
جائے گی۔“ وہ سوچی اماں اور دادی روتی بھی جاتیں
اور اسے دیکھ کر مسکرانے بھی لگتیں۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے اگر سب معمول پر ہے تو
مجھے کیوں غیر معمولی لگ رہا ہے؟“ وہ یہ بھی سوچتی۔
دوسری طرف کارل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ
اسکریں سے نکل کر عالیان کا گھلا دو بچ لے۔
”تم شادی کر رہے ہو میرے بغیر؟“
”تم سے کئی تھی کیا؟“

”جو اس نہ کرو اگر زیادہ ہی کوئی ایمر جنسی ہے تو وہ
دن انتظار کرو مجھ سے وہاں آ لینے دو۔“

”حالات کچھ ایسے ہیں کہ یہ ضروری ہے اور یہ
شادی نہیں ہے۔“

”شادی کا کہنا ہے نکاح شادی ہی ہوتا ہے۔“
”ارے شادی ہوتی ہے پر رخصتی کے بعد۔ شادی کا
بنیادی عمل ”نکاح“ ہو رہا ہے رخصتی نہیں۔“

”تو شادی ہی ہوئی تا میں کتنا خواہ ہوا امرد کے لیے
اسپتال میں آڑ تالیس گھنٹے میں سویا نہیں اس کے لیے
ہم کھڑے رہے بیٹھے تک نہیں میرا گلا خشک ہو گیا
چینلز کو اس کے بارے میں اپ ڈیٹ کر کے اور وہ
ایسے شادی کر رہی ہے بلایا تک نہیں۔“ کارل بڑا
عظیم دکھی لگنے لگا۔

”امرد نے تو مجھے بھی نہیں بلایا میں تو خود اپنی
شادی میں جا رہا ہوں اب ایک ہی صورت ہے کہ تم
سپر سونک لو اور آ جاؤ یہاں۔“

”یونیورسٹی کے باہر پارکنگ میں کھڑی رہے تا سپر
سونک۔“

”تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ میرے شہر
بالے تم ہی بنو گے۔“

”یہ بہت بڑا اعزاز ہو گا جو مجھے ملے گا۔“
”تمہاری گھر پر شہر پالی دیر ہو گی میرا خیال ہے
ابھی سے تیاری شروع کر دو۔“

مبجروں کی دعائیں کرنی چاہیں اور تصورات میں وہ خود کو اکیلا اور اداں دکھتا رہا۔ سوچیں بے رحمی سے اس کا تاریک مستقبل اس پر روشن کرتی رہیں۔
 ملا کے ساتھ ناشتا کرتے وہ ناشتا نہ کرنے کا بہانہ کرتا رہا۔

”عالیان! تم کب بڑے ہو گے؟“ وہ ہنس دیا۔
 ”شادی کے بعد۔“ وہ ہنس نہ سکا۔

”تم ایسے بچھے بچھے کیوں ہو میرے بیٹے؟“
 ”کچھ برا نہیں ہو گا۔ سب باتوں کا تمہیں معلوم

ہونا ضروری نہیں بلکہ تمہیں امرتہ کے دادا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اپوس نہیں لوٹائیں گے اور بھی

بست ساری باتیں ہوئی تھیں ہمارے درمیان۔ تم بس اتنا جان لو کہ وہ یہ نکل جلد سے جلد کو بیٹا چاہتے ہیں۔

اگر امرتہ کے پاپا مان جاتے تو میں وہ منگنی نہ کرتے۔ عالیان وہ ضرور ہو گا جو تمہارے لیے اللہ نے طے کیا ہے۔ تم نے مجھ سے کہا کہ تم ایک اچھی دعا ماننا سیکھ

چکے ہو۔ اس اچھی دعا کو پھر سے دہراؤ۔“
 سوچوں کی بے رحمی چھیننے لگی۔ ”یقیناً“ اچھی دعا کو

دہرانے کا اس سے بہترین وقت اور کون سا ہو گا۔“
 اسے مسکرائیاد آیا آخر کار۔

وہ امرتہ اپنی اور اس کے خاندان کی سکون کیوں بنا رہا ہے؟

وہ امرتہ عالیان اور اللہ کی رضا کی سکون کیوں نہیں بنا رہا؟



ان کی کلاس ختم ہو چکی ہے اور پروفیسر کے کلاس سے نکلتے ہی وہ فوراً ”اٹھ کر سب کے سامنے آکر کھڑی

ہو گئی“ جیسے وہ ایسا خطاب کرنے والی ہو جو انسان صرف اپنی ذات سے کرتا ہے وہ بھی مختلف بہانوں سے خود کو

بہلا کر۔
 سب شرارت سے اسے دیکھ رہے ہیں وہ عالیان کی غیر موجودگی کے بارے میں اس سے پوچھتے رہے

ہیں۔ سب سمجھ لینے کے انداز میں آنکھ مارنے لگے اور کئی

طریقوں سے اسے چڑانے سے خود کو روک نہیں پاتے۔

”میں عالیان سے محبت کرتی ہوں اور امرتہ سے بھی“ اور اس محبت کے خالص پن میں کوئی کھوٹ

نہیں۔ ”اس نے ایسی شان کو اپنا کر یہ کہا کہ اسے تقسیم دینا ضروری سا ہو گیا۔ وہی وہی ہنسی خاموشی میں

اُٹھ گئی اور زندگی کی انگلی نے بونے پر آمادہ لوگوں کے ہونٹوں پر ٹھہر کر ”شش“ کہہ کر انہیں چپ کر دیا۔

”بrazیل میں امرتہ زندہ نہ رہتی تو وہاں صرف وہی نہ مرنے۔ ایک کے مرنے سے دو موتیں کیسے ہو سکتی

ہیں میں نے وہاں جان لیا۔ اور جب میں نے یہ جان لیا تو میں نے خود کو وہاں روک لیا۔ کیونکہ مجھے ایسی منزل

کی طرف نہیں بڑھنا تھا جس تک میں پہنچ تو جاتی لیکن جسے پانہ سکتی جو ہماری مٹھی میں ہوتا ہے وہ ہمارا نہیں

ہوتا جو ہماری گرفت میں نہ ہو کر بھی ہمارا ہو وہ ہمارا نہیں مٹھی۔“

وہ کہہ کر رکی کہ جانچ سکے وہ تین لوگوں کے احساسات کو کمزور تو نہیں کر رہی۔

”سوالی کہتا ہے بہت کم چند ہی لوگ ہوتے جنہیں ملانے کے اسباب بنتے ہیں اور جن کے پھل جانے پر

وقت آنسو بہانا ہے وقت نے یہ آنسو برازیل میں بہائے۔ میرا خیال ہے کہ عالیان کو امرتہ پسند آئی تھی

تاکہ اس سے پہلی نظر کی محبت کا افکار ہو تھا شاید اس نے جان لیا تھا کہ انسانوں سے بھری اس دنیا میں صرف

وہی اس کی ہے۔ اس میں خوبی کا کمال ہے ناسی کا قصور۔ یہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ خوبی جنگیں ہوئیں بغاوت اٹھتی یا عذر چمکتا۔ سب ایسے ہی ہوتے۔“

اس کے انداز نے مورخ کی ہیبت اپنی جو ایمانداری سے تاریخ کو ساری سیاہی و سفیدی سمیٹ

کھٹکتا ہے۔
 ”آپ میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ میں اکیلی ہو گئی ہوں“ جبکہ میرا ماننا ہے کہ میری زندگی شاید ہی اب

امرتہ کے بغیر مکمل ہو جب میں ماچھڑ آ رہی تھی تو پلپلا

ہوں میں عالیان کو بہت یاد کرتی ہوں اور میرے لیے مشکل ہے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ اس کا ہاتھ پکڑنے کا حق میں نے اب پیش کے لیے کھو دیا۔“
شہر شہر کر اس نے غیر مرنی لقطے پر نظریں ٹکا کر کہا پھر ایک دم سے نظریں ان سب کی نظروں کے مقابل کر دیں۔

”ہاں آپ کو ٹھیک لگتا ہے۔“ مورخ نے یہاں بھی بے ایمانی نہیں کی۔

سالی جوان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا اور کلاس کے دروازے میں کھڑا تھا اس نے اپنا دل سکڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کلاس میں چھپایا سکوت ٹوٹنے میں نہ آیا اور وہ کلاس سے ایسے نکل آئی جیسے وہ عالیان کی زندگی سے لگی ہو۔



وہ سرخ تنگی بیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ سرت و اطمینان سے۔

اور نگزیب عالمگیر کی بنائی ”پوشا ہی مسجد“ کا دروازہ کھول دیا گیا ہے، مینا کاری اور مگل کاری کی آرائشی محراب سے گزرتے اس نے ذرا دیر رک کر وسیع احاطے کے بار اونچے پیناروں کے قیام تلے واقع پیناروں کو شکر گزاری سے دیکھا، جیسے مقدس مقامات کے دوست فرشتوں کو سلام کیا۔

وہ چلا حوض تک آیا اور اس کے پانی میں ہاتھ ڈبو دیا اور پھر پانی کو بچکانہ انداز میں چلو میں لے کر اچھال دیا اور مسکرا دیا۔ ایسی مسکراہٹ جو انسان کے لیے بنا دی جاتی ہے اور ”روز عقد“ اسے پیش کی جاتی ہے اسے ابھی وہ دور ہی رہا۔

وہ نماز جمعہ سے دو گھنٹے پہلے ہی آچکا ہے اور اب سر جھکا کر گنبد کی چھت تلے ستون سے کمر لگائے بیٹھا ہے۔ وہ بہت شدت سے مار گریٹ کو یاد کر رہا ہے اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ مرنے والے ہمارے ساتھ ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ بہت دیر تک اسے سر جھکائے ایسے ہی بیٹھے رہتا ہے۔

نے طنزاً ”کہا تھا میں دیکھتا ہوں تم ماچھڑ سے ایسا کیا لے کر آتی ہو جو روس سے نہیں ملتا۔ تو اب میرے پاس پیش کرنے کے لیے امرہ ہے۔“

ساری کلاس ہنس دی۔
”۲۲ مرد کے پاس عالیان ہے۔“

”عالیان تمہے پاس کارل اور کارل کے پاس شیطان۔“ کسی ایک نے بلند آواز سے کہا اور سب کے تھقروں نے زلزلے کی سی صورت اختیار کرنا کارل بھی ہنسنے لگا۔

”تو کیا ایسے بیش قیمت تحائف کو دیکھ کر پلپا خوش نہیں ہوں گے عالیان اس وقت پاکستان میں ہے امرہ کے ساتھ اور چند ہی گھنٹوں بعد ان کی شادی ہو جائے گی۔ اور مجھے اس شادی میں شرکت کرنی ہے۔“ بہت من موہنی سی آواز میں اس نے کہا وہ ان کی ہنسی میں شامل نہیں ہو سکی تھی۔

”کتنے ہی اسٹوڈنٹس نے مجھ سے کہا کہ آخر کار میری اور امرہ کی دوستی اب ختم ایک لڑکی نے مجھ سے کہا کہ میں نے امرہ سے ہار کیوں ان لی۔ نہ امرہ سے دوستی ختم ہوئی ہے نہ ہم حالت جنگ میں تھے کہ ہار جیت کا خطاب حاصل کرتے۔ میں نے حقیقت کو کھلے دل سے قبول کیا اور شدت پسندی کو اپنے اندر سے رخصت کر دیا۔ میری اور عالیان کی کہانی پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں تھی، لیکن امرہ اور عالیان کی کہانی کو نیک تمناؤں کی ضرورت ہے اور آج ان کے خاص دن میں ساری نیک تمناؤں ان کے نام کروں گی میں ان کے لیے وہ دعا کروں گی۔ جو صرف میں ہی کر سکتی ہوں۔“

اس کی من موہنی آواز غم سی ہونے لگی اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہادر نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے اور زیادہ کوششیں بھی تو ناکام کر دیتی ہیں تا کہ کبھی۔

”آپ کا ماننا ہے کہ میں ظاہر نہیں کر رہی، لیکن مجھے فرق پڑا ہے میں اس نظر آتی ہوں میں کھوکھلی ہنسی ہنستی ہوں میں کسی گمشدہ چیز کو تلاش کرتی لگتی

دن کی روشنی عماروں اور دیواروں سے ہوتی مستوئوں کو چھوٹی سیدھا گلاب میں "رحمت" یعنی اترنے لگی۔

روشنی اس آئینے پر مرتکز رہنے پر بھند ہے جس کے عکس میں وہ جھلک رہی ہے۔ دودھ میں سنہری کر میں جا ملی ہوں سے رنگ کی فرشی پوشاک میں جس کا دامن پیچھے سے زمین پر بچھا ہے اور آگے آتے آتے ذرا سا اور اٹھتا جاتا ہے گو پنے وہ نظر اتار لیے جانے کے لیے گھڑی سے "طرح دار" حسین و جمیل ملکہ کے پر شکوہ تاج کے نقش سے نقش فرشی دامن سے طلوع ہوتے سنہری گہرے رنگ کے نقوش بناتے کرتک قیام کرتے جا رہے ہیں اور موتی آسمان پر بکھرے ستاروں کی طرح گردان سے نیچے بکھرے ہیں۔ اگر اس لباس پر اتنا کچھ نہ ہو تا تو اس کے جھنگ کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہو گا کہ اسے امرت نے پن رکھا ہے۔

اس نے اپنے سر و ذرا سا اور اٹھایا اور ہاتھ میں پکڑے جمو مر کو سر پر با میں سر رکھ کر دیکھنے لگی اور پھر سرخ کلیدار دہنے کو دوسرے ہاتھ سے بھیج کر تاک تک گھونگھٹ کی صورت لے آئی۔

داوانے ایک دم غلٹ کے انداز سے دروازہ کھولا اور وہ گھبرا گئی اور جمو مروالا ہاتھ سمیٹ کر آہستگی سے نیچے لے آئی۔ گھونگھٹ تاک تک ہی رہا اس نے سرخ نہیں موڑا۔ دلوانے پیچھے سے قد آدم آئینے میں اس کے عکس کو دیکھا اور یہ کہا "دلین دلین کھینے والی لب خود دلین بنی کھڑی ہے۔ وقت کا کام تیزی سے گزرتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ گزر جائے لیکن اس سے اتنی سی اتماس ہے وہ ایسے وقتوں میں اپنی رفتار ٹھہرے ایسا پیاری صورتوں کو دیکھنے کے لیے زیادہ نہیں صرف چند صدیوں پر محیط چند میل اس کے لیے جس نے آج اپنا روپ بدل لیا ہے جس کے سیاہ پیل صرف سیاہ نہیں رہے اور جس کی صاف گوری رنگت و جھنگ رنگوں سے تل میل میں مصروف ہے۔

داوانے سوچا اس نے یہ نیا روپ کہاں سے چرایا؟ پرانی امرت کہاں گئی؟

جمو مروالے ہاتھ میں بیہندہ آمیل پھر اس نے

گھونگھٹ کا کونا اٹھا کر گردن موڑ کر داوا کو دیکھا اور مسکرا دی۔ اس نے کوئی میک اپ کیا تھا نہ کوئی زیور پہنا تھا۔ دائرے میں کئی مندی اس کی ہتھیلیوں پر آگے پیچھے براجمان تھی۔ اور دل پسند عمدہ بنیں انگلیوں کی پوروں میں تنقید تھیں۔ اس نے ابھی جوتے نہیں پہنے تھے پھر بھی آج وہ قدمیں بہت اونچی ہے۔ آج اس کی مسکراہٹ ہر رنگ سے مشابہ ہے اور ہر خوشی کی انگلی تھلے "مخو رقص" ہے۔ آج اس سے زیادہ خوب صورت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آج مسرت پر اس کی بادشاہی ہے۔

داوا اس کے قریب آگئے اور اس کی پیشانی چوم کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر باہر آگئے واحد صاحب کے کمرے میں اور اسے لن کے سامنے کھڑا کر دیا۔

کچھ وقت گزرا وہ خوف سے کچھ بول نہ سکی۔ داوا نے بابا کا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا اور اسے ساتھ لے کر باہر آگئے۔ اہل اور داوی نے اس کے آگے وہ سب کیا جو بعد ازاں انہیں خیرات کرنا تھا۔

و "سنہرے عقد" کی سجاوٹ ہونے لگی اور شاہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر گاؤں کی گلیوں میں استقبال کے لیے نکل آئے۔



مقام خدا ہے۔

ادا نیکی فرض ہے۔

رتبہ بندگی ہے۔

کئی سو نمازی اپنی صفوں میں حالت قیام میں کھڑے ہیں۔

وہ راکع۔ وہ ساجد۔ وہ عاجز۔ وہ طالب۔ وہ مومن۔

نماز جمعہ کی بادشاہی ہو گئی اور دعا مانگی جانے لگی۔ نماز سے پہلے داوا "حملہ" علی اور چند بزرگ عالیان کے پاس آچکے تھے۔ خواتین والے حصے میں لہڑی مہر بھی آچکی تھیں اور نماز سے پہلے وہ لن سے دعائیں

لے آیا تھا اور ان کا ہاتھ چوم آیا تھا۔

دعا ہو گئی تو علیان اٹھا اور امام صاحب اور سب نمازیوں کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے سب نمازیوں کو بیٹھے رہنے کے لیے کہا اور علیان کا تعارف کروانا شروع کیا۔

یہ علیان مارگرٹ ہیں۔ یہ برطانیہ سے آئے ہیں یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کی حقیقی والدہ وفات پا چکی ہیں اور یہ اپنی سرپرست والدہ کے ساتھ یہاں موجود ہیں۔ جناب علیان بفضل خدا مسلمان ہیں اور بنت عبد الواجد اور جناب عبد الکریم کی پوتی سے نکاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سب انہیں دعا میں دیں اور ان کے نکاح میں شریک ہوں۔“ غیر محسوس مسکرائیں ایسے گونجیں مانو جیسے سب نے با آواز بلند کہا ”ہاں ہم ضرور شریک ہوں گے۔ ہم یہ خوشی کیوں کر حاصل نہیں کرنا چاہیں گے جو معتبر اور درجہت میں بلند تر ہے۔“

صفتوں کی ترتیب قائم ہے اور دعا یہ ہاتھ اٹھنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے اچھے لباس عطر آگیاں ہیں اور سوچیں پاکیزہ ان کی مسکرائی نظریں متوقع دوسے کو دیکھ رہی ہیں کئی بچوں کو ان کے باپوں نے گودوں میں بٹھالیا ہے۔ اور وہ ان کے کانوں میں بتانے لگے ہیں کہ اب کیا ہونے جا رہا ہے۔

”علیان امرحہ کلب امرحہ علیان کی۔“

علیان نے خود پر سب کی نظروں کو پایا اور وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپانے میں ناکام رہا اور اس نے جانا کہ سب اس کے دل کی تیز تیز دھڑکن سن رہے ہیں اور شرارت لیے محفوظ ہو رہے ہیں تو اس کے باقاعدہ لاہوری بننے کی تقریب میں سب شریک ہیں۔

کارل سالہ اور باقی کے ہل مٹھن دم ساوھے سب دیکھ رہے ہیں۔ شاہ وزیر ساتھ ساتھ ترجمہ کر رہا ہے۔

”سحر آگینہ۔“ کارل بریڈلیا۔

علیان نے اپنے قریب بیٹھے دادا کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز سے پوچھا ”مجازت ہے دادا؟“

جو اب میں دادا نرمی سے مسکرا رہے۔
علیان امام صاحب کو حق مہراور باقی کی تعصبات پہلے ہی بتا چکا تھا۔ پھر دادا نے گواہوں کے ہم لیے اور ان کا تعارف کروایا امام صاحب انہیں اپنے ساتھ لے کر خواتین کے حصے کی طرف آئے۔

ندیاں دریاؤں میں گرنے لگیں اور دریا بحر ہوئے۔

سجدہ گاہ میں پھیلی نورانیت زندگی کی سرپرستی سنبھالنے لگی۔

”قافلہ صورت یہ مختصر مسافر کیسار لٹشیں ہے، لیکن پھر بھی اس کے جلد ختم ہو جانے کی دعا بریل مائل ہے۔“ ایک سے دوسرے گنبد کی نقشیں چھتوں تلے کئی سو نمازیوں کے سامنے سے امام مسجد کے ساتھ ”عمروس مشرق“ کی طرف جاتے اس نے اقرار کیا۔

نذر افشاں میں غوطہ زن ہو کر نکلے روانے گنبدوں کی چھتوں سے جھولتے فانوسوں کے گرد بے ساختگی سے لکے اور افشاں کی لہریں بناتے نمازیوں کے سروں پر برس گئے۔

کلام اقبال کے اسرار محبت سے چکا چوند ہوئے۔ اور ساری شاعری ایک سماعت میں سمٹ آنے کے لیے ایک سماعت میں لکھی جانے لگی۔

اس بار اب عہد قدیم عہد جدید کا مسمان بننے آرہا ہے۔

دیوائے راوی واپس اپنی جگہ قطعے اور پار شہابی مسجد کی دیواروں کو چھوٹا گزرنے لگا ہے۔ پانی اور گزریب عالمگیر کے عہد میں بنائے حوضوں میں بہہ آیا اور حوضوں نے فوارے جاری کر دیے۔ شاہی قطعے کا بھانگ کھول دیا گیا اور گھوڑے اور ہاتھی بکھیاں اور پالکیاں اپنی اپنی سواریاں قطعے کے دروازے سے اندر لے جانے لگے۔

نقارہ بجایا جا رہا ہے۔ با ارب ملاحظہ۔ سماعت نکاح۔

دن نے اپنی روشنی کم نہ کی اور اوھر لاہور میں چار بیاباں اور نمن گنبدوں پر ایہ کرم سی نظری کی سرخ

عالیان کا بیج آیا تھا "نا کہتی ہیں اگر ہمارا نکاح بھکم
خدا ملے ہے تو بس یہ ملے ہے اور اس آگے ہمیں کچھ
نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ سوچ شک ہوگی اور شک یقین
کا دشمن ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ نکاح ملے تھا۔" اس کی نظروں کے سامنے
وہ سب گھومنے لگا جس میں سب ہونا ممکن تھا، لیکن
اس کا اور عالیاں کا ایک ہونا نہیں۔ وہ دعائیں کرتی تھی
اور خود ہی ان دعاؤں پر یقین کھوتی تھی، کیسا مشکل
اور یقین سے خالی سفر کاٹنا اس نے پائی پر چلنے جیسا نہیں
نا ممکن ہی۔

لیڈی مہراں کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں اور وہ دیکھ
سکتی تھیں کہ کیسے وہ اپنے ہونٹوں کے کنارے دانتوں
میں دبا رہی ہے کہ اس کی مسکراہٹ نمایاں نہ ہو۔ اماں
واوی وانیا اسے کچھ ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کی
کبھی تھی ہی نہیں، ہر لڑکی کی شادی پر اس کے گھر
والے شاید ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے آنکھوں میں کاجل
لگا لیا تھا اور ہونٹوں پر لپ گلوں اور گھونگھٹ نکال کر
بیٹھ گئی تھی۔ ابن ساوہنا اور ویرا اسے شغل کاک کی
نست کاوش بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔

جب اس نے گھونگھٹ نکال لیا تو ویرا نے سوچا وہ
آج سے پہلے کبھی اتنی خوب صورت نہیں لگی۔ اگر یہ
سرخ رنگ کا مکمل ہے تو اسے ہمیشہ یہی رنگ ہینا
چاہیے اور اگر یہ متوجہ رسم کے اثرات ہیں تو وہ کبھی
ان اثرات سے نہ نکلے۔ وہ جو۔

ایک عروس مشرق ہے۔
حسن میں مہبطراق سی۔
طلسم میں طلسم کشا سی۔
گل پیرا ہن گل رو سی۔

ویرا مہسوت اسے دیکھ رہی تھی، ابن ساوہنا
اسے کچھ کہہ رہی تھیں کہ امرجہ نے اشارے سے
انہیں خاموش کر دیا اور بتایا کہ امام صاحب آرہے
ہیں۔ اس نے عالیاں کا نام نہیں لیا۔

امام صاحب جعفری کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ

گھونگھٹ سے ہوتی اس کی نظریاہ نگری کی جعفری
کی جھری میں جزی جھک جانے کے تیار نہیں تھی وہ
دیکھ سکتی تھی کون اس کی طرف آ رہا ہے اور کسے ساتھ
لا رہا ہے اور وہ دونوں کتنے لوگوں کی موجودگی میں کہاں
موجود ہیں۔ اس کے لب وانہ ہوئے، لیکن اس کے
محسوسات ترنم میں تو از بند کرتے چلے گئے۔

پیش قدمت کوچہ را گل می کشم۔ (تس تیرے
قدموں سے پہلے رستے میں پھول بچھاؤں)
گل می کشم گل گلاب می کشم۔ (پھول بچھاؤں
گلاب کے پھول بچھاؤں)

خاک قدمت پی دی دم وار را تمہ۔ (تیرے قدموں
کی خاک پر اپنا آپس داروں)
یارم یارم یارم۔ (میرے دوست، میرے
یار، میرے محبوب)

خوشی نے اپنے سارے پرانے معنی کھو دیے اور وہ
صرف ایک معنی پر بسرام ہو گئی "عالیاں" پر اس کے
سفید لباس شلوار تھیں پر سلوٹس تھیں۔ اس کے
آگے پیچھے وانیں، بانیں فانوسی قدیلیں، نشانوں پر
انھانے وانوں کی فوج تھی، پابجے تاشے والوں کی۔ وہ
کبھی سے اترا تھا۔ کسی سخت سے پھر بھی کوئی اس کی
برابری کا نہیں تھا اس کی خوب صورتی کی چکا چونہ لفظ
یہ لفظ بڑھتی جا رہی تھی اور اسے نظر بھر کر دیکھتے رہنا
مشکل ہو رہا تھا۔

وہ جو وہ ہے۔

عبروز آب سا۔

عشق میں قیام سا۔

زبان فیض میں کلام سا۔

طرب کے سازوں نے ملن کے گیتوں کو دعوت

کلاہری۔

لور گینے جڑے طلا سی پر ان گیتوں پر رقص کنان

ہوئے۔

وہ سنجیدہ اور خاموش تھا، لیکن اس کے اندر ہوا

جشن کے سہل کار از اس کی آنکھیں اگل رہی تھیں۔

گھونگھٹ کے پار امرجہ مسکرا دی۔ اسے صبح

مشک بید برسانے کے لیے اپنی سسلیوں کو لیے
آچکی ہے اور انہوں نے مقام خدا پر احترام سے پرواز
شروع کر دی اور اپنی مشک بید سے بھری ٹوکریاں خالی
کر لی شروع کر دی ہیں۔ شروعات انہوں نے عالیان
امرد سے کی ہے۔

عالیان نے پھر نظر اٹھا کر دیکھا اور جھری سے
گھوٹکھٹ کے بار چشم سیاہ کو جالیا بچو ابھی بھی سیاہ
تھیں، لیکن روشنی کے خزانوں سے لبریز تھیں وہ
چشمحال جنہوں نے اس کا ہاتھ تمام لیا تھا اور اسے ان
داستانوں کی اور لیے جاتی تھیں جنہیں نسل در نسل
بنا گیا اور صدیوں بعد شوق سنا گیا اس کے دل پر ایسی
کیفیت طاری ہونے لگی جس کے بیان کے لیے حیرت
بڑا اس کے بس میں نہ تھا۔

امرد نے چاہا کہ وہ "عالیان مارگرٹ قبول
ہے۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میسر، ہسا دینے والا، رلا
دینے والا، دور کر دینے والا، پاس رہ جانے والا، جس سے
پگھڑنا قسمت تھا اور جس کا "لانا" طے تھا۔
عالیان مسکرایا اور امرد بھی کیوں کہ اس نے
صاف آواز سے کہہ دیا اور اس نے صاف سلامت
سے سن لیا۔

"قبول ہے"
یوں کہا کہ سب سن لیں۔
ان فائنڈز کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا گیا جن کے
پروں پر لایا چھینٹے تھے۔
"قبول ہے" امرد کے بعد عالیان نے کہا۔
قلعے کی بلند دیواروں اور چٹانوں سے رنگ بھرے
تھاؤں کو اجمال دیا گیا۔ اور رنگ ہر رنگ میں فضا میں
بکھرتے چلے گئے۔

"قبول ہے" اس نے پھر کہا۔
"عروس اللہ" میں دف بجائے جانے لگے۔
نٹ کٹ کٹیز اپنی جھلملائی اوزھنیاں لہراتے
تیزی سے قلعے میں بھاگتے جمو کے بدلے لگیں اور
اپنی شوخ ٹوانوں میں گانے لگیں۔
جانا بد۔ بیانہ بد۔

مئے عالیان بھی انہی کے ساتھ بیٹھ گیا اور باقی سب
بھی۔ عالیان اور امرد۔ جعفری کے اس اور اس پار
آنے سامنے آگئے۔ پل کے پل عالیان نے نظر اٹھا کر
جعفری کے سوراخوں سے جھانکا اور اسے سرخ رنگ
کی جھلک نظر آئی۔ اس وقت اسے امرد کو دیکھنے کی
جلدی نہیں تھی۔ اسے امرد کو سننے کی بے چینی تھی۔
اس مقام تک وہ اس کی رضامندی سے ہی پہنچا تھا۔
لیکن اسے وہ خاص جملہ سنا تھا۔

مجھے یہ کہہ لینے دیں کہ وہ لمحہ ان پہنچا جس کی آمد کا
صدیوں نے انتظار کیا اور سوال کی طلوع ہوئی جھری
کھری ساعتوں نے "جواب" کو خوش آمدید کہا۔
امام صاحب نے نکاح پر معانا شروع کیا۔
جیسے سلائی کے لیے قطاریں باندھ لی گئیں۔

اور شہزادیاں اور رانیاں کینیز اور باتھیاں اپنی اپنی
سواروں سے اتریں، آئے لنگے میٹھاؤں، شرارے
اور چولیاں اور لمبے کچھتے زر مار رنگ رنگ دونوں کو
سنجھائیں۔ بیشیش محل کو جاتی سیڑھیوں سے قلعے
نگائی، اٹھ کھلیاں کرتی گزرتیں اور محل کے
جمو کوں میں جا کھڑی ہوئیں اور سر اٹھا اٹھا کر لوہر
پاوشاھی مسجد کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کے ہاتھوں
میں فائنڈز ہیں اور ان کے پیروں کی پانہیں سرلی
شہنائیوں کی طرح بکتی ہی جاتی ہیں اور ان کے
زیورات ان شہنائیوں پر جموتے ہی جلتے ہیں۔

امام صاحب نے بنیادی نکات کی اوائلی کے بعد
امرد سے پوچھا۔
"قبول ہے؟"

من پسند سوال۔ دل پسند کمراس۔ گل گلزار۔ گل
گلزار۔
قبولت درو شانہ پاکیزگی۔ لیے دد لولہ میں گل رنگ
ہو جانے کو ہے۔

اور جاتز ہونے کی بڑی اہمیت ہے اور اجازت تانے
کا بلند رتبہ ہے۔ بلند بلند تر۔ مشک بید سے جی
اپنی پوشاک میں بلبوس مشکبار پری طویل مسافت طے
کرنی اس مشک مشک بندھن میں بندھنے والوں پر

بیانہ بدہ کہ شمارا ستم۔

بیانہ بدہ کہ شمارا ستم۔

”قول ہے“ وہ کہتے ہی رونا چاہتا تھا کہ کوئی
ساعت ایسی نہ رہ جائے جو اسے سن نہ سکی ہو سب سن
لیں۔ سب جان لیں۔

اسنے دل پر اس نے ہاتھ رکھ لینا چاہا تاکہ وہ اس
تواز کو گھم دیا سکے جو بلند ہانگ جیل دل بیان کر رہی تھی
اور ساری دنیا اس پر جھک آئی تھی کہ اچھا تو جناب کا یہ
حل ہے؟

اور وہ مسکرائیں دونوں کو پیش کر دی گئیں جو ”روز
عقد“ ہی ہونٹوں پر کھل سکتی ہیں۔ دونوں اس
مسکراہٹ کے حق دار تھے اور انہوں نے جانا کہ
خوشیوں کے اب تک جتنے مطالب انہوں نے جانے
تھے وہ کتنے چھوٹے اور معمولی تھے۔ سرت اپنے
بھی معنوں اور رائوں کو لیے اب ان پر آشکار ہو رہی
ہے اور وہ ایسی سرت کے شکر گزار ہیں۔

نکاح محبت کی معراج ہے۔ ورنہ سب دھواں ہے
جس کا کس قیام نہیں۔

”نکاح“ سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔

”نکاح“ دونوں کی فضیلت۔

امام صاحب نے خطبہ نکاح دیا اور پھر دعا کرنے
لگے۔ وہ سب واپس منبر امام کے پاس آکر بیٹھ گئے
تھے۔ سب نمازی دعا میں شریک تھے اور بلند تواز سے
آمین کہتے جاتے تھے اور فرشتے بھی ابدی محبت کی
دعاؤں کے تحائف دیتے ”آمین“ کہنے میں شریک
ہیں۔

پھر امام صاحب نے اٹھ کر عالیان کو گلے سے لگایا
اور مبارک بلا دی۔

اور اپنے لہای بروں کو راوی کے شفاف پانی میں
منکس کرتی ان گنت فاتحانہ جھماچھم آوازیں
بھرتی تھیں سے مسجد کے صحن سے اڑاڑ جانے لگیں۔
پھر واوانے اور باقی سب نے اسے گلے سے لگا کر
مبارک بادوی پھر ایک ایک کر کے نمازی بھی اٹھ اٹھ
کرتے گئے اور اس کے لیے اسے کتنے اپنے اپنے

الفاظ میں مبارک بلا دینے لگے۔

عالیان کو لگا ساری دنیا نے اس کے نکاح میں
شرکت کی ہے اور اب ساری دنیا ہی جشن مناتی ہے۔
نکاح اس الوہی بن نے اس کا دل موہ لیا۔

حملہ اور علی وہ مٹھائی سب میں تقسیم کرنے لگے جو
ڈھیروں ڈھیروں لڑی سر نے منگوائی تھی اور پھر عالیان خود
بھی وہ مٹھائی تقسیم کرنے لگا اس نے ڈھیروں مہارکیں
وصول کیں اور بچوں کے گالوں پر جھک جھک کر پیار
کیا۔

”آپ دولہا ہو؟“ ایک بچے نے اس سے مٹھائی
لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں دولہا ہوں۔“

اس نے بڑی خوش دلی سے کہا بلکہ اس نے چاہا کہ
اس سے بار بار پوچھا جائے کہ ”کیا تم دولہا ہو؟“ اور وہ
بار بار کہے ہیں ”میں دولہا ہوں۔“

واوانے امرہ کو کتنی ہی دیر سینے سے لگائے رکھا
”میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ مجھ سے زیادہ خوش آج
اس دنیا میں کوئی نہیں۔“

”میں بھی آپ کا شکر یہ ادا نہیں کر سکوں گی دولہا!“
بہت مشکل سے وہ بس یہی کہہ پائی جذبات کی شدت
سے اس سے کلام مشکل تھا۔

مسجد خالی ہونے لگی۔

عالیان نے Anselm ہاں میں مشترکہ
مبارک بادوی شور مچا دیا۔ بغیر سن لیا اور کارل اور
سالی سے کتنی ہی دیر بات کر مارا۔

”دیکھ لو دولہا نہیں بھاگا؟“ وہ مورگن سے کہہ رہا
تھا۔

مورگن دل کھول کر ہنسی ”ہتم لاہور میں ہوتا اس
لیسے روس میں ہوتے تو بھارتے۔“

ایک سایہ سا عالیان کے چہرے پر لہرایا۔ ابھی کچھ
دیر پہلے اس کی دیر اسے بھی کالی کسی بات ہوئی تھی اور
وہ اس کے ساتھ کافی لہبا چوڑا مذاق کرتی رہی تھی۔
عالیان نے گرا سانس لیا۔ یہ پچاس شاید ہمیشہ اس
کے دل میں رہنے والی تھی کہ اس نے پیارے دلوں

میں سے ایک پیارے دل کی مالک لڑکی کو ہاں کہہ کر کیسے اسے واپس موڑ دیا تھا۔ امرجہ کی صورت وہ قائم دے میں رہا تھا، لیکن اس پیاری لڑکی کا نقصان کر کے اعلا طرفی میں وہ کبھی ویرا۔ آگے بازی نہیں لے جاسکے گا۔

مورگن اور شارلٹ سے لمبی بات کرنے اور انہیں مسجد دکھانے کے بعد وہ لیڈی مہر کے پاس آیا ان کا ہاتھ پکڑ کر جو اور ان کی گیلی آنکھوں کو صاف کیا۔

”تپ شارلٹ مورگن کی شلوہوں پر بھی رودہی تھیں اور میری ہنسی۔ میں تو رخصت ہو کر کہیں نہیں جا رہا۔“

لیڈی مورگن نے کہا۔ ”مٹھنے نے میری دعائیں قبول کیں۔“

”میری بھی ملنا! وہ بھی مسکرا دیا۔“

ان سب نے مشترکہ آسور میں بنوائیں پھر عالیان ملا امر کو گاڑی تک چھوڑ آیا اور وہ سب طے گئے۔ اس نے داوا سے اجازت لے لی تھی امرجہ کے ساتھ کچھ دیر وہیں رہنے کی۔



تو امر پریم کا جولاؤ کا نام ہے وہ ”مرد عالیان“ ہے۔ عالیان نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جس میں ملا کی انگوٹھی تھی۔ امرجہ نے وہ پٹا پیٹ رکھا تھا اور سر سے وہ ذرا پیشانی سے نیچے تک جھکا تھا اور جمو مر اور کاتوں کے بندے کناروں سے جھانک رہے تھے جیسے چوری چھپے عالیان کو دیکھ رہے ہوں۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اس محرابی لمبے برآمدے میں لے آیا جس کے اس طرف سے کبھی راوی بہتا نظر آتا تھا اور جس کی ٹھنڈی ہوا مسجدوں اور دعاؤں کی گواہی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔

امرد نے خود پر وہ جلابی رہی بڑے پختہ پایا جو این کے مطابق جلابی دلکن کے لباس کے ساتھ پیٹ دیا جاتا ہے جس میں ہر رنگ کا گلہا ہوتا ہے۔

اور جس پر ”Anata No iro Ni“ لکھا

ہوتا ہے۔ عالیان نے ذرا سا غور کیا کہ سرخ عکس تلے اس کی آنکھیں عجیب افزا تفری کا شکار سی ہیں۔ وہ رنگ سا رہ گیا کہ جنہوں نے افزا تفری چلائی اب وہ خود اس میں جھلا ہیں۔ خود فراموشی کی حالت میں وہ وقت کو پیچھے چھوڑنا چلا گیا اور نیل کے پانچوں جنہیں تلی برآمدے سلام کرتے جاتے ہیں کو اس کی آنکھوں میں ہلکورتے کھاتے دیکھا۔

”میں عاشق چشم مست یارا ستم۔“ (میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)

واپسی میں اسے کچھ وقت لگا۔

”مرد۔ مجھے عالیان کہتے ہیں۔“ اس کے بعد اسے اپنا آپ یاد آیا۔

”عالیان۔ مجھے زوجہ عالیان کہتے ہیں“ اس کا بھی وہی حل تھا۔

دونوں چاندی کے آب خوروں میں موجود عفران طے دودھ میں عکس متاب ہو گئے اور جس ذرہ اندھیرے کی پیٹ میں لپٹا مقفل دروازہ نیل کے روشن کناروں کی طرف کھلتا چلا گیا جہاں رو پھلی کر نہیں سفید روشنی سے سرخ گلاب بنانے میں مگن تھیں۔

سرخ گلابوں سے سجے کناروں پر انہوں نے اپنے قدم رکھے اور اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

”اویسی حیرت انگیز بات ہے امرجہ! کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک لڑکی جو اس شہر کی ہوگی وہ میری جان اپنی سخی میں لے ہوگی۔“

”مجھے اس میں شک ہے۔“

”کس میں؟“

”کہ تمہاری جان میں اپنی مٹھی میں رکھتی ہوں یہ اختیار تو تم رکھتے ہو۔“

وہ ہنس دیا۔ ”یہ کیا ہے؟“ اس نے انگلی سے جمو مر کو چھو کر پوچھا۔

”یہ تم پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”تتنا اچھا؟“

”اتنا اچھا کہ میں چاہتا ہوں تم اسے ہر وقت ایسے

ی لگایا کرو۔"

امرد من چاہی ہنسی ہنسی دی۔ "یہ ہر وقت نہیں لگایا جاسکے۔"
"پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اسے ہر وقت لگایا جائے۔"

امرد کے جسم میں ہنکاسا ارتعاش تھا اور عالمیان یہ محسوس کر سکتا تھا وہ ذریعہ لب ہنسی دیا اور امرد نے اس کی مسکراہٹ کو بڑا محبوب پایا۔ جس محبت نے اس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا وہ اب اس کے نام کر دی گئی تھی۔ لکیت کذبہ احساس ہر لہند احساس پر حاوی تھا۔ عالمیان نے سوچا جیسے چھپ کر دیکھتے رہتا تھا وہ مقابل آیا ہے اور کون ہے جو اسے اس سے دور لے جاسکے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں امرد!"

"میں تم سے وہ سنتا چاہتی ہوں!"

"میں تم پر مرنا تھا اور مجھے اپنا یہ مرض بہت عزیز ہے۔" اپنے دل پسند وقت کے بعد دل پسند انداز کو اپنا کر اس نے کہا۔
امرد دیر تک ہنستی رہی۔

"اور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں ناراض ہو جایا کروں گا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ میں تمہیں پسند کرنے لگوں۔ میں تم سے لڑوں گا، لیکن تمہیں دور نہیں کروں گا۔ میں فاصلہ رکھ لوں گا، لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکوں گا۔ اگر میں معاملات کو بگاڑوں گا تو انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ میری کچھ باتیں تمہیں تکلیف دے سکتی ہیں، لیکن ایسا نہیں ہو گا کہ میں ار لوں گا۔ تمہیں تکلیف دوں۔" میں عالمیان صرف تمہارا ہونے کا حق کبھی تم سے نہیں چھین سکوں گا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی مکمل زندگی گزارتا ہو اور ہم بھی انہی میں شامل ہوں گے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ میں ہماری زندگی کو مکمل کرنے کی کوشش نہ کروں۔"

وہ رکا کہ اب وہ بولنا نہیں سنتا چاہتا ہے۔

"پیغامات جو تم نے میرے لیے لکھے تھے کیا تم ان

میں سے کوئی ایک مجھے اس وقت سناسکتی ہو؟"
امرد نے اسے دیکھا۔ "یعنی یہ اب چاہتا ہے اسے بھی کچھ سنایا جائے، لیکن ایسا بھی کیا ضروری ہے۔ ہے نا؟"
"مجھے کچھ یاد نہیں۔" وہ ایسے ہو گئی جیسے اسے تو اپنا نام بھی یاد نہیں۔

چچھی سندری امررد۔

"اپنی یادداشت کھنکالو۔" وہ ایک دم ہی دل گرفتہ سا ہو گیا۔

"کیسے میرے سر پر زخم آئے ہیں۔"

"تمہارے زخم تقریباً ٹھیک ہو چکے ہیں۔"

"پھر بھی ان زخموں نے میری یادداشت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور میں تمہارے علاوہ سب بھول گئی۔ یہ بھی کہ یہ زخم مجھے کیسے آئے۔ مجھے یہ نظر نہ آیا کہ میں مرنے جا رہی ہوں، مجھے صرف یہ نظر آیا کہ میں تم سے دور جا رہی ہوں۔ مجھے یہ خوف نہیں ہوا کہ میں کس تکلیف سے گزرنے والی ہوں، مجھے یہ فکر لاحق رہی کہ تم کسی تکلیف سے نہ گزرو۔ ایک عرصہ ہوا میں نے دنیا کو دیکھنا چھوڑ دیا، کیوں کہ ایک عرصہ ہوا میں نے تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا۔ بہت برائی بات ہوئی لب یہ کہ میں کیا کیا بھول سکتی ہوں، لیکن صرف ایک "تمہیں" نہیں تم میرے ہر معنی کی لغت ہے۔ میں ہر معنی تم سے کھوجتی ہوں۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ دنیا کن شاہکاروں سے بھری پڑی ہے، میں صرف اس پر شکر گزار ہوں کہ مجھے کس سے نوازا گیا، تم سے" میرے پیغامات اب تمہیں تا عمر پڑھتے رہتا ہے اور انہیں یاد بھی رکھنا ہو گا ان میں سے ایک پر لکھا ہے۔

"Anata No iro Ni"

"یہ جاپانی ہے نا؟" یہ کوئی قدیم مصری زبان ہی کیوں نہ ہوئی اسے فرق نہیں پڑتا تھا ترجمہ کرنے والا اس کے ساتھ موجود تھا۔

"ہاں۔" وہ ترجمہ کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آئی تھی۔

گوئی پروہ پھر سے مرنا۔
مشک آہو نے نیل کی وسعتوں کو پانا اور زقند بھرتا
ہنی کے سامنے آکھڑا ہوا اور پھر دونوں ان دونوں کے
گردو کڑیاں بھرنے لگے اور پھر آٹنے سامنے کھڑے
ہو گئے اور اصلمان کے قالین پف نے زرا حمر کے
تاروں سے انہیں شاہکار میں بدل دیا اور ان میں ایک
گھرے گپت راز کو نقش کر دیا۔ جوان کی رونمائی تک
رازی رہنے والا ہے۔



ایرپورٹ صرف ساوحنای آئی تھی۔ عالیان کو
حیرت ہوئی گوئی بھی نہیں آیا۔ جاب پر جانا اتنا ہی
ضروری تھا سب تک۔
جب وہ گھر آئے تو عالیان مسکرا دیا۔ شہل کاک
کی فریٹ وال پر چھوٹی بڑی رنگ برنگی پرچیاں جگہ جگہ
چمکی تھیں اور ان پر نوٹ لکھے تھے۔ دونوں مل کر نوٹ
بڑھنے لگے اور ذرا غور نہ کیا کہ ساوحنای فریڈی مہر کو لے کر
کچن ڈور سے اندر چلی گئی ہے۔
کچھ پر جو کس لکھے تھے، کچھ پر دونوں پر مزاجہ
فقرے چست کیے گئے تھے، کچھ میں صرف امردہ کو
تھا طلب کیا گیا تھا، کچھ میں صرف عالیان کو۔ جیسے کہ
عالیان کے لیے چند نوٹس پر یہ لکھا تھا۔
”بے چاروں کے گردپ میں شمولت مبارک ہو
عالیان۔“
”دنیا میں ہر کام ممکن ہے شوہر بن کر واپس ”انسان“
بن جانا ممکن نہیں۔ دنیا میں ایک ہی مظلوم قوم ہے جو
خود پر ہوئے ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتی
شوہروں کی قوم، آواز کی اس فونٹی کے لیے نیک
تمنا میں۔“
امردہ کے لیے ایک نوٹ لکھا تھا۔ ”ہمارے پاس
اب لا آپشن ہیں ماچسٹر سے نقل جائیں یا ماچسٹر میں رہ
کر امردہ کو بھگت لیں۔ ہم سب کا مشترکہ خیال ہے
پہلا آپشن ہی قابل قبول ہے صرف۔“
کافی دیر تک ہنسنے رہنے کے بعد دونوں اندر کی طرف

”اس کا مطلب کیا ہے؟“
”تم تیار؟“ امردہ کے لیے تالیاں۔
”م نے لکھا ہے تم تیار۔“ عالیان کے لیے
تالیاں۔
”تم بوجھ کے دکھاؤ۔“
”عالیان! دنیا میں سب سے پیارا ہے۔“
”ہا۔ نہیں۔“
”کیا میں پیارا نہیں ہوں؟“ اسے لگا اسے کوئی
صدمہ ملنے والا ہے۔ اتنی جلدی ابھی تو اس کی شادی
ہوئی ہے۔
”نہیں۔ مطلب اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔“
”یعنی میں بہت پیارا ہوں؟“ اسے اسی کی فکر تھی
تھی۔
”اس بارے میں سرجنا پڑے گا۔“ اس نے قہقہہ
لگایا۔
”اچھا پھر اس کا مطلب ہو گا۔ بہا میں عالیان کے
دہ سے ہیں۔“
”تم کتنے خوش فہم ہو عالیان۔“
”میں ایسی خوش نہیں پاتا رہوں گا۔ مجھے ایسی
خوش فہمی عزیز ہے۔“
آفتاب کی تینا کی نیل کے پانیوں میں اٹھ بیلیاں
کرنے میں محو ہے اور آبی پرندے پھڑ پھڑاتے پردوں
کے ساتھ ہر فکر سے آزاد ہیں، آگے ہی آگے بڑھتے وہ
دونوں نئی منزل طے کر رہے ہیں اور ان کی آوازیں اپنی
موجودگی کا احساس دلا دیاؤں میں بچتے باب کی بے خود
لے کی طرح دفا رہی ہیں۔ ”عالیان کے ساتھ پر میں
شکر گزار ہوں۔“ عالیان سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا
پھر اس نے اس کے سر پر ہلکی سی ہاتھ سے ضرب
لگائی۔
”تلی یادداشت واپس؟“
امردہ ایسے کھلکھلائی جیسے واقعی یادداشت آئی
گئی۔
”میں خود کو تمہارے رنگوں سے سجاتی ہوں۔“
ریاب کی لے دیر تک واڈیوں میں گونجتی رہی اور اس

"MrsAlwaysRight"

گانا گاتے وہ آگے ہی آگے ان کی طرف بڑھتے آئے اور غول کی صورت ان کے اوپر جھک گئے جیسے زمین سے نکلے ڈانسا سوز کے جوڑے کو ملاحظہ کر رہے ہوں۔ اور پھر نیچے پیلیے دائیوں والے منہ کو کھول کر ایک زبان چلائے۔

"Congratulation"

امرد نے سوچا "کیسے شریف لوگ ہیں کیسے پیار سے مبارکباد دے رہے ہیں۔"

شریف لوگوں میں سے ایک نے اسے ایک گفٹ دیا جو بعد ازاں امرجہ نے اپنے کمرے میں بہت شوق سے کھولا اور ایک بیچ نکل کر اس کی ناک پر بڑے زور سے لگا۔ اس نے کتنی بار تو اس گفٹ کو فلموں اور ٹی وی میں دیکھا تھا۔ اتنا عام ہونے کے باوجود وہ بیچ (Punch) بہت خاص انداز سے اس کی ناک سوچا گیا۔ دنیا بھر میں اس گفٹ کے کھولنے والے اس سے برآمد ہونے والے "کھونٹے" سے انجان ہی ہوتے ہیں۔

اندر ایک لوٹ لکھا رکھا تھا۔ "میری طرف سے پملا تحفہ" یہ یاد دلانے کے لیے کہ میں بدلتے والا نہیں ہوں۔"

ہاں وہ کیسے بھول سکتی ہے کہ وہ بدلتے والا نہیں ہے۔

ایک تحفہ عالیان بھی کارل کے لیے لایا تھا گاہور کی سیر کرتے وہ اتفاق سے ایک ایسی دکان کے سامنے سے گزرا جہاں خالص دسی اور روایتی سلمان رکھا تھا۔ اس خالص سلمان میں سے عالیان نے کارل کے لیے کیا لیا۔ حقہ۔ جی اس نے دکان دار سے حقے کو استعمال کرنے کا طریقہ معلوم کیا اور پیک کر وا کر لے آیا۔

"تم سگریٹ بہت پیتے ہو نا۔ یہ ڈیڈ ہے سگریٹ کا۔"

"صرف ڈیڈ ہی اٹھا لائے۔ ماہ۔ گریڈ ماہ۔ گریڈ پیا نہیں لائے۔"

"نہیں وہ اگلی بار جاؤں گا تو لاؤں گا۔"

لپکے۔ دو ازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ایسے کھل گیا جیسے اندر سے کسی نے دھکا دیا۔ اور دھکا دیا گیا تھا۔ گولف بالز پاپ کارن ہیلز، ٹکر بالز کے ٹنوں ڈھیر نے دونوں کو کسی سوٹا ہی طوفان کی وزنی اور طاقتور لہری طرح اکھیا اور وہ اس میں دب گئے اور اسی میں دبے رہے اور ان کے ہاتھوں پیروں منہ سر اور نجانے کہاں کہاں ٹکر بالز مختلف رنگوں میں اپنے نقش چھوڑ گئیں۔ مطلب انہیں جو کرنا گئیں۔ دونوں نے اس ڈھیر میں سے سر نکالا۔

اور ایک دم سے شٹل کاک کے اوپر نیچے کے کونے کھدروں سے ایک فوج نکل کر نمودار ہوئی اور ایک زبان چلائی۔ "سر براٹر"

"کیسا اچھا سر براٹر تھا؟"

کارل ویرا سہلی سب آگے کھڑے تھے۔ "ٹیس شو ٹائم" کارل نے انگلی اٹھا کر کہا اور دونوں "تو" تھری کے بعد گلے میں جھولتے گٹار پر اس شدت سے ہاتھ مارا کہ امرجہ نے اپنا سر دیا وہ ڈھیر میں دبے لیا کہ مبادا وہ سری ہی نہ ہو جائے۔

عالیان نے خود کو اور امرجہ کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن گرون تک دھسے ہونے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے بار بار گولف بالز سے پھسل کر گر جاتا۔ تھک کر وہ وہیں بیٹھا رہا اور کارل ویرا اور سہلی کا شور دیکھنے لگا جو کسی راک اشار کی بھدی اور خوفناک نقل اتار رہے تھے اور شادی کے سائیڈ ایلیٹ سے لہاب ہوئے گانے کوئل جل کر اور اپھل اپھل کر گارے تھے اور پیچھے شاید پوری یونی جو موجود ہوئی تھی ٹل ٹل کر رہی تھا ساتھ دے رہی تھی۔

ان سب کے دانت نیلے نیلے رنگوں سے رنگے ہوئے تھے اور جب وہ گانے کے لیے منہ کھولتے تو بہت دلکش منظر پیش کرتے۔

سہلی نے آگے بڑھ کر عالیان کے سر پر کانڈ کی ٹوپی رکھ دی جس پر لکھا تھا۔

"MrRight"

اور پھر امرجہ کے سر پر رکھی جس پر لکھا تھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری زبان نے کافی رفتار پکڑ لی ہے۔“

”اچھا۔ سنا ہے کہ تم ایما کے گھر کوئی کارروائی کرنے گئے تھے اور اس کے کتے سے جا ملے۔ جس رفتار سے تم بھاگے دیکھتے والوں نے اس رفتار کی داد دی۔“

سائی جو ان دونوں کے قریب ہی بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا خیال ہے تم یہ سمجھ ہی چکے ہو اب کے جانور تمہارے دھوکے میں آنے والے نہیں اور وہ تم سے ڈرنے والے بھی نہیں۔“

کارل نے اچھل کر سائی کی گردن دیوچلی ”سائی پوری یونی میں ایک نہیں میں نے بچہ سمجھ کر چھوڑا ہوا تھا۔ تم نے ثابت کر دیا تم بڑے ہو گئے ہو اب۔“

سائی ہنسنے لگا ”خدا کے لیے“ مجھے تنگ کرو۔ میں تم سب کا باپ بنے رہنے سے تنگ آچکا ہوں۔“

”فکر نہ کرو، میں مستقل تمہارا باپ بنا رہ سکتا ہوں۔“ باپ کارل نے بچے سائی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سر سے بلند کر دیا۔

سائی چیخنے مارنے لگا۔ عالیان سائی کی مدد کو لپکا۔ عالیان کو انہیں ڈنر کروانے لے جانا تھا اور عالیان جانتا تھا خاص طور پر کارل اس کی جیب پر کس قدر بھاری پڑنے والا ہے۔

دوسری طرف امرجہ دیرا سا دھننا این کو ڈنر کے لیے لے جا چکی تھی۔

زندگی اس معمول پر آنے لگی جس سے وہ ہنسی ہوئی تھی۔

عالیان صبح اسے شٹل ٹاک سے اپنی سائیکل پر بیٹھا لیتا، کبھی وہ دیرا کے ساتھ سائیکل پر ہوتی، کبھی وہ تین یا چار اپنی اپنی سائیکلوں پر ہوتے۔ جب وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے ہوتی تو وہ اسے ایک لمبے چکر کے بعد یونی اتارتا۔

رات کو جاب سے واپسی کے بعد اور اپنے ہال جانے سے پہلے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی تک آتا اور

کچھ دیر ٹھہر کر چلا جاتا وہ سل پر نئی نئی دھنیں بجانے لگا تھا اور کھلتی چمک نے مستقل اس کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا تھا۔

اب وہ سائیکل کو گول دائروں میں گھماتا تھا۔ اور اس دائرے کے اندر امرجہ کو کھڑا کر لیتا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ وہ یونی میں اس کے پیچھے پیچھے رہے کیونکہ اب وہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اب یہ سوال کہ کلاس کے بعد وہ کہاں مل سکتا ہے کا جواب ”امرجہ کے ساتھ“ بھی پرانا سا ہو چکا تھا۔

عالیان نے اپنے سارے گشدرہ احساسات پالے اور اس نے بڑے جامع انداز سے خود کو اکٹھا کر لیا۔ ولید البشر نے ایک اور پار پھر کوشش کی تھی اسے اپنے کام لانے کی اور اس پار اس نے بھڑکے بنا بہت آرام سے اس کے ذہن میں یہ نشین کر دیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

لما مارگریٹ کی ساری ڈائریاں اس نے امرجہ کو دے دیں کہ وہ انہیں پڑھ لے اور جان لے کہ اس کی ماں کیسی خاتون تھیں۔

وہ کیسی خاتون تھیں یہ جاننے کے لیے امرجہ کو ڈائری پڑھنے کی ضرورت بلاشبہ نہیں تھی، عالیان کی ذات میں ان کی شخصیت بہت اچھی طرح نمایاں ہو جاتی تھی، لیکن اس نے یہ ڈائریاں اس نظر سے ضرور پڑھیں جس نظر سے عالیان پڑھتا رہا ہوگا۔

ماچسٹر کی سڑکوں پر چل کر قدمی کرتے بارش کی پھوار سے خود کو بھگوتے اور کسی گرم ریٹورنٹ کے اکیلے پر سکون گوشے میں بیٹھ کر کافی یا سوپ پیتے وہ اسے اپنے بچپن کی باتیں سنا تا۔ وہ اسے بتاتا کہ اس کی ماں دیکھنے میں کسی بھی اور جب بھی وہ مسکراوتی تھیں تو اپنے حسن کو کیسے عمل کرتی تھیں۔ وہ ان رنگوں اور پلو سات کے بارے میں بات کرتا جو مارگریٹ پر ہوتا کرتی تھیں اور اسے وہ سب جملے ٹھیک ٹھیک یاد تھے جو ماں مارگریٹ اسے گود میں بٹھائے اس کے کانوں میں کہا کرتی تھیں۔

ان سب باتوں کو کرتے وہ کم ہی افسردہ ہوا کرتا تھا۔

کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ پرسکون ہوتا جا رہا ہے۔ جس بے چینی نے اس کے اندر اپنے نچے گاڑ دیے تھے وہ نشان اب مٹنے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ آج بھی وہ کافی بیکار اسے کچن میں ہی بھول آتا ہے یہ سوچتے سوچتے کہ امرتہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ وہ اسے فون کرتا ہے اس سے بات کرتا ہے۔ فون بند ہوتے ہی وہ پھر سوچنے لگتا ہے کہ ”لب امرتہ کیا کر رہی ہوگی۔“ اور کبھی کبھی وہ ہال میں اپنے کمرے میں سوتے ہوئے گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو برازیل اسٹیڈیم کے باہر ہوتی تھی۔ وہ صرف فون ہی نہیں کرنا چاہتا وہ سائیکل بھگاتا سٹبل کاک آتا ہے اور امرتہ کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے سکون سے سوتا دیکھ کر چلا جاتا ہے۔

وہ اس کے ساتھ نئے نئے کھیل کھیلتا ہے۔ ”تمہارے پاس ایک منٹ ہے تم کہیں بھی جا کر چھب جاؤ۔ پھر ایک منٹ بعد تم ٹائم لوٹ کر آنا کہ میں نے تمہیں کتنی دیر میں ڈھونڈ نکالا۔“ وہ دونوں ہنسنے کی شام ایک ہل پر کھڑے تھے ہلکی ہلکی یوندا ہندی ہو رہی تھی اس پاس کئی ریش تھا اور وہ اسے چھب جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

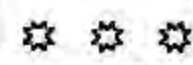
عالیان نے اپنا رخ اس سے موڑ لیا ”ایک منٹ گزرا تو وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلا اور جیسے کہ اس میں امرتہ نامی ریڈار فکس تھا اس نے ٹھیک ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر اس کو کیم کھاتے انکل آئی کی آڈ میں چھپ کر چلتی امرتہ کو جالیا اور انگلی اٹھا کر کہا ”فریز“

”اب تمہاری باری۔“ امرتہ نے مسکرا کر کہا اور رخ موڑ لیا ”ایک منٹ گزرا“ وہ ڈر اس آگے ہوئی اور ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ بندہ سیکنڈز کے اندر اندر اس نے عالیان کو ڈھونڈ نکالا کیونکہ عالیان خود بھاگتا اس کے پاس آگیا۔ وہ سڑک پر پیشی قہقہے لگا رہی تھی۔ ”کتنی بڑی ڈرامے باز ہو تم۔ چلو پھر سے کرو۔“ وہ

ساری بات سمجھ گیا۔ ”میں پھر گر جاؤں گی تم پھر سے آؤ گے اگر یہ ڈرامہ سبب ہوگا تو تم سو بار اس جیل میں آؤ گے۔ تمہیں ہر بار ہی لگے لگے وہ اس پار یہ سج میں گر گئی۔ ہر بار تم اس جھوٹ میں آؤ گے تم وہ ہی نہیں سکتے۔“ امرتہ کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ عالیان نے غور سے امرتہ کو دیکھا۔ ”تو تم نے کامل سے کلاسز مینی شروع کر دیں“

”میں گئی تھی اس کے پاس اس نے کہا ایڈمیشن کلوزڈ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”اس نے ایڈمیشن کلوزڈ کا کہا تھا یا تم انٹری ٹیسٹ میں ٹیل ہو گئیں۔ عالیان نے جاندار قہقہے لگایا امرتہ بھی ہنسنے لگی۔ جب کبھی وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوتی تو ان کی سائیکل سے اپنی سائیکل نکل کر آتا۔ انہیں گراتا ہاتھ ہلاتا کامل آگے نکل جاتا۔ اس کا ماننا تھا کہ امرتہ نے برازیل میں ایسی سہولری کا مظاہرہ کیا اور ایسے زخم کھائے کہ اب یہ چھوٹے موٹے زخم اس کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔ اور ایسے چھوٹے موٹے زخم اسے اگر لگ بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

عالیان نے چھب جانے اور ڈھونڈ نکالنے کے اس کھیل کو کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھا اب وہ اسے اس خواب کے بارے بتانے لگا تھا جس میں پھولوں سے جھی کشتی ان دونوں کو بٹھائے پانی ریلوں تھی۔ اور اس نے سوچ لیا ہے وہ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کا وعدہ بھی اس سے کر لے گا۔



لیڈی مرچنڈون مورگن کے پاس جا کر وہ کئی تمہیں وہ تالی بن گئی تھیں۔ اور ان کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خدا کی کس کس نعمت اور کس کس رحمت کا شکر یہ ادا کریں۔ ”خدا نے مجھے کیسے اور کتنا لوازا دیا ہے۔“ وہ تشکر سے کہتی جاتیں۔

انسان دوست انسانوں کو خدا نواز مانتا ہے اور وہ کبھی دکھی نہیں ہوتے کیونکہ وہ دوسروں کے دکھوں کو سکھوں میں بدلنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جوں میں کوئی نقب رکھتے ہیں نہ نظر میں حسد۔ یہ لوگ جو دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں اگر نہ ہوں تو زمین بے آباد اور بخر ہونے میں وقت نہ لے۔

ویرا کا بھائی لہلہ کسی چند دنوں کے لیے ماچسز آیا اور ایک کار میں غصے کرائیوں نے اسے ماچسز اور لندن گھمایا۔ بے چارے سائی کارل، عالیان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے چپک چپک کر جتنا متا سا ہو کر واپس گیا۔ ویرا کار بھائی لہلہ لاتی رہی اور امرتہ پوری قوت سے چلائی رہی۔

جاتے وقت وہ ویرا کے گوش گزار ایک بیان جاری کر گیا۔

”مگر تم ان سب کو روس لانے کا ارادہ رکھتی ہو تو میں پہلے ہی بتا دوں روس کے گلے ہونے کے بعد یہ دوسرا ساخو ہو گا جو روس پر گزرے گا۔“

روس پر کیسا ہی بڑا ساخو گزرتا، ان سب کو وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ڈگری کے بعد اور عالیان امرتہ کی باقاعدہ شادی کے بعد انہیں وہیں جانا تھا۔

اس دوران ایک بار امرتہ نے بھی پہاڑ پر رسے سے چڑھنے کی کوشش کی۔ اور ویرا اسے اسکیٹنگ بھی سکھا رہی تھی۔ جی وہ دن بھی دور نہیں تھا۔ جب ماچسز کی سڑکوں پر ایک کالے اور ایک بھورے بالوں والی لڑکی ریس لگاتی نظر آئیں گی۔ اور اس بار بھی رشین لڑکی خود کو ہاروے گی تاکہ پہلی بار ریس لگانے والی لڑکی مقابلے سے بدل نہ ہو جائے اور وہ اہمیت نہ ہاروے اور روس کی خبر چلتے ہوئی ہوئی جیتل نہ بدلے۔

چند ایک بار اس نے کارل کی بھی مدد کی۔ ایک بار اسے ایما کا جو تالا کر دیا اور ایما کو بھی ننگے پیر لونی سے گھر جانا پڑا۔

جو تے والی حرکت پر شرمندہ ہوتی امرتہ ایما کے گھر معذرت کرنے اور یہ ثابت کرنے لگی کہ اسے بھی

مظلوم نہیں تھا کہ کارل اس کے پاس سے جو تالا چھین کر لے جائے گا۔ ایما اس کے لیے کالی پٹانے کچن میں لگی اور ایما کے پیچھے کچن تک جاتے راستے میں آتے۔ لاؤنج بیڈ روم چند ریکس کے قریب سے گزرتے امرتہ نے اپنی کتابوں میں وہی ایک قائل کھول کھول کر خالی کرنی شروع کر دی۔ کچھ زیادہ نہیں قائل میں کا کورج کی کھٹی مٹی سی فوج آباد تھی جو اب ایما کی گھر پر پرورش پانے والی تھی۔

ایما امیرپ کی نازک اندام کا کورج کو خونی بلا سمجھنے والی بیماری سی پچی تھی۔ کچھ زیادہ نہیں ہوا ایما کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہا۔ کا کورج تھے کہ ہر طرف سے نکلے ہی آرہے تھے۔ لہجے کا کورج تو اس کے پورے خاندان نے اپنی پوری پیداوشی اور وقالی تاریخ میں نہیں دیکھے تھے۔

خیر امرتہ کا اور کا کورج کا کیا تعلق وہ تو کھانی کر آئی تھی واپس۔ اور پھر ایما کو سائیکل ریس چیلنج بھی دے دیا ایما کی سائیکلنگ اچھی تھی۔ جسٹ فار فن اس نے چیلنج قبول کر لیا اور جب وہ ٹک لائن کر اس کرنے چلی رہی تھی کہ ایک چھرا اس کے سر پر آکر لگا اور وہ بے چاری ایسے گری کہ دو دن یونی نہیں آسکی۔

”کتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جانتے ہوتا ہے۔“ شاید ایما نے نہیں سنا تھا البتہ کارل نے سنا بھی تھا اور یاد بھی کر لیا تھا۔

کارل کو برا بھلا کہتے بلکہ برا بھلا ثابت کرتے امرتہ نے ایما کے متوقع شو کے پاس بھی حاصل کر لیے تھے۔ آرٹ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اپنے ڈیراٹن کیسے گئے پلو سٹ کو پین کروہ خود بھی ریسپ برواک کر رہی تھی اچھا خاصا گلہوس ایونٹ تھا کہ کارل ریسپ پر چڑھ گیا اور یہ لے سارے ریسپ پر جم کے انداز میں ندمی بنا ایما کے ساتھ ساتھ چلتے اسے گھورتا رہا۔ نہ پلک پلک نہ گھون کا زاویہ بدلا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ یہ سمجھے کہ یہ آرگنائزر کا ہی کوئی ”ایونٹ ڈیراٹن“ ہے اور جو ریسپ پر چل رہی تھی وہ اپنی واک خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ بیکسا سٹیج جا کر وہ رو پڑی۔

کے دن میں سب کو ستاؤں کی ویسے لاما کو سنا چکی ہوں
میں۔

”کیا کچھ نہیں ہوں۔“ وہ ہنس دیا۔
”تو مورگن نے ٹھیک کہا تھا اس بار دو لہما بھاگے
مگ۔“ شارلٹ اس کے نکلنے سے اب تک بچاؤس پار یہ
کہہ چکی تھی دراصل اس سے بات کرتے اس نے
بائے کی جگہ یہ جملہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

”لیکن کتنا ہی اچھا ہوا اگر تم عین شادی کے وقت
بھاگتے۔ کتنی حسرت ہے مجھے ایسی مناظر کو برہور دست
دیکھنے کی۔ آخر حسرتیں جلدی پوری کیوں نہیں
ہوتیں اگر ایسی چھوٹی چھوٹی خواہش بھی پوری نہ ہوں
تو کیا فائدہ زندگی کا؟“

”مجھے یقین ہے جو روٹن نے ایک نفسیاتی معالج
سے رابطہ کر لیا ہوگا۔“

”میرے لیے؟“

”نہیں خود اپنے لیے۔“

”ویسے تم نے ایک اچھا ہیرو ہونے کا ثبوت دیا۔ تم
پارٹی میں جا رہے ہو؟“

”نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں جانے میں۔“

”میں پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اچھی بات ہے جانا
بھی نہیں چاہیے ویسے امرتہ اور ویرا میرے ساتھ
جا رہی ہیں۔ اور آئین بھی اور اتفاق سے سادھنا بھی۔“

شارلٹ نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔
”عالمیان چونکا۔“ ”چھا؟ کیا فلم اشار بھی آرہے
ہیں؟“

”آئیں یا نہ آئیں تمہیں اس سب سے دلچسپی ہی
نہیں۔“

”نہیں مجھے فلم اشار سے ملتا ہے۔“

”کس فلمی ستارے سے؟ پیراڈونٹ پکچرز کی
ہیروئن؟“ ”مرد سے؟“ ”ویسے امرتہ اور ویرا خاص
تیار کر رہی ہیں جانے کے لیے۔“

”چھا؟ وہ سونے لگا کہ اسے کیوں نہیں بتایا گیا۔
“اسے اس لیے نہیں بتایا کہ وہ سب آپس میں ہی
انجوائے کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کارل

”تمہارے مرنے پر میں ایک گریٹ پارٹی دلاؤں گی
کارل۔“ ”روتے روتے وہ چلائی۔“

وہ پارٹی وہ تب دینی تاج پارٹی دینے لاق رہتی اور
کارل واقعی مر بھی جاتا۔ اس کی صرف ایک غلطی تھی

کہ اس نے کارل کو پروبوز کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ لیکن
اب کارل تو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ

غلطیاں ایسے ہی جان کا عذاب بن جاتی ہیں۔ احتیاط
کرتی چاہیے۔

احتیاط سے وہ سب ایک ایک چیز کا انتخاب کر رہے
تھے تاکہ رات کی پارٹی میں وہ کسی صورت کسی فلمی

ہیرو سے کم نہ لگیں۔ شارلٹ سے کارل نے ایک
فلمی پارٹی کے بس حاصل کر لیے تھے۔ عالمیان کو تو ذرا

دلچسپی نہیں تھی جانے میں۔ کارل، سالی، شاہ ویز
جا رہے تھے۔ کیونکہ۔

دنیا بھر کے فلمی اداروں میں پڑھنے والی نسل دنیا کی
سب سے بھوکے عوام ہوتی ہے۔ یہ جتنا کھاتی ہے اتنی

ہی اور بھوک رہتی ہے۔ جتنا اور کھاتی ہے اتنی اور
بھوکی رہ جاتی ہے۔ تو اس بھوک کو مٹانے کے سب ایک

کو شش کرنے جا رہے تھے۔ وہ کھانے کھانے جو بقیہ
ان کے انہوں نے صرف تصویروں میں ہی دیکھے تھے

اور خوابوں میں ہی دیکھے ہیں۔
ان تینوں کا جوش و خروش دیکھ کر عالمیان تہمتے لگا رہا

تھا۔ پھر شارلٹ آگئی اور وہ اس کے ساتھ چم چم قدمی
کرنے لگا۔

مورگن اور وہ چند دنوں کے لیے لاما مر کے پاس
رہنے آئی تھیں۔ مورگن تو خیر معمول کے مطابق آیا

کرتی تھی لیکن شارلٹ کو اس وقت آنے کی جلدی
رہا کرتی تھی جب اس نے کوئی مزے دار سی نی کھالی

بتلی ہوئی تھی اور اس کھالی کو اسے مکمل پر فارمنس کے
ساتھ لاما کو سنا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے نی کھالی اس کے پاس

عالمیان اور امرتہ کی تھی۔
”تو تم نے برازیل میں ہزاروں لوگوں کو پھلانگا اور

کئی لوگوں کو گھونٹے مارے اور کتنے ہی لوگوں کو اٹھا اٹھا
کر پھینکا۔ ہاں یہ کھالی مجھے اچھی لگی۔ تمہاری شادی

بچھے چھپ چھپ جاتے اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ چند ایک نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور جیسے کچھ جان کر اور سب سمجھ کر وہ مسکرا دیے۔

ہل کی وسعت میں اور لوگ داخل ہوتے جا رہے تھے۔ رش بڑھ رہا تھا۔ عالیان کا کام اور مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسے پوری شدت سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ پوری شدت سے چھپ رہی تھی اور پھر افرا تقری میں بیڑھیاں چڑھتے عالیان کا پیر پھسلا اور وہ لکٹیپ لڑھک کر گر گیا۔

اور یوں دس سیکنڈز کے اندر اندر امرتہ اس کے سامنے تھی۔

”جاؤ پھر چھپ جاؤ میں پھر ڈھونڈ نکالوں گا تمہیں۔ میں سو بار گروں گا تم سو بار آؤ گی اگر یہ جھوٹ ہو گا تو تم ہر بار اس جھوٹ میں آؤ گی۔“

عالیان نے ایک آنکھ دیا کر کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ پھر سے چھپ نہ جائے۔ آج وہ اسے اس خواب کے بارے میں بتانے والا تھا جس میں اس کے بالوں میں لہریں تھیں اور اس کی پرشاک سرخ تھی۔ اب اسے امرتہ سے وعدہ لینا ہے۔ کیا وہ اس خواب کو حقیقت میں بدل دے گی؟ یقیناً وہ انکار نہیں کر سکے گی۔

جا رہا ہے لیکن اسے لٹ کس نے کروانی تھی۔“ ہل واپس آگرا بھی جانے کے لیے تیار ہونے لگا تو ان سب کو اس پر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ وہ چپ چاپ ان کی ہنسی سن رہا اور تیار ہوتا رہا اور پھر وہ سب پارٹی میں آگئے۔ کارل تو پارٹی میں ایسے شامل ہوا جیسے گیسٹ آف آنر ہی تھا۔ عالیان البتہ ادھر ادھر دیکھتا اور گھومتا رہا۔ ایک دوسرے کے ساتھ نسلک تین بڑے بڑے ہاتھ تھے، شارٹ فون اٹھا رہی تھی نہ امرتہ اور ویرا این اور نہ ہی شریف سی ساوھتا۔ حد ہے کتنی تیزی ہو جاتی ہیں یہ لڑکیں جب ایک ساتھ ہوتی ہیں تو۔

ہاتھ اور ان ہاتھ سے نکلتی بیڑھیاں جڑھ جڑھ کر اتر اتر کر وہ تھک چکا تھا۔ ہر طرف چمکتے دکتے لوگ پھیلے ہوئے تھے اور ان لوگوں میں ایک امرتہ ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے ساوھتا اور این ایک جگہ نظر آ گئیں۔

”امرتہ کہاں ہے؟“ اس نے ساوھتا سے پوچھا اور اس نے کندھے اچکا دیے۔

”گف یہ خواتین۔“ اسے ویرا بھی نظر آئی چند لوگوں سے بات کرتے ہوئے قریب ہی شارٹ کھڑی تھی لیکن امرتہ نہیں تھی۔ اس نے ان کے قریب جا کر ان سے پوچھا اور جواب میں انہوں نے ایسے دیکھا جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ ہے کون۔ اور پوچھ کیا رہا ہے۔

وہ خود ہی سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اسے دور امرتہ کی جھلک نظر آئی۔ جو مسکرا کر کسی کی آڑ میں چھپ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف پکا، لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ کتنی ہی بار وہ اسے ایسے ہی نظر آئی رہی۔ کسی کی آڑ میں چھپی ہوئی اور غائب ہوئی ہوئی۔ عالیان کو بہت شوق تھا اسے ڈھونڈ نکالنے کا تو وہ اس کا یہ شوق پورا کر رہی تھی۔

کئی سو لوگوں کی آڑ میں چھپ چھپ جانے کا تھیل اچھا ہے اپنے رہنمی آسانی رنگ کے فرائگ کے وامن کو لہراتے، خوب صورت لوگوں کے ہجوم کے



”میں ایک خوش قسمت انسان ہوں۔ میں ایک دوست رکھتا ہوں اور میری خوشیوں کے سارے راستے میرے دوست کے دل سے ہو کر آتے ہیں۔ کیونکہ میری دعاؤں پر آمین“

میرا پارا راست ہے۔
”تمہارے ساتھ مل کر بزنس کرنے کا ارادہ میں نے بدل دیا ہے۔“

”وہ کس لیے؟“
”میں بزنس کروں گا، لیکن ابھی نہیں، میرا خیال ہے پہلے مجھے زندگی کو تھوڑا انجوائے کر لینا چاہیے۔“

”اور میرا خیال ہے اب تک تم زندگی انجوائے کرتے رہے ہو۔“
”ایک بزنس اسٹیڈیز کا اسٹوڈنٹ کیا زندگی انجوائے کرتا

رہا ہوگا فرشتا ہر وقت پڑھنا لاجبوری کتابیں، اسائنمنٹس، لیچرز یہ وہ سب مجھے تو یہ معلوم نہیں کہ پونی میں کوئی کینٹین بھی ہے۔“

”کینٹین کا تمہیں معلوم بھی کیسے ہوا؟“ تمہیں کچھ خرید کر تھوڑی کھانا ہوتا ہے۔“
”مجھے تو پروفیسرز کے جنس کا معلوم ہے یا بزنس

ڈیپارٹمنٹ کا۔ پونی آنا، جاب پر جانا، ہلی جا کر رات گئے تک پڑھتے رہنا اور پڑھ کر شرافت سے سو جانا، زندگی ایسی ہوتی ہے کیا؟“

”کتنے معصوم لگ رہے ہو تم یہ سب کہتے کارل!“
”پتا نہیں عایان، کون بددعا دے گیا مجھے ایسی

معصومیت کی، میرا بھی دل چاہتا ہے، شرارتیں کروں، اچھلوں، مستی کروں، تمہارے ساتھ ادھر ادھر کی سرگرمیوں میں حصہ لوں اور نہیں تو ایک آدھ بار کسی کو

چھوٹی سی چنگلی ہی بھر لوں، دیکھوں کہ وہ کیسے اچھلتا ہے۔“
عایان سر ہلانے لگا۔ ”صرف ایک چنگلی بھرنے کا خواب ہی ادھر وارہ گیا ہو گا تمہارا؟“

”ابھی تو میں نے کوئی خواب دیکھا ہی نہیں، چند دن پہلے گوگل کرتے میری نظروں سے ایک رائل پرنسز گزری۔“

”خدا کے لیے آگے کچھ نہ کہنا، میں شاہی خاندان کی بھادی برداشت نہیں کر سوں گا۔ میں ایک سچا بزنس مشری اور میری سب بھاریاں شاہی خاندان کے ساتھ ہیں۔“

کارل نے منہ بنا لیا۔ ”تم اپنی وفاداری قائم رکھو، ویسے وہ برطانوی شہزادی نہیں ہے۔“
”اور اچھا۔ پھر بھی۔ پھر بھی کارل۔ ویسے ایسا ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کی مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ میں جب اسے اکیلا دیکھتا ہوں، مسکراتا ہوں کہ کیسی خوش قسمت لڑکی ہے ایسا۔ تمہارے بغیر کیسی خوش خوش اور پیاری پیاری ہی لگتی ہے۔“

”وہ کتنی پیاری ہے یہ امرحہ تمہیں بتائے گی، کیونکہ اس کی مسکراہٹ پر تمہارے خیالات میں امرحہ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر گھڑی بند طے کی اور جوائنٹ کی چھٹکار کھلی، جسے سنتے تم بڑے خوش خوش اور پیارے پیارے لگو گے۔“

”بابا۔ پھر تم ایسا کو مان لو۔“
”میں عایان نہیں جو اس کے پیچھے باگل ہو جاؤں اور وہ

امرحد نہیں کہ مجھے باگل کر بھی دے۔ دنیا میں ایک ”قلوٹ“ لڑکی کی کسی بھی نہیں رہتی۔ یہ ہر طرف سے حشرات کی طرح نکلتی آتی ہیں۔ کتنے ہی اسپرے کر لو۔

کیسی بھی زہریلی دوا پھیلا دو۔ یہ تباہی دنیا میں پھیلتی ہی جاتی ہے۔“
”جب تک تم لڑکیوں کو حشرات سمجھتے رہو گے، وہ

تمہارے ساتھ انسان بن کر خجیہ کیسے ہوں گی؟“
”میں خود کو انسان سمجھتا ہوں کللی ہے۔“
”تک وہ سوں کو اس سے اختلاف ہے۔“ عایان نے

بلند تقہمہ لگایا۔
کلاس لینے کے بعد وہ دونوں پونی میں شامل رہے تھے اور پھر قریب سے گزرتی ایک فزیشن لڑکی ذرا سا اچھلی اور ہلکی سی

جھنجھادی۔ کچھ زیادہ نہیں کارل نے تو اس چنگلی بھرنے کا اپنا شہانہ سا خواب پورا کر لیا تھا۔ آخر ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنے خواب پورے کرے اور ان کی آجیہ پر خوش ہو۔ آخر

کوئی کب تک اپنی خواہش میں دبا رہے رکھے۔
”یہ اس کا کام ہے۔“ کارل نے غصے میں بس لالہ ہی ہو جاتی لڑکی سے عایان کی طرف اشارہ کر کے کہا اور ہمارے

گیا۔ عایان کو بھی ظاہر ہے بھانگنا رہا، کیونکہ لڑکی اپنے دائیں ہاتھ کو پھینک کے لیے زحمت دیتی نظر آ رہی تھی۔

اسی شام کو امرحد ویرا کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی۔ امرحد نے تو ویسے بھی جاب چھوڑ دی تھی اور ویرا کے پاس بھی کچھ وقت نکل آیا تو وہ دونوں ساتھ

نکل پڑیں اور اوہرا اوہرا کھاتے پیتے وہ ماچسٹریں تو اور
گردی کرتی رہیں۔

ہے اور خوش قسمت بھی۔



”میں تمہیں اس لیے خوش قسمت نہیں کہوں گی کہ
تمہیں عالیان ملا۔ میں تمہیں صرف اس لیے خوش
قسمت کہوں گی کہ تم دیدی کی بیٹی بن گئی ہو۔“ وہ دونوں
نشست گاہ میں بیٹھی ہیں۔ ابھی ابھی امرد ماما امرد کو ان کے
کمرے میں سلا کر آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ سب ساوہنا
کی کھالی سنتے رہے تھے۔ اب یہ بھی سوچتی تھی۔

”جب میں یہاں آئی تھی تو میرا دل چاہتا تھا میں مر
جاؤں، لیکن کسی دوسری جگہ، انہا نے لوگوں، انہا نے
ماحول میں نہ جاؤں۔ مجھے یہ عذاب لگ رہا تھا، لیکن جب
میں یہاں آئی تو مجھے لگا میں جس گھر سے رہیوں گے اس لیے
نکل گئی تھی، اسی گھر میں واپس آئی ہوں۔ آریان بہت
بیمار تھا اور مجھے بہت سارے پیسوں کی ضرورت تھی اور
اس گھر کے سارے پیسے میرے حوالے تھے۔ آج تک مجھ
سے ایک پیسے کا حساب نہیں لیا گیا۔ روز صبح آریان کو ایک
فون کال جاتی ہے یہاں سے اور دیدی اسے روز ایک رقم
سناتی ہیں۔ یوں آریان بلند حوصلہ اور باہمت ہو جا رہا
ہے۔ آریان ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ اس کے لیے دیدی
نے دعا کی۔ آریان کی ماں کی دعا میں روکی جاسکتی ہیں۔
دیہی جیسے انسان کی نہیں۔ آریان کی بیماری کی صورت
میں جو مجھے لگتا تھا کہ بھگوان نے مجھے سزا دی وہ دیدی کے
ملنے سے وہم ہو گئی۔ مجھے پہلی بار لگا کہ ہاں میں بھی بھگوان
کو بیماری ہوں۔ اس نے مجھے پیارے لوگوں میں بھیجا۔
امرد اگر ہمیں درد ملتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر ملتی ہے۔“
امرد نے ساوہنا کی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ آج کل
ساوہنا بہت خوش تھی اور خوشی سے بار بار رو پڑتی تھی۔
لیڈی مہرنے آریان اور آریان کے پاپا کو ماچسٹریں بلوایا تھا۔
عالیان کی شادی کے لیے اور ساوہنا سے گزارے بھی
وقت نہیں گزر رہا تھا۔

”تم بہت خوش قسمت لڑکی ہو امرد!“ مزید آنکھیں
گھلی کرتے ہوئے ساوہنا نے کہا۔

”ہاں۔ بہت زیادہ۔ اب دنیا میں کون ہے جو مجھے سیاہ
بخت کہہ سکے۔ میں ماما کے زیر سایہ رہنے والی ہوں جو
عظمت کی بلندیوں پر ہیں۔ جو فرش پر عرش والے کی
رحمت ہیں۔“

”میں اب بھی رات کو اکثر زور کراٹھ جاتی ہوں۔ مجھے
لگتا ہے میں خواب میں وہی سب دیکھتی رہی تھی جو
تمہارے ساتھ برانڈا میں ہوا تھا۔ وہ زندگی کا بدترین
احساس تھا امرد۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم بے
جان ہو رہا ہے اور مجھے کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے
رہا۔“ ویرا پہلی بار اس واقعے کے بارے میں بات کر رہی
تھی۔

سائیکل پر پیچھے بیٹھی امرد کی آنکھیں نم ہو گئیں اور
اس نے ویرا کی گھر میں محبت کے گہرے اور شدید احساس
کے تحت ہاتھ مائل کیا۔

”میں نے اس وقت محسوس کیا امرد! کہ وہ زندگی کیا
ہوگی جو تمہارے بغیر، دگی بغیر آواز کے میں نے خود کو
دوتے پایا۔ اور اس وقت مجھے لگا کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو
میں ساری دنیا کو ٹک لگا دوں گی۔ میں اب تک نہیں سمجھ
سکی امرد کو آخر وہ کیا ہے جو میرا تم سے جڑ گیا ہے اور جو
جدا ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔ مجھے تم سے ایسا جان
لیو لگاؤ کیوں ہے۔ آخر اتنی دور روس میں رہنے والی لڑکی
ویرا اور اتنی ہی دور پاکستان میں پیدا ہونے والی امرد کے
اندرا ایسا کیا بیچ دیا گیا ہے جو تلوار ہو جا رہا ہے اور جس نے
ہمیں اپنی چھاؤں میں لے لیا ہے۔ ایسے فاصلوں پر پیدا
ہونے والے لوگوں میں اتنی قربت کہاں سے آئی؟“

اب امرد سائیکل چلانے لگی تھی اور ویرا اس کے
پیچھے بیٹھ گئی تھی۔

”اسے خدا کی رحمت کہتے ہیں جو اچھے انسانوں کی
صورت میں کہیں بھی لیتی ہے پھر فاصلوں کی اہمیت رہتی
ہے نہ رنگ و نسل کی۔“ امرد نے کہا۔ اس امرد نے
جس نے خدا سے ہزاروں لاکھوں بار شکوے کیے تھے کہ
اس نے اسے اچھے لوگوں کے جوم میں پیدا نہیں کیا۔

”شاید۔“ ویرا نے سر ہلایا اور وہ روسی گانا گانے لگی
’جسے امرد بھی ساتھ ساتھ گانے کی کوشش کرنے لگی
اور۔“

اور ماچسٹری کی سڑکوں پر سرسئی اور سفید فراروں میں
ملبوس دو لڑکیاں گنگنائی ہوئی اس راستے کی طرف بڑھنے
لگیں مہرنے رو دے سچے دوست ہی گامزن ہو سکتے ہیں اور
جنہیں زندگی سچ کے سب ہی اجالے کے لیے خوش آمدید کہتی

اور رحمت جیسے ہی دلوں میں۔ روز فون کرتے روز رو
 پڑتے۔ پہلے یہ احساس تھا کہ وہ پڑھنے لگی ہے واپس
 آجائے گی۔ اب یہ یقین کہ بس اب وہ پرانی ہو گئی۔
 رخصت ہو گئی۔ وہ روز بیا کو بھی فون کرتی سلام کرتی حال
 حال پوچھتی پھر خاموشی چھا جاتی اور فون بند ہو جاتا۔ دادا
 کہہ چکے تھے کہ اپنے باپ کی خاموشی کا احترام کرو تو وہ وہی
 کر رہی تھی۔ محبت اور ہمدردی قائم تھی اور ادھر بھی اور پھر
 رات لگتی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ سورج طلوع ہونے میں
 وقت لیتا ہے اور اس مطلوبہ وقت کا احترام کرنا چاہیے۔

موسم بدل رہا ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔ اور اس بار
 دونوں کے بیچ اہن و کلبش میں۔ صبحوں کا انتظار رہتا ہے۔
 شاموں میں گھبرا جاتا ہے اور راتوں کی خیند میں دل پسند
 خواب دیکھے جارہے ہیں۔

ماچھڑ کھر کھر کر سامنے آجاتا ہے۔ پونی ورتی میں
 گھڑیاں بند کر دینے کوئی ہاہتا ہے اور کبھی کبھی یہ دل بھی
 چاہتا ہے کہ پونی کے سارے دروازے بند کر دیے
 جائیں۔ کسی کو کہیں جانے نہ دیا جائے اور سب دائرے
 بنا کر بیٹھ جائیں اور اپنے اپنے دہس کی کمائیاں سامنے۔
 اور سب سنتے جائیں۔ سنتے ہی جائیں۔ وقت بھی نہ
 گزرنے کے لیے گھم جائے یا پوری پونی کور۔ کئی لحاف میں
 لیٹ دیا جائے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اسے محبت سے
 گھنٹوں دیکھا جائے۔ پھر اسی کے سرہانے خود بھی ٹیٹھی
 خیند سو رہا جائے۔



سسر شرم ہو جانے کو تھا بس۔ ان کی پیاری
 دلاری پونی ورتی میں گزارے دن اب دائریوں اور البہز
 میں ہی مقید ہوئے رہ جانے والے تھے۔ وہ سب
 اسٹوڈنٹس جنہیں وہ نام سے اور وہ سب جنہیں شکلوں
 سے جانتے تھے وہ سب زندگی کی راہوں میں بٹھ جانے
 والے تھے۔

سائی روپا سے اظہار محبت نہیں کر سکا۔ کیونکہ اسے گا
 کہ ایسے وہ اس کے لیے مشکلات کا باعث بنے گا۔ لیکن
 روپا نے خود ہی اسے انتظار کرنے کے لیے کہہ دیا اور سائی
 کے لیے یہ ہی ہمت تھا۔ ویسے بھی وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ
 میں اس کے فراق میں رونے کے بجائے اسے خوشی سے یاد
 کرنا اور دعاؤں میں اس کا نام مینا پسند کروں گا۔ یہ بات

صرف سائی ہی کہہ سکتا تھا اور وہ کر بھی سکتا تھا۔
 نواں اور دائم کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی انہوں نے
 خاص سسر۔ ختم ہونے سے پہلے کی تاکہ ان کے
 سب دوست شرکت کر لیں اور ویسے بھی امتحانات کے بعد
 عایان امرہ کی متوقع شادی کا ایسا شور تھا کہ انہوں نے
 امتحانات سے پہلے اپنی شادی کو ترجیح دی۔

برانک ویک آنے سے پہلے ہی مکمل نے اعلان کر دیا کہ
 وہ یہ ویک ڈو ویک پہلے سے ہی منائے گا اور اس نے ایسا کیا
 بھی۔ پہلے مرحلے میں وہ جم کی کالی بن گیا اور بغیر پیسوں کے
 کام شروع کر دیا۔ وہ ایک گھنٹہ یا کچھ زیادہ وقت ایک ایک
 کو دیتا اور اتنے سے وقت میں ہی وہ شکار کو عاجز کر دیتا۔ جم تو
 پھر بھی ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھتا تھا۔ اس نے یہ فاصلہ بھی
 ختم کر دیا۔ عین منہ کے پاس۔ عجیب غریب سیرپ پی کر
 منہ سے گندی سے بھی گندی پون نکالتے ہوئے کہ ناک پر
 ہاتھ رکھنے پر بھی پون ناک میں گھس آئے۔ ایک سی ہفتے میں
 اس نے کئی شکار نپٹا لیے اور اسی ایک ہفتے میں وہ پونی وہ
 خاص جوتے پن کر آیا جو خدا جانے اس نے کسی ساتھیس
 دان سے ہوائے تھے کہ خود آئن ایشن بنا تھا۔ ان کے
 لیے۔ ان کے ٹکڑے میں وہ ریکارڈنگ بھی جو چلنے پر چل
 پڑتی۔ اور خدا سحاف کرے سنسان قلعے میں چگاڈوں اور
 باڈوں کے چلانے کی خوف ناک آوازیں اور درمیان میں
 جاہ گرنی کے بلند بانگ شیطانی قہقہے جنہیں سنتے ہی ماؤں
 کی گوداں میں ہنہا گینے کو بل چاہتا۔

وہ جہاں جہاں سے گزر ماکوں میں اٹھلیاں ٹھونسنے پر
 مجبور کر دیتا اور طاہر سے وہ جم بنا جس شکار کے پیچھے ہو تا وہ
 ان جوتوں کی وجہ سے بھی اپنا سر پیٹ لیتا۔ اس کے یہ
 جوتے پونی میں کچھ ایسے مشہور ہوئے اور منہ سے اٹھتی ہو
 نے فضا کچھ ایسے مہکا کی کہ اس ویک کو اس کے نام سے
 منسوب کر دیا گیا۔ یعنی "عذاب ویک"

اس عذاب ویک سے اگلے ویک اس نے ایک
 مخصوص "جپ" کا استعمال شروع کر دیا۔ یہ جپ جس جگہ
 لگاتے وہی رنگ اور صورت اختیار کر لیتی انسانی کھال سے
 زیادہ بہتر جگہ کون سی ہوتی اسے لگانے کے لیے تو اسے
 انسانی کھال پر چپکا دیا جاتا۔ انسانی درجہ حرارت پر تیس
 سینٹڈ کے اندر اندر یہ تیز آواز سے پھٹ جاتی اور کھال پر
 خون نماد ہے اور جلی ہوئی کھال کی طرح پھیل جاتی۔ جس
 کی کھال پر یہ یوں چھتی وہ یہ سمجھتا کہ اس کی کھال پھٹ

”جو گیا۔“ ہاتھ ہلا بلا کر وہ پر اکو منع کرتا ہے فون نہیں کرنا۔ جبکہ وہ پر اکو ہر حال میں فون کرنا ہے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ اور وہ بے چارہ گیا۔

یہ سی کام عالیان اور کارل نے دوسرے ہالز میں بھی کیا۔ ان کا دست مطلوبہ ریسٹورنٹ کے کمرے میں دیر رات تک براجمن رہتا دروازہ کھلا رہتا اور یہ کمرے پر دھاوا بولتے دیتے۔ یہ سب کرتے دونوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر ان کا بزنس نہ چلایا انہیں کوئی جاب نہ ملے گی تو وہ کامیابی سے انہیں برائے تاون کا کام شروع کرسکتے ہیں۔ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہو تو پولیس بھی نہ ڈھونڈتی پھرے گی یا اخبارات میں نام بھی نہ آئے گا۔

ایک مشترکہ پرائم جو تقریباً ”سب ڈیپارٹمنٹس نے مقررہ وقت کیا“ وہ تیسرے لیگجر کے ختم ہونے کے بعد کلاسوں سے نکل کر کوریڈورز میں لیٹ جانے کا تھا۔ وہ سب چلنے پھرنے کی جگہوں پر بچھ گئے اور پوری پونی جام ہوئی۔ برویسرز جنہیں تھے وہیں آدھے گھنٹے تک پھنسے رہے۔ اگلا پرائم انہوں نے لائبریری میں کیا۔ ان سب نے ایک ساتھ لائبریری پر دھاوا بول دیا اور وہ ہر طرف پھیل گئے۔ اب اس لائبریری نے ان کی کتنی تیندیں اڑائی تھیں۔ آج وہ اس کاسکون اڑانے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے آئی فونز نکالے اور تیز میوزک چلا دیا اور کہتے ہی فلا بازیں لگانے لگے اور سر کے بل تلخے بنے فرش پر گھومنے لگے۔ انہوں نے پورے تیس منٹ تک لائبریری ہلاک رکھی۔ دیکھا کوئی فرق نہیں پڑا، ایسا کوئی قبر نہیں ٹوٹ پڑا، معلم کے سمندر میں رہا، دنیا چند سو سال ترقی میں پیچھے نہیں چلی گئی اور کتابوں کے سینے دکھ سے پھٹ نہیں گئے۔ امرت نے اپنے پرو فیسرز کی کاروں کو نوٹس سے بھر دیا تھا اور کاروں عالیان نے کاروں کو کھن زندہ کر دیا تھا، انہیں سفید کپڑے سے لپیٹ دیا تھا اور اس پر پرو فیسرز کی خاص عادات اور خاص باتوں کو لکھ دیا تھا۔

چند ڈیپارٹمنٹس نے مارچ کی صورت ٹریبوٹ دیا۔ وہ فوجی انداز سے پریڈ کرتے رہے اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ایک لمبی سلامی زمین پر پیر مارا کر اور اونچی آوازیں نکال نکال کر دی اور دو سر ٹریبوٹ کچھ یوں تھا کہ آکسفورڈ ریڈ بر سائیکل ہی سائیکل ہو گئیں۔ اتنی سائیکل اتنی سائیکل کہ لگنے لگنے دنیا میں چار پیوں والی موٹر سائیکل ہی نہیں ہوئی ابھی انہوں نے اپنے منہ UOM کے لوگو

مٹی۔ یہ کھل کھول پر کانوں گرن ہاتھوں بازو انگلیوں پر ہت پھٹی خاص کر ٹرکیوں کی اور اس۔ اس قسم کی چیخیں اور شیطانی دیکھنے کو ملیں کہ یعنی شاہین ایسے غضب ناک واقعات پہلے کھل کسی کو دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے۔ اس پر ایک بر کارل کے کافی پیسے لگ گئے تھے، لیکن خیر جب وہ وزیر اعظم بن جائے گا تو ٹیکس کی صورت سب وصول کرنے لگا۔ کارل نے اپنے کمرے میں باقاعدہ ایک ایک کاٹیم لکھ کر فرسٹ بنا کر لگا رکھی تھی جسے وہ شکار کر لیتا اس پر تک لگا دیتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں اسے بچھٹانا پڑے خاص کر جب وہ بوڑھا ہو جائے تو یہ سوچ سوچ کر آپس بھرنے کہ اس نے ان چند ایک کو بھی کیوں چھوڑ دیا، جنتیں وہ ذرا سی منٹ سے الوبنا سکتا تھا، تو وہ ذرا سی محنت اب کر رہا تھا۔ اس نے کیا کچھ نہیں کیا جو کیا کم کیا۔ حتی کہ وہ پڑا بوائے بن کر کر ٹر ہار میں ہی جا نا رہا اور ان کے کمروں میں مختلف جنس چھوڑ چھوڑ کر آتا رہا۔

ایما کے کمرے آگے اس نے بورڈ کا ڈیرنگ ڈیا اور وہ بورڈ کچھ ایسے تھے کہ ایما نے فوراً ”انہیں آگ کا دی بعد میں وہ اپنی دوست کے آگے بیٹھ کر روٹی رہی اور پوچھی رہی۔ کیا میں ایسی ہوں۔ ایسی؟

پتا نہیں وہ کس ”ایسی“ کے بارے پوچھ رہی تھی کیا ہاتھ سے بنائی اس چھگی کے بارے میں جس کے براؤن بال تھے اور جس نے نیلا گاؤن پہن رکھا تھا اور جو مسکرا کر ایک کلتے دنیا سے خوب صورتی ہمیشہ کے لیے ناپید ہو چکی ہے کا واضح اعلان کر رہی تھی اور جس پر لکھا تھا۔

”Reloaded Ayma is Back“

”Horror“ بہر حال باقاعدہ پرائم ویک کا آغاز انہوں نے مالک پتے ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے رات گئے اکیلے اکیلے جو نیز زہر پلٹ بول کر ان کے منہ پر نیپ چپکا کر۔ ان کے ہاتھ باندھ کر۔

”تم انہیں کر لیے گئے ہو۔“ کا بیوٹ دے کر کیا۔ سائی اور امرت کا کام نیپ چپکانے کا تھا۔ عالیان اور کارل کے ہاتھ میں ہتھیار تھے اور وہ پونی کی سپر گن میں تھامی مدد کر دے گی یعنی وہاں سے گزرتی ہے اور انہوں کاروں کو لٹکارتی ہے کہ وہ پولیس کو بلا رہی ہے اور فون نکال کر کان سے لگاتی ہے اور انہوں کاروں سے چاروں کی کٹیٹی پر گن رکھ دیتے ہیں کہ اگر فون کیا تو یہ کیا۔

اور وہ انہیں عایان کے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھتی رہی۔



"اعمالِ نیک یا کبیرہِ قتل پر تحریرہ نوری رہائی ہے جسے برگزیدوں کے سائے "آبِ حق" سے لکھا جاتا ہے۔"
لیڈی منٹ۔ خدا کے بنائے خوش قسمت انسانوں میں سے ایک میں ہوں۔ میں خود پر نظر ڈالتی ہوں تو یقین رکھتی ہوں کہ خدا کو کیسا پیار ہے مجھے۔ میں نے اپنی زندگی کا وقتی وقتی کنگال ڈالا کہ کیا مجھے کوئی ایسا دکھ ملا جس نے مجھے برباد کر ڈالا جو اب ہے نہیں۔

میرے عزیز شوہر اپنے وقت مقررہ پر رخصت ہو گئے اور میں نے ان کی موت پر صبر کو شکر سے اپنایا۔ میں جسمانی نقص کا شکار ہو گئی اور مجھے اس نقص پر بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی، کیونکہ میں نے خود کو اس حقیقی تحریر کو پڑھنے کے قابل کر لیا تھا کہ مجھے بنانے والا مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرنے والا ہے اور اس پیار کرنے والے کا فیصلہ ہر حال میں میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ تکلیف کی صورت وارد ہو یا کسی راحت کی صورت نصیب ہو۔ یہ میرے چاہنے والے کا فیصلہ ہو گا اور مرعالم اپنے چاہنے والے کے ہر فیصلے پر سرکوا ایسے جھکتی ہے کہ وہ کبھی اٹھ نہ سکے۔

خدا کو کتنا راضی کر سکی ہوں میں، یہ شاید میں اس کے بندوں کو کتنا راضی رکھ سکی ہوں سے جان سکوں۔ میں ایک عام ذوقان ہوں مرعالم۔ میرے پیارے بیٹے ڈیش نے بچپن میں مجھے یہ خطاب لیڈی دیا تھا اور میں نے اسی وقت سے خود کو لیڈی مہربان لیا۔ ڈیش کا دیا خطاب میرے لیے کسی شہنی خطاب کے باقاعدہ دے جانے سے زیادہ خاص ہے۔ میں نے اپنے اہل میں انسان کمائے ہیں۔ میری اس کلمتی پر یقیناً "خدا خوش اور کالور میں یقیناً" خدا اس کلم کو دیکھنے کی درخواست کریں گی۔ جس سے اس نے میری قسمت لکھی، میری گود میں انمول انسان دے اور مجھے ان کا سر پرست بنایا۔ خدا نے مجھے وہ اعزاز دیا جس پر شکر ممکن نہیں۔ "محبت بقا کی صورت اٹھی اور ماں کی صورت بنی۔"

"ساوحتت۔ انسان ایک مکمل زندگی گزار سکے یہ کیونکر ممکن ہے۔ شاید کبھی نہیں، لیکن میرے لیے مکمل زندگی آریان کا ٹھیک ہو جانا ہے اور وہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ میں اب

سے پینٹ کر رکھے تھے۔ چند اخبارات اور مقامی ٹی وی چینلز اس کی کوریج کے لیے وہاں موجود تھے، کیونکہ کارن چاہتا تھا اسے مکمل ٹیم ملے۔ گلوبل نیوز سٹی مقامی ٹیم ضرور اسے ملنے والا تھا۔

پہلے وہ آکسفورڈ روڈ اور ملحقہ سڑکوں پر سائیکلوں سے مارچ کرتے رہے، پھر یونی کے اندر آگئے اور پوری یونی کا ایک چکر لگایا۔ پھر وہ سب ایک مخصوص راستے سے گزرے جہاں رنگوں سے بھرے تلاب نما ڈسپوزبل قلعے رکھے تھے۔ ان کی سائیکلیں مختلف رنگوں سے گزرنے لگیں اور پھر وہ یونی میں پھیلی گئے اور یونی کی سڑکوں کو دھتک رنگوں میں بدلتے چلے گئے۔ پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ یونی کا ایریل ویج مبہوت کر دینے والا تھا جسے ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔

تو یہ سب جا رہے ہیں، زندگی میں کسی تعلیمی ادارے میں جانے سے زیادہ خوش کن کونسی نہیں ہو ما اور اسی تعلیمی ادارے کو خیرباد کہہ دینے سے بڑھ کر کوئی جذبہ اور اس کر دینے والا نہیں ہوتا۔ کاش انسان کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوا کرے اپنی محبوب چیزوں کو وہ مٹھی میں دبا کر دل کے قریب کر لیا کرے اور یادیں مٹتی بھی تازہ کیوں نہ ہوں وہ ہوتی تو یادیں ہی ہیں نا۔ انہیں کیسے بھی تصویروں یا ڈائریوں میں مقید کر لیا جائے۔ یہ ماضی کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ ہلاتی دور سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جو درس گاہ بائیس واہیے "خوش آمدید" کہہ رہی تھی۔ اب وہ ہاتھ ہلاتے "الوداع" کہنے والی ہے۔

امر۔ نے ان احساسات کو لے کر خود کو دگر فرتہ ہوتے دکھا۔

"وہ کارل کے سر پر کتابیں مار رہی ہے۔ وہ سائی کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔ وہ ویرا کی رولر کو سٹر کے پیچھے بیٹھی خوف سے چلا رہی ہے۔ وہ آکسفورڈ روڈ پر سائیکل چلا رہی ہے۔ اس نے عایان کو گرا دیا ہے۔ وہ ٹیٹ بر ٹیٹ لے کر کھار رہی ہے اور وہ انہیں واپس کرنا خود کو بھلائی جا رہی ہے۔ اس کے دل پہنے کو اسٹوڈنٹس ایسین فلگ کہنے لگے ہیں۔ اس کے دل پہنے پر پانچ سٹر کے ڈوب جانے کا ڈر ہے۔" یونیورسٹی کے اس سفر نے اسے کتنا بدل دیا۔

وہ سب ان ہی سائیکلوں پر بیٹھے پانچ سٹر کی سڑکوں کو دیکھ کر تے پانچ سٹر سے دور جا رہے تھے۔ پہلے کارن سائی اور عایان نے دیکھ لگائی۔ پھر کارل اور ویرا نے۔

اپنی ماں سے کہتی ہوں کہ میں نے جان لیا ہے ماں ہونا کتے ہیں۔ ماں ہونا عظمت کو کہتے ہیں۔ پر وہ انسان عظیم ہے جو ماں سا ہے۔ میں عظیم نہیں ہوں، لیکن آریان کتا ہے۔" میں ایک باہمت اور عظیم عورت کا بیٹا ہوں۔" اور آریان کے یہ الفاظ میرا کل اثاثہ ہیں۔ میری مکمل زندگی میں انسان ہو سکی کہ اور تھما زیادہ ہے۔"

قدی نہیں کرنے دی۔ میں جذباتی طور پر کمزور ہو رہی ہوں، لیکن پھر بھی میں آگے بڑھتی رہوں گی۔ میں سخت موسموں میں پلٹ لڑکی ہوں، کیونکہ میں نے جان لیا ابرقانی طوفانوں میں بھگتے رہنے کا سبق سکھا ہے اور میں اپنے سبق بھولتی نہیں۔

دکھ جس دریا میں بہتا ہے میں اس دریا پر پل بنا کر گزر جاتا ہوں۔"

"کارل۔ دنیا کیسی وسیع ہے اور کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے مجھے ذرا تفصیل سے دنیا میں نکل کر دیکھنا چاہیے۔"

یہ بات بہت پہلے سے طے تھی کہ ڈگری کے بعد میں اور عالیان ملتا ہر گے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور مل کر بزنس کریں گے۔ لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ عالیان کو بزنس کرنا ہے اور مجھے ہنگامہ مجھے یہ لگتا ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں کہ کارل آجائے اور کچھ کر دکھائے اور مجھے یہ یقین سا بھی ہے کہ کیسے کوئی ایک خاص وقت میرے انتظار میں ہے۔ تو میں انتظار کرنے والوں کا انتظار ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اسی قلم سے میں دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میرا انتظار کیا جائے۔ میں انتظار ختم کرنے جا رہا ہوں۔

"علم جس وسعت پر محیط ہے شاکر داس کا کوزہ ہے۔" ارحمنہ فاتحوں کی آنکھوں کی چمک کیسی ہوتی ہوگی؟ شخاف اور نذر۔ عالم کل کی روشنی سے بھرپور۔ اور ان کی آنکھیں۔ سورج کی آمدی بروقت اور ان کا ارتکاز آکاش سابلند۔ قائم اور مضبوط فارغ۔

کیا میرا شمار فاتحوں میں نہیں ہوگا۔ یقیناً ہاں کیونکہ میں گری میں اٹھی اور میں پھر سے چل دی۔ میں کمزور تھی میں مضبوط ہوتی چلی گئی۔ میں نے چلنا سیکھا اور میں دوڑنے بھی لگوں گی اور اڑنے بھی۔ اگر میرے والدین میرے دو بہن جاتے تو میں بہت پہلے زندگی کے آغاز پر اڑنے لگتی۔ لیکن میرے خطے میں ابھی اڑانے کا رواج نہیں آیا۔ یہ کوئی فرسودہ یا جاہلانہ رسم نہیں کہ اس پر شرمندہ ہوا جائے یہ تو فخر ہے۔ میں امرتھ اپنی وہ اڑان ضرور اڑوں گی جو ہر انسان کا حق ہے۔ زندگی کی وسعتوں میں میں اپنے آسمان تلاش کرتی رہوں گی۔

"جو ہر کل" مقصد حیات کے بازار میں عمل کے واسطوں فروخت ہوتا ہے۔

سالی۔ انسان کا اثاثہ کوئی ایک انسان یا چیز ہو سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ میرے اثاثے دنیا کے کونوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے فون پر "آن لائن باتیں کرتے ہیں۔ مجھے کسی سبب سے ملتا ہے اور میں جذباتی ہو جاتا ہوں" کیسا خوش قسمت انسان ہوں میں۔ خدا نے مجھے وہ دل دیا جس میں سب کے سب دکھ ایسے محفوظ ہیں۔ جیسے سیکرٹ یا کس میں جیتی اشیائیں نے اپنی ساتھیوں کو نہیں دل کو کھلا رکھا۔ میں کبھی آتھیا نہیں اور میں نے بھی غلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے کسی کی تلبندگی کو معمولی نہیں سمجھا۔ میں نے انہیں ویسے ہی اپنے دل پر محسوس کیا جیسے وہ ستانے والے کے دل پر چتا۔ دنیا بے شک غم سے بھری پڑی ہے، لیکن اس غم سے بڑھ کر کوئی غم بڑا نہیں کہ آپ کے غم کو سننے والا کوئی نہیں۔ آپ کو سلی دینے والا آپ کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔ میں سالی ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔

"افرا تقری کے اس عالم میں زرد اور کو ٹھہر جائیں اور لفظوں کی گونج کا انتظار نہ کریں اور اپنی ساتھیوں کو اس گویائی کے قاتل کریں جو گونجی ہوتی ہے اور چھپے ہوئے دکھوں اور سکتی ہوئی تکیوں کی خاموشیوں کو سنیں اور یہ جان لیں کہ جو کلام خاموشی کرتی ہے وہ زبان نہیں کر سکتی۔ جو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف وہی محسوس کیا جا سکتا ہے تو سب سن لیں اور سب محسوس کر لیں۔"

"دنیا میں گھوم پھر کریں یہ ہی خاموشیاں سنتا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"بلند یوں پر جدوجہد سے پہلے عزم کنڈیں ڈالتا ہے۔" درانیہ۔ زندگی سفر مسلسل ہے اور ہم اس کی سواری زندگی کے اس موجودہ پڑاؤ سے گزرتے ہیں مشکلات کا شکار ہوتی ہوں۔ کیونکہ خود کو تھک تھک کر یہ کہتے رہنا کہ ہاں میں ایک اچھا انسان ہوں۔ مجھے ہی کرنا تھا۔ کبھی کبھی بہت مستی لگتا ہے۔ لیکن مجھے یہ خوشی ہے کہ میں نے محبت کو سرد نہیں پڑنے دیا اور نظرت کو اس کی طرف پیش

"عمایانہ۔ مقصد حیات کی جامع وضاحت مجھ پر کھلی تو میں نے اس دکھ کو کم ہوتے پایا جو ماما کو لے کر میں اپنے دل پر محسوس کیا کرتا تھا۔"

اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بعض اوقات ہم خود اپنے لیے تعلق نہیں بھاگ دوڑ کر اکٹھی کرتے ہیں۔ ان پر بار بار سوال اٹھاتے ہیں۔ انہیں کہہ دیتے ہیں۔ ان پر آنسو بہانے کے مواقع تلاش کرتے ہیں لیکن انہیں ترک کر دینے کے طریقوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب سے زیادہ ظالم خود اپنے لیے ہوتے ہیں۔ میں اب اپنی سوچ کو پہلے سے زیادہ مثبت اور ارادوں کو مضبوط کر رہا ہوں کیونکہ مجھے جلد ہی "مہر اوس" کی بنیاد رکھنی ہے جس کی گفتنی ایک سے شروع ہوگی اور پھر گفتنی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ جہاں بچوں کو جو ہر کل کی کہانیاں سنائی جائیں گی اور روشن صحیحوں کی نوید دی جائے گی۔



"A Tale of Aliyan and Amarah"
"Join us To Celebrate its End"

لیڈی مہر نے ان کی شادی کے لیے کتاب لکھا کارڈ پر لکھوایا تھا۔ شنل کاک میں اب ان دونوں کی شادی کی تیاریاں تیز کر دی گئی ہیں۔ شنل کاک کے قریب ہی ایک چھوٹا سا خوب صورت گھرانہ دونوں کے لیے خریدیا گیا ہے کہ وہ دونوں اپنی ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز اپنے مل بوتے پر کریں۔ ڈینس مستقل ماما مہر کے پاس آکر رہنا چاہتا ہے۔ لیڈی مہر ڈینس پلانرز کے ساتھ کافی مصروف رہتی ہیں۔ ان کے لاڈلے بیٹے کی شادی ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے سارے ماٹھیٹر کو اکٹھا کر لیں ورنہ ساری برطانیہ کو تو ضرور ہی سڑکوں پر زلزلہ لائیں کہ میرا بیٹا کبھی میں اپنی دہن کو بھٹائے گزرنے کا تم سب نے ہاتھ بلانے ہیں ان پر بھولیں برسانے ہیں۔ اور ان کے بس میں ہو تو وہ براہ راست ان کی شادی کی فراہمیتیں چلا دیں کہ ساری دنیا بیٹھ کر دونوں کی شادی دیکھے لیوں یہ ضروری نہیں کہ شاہی خاندان ہی اسکا شادیاں کرنا پھرے۔

فازغ بوقت میں ویرا بھی شادی کے لیے کچھ نہ کچھ پلان کرتی رہتی ہے۔ ان نے اپنے ماما پاپا سے جاپان سے Ni Anata No 10 لکھاست رنگی پارچہ منگوا لیا ہے۔ اور ان سے جاپانی رسم کے مطابق شادی کے دن گھرواپسی

پر شیشے کی پلیں تڑوانا چاہتی ہے۔ پراگ کے کچھ دوست ان کی شادی کے دن ایک پورا لگانا چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی سرسبز و شاداب رہے۔ ان کے کچھ دوست دوست ان کے آگے رنگوں میں بھرے قفل رکھنا چاہتے ہیں جن میں ہاتھ ڈبو کر وہ کیڑوس پر مثبت کرتے جائیں گے اور اس کیڑوس کو اپنے گھر میں نمایاں جگہ لگائیں۔ اور بھی بہت سے دوست اپنے اپنے دل پسند رنگیں کرنے والے ہیں۔ یوں ان کی شادی یونیورسل ہونے والی ہے۔ اور یہی سب دوست سرور اتوں میں آتش دان کے پاس بیٹھ کر اپنے پوتے پوتیوں کو ان کی کہانی کچھ یوں شروع کر کے سنانے والے ہیں۔

تو تقریب کا آغاز چینی ساختہ بڑے بڑے ڈرموں کے بجنے سے ہوگا، فی الحال یہی سب طے کیا گیا ہے Anselm بل مینس ڈگری کے بعد اپنے اپنے گھروں کو بالکل جانے والے ہیں۔ انہیں اور گھنٹے ہی روٹیسرڈ ان گنت ہوئی فیلوز اور ان دونوں کے کلاس فیلوز کو شادی میں شرکت کرنی ہے جس کی خبر The Tab Manchester میں مختصراً کہانی کے ساتھ آچکی ہے تو ایک اندازے سے سارا ماٹھیٹر اکٹھا ہونے ہی والا ہے۔ ڈینس ڈینس کے اسٹوڈنٹس الگ سے۔

دنیا بھر سے لیڈی مہر کے سب بیٹے شنل کاک آنے ہی والے ہیں۔ ویرا، این کے والدین، آریان، آریان کے پاپا، داوا، رائیہ وغیرہ سب شارٹ گو جو روڈن کے ساتھ مل کر عالیان امرد کہانی ایکٹ کر کے پیش کرنی ہے۔ جو روڈن عالیان بنے گا اور شارٹ امرد۔ مورگن نے بس کسی طرح سے ایک گانا تیار کر لیا ہے۔ سائی، روپا کے ساتھ شادی میں شرکت کرے گا اور ایک لمبی تقریر کرے گا اب وہ بولے گا اور سب سٹینس گے بہت سن لیا سب کو۔

کارل نے ان گنت بے ضرر اور معمولی سے ویڈیو گرامنگ تیار کیے ہیں۔ جن میں سب سے بے ضرر دو لہا، ڈینس کی بغیر جھٹ کی کار جسے وہ شہ بلا چلا رہا ہے گا لیگان گنت مہمانوں کے ہجوم میں بے قابو ہو جانا ہوگا۔ مہمان بھاگیں گے چلا میں گے اور دو لہا، ڈینس کا گلابی رنگ سفید پڑ جائے گا۔ کیسا مزا آئے گا۔ مزید یہ کہ دور لیکن وہیں موجود پھولوں سے جی جھیل میں کار کا شہزاد سے کرسا بنا ہوا ہوگا۔ یہ مذاق قطعاً نہیں ہے۔ وہ پورے ہوش و حواس سے سنجیدہ ہے۔

تواہتمامات کے ختم ہوتے ہی رزلٹ سے پہلے انہوں نے پتھل پائی رکھی۔ پارٹی کا افتتاح کارن کے ڈانس سے ہوا۔ پہلے ہاف یعنی شادی سے پہلے میں وہ بھلا چنگا ڈانس کرتا رہا دوسرے ہاف میں انہوں نے منظر کوں کی طرح۔ یعنی شادی کے بعد عالیان کا حال۔

دوسرا ہاف ایسے کامیاب رہا کہ سب ہنس ہنس کر تھک چکے ہیں۔ پھر بھی ہنس رہے ہیں۔ شادی کے بعد ساری دنیا تمہارے حال پر ایسے ہی ہنسے کی وقت ہے سوچو لو کارن نے ہنسے والوں کی طرف اشارہ کر کے دائیں آنکھ دبا کر کہا۔

"مجھے انتظار رہے گا۔" عالیان نے بھی آنکھ دبا لی۔ ہنس اندھیرے میں ڈوب گیا۔ صرف فلور پر روشنی رہ گئی۔ فلور پر لا تورا، الارم رکھ دیے گئے اور وہ ایک ایک کر کے بجنے لگے۔ خطے کی خطیں۔ خطروں۔ خطروں۔ خطروں۔ ایک کا تھک۔ تمک می لڑے ہیں۔ اسنوڈس اور حواہر چل پھر رہے ہیں۔ زمین ڈنڈے کی طرح وہم وہم کرنے لگی ہے۔

کیونکہ انہیں لٹیک کو سنبھالتی ہے بالوں والی لڑکی چلتی آ رہی ہے اور تمک می بیٹے عالیان کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ سب اسنوڈس ان کے گرد دائرے میں سمٹ آئے ہیں۔ ڈی ہے نے دھماکا کیا اور سب اچھل کر فلا یا ڈی لگاتے پھٹ کر گر گئے ہیں اور کارن فلور پر بیٹھ کر جھان بھان کر کے رونے لگا ہے۔

سندری لہوں کی آوازیں۔ اور یہ ایک بڑی سوتالی کی لہرائی اور سب اس میں بہ رہے ہیں۔ ہائے ماچسٹریا۔۔۔ سب فلور پر تھرتے ڈوبنے کی اداکاری کر رہے ہیں اور انکی کامیابی سے کر رہے ہیں کہ عالیان ہنس ہنس کر دیوانہ ہو رہا ہے۔

اب اصل اٹھا اور فلور پر سر کو تھکتے ہے نیازی سے چلنے لگا ہے اور پیچھے پونی کی عوام دوپٹے سے اچھے اچھے کر لوی لٹری ہوئی جا رہی ہے۔ ہل پھرے اندھیرے میں ڈوب گیا اور اس بار روشنی ہوئی تو فلور پر ڈر ٹین پڑ تیار تھی۔ اور سب نے ہانک پھین لیں اور اصل اور عالیان کے گرد جمع ہونے لگے۔ سائی ڈرم بجا رہا تھا اور شاہ ویز دعائی پلیٹیں پس منظر میں چینی کانا انک سے چل رہا تھا۔ ہل پھرے اندھیرے میں ڈوبا اور روشنی ہوتے ہی اصل سائیکل چلا نا نظر آیا اور عالیان کو گرا کر یہ جاہ جا۔ پھر آیا پھر گرا پھر آیا پھر۔

ہل اندھیرے میں ڈوبا اور اس بار اصل سرخ گھونٹ میں نظر آیا اور جھان بھان کر کے روتے قہقہے بے کنے کے بجائے عالیان کے کیے ظلم دنیا بھر کو بتا رہا ہے۔ ظلم عالیان۔ مقلوب ہے چاری امرج۔

اس پورے مجمع کے بعد سب نے ایک ایک منٹ کی تقریر عالیان کے لیے کی کہ ابھی بھی وقت ہے پچھلے دو دن سے سے بھاگ لو۔ پھر نہ گدھوں میں شمار ہو گا نہ گھونوں میں۔ صرف شوہروں میں وہ بھی شرمندگی سے۔ کارن نے اپنی تقریر کا آغاز بچھ یوں کیا۔ "میں نے ہمیشہ آپ سب کا بھلا چاہا۔"

"ہمیں اس میں کبھی شک نہیں رہا۔" شاہ ویز نے آہ بھری پھر دانت نکالے۔

"اور میں ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔" کارن نے شاہ ویز سے بڑے دانت نکالے۔

"ظاہر ہے ہماری قسمت اتنی اچھی کیسے ہو سکتی ہے۔" سائی نے رو کر کہا۔

"مجھے تو یہ سمجھنا ہی بومس لگتا ہے کہ دو لوگ اتنا لمبا وقت ایک دوسرے کو برداشت کریں۔"

"تمہارے معاملے میں یہ سچ ہو گا نا۔" عالیان نے بلند ہانک کہا۔

"تو اگر ایک اچھی زندگی گزارنی ہے تو شادی۔"

"وہی ہے تمہاری شادی کسی شہزادی سے ہوئی یہ میری پیش گوئی ہے۔" ہم نے اسے تقریر کے درمیان ہی ٹوکا۔

"مجھے یہ پیش گوئی اچھی لگی۔" اور تم بھی جو کبھی نہیں لگے۔" کارن بھول رہا تھا کہ ابھی اس نے "نو شادی" کا مشورہ سب کو دیا ہے۔ اب وہ اپنی شادی کی پیش گوئی پر خوش ہو رہا ہے۔

"اور وہ شہزادی ساٹھ سیکنڈ کے اندر اندر صد سے سے مرجائے گی۔"

جیسے کارن کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوئی اس پر سارے مہینوں ایک طرف رکھ کر وہ سب اجڈ گواروں کی طرح ہنسے۔ رکے۔ پھر ہنسے اور ہنستے ہی رہے۔

"یہ بھی برا نہیں، جلدی جان چھوڑ دے گی میری کارن کی بلا سے دو سو شہزادیاں مرجائیں۔"

"تم ماچسٹریا چھوڑ دو گے۔" سب پھین نے اگلی پیش گوئی کی۔

"تم برطانیہ بھی چھوڑ دو گے۔" ڈیرک نے کہا۔

"اب یہ نہ کہہ دنیا یہ دنیا بھی پھوڑے گا۔" سالی بھی کیوں پیچھے رہتا۔

"اس نے تو کہا نہیں، لیکن اس کے کندھے پر گن رکھ کر تم نے ضرور کہہ دیا۔" کارل نے ان سب کی طرف دیکھا اور گلا کھنکارا۔

"اب یہ سارا ماحول میرے لیے بن گیا ہے تو سنو میں تم سب کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہوں۔ تم سب بری طرح سے مجھے یاد کرنے والے ہو۔ اتنا کہ تمہیں میرے نام کے دورے پڑا کریں گے اور تم یہ دعا کیا کرو گے کہ کہیں سے میں آ جاؤں اور تمہاری جان عذاب میں لے آؤں۔ تم اپنے بچوں کے نام کارل رکھو گے اور اپنی سویت بائٹ کو سویت کارل کہہ دیا کرو گے۔ تمہارا کہیں دل نہیں لگے گا تم دنیا میں پاؤں کی طرح مجھے ڈھونڈتے پھرو گے۔ تمہاری بیویاں نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس تمہیں لے کر جائیں گی اور پانا آخر تم سے طلاق لے لیں گی۔ تمہارے پاس بڑے گھر ہوں گے، کئی کئی گاڑیاں کھانے کو دنیا جہاں کے کھانے، لیکن تمہارے پاس ایک کارل نہیں ہو گا۔ اور بس پورا ہر چیز کا مزا خراب ہو گا۔ تم یوں کی ایک ایک بات، ایک ایک پل بھوں جاؤ گے سوائے کارل دی کرٹ کے۔"

کارل نے آخری جملہ بہت سکون سے ہاتھ ان سب کی طرف لہرا کر کہا۔ یعنی وہ سیدھے سیدھے یہ کہہ رہا تھا کہ "زندہ رہنے کے لیے بہت ضرور تمیں درپیش ہوں گی، لیکن پھل کے لیے صرف ایک۔"

زندگی میں ایک کارل۔ زندگی میں صرف ایک کارل۔

اس پابنی سے اگلی رات امرت کو ویرا لینڈی مہراں سا دھننا شارٹ سمر گن کی طرف سے دی جانے والی پچھل پابنی تھی۔ جس میں کارل نے ٹرکی کا گیت اب اپنا کر گھسنے کی کوشش کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ایسے میک اپ کیا تھا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر ڈوب مرتیں کہ ایسے بھی تیار ہوا جاسکتا ہے۔ لیکن سالی نے پہلے ہی ویرا کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ کارل باں آ رہا ہے اور ویرا نے کارل کو باں کے دروازے پر ہی پکڑ کر پھینکا۔

اس پابنی سے پہلے ویرا نے اس کے کمرے سے بیخامات چر آ کر این کے ساتھ رات کو ہل جا کر درخت کو میسج مرنی کی صورت سجا دیا تھا تو عامیان جس کا یہ خواب تھا کہ ایسا

سانچہ اس کے ساتھ بھی ہو گزرے تو وہ خواب اس کا پورا ہوا اور کارل اور سالی کو اس درخت سے دور رکھتے وہ اس حقیقت کو خواب ٹاکی سے دیکھتا رہا۔

بال کی آرائش قابل دید تھی۔ یہ وہی پرانے قلعے ساہل ہے جس میں شارٹ کی شادی کی پابنی ہوئی تھی۔ جس کے عین درمیان میں بہت بڑا گول فلور ہے اور جس کی چھت پر ایک ایچ ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے روشنی نہ پھوٹ رہی ہو۔

ہلکی نیلی اور سفید روشنیوں کے ملاپ سے اس وقت فلور جگمگا رہا ہے اور سنہری گلی فرک میں ویرا امرت کے ایک ہاتھ کو اٹھائے اور ایک کو کمر میں رکھے آہستگی سے فلور پر دائرے میں حرکت میں ہے۔ امرت ہنستی جاری ہے۔ پھر شارٹ نے امرت کو پکڑ لیا اور قطعاً نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور تیز تیز گھمیلایا۔ پھر این اور پھر ایک ایک کر کے سب نے اور آخر میں اسے ایک منٹ کے لیے سیدھا کھڑا رہنے کے لیے کہا۔

وہ پورے پانچ منٹ تک فلور پر گری بیڑی رہی۔ پھر فلور پر مشروبات بھرے گلاس رکھ دیے گئے اور امرت کو ایک لیکن درست مشروب اٹھا کر پینے کے لیے کہا گیا۔ گلاس مختلف رنگوں کے تھے جو اپنے اندر موجود مشروب کے رنگ کو بدل کر منعکس کر رہے تھے۔ امرت کو فلور پر لاتعداد گلاسوں کے درمیان چلتے ایک گلاس کو اٹھا کر پینا تھا۔ وہ جھک کر یا سو گتھ کر کسی گلاس کا مشاہدہ نہیں کر سکتی تھی۔ غلط مشروب اٹھانے پر فلور پر موجود حوام باقی کے مشروبات بھرے گلاسز اٹھا کر اس پر انڈیل دے گی۔ جن میں سے چند میں نیلی پٹی یا بیباں تھیں۔

"ہیٹس سیکنڈ۔" ویرا جوش سے چلائی۔ اس کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ اس نے آخر کار آنکھیں بند کیں اور آکر بیکر کما اور جس گلاس پر انگلی آئی اسے اٹھا لیا اور ڈرتے ڈرتے سب کو دیکھا۔ سب مسکرائیں رہے کھڑی تھیں۔ اس نے ہرے رنگ کے گلاس میں نیلے نظر آتے مشروب کا ایک گھونٹ بھرا اور آکر بیکر کام کر گیا۔ وہ انار کا جوس ہی نکلا۔ اس کا لباس تیار ہونے سے بچ گیا۔

پھر انہوں نے اسے فلور کے عین درمیان کھڑا ہوا جانے دیا اور وہ سب اس کے پاس آئے پیچھے اس کے پاس پہنچے۔ کھیں۔ کچھ اس کے دامن کے پاس نیچے بیٹھ گئیں

اور مصنوعی لیکن دلکش پھولوں، بیلوں، ستاروں کو اس کے لباس میں جڑنے لگیں۔ اپنی نیک تمناؤں کو بطور سجاوٹ وہ اسے پیش کر رہی ہیں۔

شکل چاند اور مثل تاج پھولوں کو دیرانے اس کے سر پر رکھا، پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اب وہ ساری لڑکیاں جن سے ہاں بھرا بڑا ہے۔ اس کے گرد صحت آمین۔ ایک دوسرے کو شہزادہ دیکھنے دینے لگیں اور امرت کو کہنے لگیں یا امرت کے آگے ہونے لگیں۔ ہاں میں امرت، امرت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ امرت کو یہ تاج کسی ایک کے سر پر رکھنا تھا۔ ایسے موقعے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ امرت کسی کے سر پر بھی تاج رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور آخر کار انہیں خوب تھکا کر اس نے کسی ایک کے سر پر رکھ دیا۔

”میرا دلہا جو رڈن جیسا ہر ڈرنہ کوئی نہ ہو۔“ این خوشی سے چلائی۔ تاج اس کے سر پر رکھا گیا تھا۔

”میرا جو رڈن ہی نہ لے اڑنا۔“ شارٹ بنے ققمہ لگایا۔

پھر ایک بہت بڑے بورڈر عالیان کی تصویر دکھائی گئی اور بندرہ لڑکیوں نے آگے بڑھ کر تصویر کے بندرہ جیسے ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اب امرت کو ایک ایک کے پاس جا کر انہیں دعا دے کر نمن کی تعریف کر کے منت کر کے خوشامد کر کے کہے بھی وہ حصہ لانا تھا اور ایک ایک کر کے تصویر مکمل کرنی تھی۔ وقت مقرر تھا اور اگر وہ وقت مقررہ تک تصویر مکمل نہ کر سکی تو اسے دنیا کی چھوڑ ترین محبوبہ کی ”Sash“ کر اس پٹی پہنائی جائے جو ہر صورت اسے اپنے نوید تک ڈریس پر بھی پہنے رکھنی ہوگی۔

اب امرت ایک ایک کے پاس جا رہی ہے۔ انہیں دعا دے رہی ہے، خوشامد کر رہی ہے۔ ان کی تعریف کر رہی ہے۔ محنت کر رہی ہے، پھر ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے روٹی صورت بنا کر بیٹھ رہی ہے۔ اتنی ڈھیٹ تھیں سب کہ اسے عالیان دینے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ ساوحنہ نے بڑے آرام سے دے دیا۔ شہزادے بڑا تنگ کیا اور آخر میں وہ دیرانے کے پاس آئی اور سنہرے بالوں والی حسن میں کمال کو چھوٹی لڑکی کی بھیلی کھولنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ وہ چھوڑ بیٹھ کر کا خطاب لے لے گی۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور جیسے دیرانے جان گیا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور اس نے اپنے چہرے کو اس کی

محبت سے بھگو لیا کہ امرت جان لے کہ آخر کار مصحوبانہ محبت سے آگے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یعنی بھیلی اس کے آگے کھول دیتی، کھلیے امرت نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر محبت سے دبا دیا اور سرگوشی کی۔

”مجھے تم ہی دعا کی طرح ملنی ہو، تمہیں میری دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔“

دیرانے بھیلی کھول کر اس کے آگے کھڑی تھی وہ بندرہ کے رکھنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی اور امرت نے عالیان کو کھل کر لیا۔

ہاں میں اندھیرا چھا گیا۔ امرت کو ہاں سے باہر لے جایا گیا اور کچھ دیر بعد واپس لایا گیا۔ فلور پر جا بھاقتہ آدم سنہری چو کٹھنوں میں جڑے آئینے کھڑے کیے رکھے تھے۔ سارا ہاں اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ صرف فلور اب تاریکی اور بجلی کھلائی روشنیاں منعکس کر رہا تھا۔ اسے جس آئینوں کے درمیان کھڑا کر دیا گیا۔

سارا ماحول جیسے ایک دم سے بدلا۔ اس نے خود کو سنہری ققمہ سے لکھی جانے والی الوی داستان پایا جو سنی جاتی ہے نہ سنائی۔ صرف دکھائی دیتی ہے۔ خوابوں کی رحم دلی سے۔ اس نے گھوم کر چار اطراف دیکھا اور اس کی آنکھیں سب ہی سنہری خواب سموتے چمکنے لگیں۔ اس نے سر کو ذرا سا اٹھایا اور اپنے دامن کا کونا ایک ہاتھ میں پکڑا اور ذرا سا گھوم لرا پیسے ارالی جیسے خود سے ہی مرعوب ہو۔

”کیا کر رہی ہو امرت۔ اچھا جلدی کر۔ کسی ایک آئینے کے جیسے عالیان کھڑا ہے۔ ہم سب منتظر ہیں کہ تم اسے ڈھونڈ پائی ہو کہ نہیں۔“ دیرانے اندھیرے جیسے سے بلند آواز میں کہا۔ وہ چوکی۔ آئینے اس کے قدم سے اونچے تھے اور صورت بگاڑنے والے تھے۔ کسی میں اس کی ٹھوڑی بیروں کو چھو رہی تھی۔ کسی میں وہ پابست بھری نظر آ رہی تھی، کسی میں موٹی بھدی، کسی میں چھوٹی سی اور کسی میں اس کا قد آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ صرف میں آئینے ایسے تھے جن میں اس کا عکس مکمل تھا۔ ”عالیان کس آئینے کے پیچھے ہو کوئی اشارہ ہی دے دو۔“ اس نے سرگوشی کی جو ظاہر ہے کان لگانے والوں نے سن لی اور چیستانگ کا شور ڈال دیا۔

”میں نے سوچا ہاں میں خاموشی بہت ہے تو ڈراما بہت بنکا۔ ہونا چاہیے۔“ اس نے وانت نکال کر جموٹ بولا۔

ہاں میں شور آئی لیے نہیں تھا کہ وہ عالیان سے پوچھ نہ

تھے اور عایان بھی گھنگھار کر یا کسی اور طرح سے اشارہ نہ دے سکے۔

آئینے کے پیچھے کھڑے عایان کا دل چاہا کہ وہ ہولے سے پھر مار دے کہ اتنے سارے لوگوں میں اس کا سر بلند رہے لیکن پھر وہ یوں مسکرایا کہ چھپ جانا اور ڈھونڈ نکالنا کبھی تو ایمان داری سے ہو۔

کھلی آنکھوں سے اس نے تصور باندھا کہ کیسے امرتہ آئینوں کے درمیان اپنے عکس پر مترنم ہوگی اور اسے جیت جانے کی جلدی نہیں ہوگی اسے تو اسے اپنے کی فکر ہوگی۔ اب وہ عارضی طور پر بھی اسے گم شدہ رکھنے کے حق میں نہیں ہوگی۔ تصور کے اگلے بڑاؤ میں اس نے خود کو چند دن پہلے کے ایک منظر کو دہراتے دیکھا وہ دونوں شرے سے دور ہزے پر بیٹھے ہیں اور چھوٹوں کو اپنے گرد لگ چھپ جاتے ہیں۔ عایان نے اپنی آنکھیں ایک ہاتھ سے بند کر رکھی ہیں کیونکہ اب وہ اس باکس کو ٹھونسنے ہی والی ہے جو وہ اپنی دور اپنے ساتھ لانی سے اور ساتھ ساتھ اسے دھمکتی جا رہی ہے کہ اگر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ باکس کو تالا لگا کر چابی جمیل میں پھینک دے گی۔ اتنا ہی نہیں۔ جمیل میں کوئی نہ چابی ڈھونڈ کر اسے ہی لانی ہوگی۔

ایک چابی کے لیے جمیل میں کون کون سے اس لیے اس نے آنکھیں بند ہی رکھیں اور اس کے کہنے پر ہی کھولیں اور اپنی کل کائنات کو مل بیٹھ کر بانٹ لینے کے انداز سے اس نے کاغذ کے رول کو کھولا اور اسے بھگمانے پھیلا دیا۔

”یہ دیکھو میری بیماریوں کا ماخذ۔“ وہ دنگ رہ گیا افشاں اس کے چہرے پر بھری تھی اور افشاں کی جھلملاہٹ امرتہ کی آنکھوں میں جمیل جمیل تھی۔

عایان نے اس کی سمت اپنی کرن ناز سے باندکی۔ ”تو وہ اسے اپنے پاس رکھے ہوئے تھی۔“ وہ پلک نہ جھپک سکا اور اسے دیکھا رہا۔

”میری بیماری امرتہ۔“ کیسا دل پر جلتے رنگ بجا رہنے کا احساس تھا۔

”یہ تم ہو۔“ اپنی ساری دلربائی لیے وہ اس کے اسٹیج پر محبت سے ہاتھ رکھ کر مسکرائی۔

اس کے دیکھتے رہنے کے انداز سے بس وہ پوری کل ارغوان سی منور ہو گئی اور اس کے عکس میں وہ خود کو ہمیں دراصل اسے ہی پھر سے تلاش کرنے لگا۔ اسی کے کام سے لگے رہتا کیسا مسرور کن تھا۔ اس نے ذرا ہی آنکھیں بند کیں

اس سوچ کے لیے جو نعمت کی طرح اس پر نازل ہوئی کہ کیا وہ پہلوں اور راتوں میں اس کی تصویر کو دیکھا کرتی رہی ہے۔ اور ٹھیک اسی دوران امرتہ نے اس کی ان آنکھوں سے جن پر اسی کا قبضہ تھا یہ جانچ لیا کہ وہ کس سوچ میں جلا ہیں۔

”ایک بار ایسا ہوا کہ صبح ہو گئی اور مجھے اس سے شکایت ہوئی۔ اس نے بتایا بھی نہیں اور بتا بھی دیا کہ جیسے اس نے پوچھا بھی نہیں اور پوچھ بھی نہ کیا۔“

”تم مجھے رات بھر دیکھتی رہیں۔“ اس نے لفظ ”مجھے“ استعمال کیا۔

امرتہ باکس میں سے سرخ رین نکالنے لگی لیکن اس کے ہاتھوں کی نازاں جنبش سے اس نے جان سہا کہ وہ کتنی راتوں تک اسے تھامے آنکھوں کے سامنے رکھتے رہے تھے اور کبھی تھکے نہیں تھے۔

امرتہ رین ہاتھ میں لیے اب اسے ان کی کہانی سناری تھی اور اس کے لیے مشکل تھا۔ دو کام ایک ساتھ کرنا اسے دیکھتے رہتا اور اسے توجہ سے سنا۔

سچے جذبوں سے مسخر ہوتا رنگاز دونوں میں آیا۔

یاں بس بیس۔ بیس۔ ”سہاں یار“ قائم ہوا۔

تصور کے اگلے بڑاؤ سے جس میں وہ بے شمار بار جا چکا تھا نکلا اور آئینے کے پیچھے خود کو موجود پایا۔

مردم کا ہمار نور سا شاہکار ”آئینے کے اس اور اس پار“

آنکھیں بند کر لینے کا مقام ”محویت“

آنکھیں کھول دینے کی غلٹ ”محبوبیت“

ایک ایک کر کے وہ ایک ایک آئینے کے پاس چل چل کر جانے لگی اور پھر سب کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک جہتی ہے جسے اسے بوجھنا ہے۔ کیا وہ اس آئینے کے پیچھے ہو گا۔ جس میں اس کا قد آسمان سے ہاتھ کر رہا ہے کہ اسے پا کر وہ خوشی سے آسمان چھونے لگی یا اس میں جس میں وہ ایک سے کئی امرتہ بن گئی یا اس میں جس میں وہ کھل ہے۔ اور ایسے تین آئینے ہیں وہ ان تین آئینوں کے پاس نئی لور غور کیا۔

”اوہ۔“ اس نے اب غور کیا کہ جس میں وہ اپنے عکس کو مکمل سمجھ رہی تھی اس میں اس کا چہرہ اصل جسامت سے ذرا سا بڑا تھا۔ وہ دوسرے کے پاس نئی اور بہت غور کیا۔ وہ بھی اس کے عکس کو ٹھیک منظر کشی کر رہا تھا۔ وہ

سیاہ ہونے لگی اور امرد نے اپنی آنکھوں کو بھی سیاہ پایا۔ ہاں میں چھائی خاموشی مسرت انگیز لفظوں سے کلام میں بدلی اور وہ سب بڑے دل سے مسکرائیں جیسے وہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ اسی آئینے کو بالے جس کے پیچھے عالیان تھا۔ پھر وہ باہر باغ میں آگئے جہاں ہاں میں پھیلا کر انسانی قد سے ذرا سی اونچی آسانی لائینیں رکھی تھیں۔ وہ سب سرخ تھیں اور مختلف ذہنوں میں ان پر عالیان "امرد لکھا تھا۔

"اوو" "امرد بے یقینی سے چلا آگئی۔ دائم اور نوال کی شادی میں جس طرح ان کے دوستوں نے ان کے لیے آسمان کو روشن کیا تھا امرد کے لیے سمور کن تھا۔ وہ اتنی دیر تک سر کو اٹھائے دیکھتی رہی تھی کہ عالیان اور ویر اس کے اٹھناک پر حیران تھے۔

"کیا تمہیں بھی ان کے سنگ اڑنا ہے۔" عالیان نے فریاد کیا۔

"مگر ایسا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔" وہ بوجھتھی۔ اور ویر اسے مہوت کرنے کے لیے تیار تھی اور اس کے قد سے اونچی لائین بنوائی تھیں۔ وہ سب دو دو کے ایک ایک لائین کے قریب کھڑی ہو گئیں۔

خوشی سے امرد کی آنکھیں جھلک کرنے لگیں اور کتنے ہی آنسو اس کی آنکھیں جھلک گئے اور اس نے ویر کو ستانوں سے تمام لیا۔

"یہ تحفہ ہم سب کی طرف سے ہے امرد۔" ویر نے ابن سادہ شاد لٹ "مورگن کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

امرد نے مسکرائیں سب کو دیکھا شدت جذبات سے وہ ایک لفظ نہیں بول سکی۔

عالیان نے جھک کر لائین کو روشن کیا اور لن دونوں نے مل کر اسے بلند کر دیا اور پھر اپنی گرفت سے انہیں آزاد کر دیا۔

نام اس کا۔ نام میرا۔

ساتھ اس کا۔ ساتھ ہمارا۔

سرخ خیموں نے ان کے ناموں کو اپنی دسترس میں رکھتے ٹٹت سیاہ کو جلوہ افروزی سے روشن کرنا شروع کر دیا۔

حقیقت جہاں کی عکاس ہے۔

ہاں ہے مثال ہے۔

امرد اپنے آپ پر معصومانہ سامان کرنے لگی۔

تیسرے کی طرف پٹنے لگی اور ایک دم سے رکی۔ بہت مدھم بہت ہی ہلکا یہ آئینہ اس کے عکس کو دہرا منقلس کر رہا تھا۔ وہ تیسرے آئینے کے پاس گئی اور خود کو اچھی طرح سے دیکھا اور آئینے پر ہاتھ رکھ دیا کہ اسے یقین تھا جو آئینہ اسے کھل کرے گا اسی کے پیچھے عالیان ہو گا۔

"یہاں ہے عالیان۔" اس نے بلند آواز سے کہا پھر آواز دی۔ "عالیان" اور عالیان نے سر ہری چو کھنے کے کنارے سے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا۔ ارغوانی پوشاک میں لمبوس گھیر وار دامن کو فرش پر پھیلائے وہ آئینے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ تاریخی اور گلابی روشنیوں کا غلاب اس کے ارد گرد ہے اور کھلے بالوں میں کبھی نہ ٹھہرنے کے لیے جھوم رہا ہے۔

"تو کیا اس کے جوتے کا بکل کھلا ہے۔ تو پھر اسے فوراً بیٹھ کر اسے بند کر دینا چاہیے۔"

وہ ذرا سا آگے ہوا۔

اور سب ہی آئینے "برہا" میں دل گئے اور جھرمٹ در جھرمٹ ہی وہ اس کی تاروں سے کھٹنے لگے اور مدھم سوں کی تعلیم دینے لگے۔

"عالیان۔" "امرد گیت مانڈنی پس دی۔

"چلو اب تو وہ گیت گا دو جو گلابی گالوں والیاں سبز زاروں میں بھائی ایک لک کر۔" "اٹھائے عشق" میں گاتی ہیں۔

اور ساری چمکی مسکراہٹوں کی نگاہیں ہاتھ میں لیے عالیان ستارہ ستارہ ہوتی اپنی آنکھوں کو اس کی آنکھوں کی کندوں سے مطیع ہوتے آئیے سامنے آیا جیسے ساری دنیا چھپ گئی ہے اور شرارت "انہیں ساکت کر گئی ہے۔

اور چلو اب وہ گیت بھی سنا دو جو شب کو سحر کرنا ابتدائے جمال یار ہے۔

امرد خوشی سے چلاتی اس سے پہلے اس نے اپنی سوچ کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

"تیسرے عکس کو تم ہی منقلس کرتے ہو۔ مکمل۔ تم میرا آئینہ ہو۔"

عالیان تھے بڑھا اور اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اس کے عکس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تم سے مکمل ہوں امرد۔"

"اور اب اس گیت کی ابتدا بھی تمہی جو "جہان جاوداں" کی اور کیے جاتا ہے۔" اس کی بھوری آنکھیں

سارہنا سمیت ماٹھی شرونی میں تقریب تقسیم استاد میں موجود ہیں۔

ایک ایسا دن جب اعزاز یافتہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور خاص ہونا اچھا لگتا ہے۔ جب دل چاہتا ہے اور آگے بڑھا جائے اور ساری دنیا فتح کر لی جائے، جب بلندیاں چھوئی لگتی ہیں اور حوصلے جولن۔ یونی کاسفر ختم ہونے جا رہا ہے۔ زندگی نئے اعزازات لیے آگے بھی تیار کھڑی ہے سخت مقابلے اور نہ ختم ہونے والی دوڑ کے ساتھ۔

تو اس کھلے کھلے دن گولڈ میڈل گلے میں پہنے دیر اور کارل نے ڈگریاں ہاتھ میں لیے عالیان امرہ امین شاہویز اور سالی نے اپنے سب ہی کلاس فیلوز اور یونی فیلوز کے ساتھ کھلے آسمان تلے مسوں پر تاج کی طرح تخی سیاہ ٹوپوں کو ہاتھ بلند کر کے پورے جوش سے ہوا میں اچھال دیا۔

”علم وہ روشنی ہے جس پر کوئی اندھیرا غالب نہیں۔“
وہ خود ہی فضا میں اچھلے۔
”علم سے جیتی کچھ نہیں۔“

”ہم جیتیں ہیں۔“ وہ ایک ساتھ چلائے۔
اور علم کسی کی میراث نہیں۔
ٹوپیاں ایک بار پھر اچھالی گئیں۔ سیاہ گاؤں دلکشی سے بھڑ بھڑاتے۔

میں نے علم کی طرف لائسنسی سے سوال اٹھایا۔ علم نے
”ہاں“ من کر ”علم“ ہو کر جواب دیا۔
اب وہ یونی میں بھاگ رہے ہیں اور چلا چلا کر اچھل رہے ہیں۔

میں نے علم کو سوچ سے شروع کیا۔ سوال سے کھوج نکالا اور جواب پر اگلے سوال کی طرف پلکا۔
یونیورسٹی کی حدود میں ان کے رجوش نعرے گونجتے رہے اور ٹوپیاں گاہے بگاہے اچھلی جاتی ہیں۔

”اور علم کی فریڈیت پر کوئی شک نہیں۔“

مسک ہے کہ کہیں ماند نہیں اور سجاوٹ ہے کہ کہیں کم نہیں۔ زمین کی دست پر ہنر ہے اور اس کے کناروں پر گلستان، آب رواں پر لمبی ٹوکوں والی کشتیاں پھولوں سے لدیں رواں ہونے کے لیے تیار ہیں۔ انہیں اپنے مہمانوں کا انتظار ہے۔
سکر اہٹوں کی اجاہ داری ہے اور جشن کا سہل۔

”مجھے اس حقیقت پر گمان سے عالیان! وہ ذرا سا اس سے آگے بڑھ گئی تھی کہ گردن موڑ کر اس سے کہا۔“
اس کی گردن کا مرحولہ بلند خم اور اس کے کانوں کے دکتے بندوں کے ہلکوروں نے اسے سارے الفاظ بھولا دیے اور صرف اسے دیکھنا یاد رہ گیا۔
”میں نے آسمانوں کی مسند سے اسے اترتے دیکھا اور درخش پانچوں میں جھلملاتے
اتوار نور کی دسترس میں
محبوب کی تواز سے تواز ملاتے
لوح ہار پر قلم بند ہوتے۔“

اس کے لیے دیکھنے پر امرہ نے چاہا کہ وہ کئی سو پھول بن جائے اور اس پر چھلور ہو جائے اس کی پوروں سے عطر پھوٹ نکلے اور وہ اس کی نفاذوں کو عطر آگین کرتی جائے۔
سرخ لائسن بلند ہوتی چار اطراف پھیل رہی تھیں۔
رات اسی سجاوٹ سے سنبے کے لیے پوری طرح سے تیار تھی۔

”تم سے محبت مجھ پر فرض ہے۔“ وہ اس کے پاس چلا آیا۔
لائسنوں کے سنگ اڑتیں امرہ کی نظریں جملن روشن کر پائیں اور اسے ذرا دیر نہ لگی یہ کہنے میں۔

”اس فرض کو میں کبھی تقاضا نہیں ہونے دوں گی۔“
اور روشنیوں نے اپنے سارے ماخذ ڈھونڈ نکالے۔
”ایک امرہ اور ایک عالیان ہے۔“

پورہ انہیں مرکز بنا تیں کائناتی بینکھڑیاں بن کر کھل کر ”گل نور“ ہوئیں۔



درسگا میں عبارت گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں اور علم ”ایمان“ کا۔ دنیا میں کوئی ایسا میزان نہیں جس میں علم کو رکھ کر تو لا جا سکے کہ کوئی وزن اس کے ہم پلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو میں علم کے دم قدم سے زندہ رہتی ہیں اور پائندگی پاتی ہیں۔ اس لیے خوش قسمتی میں دو لوگ امتیازی ہیں ایک وہ جو شاگرد ہے ایک وہ جو استاد ہے۔
ہمارا کاروشن دن آچکا ہے۔

داوا آپکے ہیں اور ویرا، این کے والدین بھی۔ شنل، کاک میں میلہ ج گیا ہے۔ دیس دیس کی کہلیاں دو ہی راتوں میں نشست گاہ میں سداہی گئی ہیں۔ اور اب وہ سب

”تم نے یہ سب صرف اس ایک بات کے لیے کیا؟“
 امردہ دیر تک مسکراتی رہی۔
 ”ہاں۔ میں بچھڑانا نہیں چاہتا امردہ۔ اور تمہاری باتیں
 میرے لیے صرف باتیں نہیں ہیں میں خود کو ان کا مطیع چاہتا
 ہوں۔“ وہ اسے ایک گھوڑے کے پاس لے آیا اور
 گھوڑے پر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اور پھر گھوڑے کی نگام
 پکڑ لی۔

سرسبز امردہ کے ذہن سے خوشنما کلیاں بن کر جھڑپیں
 اور دھند کے مرغولوں نے ان دونوں کی موجودگی کو ترم سے
 کچھ یوں گویا کیا۔
 ”عشق جو اسرارِ اعظم ہے۔“
 ”یہ دونوں اس کے رازدار ہیں۔“
 اور ان آخری الفاظ پر بہت حید اپنے قلم کو روک دیتی
 ہے کہ کھل کی میں نے داستانِ افکار۔
 داستانِ یار۔ ”یارم“



”سب تعریفیں صرف اور صرف خدائے برتر کے لیے
 جو لفظ آرتا ہے انہیں ترتیب دلو آتا ہے اور جو ہر تخلیق پر
 قادر ہے۔“



عقلمندان

تہمت - 400/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، منہ 14، کراچی

فون نمبر:
 32735021

وہ سب اس رستے کے کنارے کھڑے ہیں جہاں سے
 سب کا رخ کو آتا ہے۔ اور دور سے وہ آتی نظر آنے لگی ہے
 جس کی پچھلی سیٹ پر ماما صبر کا شہزادہ بیٹھا نظر آ رہا ہے اور
 اس کے ساتھ بیٹھی دادا کی بری امردہ اور آگے دو لہما ساہی
 خوب صورت لگتا شہہ بالا کارل اور اس کے ساتھ بیٹھی
 دلہن سی پکا چوند شہہ ہلی دیر۔

ان کے آتے ہی فضا میں شور اٹھا ہے اور وہ جوش سے
 چلانے کے لیے تیار ہونے لگے ہیں۔ عایان کار سے اتر کر
 امردہ کا ہاتھ پکڑنے کے لیے تیار ہے اور امردہ اسے اپنا
 ہاتھ پکڑانے کے لیے تیار ہے۔ اور یہ شہنائیاں بجنے کی
 ابتدا ہے۔

سورج کی کرنیں درختوں کے جھنڈوں سے مصافحہ
 کرتیں، شاخوں پر ذرا ذرا رستیں، دھند کے ذروں سے
 اپنا حیت برتیں، من کے انظار میں در آدہ کی چاپ لیے
 اتر رہی ہیں مہور ہنگہ ہو آئیں اپنے سنگ خوب صورت
 پروں والے پرندوں کی آوازیں دہن دہن سے اپنے
 پتھکوں پر بیٹھتے ناز رہی ہیں۔

عایان نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے اور وہ اسے ہل سے
 گزار کر دوسری طرف لے جا رہا ہے۔ وہ سمجھی وہ اسے وہ
 جگہ دکھانے لایا ہے جہاں ان کی شادی کی تقریب ہوئی
 متوقع ہے، لیکن دھند کے بادلوں میں اترتے ہی اسے اپنا
 خیال بدلتا رہا۔ اور خیال سا آیا کہ اس نے لہراتے بانوں کی
 فرمائش کی تھی اور اسے اس کے لباس کے خاص ہونے کی
 اتنی فکر رہی تھی۔

”تم کس یاد کو تازہ کرنے آئے ہو یہاں عایان۔“
 ”یاد نہیں خواب، بہت سارے خواب۔ ماما کا کافی خرچ
 ہوا میرے ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے۔“ عایان نے
 اسے شانے سے پکڑ کر ذرا سا گھما کر کہا کہ وہ دیکھ لے وہ
 اسے کہاں لایا ہے۔

امردہ کو اگلا سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اسے
 اپنے ہر خواب کے بارے میں بتا چکا تھا اور اسے ان خوابوں
 کی عملی صورت شمولیت پر اعتراض نہیں تھا۔

”تم نے کہا تھا میں جب بوڑھا ہو جاؤں گا تو مجھے بچھڑانا
 پڑے گا، گھوڑے پر بیٹھنے میں مجھے تمہاری مدد کرنی
 چاہیے تھی۔ آداب مل کر ان گھوڑوں سے پوچھیں آج
 ان پر نگام اور زمین کہاں سے آئی۔“ وہ اسے لے کر آگے
 بڑھا۔

نبیلہ عزیز

وصفِ عیسیٰ

ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی شہینہ خاں کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔

منوہ شہینہ اور نیو کے بھائی رضا حیدر کے دو بیٹے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر پرنس مین سے اور بے حد شان دار پرشائی کا مالک ہے۔ ولید الرحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیو کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں دم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھل کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوفناک حصار میں باندھ دیتی ہے۔ آہم عزت مکمل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹال سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کرتا ہے۔ فارہ روٹی ہے۔ اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بھدا اصرار دے ہو کر کرتی ہے۔

انیسویں قسط



Copied From Web



Copied From



ولید اپنے بستر پہ لیٹا اپنے لمرے کی تھمت کے کسی زیدہ قسطے کو کھورتے ہوئے بے حد گہری سوچ میں کم نظر آ رہا تھا وہ آج ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تھا اور لا شعوری طور پر مسلسل کسی انتظار میں لگ رہا تھا۔
 ”اسی۔“ اس نے بڑے شرمے ہوئے اور پُر سوچ لہجے میں پکارا تھا اور کمرے سے باہر نکلتی زیدہ خاتون کے قدم رک گئے تھے۔

”ہاں کسو۔؟“ انہوں نے فوراً ”پلٹ کر ولید کی طرف دیکھا۔
 ”اسپتال کون کون آیا تھا مجھ سے ملنے۔؟“ ولید جیسے کچھ منٹا چاہتا تھا۔
 ”بہت سے لوگ تھے۔ میں تو کسی کو جانتی بھی نہیں۔ اب تمہیں کس کا بتاؤں؟“ وہ لاعلمی سے بولیں۔
 ”جن کو جانتی ہیں ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا؟“ ولید کرید رہا تھا۔
 ”تیور کے سوا اور کسی کو جانتی ہوں بھلا۔“ انہوں نے لا پرواہی سے کہا۔
 ”تیور کی فیملی کو بھی جانتی ہیں آپ۔ اس کی مدد اس کے قادر اس کی سسٹل۔ سب کو جانتی ہیں کیا وہ نہیں آئے۔؟“ اس نے اپنے سوال کو خاصا گول مول سا کر دیا تھا۔
 ”نہیں۔ ان میں سے تو کوئی بھی نہیں آیا۔ تیور آ گیا ہی تھا۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
 ”تھا۔! وہ بے حد آہستگی سے کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔
 اس کی آس ٹوٹ گئی تھی اور وہ پھر سے کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔
 ”یعنی کہ وہ بھی نہیں آئی۔؟“ اس نے دل ہی دل میں خود کلامی سی کی تھی۔
 ”مگر کیوں۔؟“ اسے پتا بھی تھا بھر بھی۔؟ پھر بھی نہیں آئی۔؟ ایسی کیا بات ہے بھلا۔؟ اس نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔؟ وہ وہ ٹھیک تو ہے نا۔“
 ولید کو سوچتے سوچتے اس کی فکر لگ گئی تھی اور تب ہی باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی وہ بے اختیار جو تک گیا تھا۔

”کون ہے۔؟“ باہر سے زیدہ خاتون کی آواز سنائی دی تھی۔
 اور جواب میں باہر سے کس کی آواز آئی تھی یہ ولید کو سنائی نہیں یا تھا۔
 پھر چند منٹ بعد قدموں کی چاپ ابھری اور زیدہ خاتون کے ساتھ کوئی اندر داخل ہوا۔
 ”ولید۔! دیکھو بیٹا۔ کون آیا ہے۔؟“
 زیدہ خاتون نے اندر داخل ہونے ہی سے متوجہ کیا تھا اور ولید ان کے ساتھ باہر امر تقاضی کو دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”ارے۔ آپ۔؟“ ولید نے بے اختیار ذرا سا اٹھنے کی کوشش کی۔
 ”ارے۔ رے۔ لیٹے رہیں۔ اتنی بہادری کا مظاہرہ مت کریں۔ پلیزریٹیکس۔! باہر آنے فوراً بڑی تیزی سے کہتے ہوئے اسے اٹھنے سے روکا تھا۔
 ”اسی پلیزریٹ۔!“ ولید نے ذرا سارے کے لیے ماں کی طرف دیکھا تھا اور زیدہ بیگم نے سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ کے اسے سہارا دیا اور تکبیلوں کے سارے اسے شہور از سا کر دیا تھا۔
 ”بہنہ جیسے نا۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟“ ولید نے اپنے آپ کو پُر سکون کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
 ”تھینکس۔! باہر آکتے ہوئے آگے بڑھ کے اس کے بستر کے قریب رکھی کر سی۔ بہنہ گئی تھی۔
 ”تھینکس سنے کا حق تو میرا جتا ہے کہ آپ میری عیادت کے لیے میرے گھر تک آئی ہیں۔“ ولید حقیقتاً دل سے ممنون ہوا تھا اس کا۔

”یہ زبردستی کی عیادت ہے۔ یاد ہو گا آپ کو۔“ ماورا نے اسے ہاسپٹل والی ملاقات یاد دلائی۔
 ”یاد ہے۔ دراصل آپ جیسے بڑے لوگوں سے سارے کام خود کہہ کر ہی کروانے پڑتے ہیں۔ چاہے وہ عیادت
 ہی کیوں نہ ہو۔“ ولید نے بڑے عاجزانہ انداز سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
 ”اب ایسی بات بھی نہیں ہے جو کام ہم نے نہیں کرنا ہوتا، ہم کسی کے کہنے پر بھی نہیں کرتے۔ جب بھی
 کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔“ ماورا بھی بھلا کب لگی لٹی رکھ سکتی تھی۔
 ”چلیں گی۔“ پھر تو آپ کا دیا ہوا تھینکس کہ آپ میرے کہنے پر نہیں اپنی مرضی سے عیادت کے لیے آئی
 ہیں۔ میرے لیے یہ واقعی خوشی کی بات ہے۔“

ولید نے سچے سچ خوشی کا اظہار کیا تھا۔
 ”اے۔۔۔۔۔ آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ طبیعت کیسی ہے اب۔“ ماورا نے سر جھٹکتے ہوئے
 پوچھا۔

”طبیعت اللہ کے کرم سے فٹ فاٹ ہے۔ جیسے ہی زمین پہ پیر لگ گیا سمجھ لہجے گا کہ میں بھاگ گیا۔“ ولید
 نے اپنی ٹانگوں کو ذرا سی حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اچھا۔ تو پھر زمین پہ ہی کب لگا رہے ہیں؟ مطلب کہ کب بھاگ رہے ہیں۔“
 ماورا خاصی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی اور ولید اس کی دلچسپی پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
 ”بس۔! دو دن اور۔“ وہ اپنے ہاتھوں پر ہوں کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

”اور دو دن بعد۔“ اس کا سوال مختصر تھا۔
 ”بھاگ جاؤں گا۔“ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔
 ”کہاں۔“ اس کا سوال پھر رجتہ تھا۔
 ”جہاں دل لے چلا۔“ وہ بھی بڑی ترنگ سے بولا۔

”تیور حیدر کے گھر۔“ ماورا نے اس کی اصل نہیں پتہ ہاتھ رکھا۔
 ولید نے بے اختیار چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا وہ بہت نارمل سے انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
 ”تیور حیدر کے گھر؟ مگر کون۔“ اس نے وجہ جانتا چاہی۔

”کیونکہ تیور حیدر کے گھر سے جب کوئی بھاگ بھاگ آپ کے پاس آسکتا ہے تو پھر ظاہری بات ہے کہ آپ
 بھی وہاں ہی جائیں گے۔“ اس نے کندھے اچکائے اور ولید کی الجھن مزید بڑھا دی تھی۔
 ”تیور حیدر کے گھر سے بھاگ بھاگ کون آسکتا ہے بھلا۔؟ سوائے تیور حیدر کے۔؟“

ولید انجان بننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ واقعی انجان تھا۔
 ”مگر میں نے تو تیور حیدر کے ساتھ کسی اور کو بھی دیکھا تھا۔“ ماورا نہیں جانتی تھی کہ ولید سچے سچ انجان ہے۔
 ”کسی اور کون۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”جس کا آپ کو یقیناً اب بھی انتظار ہو گا۔“ وہ قدرے لاپرواہی سے بولی۔
 ”مگر آپ کیسے۔؟“ ولید اپنی حیرانی چھپا نہیں سکا تھا۔

”مجھے بھلائیے چاہل سکتا تھا؟ بس اس وقت اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ وہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
 میری بھی آنکھیں چل چلیں تھیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا مجھ سے بھی نہیں چھپ سکی۔ کیا نام ہے اس کا۔؟“ ماورا
 بات کرتے ہوئے آخر میں جیسے یاد کرتے ہوئے ذرا سا سوالیہ انداز میں بولی تھی۔
 ”عزت حیدر۔“ ولید کو اپنی ہی زبان سے اعتراف کرنا پڑ گیا تھا اور ماورا اس کے اعتراف پہ بڑے سکون سے

مسکرا دی۔

”ہاں۔ ایسی نام تھا۔“ اس کے لہجے اور مسکراہٹ سے دلچسپی اور شرارت تھلک رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ آئی تھی؟“ ولید زیر لب بولا۔

”جی ہاں۔ آئی تھی۔ ساری رات اسپتال میں گزار کر گئی تھی۔ میں گواہ ہوں اس چیز کی۔“ ماورا اس پتویشن اور ولید کی کیفیت سے خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ محض ”ہوں“ کر کے رہ گیا تھا۔

”کانٹیکٹ نہیں ہے اس سے۔“

”جب فائرنگ ہوئی، موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں پتا نہیں کہاں گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا ہے کہ میری سم ایڈریس کو دے گا آج۔ اس میں میرے کافی کانٹیکٹس ہیں۔“

”کوئی بنا اجائے ہو۔“ زبیرہ خاتون چائے کے ساتھ چند دیگر لوازمات بھی لے آئی تھیں اور ٹرے چھوٹی سی ٹیبل پر لا کر رکھ دی تھی۔

”ہاں آئی۔“ اس نے کہا ”کیا تکلف کیا آپ نے؟ میں ابھی گھر سے لچ کر کے ہی آئی ہوں۔“ ماورا کو ان کے اتنے تکلف پر شرمندگی ہوئی تھی۔

”ہاں نہیں بیٹا۔ اس میں تکلف کی کیا بات ہے بھلا؟ مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب میرے بچوں کے مہمان ہمارے گھر آتے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ کوئی آتا بھی نہیں ہے نا۔“ زبیرہ خاتون کی بات پر ماورا نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر ولید کی طرف۔

”جی ہاں۔ ہماری ٹیبل میں صرف ہم ہی ہیں کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں کا زیادہ آنا جانا بھی نہیں ہے۔“ ولید نے ان کی بات کی وضاحت دی تھی۔

اور ماورا سہلا کر رہ گئی۔

”لیکن آج تو آپ کو کسی اور کے آنے کا انتظار تھا نا؟“ ماورا نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے شرارت سے اسے چھیڑا اور جواباً ”ولید بھی مسکرا دیا تھا۔“

”وہ تو ہے۔ لیکن آپ کا آنا بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آج کے دن کے لیے ہی کافی ہے۔ میں خوش ہوں۔“

ولید نے بے ساختہ سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا، ماورا اس پر ہنسی تھی۔

”کیا بات ہے حیدر؟ تم نے مجھے کوئی جواب ہی نہیں دیا؟ اور ادھر میں ہوں کہ مسلسل انتظار میں ہوں۔“ قیام مرزا دعا سلام کے بعد اصل بات کی طرف آگئے تھے کیونکہ مونس مرزا حقیقی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرنے پہ اتر آیا تھا۔

”جواب تو میں ضرور دیتا۔ دراصل ابھی میری تیمور سے بات نہیں ہوئی اور ایسے معاملوں میں تمہیں پتا ہے کہ گھر میں کچھ ڈسکشن تو ضروری ہے تا جبکہ تیمور اس ہفتے بہت بڑی رہا ہے۔ اس کا دوست زخمی ہو گیا تھا اس لیے میں نے اس ٹاپک پر بات ہی نہیں کی۔“ رضا حیدر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

”اچھا؟ ایسا کون سا دوست ہے اس کا جس کے لیے وہ اتنا بڑی ہو گیا کہ تم بات ہی نہیں کر سکتے؟“ قیام مرزا کے انداز میں عجیب جھین سی تھی۔

”ولید رحمان۔ بچپن کا دوست ہے اس کا۔ ایک نیوز چینل پر پروگرام بھی کرتا ہے اخبار میں بھی کام کر چکا

﴿ماہنامہ شعاع مارچ 2015 256﴾

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

ہے اسی وجہ سے اس پر فائرنگ بھی ہوئی ہے۔
 رضا حیدر ان کے نتیجے کی چیخیں محسوس نہیں کیا تھے اس لیے پورا نرمل سا جواب دیا تھا۔
 ”آج صبح صرف تیمور کا دوست ہے یا عزت کا بھی۔؟“ قیام مرزا کے لہجے میں ذرا اور گھنچاؤ آیا تو رضا حیدر بری طرح چونک گئے تھے۔

”عزت کا۔؟ کیا مطلب۔؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟ صاف بات کرو۔“ رضا حیدر کے لہجے میں بھی نرمی کے بجائے سنجیدگی آگئی تھی۔

”مطلب کہ جب وہ ولید رحمان زخمی ہوا ہے تو تیمور سے زیادہ پریشان حال عزت ہی تھی اور رات بھر اسپتال میں موجود رہی ہے۔ آخر کچھ تو ریلیفیشن ہے ان کا۔؟“
 ”قیام مرزا۔! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم میری بیٹی کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“ رضا حیدر کچھ سخت ہونے لگے اور تیرک گئے تھے۔

”ویکھو حیدر۔! میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں تمہارا محسوس اس بات کا ہے کہ تم نہیں جانتے اور آج تم سے بات بھی اسی لیے کی ہے کہ تم بھی جان جاؤ تمہارے بیٹے کا دوست بڑی اونچی اڑان بھر رہا ہے اور اس اڑان میں تمہاری اولاد اس کا پورا پورا ساتھ دے رہی ہے۔ اگر میں اس معاملے میں غلط ہوا تو مجھے سچ پورا ہے میں بے عزت کرنے کا پورا حق رکھتے ہوں میں ان بھی نہیں کروں گا۔“ قیام مرزا نے بات اتنے وثوق سے کی تھی کہ رضا حیدر کے پاس سوائے خاموشی کے اور کچھ رہائی نہیں تھا۔

”اور دیکھ لیتا ہے تیمور اس پروپونل سے انکار کر دے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔ باقی تمہاری مرضی۔“ قیام مرزا نے ہیشن گوئی کی تھی۔

”ایسا بھی نہیں ہو گا قیام مرزا۔! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ عزت کی شادی مونس مرزا سے ہی ہوگی۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔“ رضا حیدر نے انتہائی پھرتیے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”ولید! نہیں۔! وہ ذریعہ بڑھانے تھے اور پھر ایک دم دل میں نجانے کیا ابلی آیا تھا کہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک دم دو بار پر دے مارا تھا۔

”کبھی نہیں۔! وہ غصے سے دھاڑاٹھے تھے اور یہی ان کا اصل روپ تھا۔ اصل شخصیت تھی سو رہے باقی سب تو!



”اسلام علیکم سب۔! ناورانے نچل کے قریب آتے ہوئے سلام کیا۔
 ”و علیکم السلام۔ پلیز تشریف رکھیے۔“ تیمور نے اپنے کام سے دھیان ہٹاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا تھا۔

”جی۔ کیسے بلا یا۔؟“ ناورانے مطلب کی بات کی۔
 ”یہ ایک پراجیکٹ چیک کریں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں۔“ تیمور نے ایک فائل اپنے سامنے سے اٹھا کر

ناورا کے سامنے رکھ دی تھی۔
 ”اس پراجیکٹ میں کیا چیز اسپیشل ہے جو آپ مجھے چیک کروا رہے ہیں؟“ ناورانے فائل کھولتے ہوئے اس سے استفسار کیا تھا اور فائل پر بھی نظر دوڑائی تھی۔

”آپ کا نام۔ اور آپ کے کام کی ڈیمانڈ۔ آپ کے ڈیزائن ہاتھوں ہاتھ رک رہے ہیں اور اس چیز کی خوشی جتنی مجھے ہو رہی ہے۔ اتنی شاید آپ کو بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی بنیاد میں نے خود رکھی ہے اس کو دریافت میں

نے کیا ہے۔ وہ بھی فعل آباد سے اور اتنی مشکل سے۔
 تیمور نے بڑے پرجوش اور خوشی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ پورا نے
 نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا اور اس کی نظروں کی شوخی سے
 نظر چراگئی تھی۔

”یعنی اس کا گریڈ آپ کو جاتا ہے؟“ ماورا بڑے شرے ہوئے سے لہجے میں بولی تھی۔
 ”بابا بابا!“ تیمور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور اتنے جاندار انداز سے ہنسا تھا کہ ماورا اب کی بار نظر نہیں چرا
 سکی تھی اور نہ ہی اپنے دل و نظر کوئی اختیار رکھ سکی تھی۔

”ارے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے یہ کب کہا ہے۔ میں نے تو خوشی کی بات کی ہے۔“
 تیمور نے اس چیز کا گریڈ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔
 ”لیکن ہے تو یہ سچ۔ اس کا گریڈ آپ کو ہی جاتا ہے اگر آپ مجھے جب آفر نہ کرتے تو یقیناً میں اس وقت
 اپنے گریڈ سے ہٹنے کے کوئی اور چاب کر رہی ہوتی۔“

ماورا نے اس کا گریڈ کھلے دل سے اسے دیا تھا۔
 ”چاب آفر دینے سے کیا ہوتا ہے؟ جو بھی ہوتا ہے انسان کی اپنی محنت اور لگن سے ہوتا ہے۔“ تیمور نے
 کندھے اچکائے۔

”ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ جو بھی ہوتا ہے انسان کی اپنی محنت اور لگن سے ہوتا ہے اور یہ ایک اٹل
 حقیقت ہے کہ ہوتا ضرور ہے۔“ ماورا نے اعتراف میں سر ہلایا تھا۔

”چھا۔ مگر میں تو ابھی تک اس ”ہونے“ کے انتظار میں ہوں کہ جانے کب ہو گا؟“ وہ اپنی روانی میں کہہ ہی
 گیا تھا۔

”بہت جلد ہو گا۔“ ماورا کا جواب مختصر اور مبہم سا تھا۔
 ”کیا۔۔۔؟“ وہ بے ساختہ بولا۔

”آپ جس کے انتظار میں ہیں۔“ تیمور کے دل میں خوش گانٹھوں نے یکدم سر اٹھار تھا۔
 ”میں سمجھا نہیں۔ مطلب۔۔۔؟“ اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”مطلب کہ میں آپ سے۔۔۔“ اس سے پہلے کہ ماورا زبان پہ تیا جملہ مکمل کرتی ”اچانک تیمور کے سواٹل پہ
 رنگ نیون بج اٹھی تھی۔

”اف بابا۔“ تیمور دل ہی دل میں کرا رہا تھا۔
 ”اگسکیوزی۔“ اس نے معذرت کرتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔ دوسری طرف رضا حیدر تھے۔

”ہیلو۔“ تیمور کا دھیان ماورا کے ادھورے جملے کی طرف تھا۔
 ”گھر کب آرہے ہو۔“ ان کا لہجہ سرو سپاٹ سا محسوس ہو رہا تھا۔

”کیوں۔؟ خیریت۔۔۔؟“ تیمور چونکا۔
 ”جو پوچھا ہے۔ وہ بتاؤ۔“ ان کے انداز میں بذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ لہجہ بے چنگ اور کرخت سا لگ رہا تھا۔

”جس وقت روز آتا ہوں اسی وقت آؤں گا۔“ اس نے بڑے نارمل سے انداز میں جواب دیا تھا۔
 ”ابھی آؤ۔“ انہوں نے غم صا اور کیا۔

”ابھی۔۔۔؟“ اسے حیرت ہوئی۔
 ”ہاں۔۔۔ ابھی۔۔۔ گھر پہنچو۔“ انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”مگر بابا! تیور کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا رہ گیا تھا اور دوسری طرف سے فون بند بھی ہو گیا تھا۔
”مجھے اجازت سے میں جاؤں اب۔“ اور کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔
”لیکن وہ؟“ تیور کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”آپ ابھی پریشان ہیں۔ اپنی پریشانی سو لو کریں۔ باقی بات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی میری نچیل پہ بھی کافی کام پڑا ہے۔ چلتی ہوں۔“ اور اکر کر پلٹ گئی تھی اور تیور پریشانی سے سر پکڑنے کے بیٹھ گیا تھا۔
پھر ایک دم گہری سانس خارج کرتے ہوئے انھا اور موبائل لے کر آفس سے نکل گیا تھا۔



تیور بڑی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا تھا اور سیدہ رضا حیدر کے پاس آیا تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں تھے اور انگلیوں میں سرسبزہ بٹے بیٹھے اسی کے انتظار میں تھے۔ تیور دروازے پر دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔
”جی۔ کھینچ۔ خیریت تو ہے نا؟“ تیور نے اوپر ادھر کے بجائے سیدہ حاسواں پوچھا تھا۔
”ولید رحمان کون ہے۔؟“ انہوں نے سگریٹ کا کش لے کر دو حواں فضا میں چھوڑتے ہوئے استفسار کیا۔
تیور کو ان کے بدلے بدلے انداز سے ابھن ہوئی تھی۔

”یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ولید رحمان کون ہے۔؟“ تیور نے لا پرواہ انداز سے کہا تھا۔
”میں تم سے جانتا چاہتا ہوں کہ ولید رحمان کون ہے۔؟“ انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔
”ظاہر ہے۔ میرا دوست ہے۔ اور کون ہے۔؟“ اس نے گندھے اچکائے۔
”تمہارا دوست ہے تو پھر عزت کا کیا ہے۔؟“ رضا حیدر کے حد درجہ بے لگب سوال پہ تیور بری طرح ٹھنکا تھا۔
یعنی یہ بھانڈا پھوٹ چکا تھا؟

”کیا مطلب ہے آپ کا۔؟“ تیور کو ان کا یہ سوال کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔
”مطلب ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ اگر تمہارا دوست ہے تو پھر عزت کا کیا ہے۔؟“ انہوں نے پھر ہرا کے پوچھا تھا۔
”بابا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔؟ کیا ہوا ہے؟ کچھ بتائیے تو۔“ تیور نے پھر بھی نرمی اور تحمل سے کام لیا تھا۔

”پوری رات ہسپتال میں رہی ہے اس کے پاس۔ آخر کیوں؟“ رضا حیدر نے سختی سے پوچھا۔
”پہلیں غلط قسمی میں مت پڑیں۔ وہ اس کے پاس نہیں رہی۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ تھی تھی۔“ تیور کو سن کے لیے بولنا پڑا۔
”تمہارے ساتھ کیوں گئی تھی۔؟ کیا تک ہتی تھی اس کے جانے کی؟ وہ بھی ایسی ہنگامہ خیز چوہن نہیں۔؟
کوئی توجہ ہوگی نا۔؟“ وہ اپنی بات اپنی ضد کے لئے ہوتے تھے۔
”ہاں۔ وجہ تو تھی۔“ تیور کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا۔
”کیا۔؟“

”ہماری نئی ڈیڑھ انٹرنو ماڈرن تھنسی کی مدراٹھ مٹ تھیں ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا وہ اکیلی تھیں۔ میں عزت کو ساتھ لے گیا۔ عزت ان کے پاس تھی رات بھر۔“
تیور نے پہلی بار شاید بات کو گھمانے کی کوشش کی تھی اور اسے طریقہ بھی نہیں آیا تھا۔
”دیکھو تیور! تم میرے باپ نہیں ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ جموٹ بولنے سے پہلے سوچو کہ کس کے

سامنے بول رہے ہو؟“ رضاحیدر نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا بابا۔ عزت ان کے پاس تھی۔“

”تھک ہے تم اگر کہہ رہے ہو تو یہ مان لیتا ہوں۔“ انہوں نے سر جھٹکا۔

”تھک نہ ہو۔“ اس نے فوراً شکر یہ ادا کیا۔

”لیکن تمہیں بھی ایک بات سنانی ہوگی۔“ انہوں نے اب کی بار قدرے مبہم سے لہجے میں کہا تھا۔

”کیا۔“ تیمور چونکا۔

”میں مولس مرزا کے پرنسپل کے لیے باہی بھر رہا ہوں۔ ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔ انکار کی

کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ رضاحیدر کا انداز دو ٹوک تھا۔

”واٹس۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اس پرنسپل کو رجسٹر کر چکا ہوں۔“ تیمور کو اک جھٹکا سا لگا تھا۔

”رجسٹر کر کے کا حق اور اختیار صرف میرے پاس ہے اور فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔ عزت کی شادی

مولس مرزا سے ہی ہوگی۔ جو خیال تم لوگوں کے دل میں ہے وہ نکال دو۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ کر اپنی جگہ سے

اٹھ کر جانے لگے۔

”مگر بابا! اس نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ وہ جاتے جاتے رک گئے تھے اور اس کی سمت پلٹے تھے۔

”میں دوست کو دوست کی او آت تک ہی رکھنا پسند کرتا ہوں۔ اس لیے تم بھی دوست کو دوست ہی رہنے دو۔

رشتہ بدلنے کا سوچنا بھی مت۔“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چھکی دی تھی۔

”اگر دیکھا جائے تو۔ ایسا تو آپ بھی سوچ رہے ہیں۔ آپ کیوں رشتہ بدلنا چاہتے ہیں۔“ تیمور کا لہجہ بھی دو

ٹوک ہو چکا تھا۔

”میرے بدلنے میں اور تمہارے بدلنے میں بہت فرق ہے صاحبزادے۔! میرا دوست میری نگر کا ہے۔ تمہارا

دوست تمہاری نگر کا ہوتا تو اور بات تھی۔ کیونکہ قیام مرزا سے رشتہ بدلنے میں بھی میرا ایک مقصد ہے۔ تم آج کا

وقت دیکھ رہے ہو۔ میں کل کا وقت دیکھ رہا ہوں۔ تجھے؟“

وہ استغرائیہ۔ انداز سے کہہ کر باہر نکل گئے تھے اور تیمور وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔!

شام سے پہلے کا وقت تھا۔

ولید و انیسوں کے زیر اثر سو رہا تھا کوئی دس بجے پاؤں اس کے قریب آیا تھا اور پھر رونے لگا۔ بے حد آہستگی اور نرمی سے

اپنا نرم و نازک سا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا تھا اس کے ہاتھ کے لمس کی تاثیر اس کی روح تک محسوس ہوئی تھی۔

اور اک مانوس سی خوشبو بھی جس نے اس کے سوتے ہوئے اعصاب کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا اور ولید نے

تیندے سے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں جیسے اسے الہام ہوا ہو۔

”کیسے ہیں۔؟“ عزت اس کی پیشانی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

”تم؟“ ولید اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ایک بار پھر چونکا تھا۔

”ہی۔ میں۔ عزت حیدر۔ بذات خود۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔ ولید نے بے ساختہ انھنے کی کوشش کی

تھی۔

”لینے رہے۔ لینے رہے۔“ ولید نے ولید کو انھنے سے منع کیا تھا۔

”نہیں۔ میں انھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بستر کی دونوں سائیڈوں پر ہاتھ جماتے ہوئے انھنے کی کوشش کی ہنمو

ماہنامہ شعاع مارچ 2015 260

پھر بھی اکیلا نہیں اٹھ سکتا تھا۔

اور عزت بے اختیار اس کے قریب آئی تھی۔
”رکے میں اٹھائی ہوں۔“ اس نے قریب جھکتے ہوئے کہا تھا اور ولید نے اپنے قریب جھکی عزت حیدر کے پیکر سے بمشکل نظر چا کر نظر کا رخ بدل دیا تھا۔

عزت نے اسے بڑی احتیاط سے سارا دے کر پیچھے ہٹے رکھتے ہوئے ٹیک لگا کر بٹھا دیا تھا۔

”یہ سارا مجھ پہ ادھار تھا۔“ عزت اسے بٹھا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

ولید نے بے ساختہ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی سارے سے تو شروعات ہوئی تھی۔ اور ابھی تک اسی کے زیر اثر ہوں۔“ عزت بڑے اطمینان سے کہتی کر رہی۔ بیٹھ گئی تھی۔

”اور میں ابھی تک اس خوشبو کے حصار میں ہوں۔ جو اس وقت بھی میرے حواسوں میں اتر رہی ہے۔“ ولید نے نہیں سکا تھا۔

”قننا ٹیک۔؟“ عزت دلچسپی سے بولی۔

”کیا۔؟“ بے ساختہ بولا تھا۔

”بریفوم۔“ وہ ہنوز دلچسپی سے بات کر رہی تھی۔

”چھانام ہے۔“ ولید نے سر ہلایا۔

”چاہیے۔ اگر پسند ہے تو۔“ عزت نے اسے چھیننے کی کوشش کی۔

”صرف بریفوم نہیں۔“ اس نے لمبی گرون ہلائی۔

”صرف خوشبو کا کیا کروں گا میں۔؟“ ولید کی سوالیہ نظریں عزت کے چہرے پہ اٹھیں تو وہ خود نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ پلکیں جھک گئی تھیں۔

”آپ کو یہ خوشبو اچھی لگتی ہے۔ پوز کریں گے تو اور اچھی لگے گی۔“ عزت نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

ولید جان چکا تھا کہ وہ اندر سے نروس ہو چکی ہے۔

”مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ یہ خوشبو میرے ملبوس سے اٹھے۔ بلکہ یہ اچھا لگتا ہے کہ یہ خوشبو آپ کے ملبوس سے اٹھے اور مجھ تک آئے۔ میں اسے اپنی روح تک محسوس کروں۔ اور مسح ہو جاؤں۔“ ولید نے اپنی خواہش کا اظہار بڑے سلیقے سے کیا تھا۔

عزت حقیقتاً ”کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔“

”چلتی ہوں اب۔“ عزت نے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”تتی جلدی؟ تمھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی۔ میرے کمرے کو اس خوشبو سے مہکنے دیں ابھی۔“ ولید کو اس کے جانے کا سن کر بے چینی ہوئی تھی۔

”ابھی کے لیے اتنا مسک جانا ہی کافی ہے۔“ عزت نے اپنے بیگ کے ساتھ لٹکے گھاسڑا تار کر اپنے بالوں میں انکا لیے تھے۔

”اور آئندہ۔؟“ وہ فوراً بولا۔

”آئندہ کی آئندہ دیکھیں گے۔ ابھی کے لیے اجازت۔“ عزت کی اس جلد بازی پہ ولید دل مسوس کے رہ گیا تھا۔

”اگر اتنی جلدی تھی جانے کی تو مجھے بگانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔؟“ اس نے آخر کہہ ہی دیا۔

”میں آپ کو چیکانا نہیں چاہتی تھی۔ آپ خود جاگے ہیں۔ سونہ میں تو آپ کو دیکھ کر ہی چلی جاتی۔“ عزت بڑے اطمینان سے بولی تھی۔
 ”تو اب مجھے بھی تو دیکھنے دیں کہ آپ آئی ہیں۔“ ولید اتنے دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس تھوڑی دیر اور بیٹھے۔
 ”نہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ سونہ تیمور بھائی کو اچھا نہیں لگے گا۔“
 ”تیمور کو؟“ ولید چونکا۔

”ہاں۔ اور جان گئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے میں انٹرنلڈ ہیں۔“ عزت نے کہتے ہوئے سر جھکایا تھا اور ولید کو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

”واٹ؟ تیمور کو پتا چل گیا؟ مگر کیسے؟“ ولید کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
 ”اس روز جب آپ کا فون بند ہونے سے پہلے فائرننگ کی آواز اور آپ کی آواز سنی تو میرا دل بالکل ماؤف ہو گیا تھا میں سیدھی تیمور بھائی کے پاس گئی تھی اور سب بتا دیا کہ آپ مجھ سے بات کر رہے تھے تو یہ سب ہو گیا۔ پھر ان کے ساتھ ہی میں بھی گھر سے نکل آئی۔ اور اسپتال میں بھی پوری رات ان کے ساتھ جاگتی رہی اور روٹی رہی۔ اس لیے انہیں پھر پتا تو چلانا ہی تھا نا۔“ عزت بڑے معصوم سے انداز میں بولی تھی اور ولید کے ذہن کے پردے پہ پورا کی تو زلزلہ لگی تھی۔

”مجھے بھلا کیسے پتا چل سکتا تھا۔؟ بس اس وقت اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ میری بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ مجھ سے بھی نہیں چھپ سکی وہ۔ (وہ تو ماہ امرتسنی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔)

”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“ عزت نے اسے اس طرح شاک کی سی کیفیت میں دیکھ کر جو نکایا تھا۔
 ”نہیں۔ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ ولید نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”پلیز۔ شیئر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔“ عزت نے اسے حوصلہ دیا۔
 ”کیا شیئر کروں؟ تم میری بلیننگز نہیں سمجھ سکتیں۔“ وہ بار بار نفی میں ہی سر ہلا رہا تھا۔
 ”کیسی بلیننگز۔؟“ وہ بھی نہیں تھی۔

”میں نہیں چاہتا تھا کہ تیمور کو اس طرح کچھ پتا چلے۔ میں یہ بات خود کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ کوئی غلط بات نہ سوچ لے۔“ ولید بیٹھے بیٹھے پینشن اور ٹارگٹ کا شکار ہو گیا تھا۔
 ”انہوں نے کچھ غلط نہیں سوچا۔ انہیں اعتماد ہے آپ پر۔ مجھ سے بھی زیادہ۔“

”نے شک اسے مجھ پر اعتماد ہے۔ مگر اس نے پھر بھی میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا بھلا۔؟“ اف۔ یہ دل بھی انسان کو کبھی کبھی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔“ اس نے کہتے ہوئے سر جھکایا تھا۔
 ”اسی لیے کہہ رہی ہوں ناں کہ میں اب چلتی ہوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میں بھی۔“ اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور ولید معصوم سمجھ گیا تھا۔

”اوکے! اب میں بھی نہیں روکوں گا۔ ٹھیک سے“ آپ جائیں۔“ ولید نے بھی اصرار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اور عزت مسکرا کر اسے دیکھتی ہوئی خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔
 ”اوکے آئی! انڈہ حافظ۔“ عزت نے بچن سے باہر نکلتی زبیدہ خاتون کو مخاطب کیا وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ٹھنک گئیں۔

”ارے بیٹا۔ اتنی جلدی۔؟ ابھی بیٹھو تو سہی۔ میں ولید کے لیے کھانا بنا رہی تھی اس لیے بچن میں دیر ہو گئی۔“

انہوں نے اسے روکا۔
 "تھینک یو آئی! لیکن ابھی نہیں۔ ان شاء اللہ وہ بارہ آئی تو میں بھی آپ کے ہاتھ کا کھانا ضرور کھاؤں گی۔"
 عزت نے بڑے پارے کتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔
 "ضرور بیٹا۔ اچھے خوشی ہوگی۔" زہیدہ خاتون نے اس کے بال جھپکے تھے اور عزت مسکرا دی تھی۔



لیصل آپلو سے واپس آتے ہی فارہ کو بخار نے گھیر لیا تھا۔
 اور وہ بستر سے لگ گئی تھی جس کی وجہ سے آفاق کو بے حد پریشانی ہوئی تھی اور اسے اس قدر پریشان دیکھ کر
 شینہ بزوانی کا سیوں خون پڑھ گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ خود فارہ سے ذرا فاصلے پر ہی رہی تھیں۔ کیوں کہ انہیں یہاں تھا
 جیسے ہی وہ اس پر توجہ دین کی وہ فوراً "لا پروا اور بے نیاز ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی اس لگڑ میں چملا
 رہتا۔

لیکن وہ اتنا پریشان تھا کہ اپنی پریشانی لے کر ان کے سامنے بھی پہنچ ہی گیا تھا۔
 "مئی! وہ بہت زیادہ دیکھا ہو چکی ہے۔ اسے روز بخار ہو جاتا ہے۔ میڈیسن بھی نہیں لے رہی۔ آپ اسے
 سمجھائیں۔ پلیز۔" آفاق جیسے تھکا ہوا کران کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔
 "کیوں؟ میڈیسن کیوں نہیں لے رہی؟" شینہ بزوانی نے لا پروائی کا مظاہرہ کیا۔
 "دکترتی ہے، مجھے وہ مشنگ ہونے لگتی ہے۔" آفاق پریشانی اور تشویش سے بتا رہا تھا۔
 "وہ مشنگ؟" شینہ بزوانی اپنی لا پروائی کے خیل سے یکدم ماہر آئی تھیں۔
 "صرف میڈیسن لینے کی وجہ سے ہوتی ہے یا وہ بے بھی؟" انہوں نے بڑے کھوجنے والے انداز سے
 دریافت کیا۔

"وہیے بھی۔ بلکہ جب سے اسے بخار ہوا ہے تب سے وہ مشنگ ہو رہی ہے۔"
 آفاق کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی اور اب یہی حال شینہ بزوانی کا بھی تھا۔
 "وہ مائی گاڈ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟ میں اسے ابھی کسی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی
 ہوں۔ اس کا کھل چیک اپ ضروری ہے اب۔" شینہ بزوانی تو اک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر فوراً اٹھ گئی تھیں۔
 "لیڈی ڈاکٹر؟" آفاق ساری بات سے صرف لیڈی ڈاکٹر کا لگا تھا اور اس کا منہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا گیا
 تھا۔ مگر وہ ابھی انجان تھا اس لیے سمجھ نہیں پایا تھا۔



شینہ بزوانی جیسے ہی آفاق کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں ان کے قدم مزید ٹھکے تھے۔
 کیونکہ واش روم سے فارہ کی ابکائیوں کی آواز سن آ رہی تھیں۔
 وہ باہر کمرے میں ہی ٹھکتے ہوئے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگیں۔
 کچھ دیر بعد وہ باہر نکلی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور رنگت ہیلی زرد ہو رہی تھی۔ شینہ بزوانی پک کے اس
 کے قریب آئیں اور اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"فارہ۔ میری بچی۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟" شینہ بزوانی اسے اپنے ساتھ
 لگائے بیڈ کے قریب آئیں اور بڑی احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ وہ نقاہت کی وجہ سے ہلکے ہلکے لرز رہی تھی۔
 "میرا۔ میرا۔ سر۔ چکر آ رہا ہے آئی۔" اس نے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

ڈونٹ دہری بیٹا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی ڈاکٹر سے ٹائم لیتی ہوں۔“
انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کسی ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کیا تھا اور فارہ کی اتنی بری حالت ہو چکی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں انکار نہیں کر سکتی تھی اور نہ اسے دنوں سے وہ آفاق کے ساتھ ایک ہی ضد لگائے بیٹھی تھی کہ نہ میڈیسن لینی ہے نہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اور آفاق تھا کہ فتنیں کر کے تھک گیا تھا۔ اس لیے آج مجبوراً ”فریاد لے کر ٹینہ بیروالی کے پاس پہنچ گیا تھا۔“



میں نعموستانہ

میں نعموستانہ

میں شوخنی رندانہ

میں تشنہ کہاں جاؤں

بی کر بھی کہاں جانا؟

عزت آج پھر بڑے مڑا میں تھی اور آج پھر اس کی گاڑی میں علیہ پروین قل والیوم سے گونج رہی تھی۔ اور اس تو از اور میوزک کی لپے عزت خود بھی ہمیشہ کی طرح جھوم رہی تھی۔

میں شمع فروزاں ہوں

میں آتش لرزاں ہوں

میں سوزش بھراں ہوں

میں سوزش بھراں

میں منہل پروانہ

میں نعموستانہ

میں شوخنی رندانہ

اس کی گاڑی میں یہ میوزک گھر کے پورچ میں داخل ہونے تک بجا رہا تھا اور گاڑی سے اترنے کے بعد وہ بیگ لے کر گنگنائی ہوئی اندر کی سمت بڑھی تھی۔

”بی بی جی! تیمور صاحب نے آپ کو اپنے بیڈ روم میں بلا دیا ہے۔“ ملازمہ نے عزت کو دیکھتے ہی اطلاع کی تھی۔ اور عزت کے بیڑھیاں چڑھتے قدم قدم گھم گئے تھے۔

”تیمور بھائی نے بلا دیا ہے۔؟ مگر کب۔؟“ اس نے تعجب سے ملازمہ کو دیکھا۔ کیونکہ وہ ابھی تو گھر میں داخل ہوئی تھی اور ابھی پیغام بھی آیا۔؟ حیرت ہی تو تھی۔

”کافی دیر سے کہہ رکھا ہے کہ آپ جیسے ہی گھر آئیں۔ ان سے ضرور مل لیں۔“ ملازمہ نے اس کی حیرانی دور کی تھی۔

”اوہ اچھا!“ عزت کے قدم سست بڑ گئے تھے اور وہ بیگ ملازمہ کے حوالے کر کے خود تیمور کے بیڈ روم کی طرف آگئی تھی اندر سے تھوڑی پریشانی بھی ہوئی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے کہ تیمور نے اتنی دیر سے اس کے لیے پیغام تھوڑا رکھا ہے۔

اس نے دروازے کے سامنے پہنچ کر آہستگی سے دروازہ پر دستک دی تھی۔
”آجاؤ۔“ تیمور جان گیا تھا کہ دروازے پہ کون ہے۔

”السلام علیکم بھائی۔“ عزت بڑے محتاط انداز سے اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”وعلیکم السلام۔“ تیمور بیڑ پہ بیڑ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا یقیناً ”کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا جب اسے
 دروازے کی دستک نے چونکایا تھا اور اب وہ عزت کی طرف متوجہ تھا۔
 ”آپ نے بلایا تھا بھائی۔؟“ عزت نے بلا تمہید پوچھ لیا۔
 ”ہاں۔ آؤ بیٹھو۔“ تیمور نے اسے قریبی صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
 اور عزت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی سوالیہ!

”تو پھر فیصلہ سنا لیا تم نے۔؟“ ماورا الاؤنچ کے صوفے پہ لیٹی بہت آرام سے اپنے موبائل پہ کوئی نیوڈیزائن کری
 ایٹ کر رہی تھی جب سبلی گل بھی وہیں آگئیں۔
 ”کیسا فیصلہ۔؟“ وہ اپنے دھیان میں مگن ان کی بات سمجھ نہیں پاتی تھی۔
 ”تمہاری شادی کا فیصلہ۔“ انہوں نے واضح کیا۔
 ”اوہ ہاں۔ بس یوں سمجھیں کہ ابھی تیلی جلائی ہی تھی کہ رضا حیدر نے پھونک مار دی۔“ ماورا کافی خنکی اور
 جینھلا ہٹ سے بولی تھی۔
 ”کیا مطلب سے تمہارا۔؟ کیا پھونک مار دی۔؟“ سبلی گل کے بھلا کیا سمجھ میں آسکتا تھا۔
 ”مطلب کہ ابھی فیصلہ سنانے ہی والی تھی کہ رضا حیدر کی کال آگئی اور بات ادھوری رہ گئی۔“ اس نے وجہ
 بتائی۔

”پھر۔؟“ انہوں نے مزید استفسار کیا۔
 ”پھر کیا۔ پھر وہ گھر چلا گیا۔ اور میں اپنے گھر آئی۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے
 ”اور آگے۔؟“ برجستہ سوال جاری تھے۔
 ”آگے کیا۔؟ وہ پوچھے گا۔ میں بتا دوں گی۔ بس بات ختم۔“ اس کی لاپرواہی کا وہی عالم تھا۔
 ”بات کیسے ختم ہو سکتی ہے بیٹا۔ پوری زندگی کا سوال ہے یہ فیصلے روز روز نہیں ہوتے۔“
 ”یہ پوری زندگی کا نہیں۔ میرے گہرے سوال جب سبلی گل۔ جس کے لیے میں یہ رسک لے رہی ہوں۔“ ماورا
 کے انداز میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔
 ”کبھی کبھی تیری ماں کی طرح سوچتی ہوں کہ تم یہ رسک نہ لو۔ مگر پھر جب تمہارے لیے یہ ترکا خیال آتا ہے تو چپ
 ہو جاتی ہوں۔ کہ چل ٹھیک ہے۔ اللہ کے بھروسے پہ تو یہ رسک لے ہی لے تو اچھا ہے۔“ سبلی گل بھی جیسے ڈانواں
 ڈول سی لگ رہی تھیں۔
 ”سبلی گل پلیز۔!“ ماورا بیزاری سے صوفے پہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور ان کی بات سنتی عافیہ بیگم دروازے سے ہی
 پلٹ کر سبلی گل تھیں۔

اپنے بیڑوم میں اپنے بیڑ پہ بیٹھی عزت کا چہرہ ادھواں ادھواں ہونا تھا۔
 اسے رضا حیدر کے رد عمل کا سن کر ہی اپنی آنکھوں کے سامنے مارے سے ناپتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور
 داغ ماؤف سا ہو رہا تھا۔
 ”لیکن اس سب کے باوجود تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تمہیں اور ولید کو کوئی بھی الگ نہیں

رہ سکتا۔ جیسے تم دونوں کی کورٹ میں جج بھی کروانی پڑی تو کروادوں گا۔ یوڈونٹ وری۔ ایڈ۔ بی کیئر قتل۔ ”تیور کی آواز اس کے کانوں میں ابھی تک جیسے سائیں سائیں کر رہی تھی۔!

ماورا بڑے دل سے تیار ہو کر نیچے آئی تھی۔
 نیچے پارکنگ میں تیور گاڑی سے نیک لگائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ماورا کو نیچے آتے دیکھ کر فوراً سیدھا ہو گیا
 تھا اور اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔
 ”انتالیٹ کروا۔“ وہ بڑی نرمی سے بولا۔
 ”بس تیار ہونے میں ٹائم لگ گیا۔“ ماورا عجلت سے کہتے ہوئے قریب آئی۔
 ”وہ تو نظر آ رہا ہے۔“ اس نے سر تاپا سے دیکھا۔
 ”اچھا۔؟“ وہ مسکرائی۔
 ”ہوں۔! اچھی لگ رہی ہیں۔“ تیور نے تعریف کی۔
 ”تھینکس۔! چلیں اب۔“ وہ گاڑی کی دوسری سائیڈ کی طرف مڑی اور تیور نے بھی مسکراتے ہوئے
 ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔
 ”کہاں جانا ہے اب۔؟“ روڈ پہ آتے ہی ماورا نے تیور کی طرف دیکھا۔
 ”کورٹ۔ اور کہاں۔“ تیور بڑا پرسکون اور خوش نظر آ رہا تھا۔
 ”اور بعد میں۔؟“ وہ کچھ جانتا چاہتی تھی۔
 ”جہاں تم کہو۔“ وہ مسکرایا۔
 ”اوکے۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔
 اور اگلے چند منٹ بعد وہ کورٹ میں موجود تھے گواہ بھی تھے اور وکیل بھی۔
 ”ماورا پلیز۔!“ تیور نے اسے پیر اور پین تھمایا۔
 ماورا نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر تیور کو دیکھا۔
 تیور بھی پیر ز اور پین لیے بیٹھا تھا ”ادھر تیور نے پراپرٹی کے پیریزپہ سائن کیے تھے اور ادھر ماورا نے نکاح
 نامے۔ دیکھا کر لے تھے۔
 ”مبارک ہو۔“ لوگوں نے انہیں مبارکباد دی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔
 ”آج سے سب کچھ تمہارا ہے۔“ تیور پرسکون تھا۔
 ”لیکن میں تمہاری نہیں ہوں۔“ ماورا کے چہرے کے تاثرات تسلیم نہیں تھے۔
 ”کیا مطلب۔؟“ تیور یکدم ٹھٹھکا اور ماورا نے اپنے بیگ سے ریوالور نکال لیا تھا۔
 ”مذہب کہ اب تیسرے قسم ہو چکا ہے۔ اب بس۔“ ماورا نے اس پر ریوالور تان لیا تھا۔
 ”تھر ماورا۔! تیور نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ماورا نے سننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور گونجا چلا دی تھی۔ جو سیدھی
 تیور کے سینے میں لگی تھی۔
 ”ماورا۔“ وہ زور سے چیخا۔

”تیور۔!“ ماورا انتہائی زور سے چیخ کر یکدم اپنے بستر سے اٹھ بیٹھی تھی اور ہاتھ مار کر سائیڈ ٹیبل کا ایسب چلا دیا
 تھا وہ سینے میں شرابور ہو رہی تھی اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا یوں جیسے سینے کے اندر کوئی بے رحم گھوڑا

﴿ماہنامہ شریعہ مارچ 2015ء 266﴾

دو ڈرا ہوں۔ اس کے ڈراؤ نے خواب نے اسے حقیقتاً دکھلا کے رکھ دیا تھا۔
 ”تیور۔؟“ اس نے خود کھامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا اور پھر سینے سے پیچھے اپنے چہرے کو چھو کر
 محسوس کیا تھا۔ قفل۔؟ تیور حیدر کا۔؟ م میرے ہاتھوں۔
 اس نے لیمپ کی روشنی میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیکھے تھے دل ابھی بھی دھک دھک کر رہا تھا۔

”مبارک ہو مسز یزدانی آپ دادی بننے والی ہیں۔ آپ کی دسویں رپورٹس آئی ہیں۔“
 ڈاکٹر نے فارہ کی رپورٹس چیک کرتے ہی شینہ یزدانی کو اندر بلایا تھا اور شینہ یزدانی کو تو پہلے ہی شک تھا اب تو
 ڈاکٹر کی طرف سے بھی تصدیق ہو گئی تھی۔
 ”خیر مبارک ڈاکٹر صاحبہ۔ خیر مبارک۔ میں بس ابھی آئی۔ پہلے اپنی ہو اور بیٹے کو یہ خوشخبری سنا دوں۔“ شینہ
 یزدانی سے ذرا سبر نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر مسکرا دی تھی۔
 ”اتفاق۔ اتفاق۔ اتفاق۔“ وہ در سے ہی انہیں پکارتی ہوئی روم میں داخل ہوئی تھیں۔
 ”جی می۔؟ خیر بہت۔؟“ اتفاق کھڑا ہو گیا بیڈ پر پڑی فارہ نے بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”مبارک ہو میری جلن۔ مبارک ہو۔ میں دادی بننے والی ہوں۔ فارہ کی رپورٹس آئی ہیں۔“
 شینہ یزدانی نے خوشی سے چپکنے ہوئے اتفاق کے دونوں بازو پکڑ کر مبارکباد کا اعلان کیا تھا۔ مگر دوسری طرف کا
 رد عمل وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔
 اتفاق کے چہرے پہ خوشی کے بجائے اک تاریک ساسا۔ لرا گیا تھا۔
 ”دادی بننے والی ہیں۔؟“

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول ہماری تھی	شریک سفر	کسی راستے کی تلاش میں	میرے خواب لوٹا دو
			
راحت جنجیل تبت 300/-	زہرہ منٹار تبت 550/-	میونہ خورشیدی تبت 350/-	عجبت عہد اللہ تبت 400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 ادوارہ کراچی
 فون نمبر 32735021

گزر گئی جو جن پر وہ کوئی کیا جلنے
پھڑے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے اٹلنے

جہاں پہ چاک گر جہاں بھی چاک بل بن جلنے
گزدہ ہے ہیں اب منسزوں سے دیلنے

میرے بیوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
مردل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جلنے

تیرے حضور جنہیں کہہ سکی نہ گویائی
میرے سکوت نے دہرا دیے وہ اٹلنے

تمام وسعت کو نین کو ڈبو دیں گے
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ نہ اعتبارِ جمال
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جلنے

نہ شمعِ بزم پہ کچھ آج آنے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے
اقبال صافی ہدی

کچھ دنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے جو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں

اس کی ہمراہی میں جو بھی وقت گزرا یادگار
دن بہت اچھے لگے راتیں بہت اچھی لگیں

وقتِ رخصت اس نے تھوڑے پھول لود کچھ پل دے
آنسوؤں سے ترے سوا قاتیں بہت اچھی لگیں

حالِ دل اس کو سنانا حوصلے کی بات تھی
حوصلے کی یہ کراماتیں بہت اچھی لگیں

شہرِ واپس جانے پایا وہ کہ رستے بند تھے
اس برسِ زند تار برساتیں بہت اچھی لگیں

بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں مداراتیں بہت اچھی لگیں

ہم بسا اِدِ عشق پر کب ہارے اس سے مگر
جان کر کھائی ہوئی باتیں بہت اچھی لگیں
علی عباس زیدی



زخم کب کا تھاددا اٹھا ہے اب
 اس کے جانے کا دکھ ہوا ہے اب
 میری آنکھوں میں خواب ہیں جس کے
 اس کی آنکھوں میں رت جگسا ہے اب
 کتنے موسم ہیں صرف اس کے لیے
 کتنے چہروں پہ وہ سجا ہے اب
 اُس حوالے سے زندگی میری
 گھنے جنگل کا سلسلہ ہے اب
 ایک دیوانہ اپنی وحشت میں
 بات کہنے کی کہہ گیا ہے اب
 تاہار مادل

خواب خواب آنکھوں میں
 اجنبی سا چہرہ تھا
 خواب بنتے بنتے ہی
 خواب کی مسافت میں
 دُور تک گئے ہم بھی
 آنکھ جب کھلی اپنی
 بیدار تپا پایا کہ
 خواب خواب ہوتا ہے
 سخت کی لکیروں کا
 خواب کے جزیروں سے
 واسطہ نہیں ہوتا
 اپنی پلکوں پہ ہر شب
 اک ہی خواب رکھنے سے
 خواب سچ نہیں ہوتا
 شہناز شیخ

شاگردوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ ”اے آرمین آرمین آرمین آرمین“

نازیہ سلطان۔ حیدر آباد

مختصر

صنعت کار: ”بیٹے! میری طرف سے تمام کارکنوں کو کپڑوں کے دو دو جوڑے بطور سزویوں کا تحفہ دینے کا اعلان کرو۔“

بیٹا: ”مہلکان کیل دو جوڑے تو انہیں دے دیے بھی چاہئے ہیں آپ تو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔“
صنعت کار: ”بے چارے اللہ بخش کا ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا تھا، میں نے کہا تھا کہ تمام عمر کے لیے اس کی تنخواہ دینے کے آرڈر جاری کیے جائیں اس کا کیا بیٹا؟“

بیٹا: ”یہ کلام ہو گیا تھا آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔“

صنعت کار: ”اور ہاں دیکھو! نذر کی بیوہ کے لیے نامہ وظیفہ جاری کرو، اللہ بخشے وہ بھی بہت محنتی کارکن تھا۔“

بیٹا: ”ٹھیک ہے ابو!“
صنعت کار: ”مجھے اگلے ہفتے یاد دلانا، محمد دین کو اس کی بیٹی کے جینز کے لیے پچاس ہزار روپے کا چیک دیتا ہے۔“

بیٹا: ”بہت اچھا ابو، مگر وہ بے چارہ انفلوینزا سے ہسپتال میں پڑا ہے۔“
صنعت کار: ”اسے اس کی تنخواہ تو مل رہی ہے نا؟“

بیٹا: ”جی ابو، مگر بے چارہ غریب آدمی ہے ہسپتال کا خرچ اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے۔“

مسکراہٹیں

نقوش کے بڑے بڑے طفیل نے ایک بار اپنے معاصر مرزا اویس کو اپنی ایک کتاب دی اور داد کے طالب ہوئے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ”تا سٹل اچھا ہے۔“
محمد طفیل اس خاموش طنز کو خاموشی سے لے گئے۔
کئی سال بعد مرزا اویس نے اپنی کتاب نقوش میں تبصروں کے لیے دی۔ محمد طفیل نے کسی رائے کا اظہار کیے بغیر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ مرزا صاحب نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ ”محمد طفیل صاحب! کیا خیال ہے کتاب پسند آئی؟“
محمد طفیل صاحب نے مسکرائے۔ ”اس کا تو تا سٹل بھی اچھا نہیں ہے۔“ یعنی عابد... کراچی

تحفظ

ایک لڑکی نے نجوی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔
”لی بی! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“ نجوی نے پوچھا۔
”یہ ہی پتھو اپنے مستقبل کے بارے میں۔“ لڑکی نے سرسری انداز میں کہا۔

”تمہارا مستقبل کافی حد تک محفوظ ہے۔“ نجوی نے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اپنے تانتوں کی لہائی تھوڑی اور برصا لو تو یہ مزید محفوظ ہو جائے گا۔“

حنا صبیح۔ راولپنڈی

سارے گناہ

استاد نے کلاس میں روزے کے فضائل پڑھاتے ہوئے سوال کیا۔
”ہاں تو بچو! وہ کون سی چیز ہے جس سے انسان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟“

صنعت کارنہ "کوئی بات نہیں اسے کہو کہ اسپتال کے سارے مل ہم لو اکریں گے" بیٹا۔ "ہو! آپ کتنے اچھے ہیں، لیکن میں ایک بات کہوں؟" صنعت کارنہ "کہو بیٹا کہو۔" بیٹا۔ "آپ اس قدر صدقہ زکوٰۃ خیرات دیتے ہیں، لیکن ان عموں سے جتنی مراعات آپ اپنے مزدوروں کو دے رہے ہیں اگر اس سے آدمی مراعات بھی آپ ان کی شرائط ملازمت میں شامل کر دیں تو اس سے ان کی عزت نفس مجروح ہونے سے بچ جائے۔" صنعت کارنہ "وہ تو نیک ہے بیٹا! مگر پھر ہمیں مختیر کون کے گا؟" شاہنہ عمران۔ مہجرات

رشیدہ حوال۔ کراچی

ضرورت

ڈاکٹرنہ "اگر میں تمہارا آپریشن کرنا ضروری سمجھوں تو کیا تمہارے پاس میری فیس کی رقم ہے؟" مریضنہ "فرض کیجئے کہ میرے پاس آپ کی فیس کی رقم نہیں ہے تو کیا آپ تب بھی میرا آپریشن کرنا ضروری سمجھیں گے؟" الماس خوب۔ ہزارہ

بہری

ایک عورت نے اپنے شوہر پر بارہ گولیاں چلائیں۔ مقدمے کے دوران جج نے پوچھا۔ "تازہ نے اتنی زیادہ گولیاں اپنے شوہر کے جسم میں کیوں اتاریں آخر؟" "ذرا صل۔ میری موکلہ اونچا سنتی ہے۔" ملزمہ کے وکیل نے دفاع کرتے ہوئے کہا۔ سعیدہ ہاشمی۔ رحیم یار خان

کام کے کانڈ

ایک انسان نگار نے اپنے ان پڑھ نوکر کو کانڈ جلاتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا۔ "ارے۔ کیس میں میرے کام کے کانڈ تو نہیں جلا دیے؟" نوکر نے جواب دیا۔ "حضور! میں اب اتنا بھی احمق نہیں۔ صرف لکھے ہوئے جلاتے ہیں۔ سلاوے کانڈ ویسے ہی چھوڑ دیے ہیں۔" نور فاطمہ۔ نواب شاہ

مشکلات

ایک شخص گھر لوٹا تو دیکھا اس کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد خاتون نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو احساس ہوا کہ کوئی پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو پیچھے اس کا شوہر مسکرا رہا تھا۔ خاتون نے جوالی مسکراہٹ سے شوہر کو دیکھا اور دعا مانگے بغیر ماہ نماز اٹھانے لگی۔ "تم نے دعا کیوں نہیں مانگی؟" شوہر نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"میں دعا مانگنے والی تھی کہ اللہ! میرے میاں کی مشکلات ختم کر دے۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ اگر یہ دعا قبول ہوگی تو میں مریاؤں کی۔" بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔

مہرین ظفر۔ ڈھری

حاضر و غای

ایک صاحب جوتے ہاتھ میں لیے دو بے پاؤں زینے پر سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ بستر پر لیٹنے ہی والے تھے کہ ان کی بیگم نے غنودگی میں پکارا۔

تذکرہ اولادِ صالح

پودے طود پرمانتے ہیں تو شیطان آپ پر قاب
ہیں کرتے گا۔
۱ اگر ماں باپ ان پڑھ ہیں اور بچہ پڑھا ہوا ہے
تو بھی ان کا حکم ماننا، اگر آپ کی خواہش کو ماں
باپ نے روند ڈالا ہے تو بھی ان کا کہنا ماننا

یہ کر کے دیکھو تو اس کے نتیجے میں بے شمار فضل
ہو جائیں گے۔
۲ اگر آپ کے ماں باپ نے آپ کی خواہش کو
روند ڈالا ہے تو بھی ان کا کہنا مانو۔
(واصف علی و اصف)
نخچہ اکرم - گاؤں گوہلی

معافی اور اخلاص

ایک قبیلے کا سردار طلوع تیس کے قبیلے کی طرف
جانکلا۔ اس قبیلے کا سردار مالک بن حوف تھا اس
نے طلوع کو نہ پہچانا۔ اس کی آؤ بھگت کی۔
جب طلوع اپنے قبیلے میں واپس آ گیا تو مالک کو
پتا چلا وہ کن تھا۔ اس نے ہوا اور اس نے طلوع کو خط
لکھا کہ

• میں بہت پشیمان ہوں اور اپنی غلطی پر معافی کا
طالب۔ میں نے آپ کو نہ پہچانا اور نہ خاطر تواضع میں
کو تاہم نہ ہوتی، اس نے جواب دیا۔
• معافی کی ضرورت نہیں لیکن تمہارا یہ کہنا کہ مجھے
پہچاننے پر میری خاطر تواضع کرتے۔ یہ بہت گری ہوئی
بات ہے۔ کوئی بھی جہان ہوا اس کی مہمان داری میں
کسر امتحان رکھتی چاہیے۔ اگر مہمان کوئی بزرگ یا عزیز
ہے تو یہ مہمان داری اس کا حق ہے۔ اگر مہمان کوئی اجنبی
یا معمولی شخص ہے تو اس کی خاطر تواضع کو واقعی مہمان داری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت خینہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں
نے فرمایا۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدد (پانی) سے
وضو اور ایک صاع (پانی) سے غسل کر لیا کرتے تھے۔
فوائد و مسائل -۱

۱- صاع پیمائش کا ایک پیمانہ ہے جس کی مقدار
کو گرام کے حساب سے دو کلو اور سو گرام اور بعض
کے نزدیک ڈھائی کلو ہے۔
مدد جو تھانی صاع کو کہتے ہیں اس کی مقدار پانچ
سو تیس گرام ہے۔

ماضع کے لیے صاع تقریباً دو لیٹر سے کچھ زیادہ
اور مداس سے جو تھانی سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی تقریباً
آدھا لیٹر۔

۲- اس کا یہ مطلب نہیں کہ غسل اور وضو کے لیے
اس سے کم یا زیادہ پانی جائز نہیں۔ مقصد محض ایک
اندازہ بیان کرنا ہے تاکہ بلاوجہ بہت زیادہ پانی
مضاع نہ کیا جائے بلکہ تصور ہے سے پانی کو اس طرح
استعمال کیا جائے کہ لہری معافی حاصل ہو جائے۔
(مسلم)

والدین کا احترام

۱ اگر ماں باپ کے پاس علم کم ہو پھر بھی ماں باپ
کا مرتبہ بڑا ہے۔
۲ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ آبا جہاں کا مدارج چل گیا ہے
تو وہ آدمی پامش ہو کے مرے گا۔ آپ کے مہمان باپ
قیامت تک آپ کے ماں باپ رہیں گے۔
چاہے آپ کچھ بھی بن جاؤ۔
۳ اگر باپ کے نالائق ہونے کے باوجود اس کا حکم

سمجھا جائے گا یا
توبہ رحمن۔ نعل

اچھے حکمران

فضیل بن یحیٰی کہتے ہیں۔
اگر میں سحاب الدعوات ہوتا تو اللہ سے دعا کرتا
یا اللہ! ہمیں اچھے حکمران نصیب فرما۔ اگر حکمران اچھے ہوں
تو شہر سرسبز و شاداب اور پُر رونق ہو جاتے ہیں۔
لیکن اگر حکمران برے ہوں تو وہ اپنی خیا توں اور
مقاہم کے ذریعے بستیاں آباد دیتے ہیں اور خزانے
خالی کر دیتے ہیں۔
صیغہ شریعت۔ لاہمد

تقصیر

ایک نوجوان تو بیابانہ جڑے کے گھر کے سامنے تھے
بڑی آگے۔ اس جڑے کی بیوی کی عادت تھی کہ وہ
ہر ایک پر تنقیدی نظر رکھتی تھی ماں کے ڈانٹنگ ہالہ سے
سلنے والوں کا گھر صاف نظر آتا تھا۔
ایک دن جب وہ دونوں ناشتے کی میز پر بیٹھے
ناشٹا کر رہے تھے تو بیوی نے دیکھا کہ سامنے والوں نے
کپڑے دھو کر باہر بالکونی میں پھیلانے ہوئے ہیں۔
یہ لوگ کتنے خراب اور گندے کپڑے دھوتے ہیں!
بیوی اپنے شوہر سے بولی۔ ان کو چاہیے کہ اپنا صاف
تبدیلی کریں۔ یا کم از کم کسی سے سیکھ لیں کہ کپڑے
کس طرح دھوئے جاتے ہیں!
شوہر نے نظریں اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا لیکن
خاموش رہا۔
ہر بار جب بھی ان کے بڑی اپنے کپڑے دھو کر
پھیلانے، وہ گھر اندر ان کے کپڑوں کی دھسلانی ہمیشہ
اس خاتون کی تنقید کا نشانہ بنتے رہتے۔
ایک دن وہ صاف کپڑے دیکھ کر حیران رہ گئی اور اپنے شوہر
سے بولی۔
دیکھا! بالآخر انہوں نے سیکھ ہی لیا کہ کپڑے کیسے
دھوئے جائے جاتے ہیں۔ ٹھکر ہے کہ آج ان کے کپڑے

صاف ہیں۔
شوہر نے اپنی بیوی کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔
"آج صبح میں جلدی آگے گیا تھا اور میں نے اپنے
ڈانٹنگ ہال کی وہ کھڑکی صاف کی ہے جہاں سے تم
سلنے والوں کو دیکھتی تھیں!"
بالکل ایسا ہی ہماری روزمرہ زندگی میں ہوتا ہے۔
خرابی ہمارے اندر ہوتی ہے اور ہم دوسروں کو مرد و عورتوں
شہر لیتے ہیں۔
غزوہ افسر۔ کراچی

عظم

جب اللہ تعالیٰ نے خلقت کو رزق تقسیم کیا تو عموں
مردوں کے حصے میں لکھا اور انہوں نے اسے ٹھکرے
کے ساتھ قبول کیا۔
(ابوالحسن خرقانی)
ہر شے کا عظم کھانا، عموں کے لیے باعثِ فضیلت
ہے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کے سبب سے نہ ہو۔
(حضرت جنید بغدادی)
جس کو اللہ تعالیٰ مقبول کرتا ہے، اس پر ظالم کو تسلط
کرتا ہے، جو اس کو سرخ دیتا ہے۔
(حضرت بایزید بسطامی)
لوگوں کو تین باتوں سے تم ملنا ہے۔ بیش از وقت
چاہتے ہیں۔ بیش از قسمت مانگتے ہیں اور دوسروں
کے مال کو چاہنا چاہتے ہیں۔
(آئینہ)
تمہاری شادمانی دراصل تمہارا عظم ہے، جسے نہ خراب
کر دیا گیا ہے۔
(ظہیر جبران)
جب تو کوئی عظم دیکھے تو استغفار کر۔ عظم خالق کے عظم سے
آتا ہے تو اپنے کام میں لگاؤ۔
عفدا، اقصیٰ تاہر۔ کراچی

زندگی

زندگی صرف خوف ہی نہیں زندگی ملن بھی ہے

فرمایا کہ میری فراست یہ کہتی ہے کہ یہ شخص نورانی ہے۔
 اور میری فراست یہ کہتی ہے کہ یہ شخص "بڑھی" ہے۔
 امام شافعی نے فرمایا۔
 یہ شخص جب نماز سے فارغ ہو گیا تو لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟
 اس نے بتایا: "سال گزشتہ تک تو میں بڑھی کا کاروبار کرتا تھا مگر اس سال میں نے "نوادری" کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔"
 حیرانہ نہیں۔ منہ کی بہا قالہ میں

سیکھنے کی بات

ایک قافلہ ایک اندھیری گلی سے گزرا۔ ان کے پاؤں میں کنگریاں بچھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ کسی اندھ کو بھی سمجھ سکتی ہیں، تنگی کی خاطر اٹھا کر حیب میں رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اندھ کو نے کم۔ جب اندھیرے سے باہر آئے اندھ دیکھا تو وہ ہرکے تھے۔ جنہوں نے اٹھائے وہ بچھتے کہ تم کیوں اٹھائے۔ جنہوں نے نہیں اٹھائے وہ بھی بچھتے۔ دنیا کی زندگی کی مثال اس اندھیرے کی ہے۔ نیکیاں کنگریوں کی طرح ہیں۔ اس زندگی میں جو بھی تنگی کرے گا وہ آخرت میں میرے جیسی ہوگی اور انسان ترے عا کہ زیادہ کیوں نہیں کی۔
 فوڈیہ ٹمبٹ۔ ہانیہ عمران۔ مگرات

وقت بھی مہرتا ہے

وقت پتا نہیں جان دار ہوتا ہے یا بے جان لیکن مر جاتا ہے۔ جیسے مزدے کو دوبارہ زور کرنا ناممکن ہے اسی طرح ہم لاکھ جاہیں تو بھی گزرنے والے کو پھر سے جی نہیں سکتے۔
 ہر لمحہ ایک ممکنہ زندگی ہے۔ لمحے کو جینا ہی دراصل زندگی جینا ہے۔
 نیلم ملک

زندگی صرف حاصل ہی نہیں ایسا بھی ہے۔ ہرن کا گوشت الگ حقیقت ہے چشم آہلا لگ تمام ہے زندگی کارخانوں کی آواز ہی نہیں لکھاس پرناز بھی ہے زندگی صرف میں ہی نہیں زندگی وہ بھی ہے۔ تو بھی ہے زندگی میں صرف مشینیں ہی نہیں، چہرے بھی ہیں۔ تھلائی نگاہیں بھی زندگی مادہ ہی نہیں روح بھی ہے اور سب سے بڑی بات زندگی طوہی معراج حجت بھی ہے۔
 (دل، دیا، سندھ۔ فاضل علی و اصف)
 فوڈیہ ٹمبٹ۔ مگرات

بڑے آدمی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر دیکھے جاتے ہیں عطا تو اس کے حق میں ہوتی ہے جو حق واد ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آستانہ کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے۔ اسے اپنے حیلے کی آزمائش اور بقدر کی ناگوار گزرتی ہے۔
 (مختار مسعود کی قسط الامال سے اقتباس)
 ناہید راشد۔ کراچی

حکیم لقمان نے کہا

میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا۔ مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لیے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔ کسی نے پوچھا۔
 "اگر یہ اثر نہ کہے تو؟"
 وہ مسکراتے اندھ بولے۔
 "دوا کی مقدار بڑھا دو۔"
 مددگار فہمید۔ کراچی

عالمانہ فراست

حضرت امام احمد بن حنبل اور حضرت امام شافعی دونوں جامع مسجد میں تھے کہ ناگہاں ایک اجنبی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت امام احمد بن حنبل نے



خدا کے کلمے ہیں میرے دل کا مٹلا

نخبہ اکرم _____ گاؤں کو بیگی
 جگر ہو جانے کا چلنی یہ آنکھیں خون دہریں کی
 وہی بے یقین لوگوں سے بھاگ کر کچھ نہیں منتا
 نمرہ اقرآ _____ کراچی
 بھڑا تھا جس عزور سے وہ بھی تو یاد کر
 آنکھوں میں تیری آج یہ آنسو فضول ہیں
 مائتہ عمران _____ ریاضی
 اپنی قاموشیوں میں ہنسنا بیٹھے
 لوگ باتوں کے درمیاں بیٹھے
 افتخار غلام _____ کراچی
 ہارے پاؤں اٹھتے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
 بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آتے
 سعید ہاشمی _____ کراچی
 زندگی تیرے تعاقب میں لوگ
 اتنا چھتے ہیں کہ مر جاتے ہیں
 اقرآن ملک _____ گوجرانوالہ
 میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
 ابھی تیرگی، ابھی روشنی، ابھی جلا ہوا، ابھی بجھا ہوا
 نادیہ مہرلی _____ لاہور
 پھر آج مسکرا کر انہوں نے کیا سلام
 پھر آگ ذرا سی آس پہ جینا بڑا عجیب
 نگہت ذوالفقار _____ کراچی
 بہت سوچا بہت سمجھا بہت ہی دیر تک پرکھا
 تنہا ہو کر جی لینا محبت سے تو بہتر ہے
 زینت پروین _____ کراچی
 کہاں لے جاؤں گا تجھ کو شب تاریک میں اسی وقت
 اُسے میرے دکھ: میں بے یں ہوں میرے پہلو میں ہی سوا

ثناستہ اکبر _____ گڈوالوٹی
 ہیری بزم دل تو اجڑ چکی میرا فرش جاں تو سمٹ چکا
 سبھی جانے کے مرے ہم نہیں مگر ایک شخص گیا نہیں
 ہاں بکراواں میرا بکراواں میں شکستہ باہوں تو اس لیے
 کہ قدم تو سب سے ملا لیے، مراد کسی سے ملا نہیں
 عطیہ شفیق _____ جڑانوالہ
 ہاں لٹی آیا مگر ابھی اور بڑے سے لٹی
 ہاں اہل ستم ستم کرنے رہیں گے
 ماریہ چھا نگیر _____ کیر والا
 اک نگاہ بر فیسی، ایک بل پھر سا
 آدمی نہیں مرنا صرف خون سے
 حیات بخش _____ کراچی
 خرمی کی بات نہیں ہے کوئی فسانے میں
 درد نہ خند نہ تھا آپ کو سنانے میں
 بہا بخش _____ کراچی
 اے شخص! میں تیری جستجو سے
 بے زار نہیں، خاک گیا ہوں
 شکیر نور _____ لاہوری
 نگاہ تیس سے دیکھو، ہمیشہ سن فیسی کو
 صنم جیسا بھی ہو، جس کا بھی ہوا بے مثال ہوتا ہے
 حیرا قریشی _____ لاہور
 چمکنا جو ہو جاتا ہے آگینہ و فاون کا
 گن کر بے یقینی کا جو آگ بارگ ہاتھ
 ذہنا یاب کنول _____ تیرنگ
 مناقتوں کا نصاب پڑھ کر محبتوں پہ کتاب لکھنا
 بہت کھنٹی بے خزاں کے ملتے پہ داستان تلاش کرنا
 انجیل _____ ڈوبرک
 ہم ذمہ داری اذیت کے ہیں گزرتا درسا فر
 پاؤں بھی ہیں مثلِ ذوق ہنر بھی نہیں جاتا



ہوں کہ اب وہ دور گزر گیا جب پاکستانی فلم میں بھاری بھر کم ہیروئنز کھیتوں میں ڈانس کے نام پر چھلانگیں لگاتی تھیں۔ (ماہ نور! آپ نے عمر وار ہیروئنز کا لفظ نہیں استعمال کیا... کیونکہ آپ بھی تو۔)

زندہ قوم

عافیہ صدیقی پر امریکی عدالت میں کوئی بھی جرم ثابت نہ ہو سکا اس کے باوجود انہیں چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔ فیصلے کے بعد کمرو عدالت میں ”سیم سیم“ کی صدا میں گونجنے لگیں ہماری حکومت کی بے بسی پر وہاں کسی نے کہا کہ ”شی ازواڈائر آف آؤڈر نیشن“ (یہ ایک مردہ قوم کی بیٹی ہے) لیکن اگر دیکھا جائے تو قوم مردہ نہیں ہے آج بھی عافیہ کے لیے آواز بلند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کراچی میں مزار قائد پر ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے مشتاق و شہد ہو کر اس کے لیے آواز اٹھائی۔ آٹھ فروری کو کراچی میں ہونے والا قومی جرگہ اس کی تازہ مثال ہے جس میں کراچی کے لوگوں کی کثیر



سنہری دور

ماہ نور بلوچ کہتی ہیں کہ ”میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی بحالی میں میرا بھی تھوڑا بہت حصہ ہے۔ (اب ”میں ہوں شاہد آفریدی“ اتنی بھی ہٹ نہیں ہوئی کہ آپ۔؟) ماہ نور نے مزید کہا کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا سنہری دور لوٹ آیا ہے۔ (ایک فلم سے ہی اتنی خوش فہمی... واہ جی واہ) اور میری فلم کو میری سوچ سے بھی زیادہ رسپانس ملا ہے۔ (آپ کی سوچ اتنی...؟) اب ہماری فلم انڈسٹری میں معیاری اور اچھی فلمیں بن رہی ہیں (کیا آپ ان میں کلم کر رہی ہیں اس لیے...؟) جبکہ ڈراما انڈسٹری میں بھی میرے کام کو سراہا گیا ہے (کام کو یا...؟)

انہوں نے فلم میں اپنے آئٹم سونگ کے متعلق کہا کہ اس پر بہت تنقید ہوئی لیکن میں سمجھتی



ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں ایک سے
بڑھ کر ایک سانحہ ہوا ہے۔ ذرا بتائیے! حمزہ علی عباسی
کس کس پر قلم بنائیں گے؟ ہونا تو یہ چاہیے کہ
دہشت گردی کی جڑ ختم کی جائے۔

احتیاط

”جرنل آف مائیکرو اسکوپک اینڈ الٹرا سٹریکچر“ میں
شائع ہونے والے ایک تحقیق کے مطابق وائی فائی
سگنلز بچوں کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ یہ سگنلز اس
حد تک نقصان دہ ہیں کہ حاملہ عورت بھی اس سے
محفوظ نہیں، تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ
پرگنٹنسی کے دور سے گزرنے والی مائیں اپنے ساتھ
موبائل فونز نہ رکھیں کیونکہ ان سے نکلنے والی شعاعیں
ان کے بچوں کے لیے زہر قاتل ہیں۔ بیوں کی نسبت
بچوں کے دماغ وائی فائی اور موبائل سے نکلنے والی
شعاعوں کو زیادہ جذب کرتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو
عموماً دو آؤں اور کیڑے کوڑے مارنے والی دو آؤں کے
اسیرے اور اسی طرح کی چیزوں سے تو بچاتے ہیں لیکن
موبائل فونز اور وائی فائی کے خطرے سے بھی بچانے
کی ضرورت ہے۔

کچھ بوہڑ اور ہر سے

ہم سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے بچوں کی یاد
میں اتنے تعزیتی اجتماع نہیں ہوئے جتنی زیادہ شخصیں
روشن کی گئیں۔ شہداء کے لیے دعا ہوتی ہے انہیں
خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے مسلمانوں کی تاریخ
میں ہمیشہ یہی ہوا ہے گمراہوں پر ماتم ہوتے ہی ہم سنا
لیکن گمراہ پر چراغیں کرتے بھی نہیں دیکھا۔ کئی سبائی
سول سوسائٹی نے سڑکوں پر اتنی سویم بتیاں روشن کی
ہیں کہ چراغوں کا سہل بندھ گیا۔
(عبداللہ طارق سہیل۔ نئی بات)



تعداؤں نے شرکت کی اس کے علاوہ ملک کے دوسروں
شہروں سے بھی لوگ اس میں شریک ہوئے جبکہ
وزیراعظم نواز شریف صاحب کا بھی فوزیہ صدیقی کے
پاس فون آیا اور انہوں نے عافیہ کے لیے ٹیک ٹمنٹوں
کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ لٹنڈ سے عافیہ کے لیے دعا کرتے
ہیں (اور امریکا سے؟)

تبدیلی

کہتے ہیں کہ ماں بننے کے بعد لڑکی میں بہت
تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن متیرا میں اتنی تبدیلی آئے گی
یہ شاید کسی کے تصور میں بھی نہ ہو۔ اب دیکھیں متیرا
کہتی ہیں کہ ماں بننے کے بعد انہیں اپنی ذمہ داریوں کا
احساس ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے متعدد
آفرز بولڈ شوٹس کی ٹھکرا دی ہیں اور اب وہ صرف
ماؤٹنگ اور ڈراموں میں کام کریں گی۔ ان کا جیون
ساتھی انہیں بہت بہار کرتا ہے اور وہ ان پر اعتماد بھی
کرتا ہے (متیرا اس اعتماد کو قائم رکھنا) متیرا نے مزید کہا
کہ ”شادی سے پہلے جو بولڈ شوٹس کروا دیے وہ میری
غلطی ہے اب میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور
ماں بننے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ میری بہت
بڑی غلطی تھی اور غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے
(دیکھا! متیرا کے منہ سے یہ باتیں۔ حیرت ہوئی یا؟)

دکھ

ہمارے ہاں ہر چیز ہر بات ہر سانحہ کو کیش کرنے کی
روایت سی بن گئی ہے۔ اب دیکھیں سانحہ آری
اسکول پشاور پر اداکار حمزہ علی عباسی نے ایک فلمی قلم
بنانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور ان دنوں وہ فلم
میں کام کرنے کے لیے معصوم بچوں کی تلاش میں
ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ٹی وی پروڈیو سراس سامنے
پر ڈرامے بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس سانحہ کی
اہمیت لوگوں کے دلوں میں کم نہ ہو جائے اس لیے ملی
ظفر نے بھی ایک گانا بنایا جس میں ان کے ساتھ ساتھ
بہت سارے آرٹسٹ شریک ہوئے یہ سب تو ٹھیک

پہلی بارش

مصنف: خولید ایما ڈولیس
تحریر: اجمل کمال

بیانیہ ہے، بلکہ اجتماعی اہمیت کے مسائل کا بھی موثر اظہار ہے۔

”ایٹالی“ کا الیہ ایک ایسے گاؤں کا الیہ تھا جسے اس کے مکینوں نے بہتر زندگی کے انتخاب کا حق استعمال کرتے ہوئے الوداع کہنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ گاؤں میں خالی مکانوں اور ان گھروں کی وحشت زدہ فضا میں محض وہ نفوس بچ رہے جن کے لیے یہ انتخاب ناقابلِ قبول تھا۔ گاؤں نہ چھوڑنے کا فیصلہ ان کی زندگی کو بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تھالی و وحشت اور ویرانی عطا کرنے والا تھا۔

”حقیقت یہ ہے کہ ایٹالی گاؤں کے دیوار و پار زندہ رکھنے کی میری تمام کوششوں کے باوجود یہ کبھی کامرکجا ہے۔ یہ اسی وقت مر گیا تھا جب بیٹا اور میں یہاں اکیلے رہ گئے تھے، بلکہ ہمارے آخری پڑوسیوں کی موت یا نقل مکانی سے بھی پہلے۔“

ماضی سے خوف اور مستقبل سے امیدیں وابستہ ہوا کرتے ہیں۔ مگر ایک ستم شدہ امکان اور ڈھمے جانے والی امید کے ساتھ زندگی کو بسر کرنا؟

”میں نے ایٹالی کے زوال کے سبب رفتار متواتر عمل کو ایک ایک جان کر کے چیا ہے۔ میں نے مکانوں کو ایک ایک کر کے شکستہ ہوتے دیکھا ہے اور اس عمل کا راستہ روکنے اور اپنے مکان کو اپنا مقبوضہ بننے سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان تمام برسوں میں۔ میں بے بسی سے پاس کھڑے ہو کر اس طویل سفاک جان کنی کی لذت کو دیکھتا رہا ہوں اور اب جب میں خود موت اور فراموشی کی گھر پر کھڑا ہوں۔ میرے کانوں میں جو آواز گونج رہی ہے وہ کالی کی تہ کے نیچے دے

جاننے کو حق جاننے کے لیے جاننے کی جستجو پہلا مرحلہ ہے۔ نفع انتخاب اور معیار کے مدارج طے کرنے کے بعد حاصل ہونے والا لطف ذہن کو پرکھ کی صلاحیت اور فہم کو نئے جہان کا عطا ہونا اس کا مرہبہ شل ہے۔

الیہ ہر دور میں زندگی کی ایسی حقیقت رہا ہے جس کو تسلیم نہ کرنے سے اس کی حقیقت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ماسوائے اس کے کہ آپ اسے فراموش کر دیتے۔
زندگی کی کمانی کا انجام موت کے بغیر ناممکن ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا سامنا ہم کرنا نہیں چاہتے مگر ہمیں کرنا پڑتا ہے۔

الیہ جدائی سے عبارت ہے اور اس کے ظہور کے بھی اتنے ہی امکان موجود ہیں جتنے زندگی کے۔ بعض ایسے قدرت کے کلم کا شاہکار ہوتے ہیں اور بعض انسان کے فیصلوں کا نتیجہ جو بھی جیسے بھی۔ الیہ روزانہ سے انسانی رویے کے ارتقا اور بقا کا امتحان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

ایک لکھنے والا اگر تحریر کے طلسماتی کرشمے جیسا ہنر رکھتا ہے تو موضوعات کا انتخاب اس کی ہنر آزمائی کا منفرد اظہار بن جاتا ہے۔ زندگی سے بھرپور چمکتے رنگوں اور چروں ڈوبتے ابھرتے رنگوں کے بجائے تھالی خاموشی اور ویرانی میں گھرے ایک اکیلے شخص کی خود کلامی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔ اپنی نوع کا منفرد انتخاب ثابت ہوتا ہے۔

ہسپانوی زبان کا شاہکار ناول ”پہلی بارش“ ایک ایسے ایسے کی روداد ہے جو نہ صرف انفرادی تاثرات کا

پتھروں کی چیخوں اور گل مز کر مٹنے ہوئے لکڑی کے شہتیروں اور وردانوں کی شتم نہ ہونے والی سکیوں کی آواز ہے۔"

یہ ناقابل یقین واقعہ ایٹلی کے ساتھ ساتھ اگلے شخص کا بھی ایسہ تھا۔ امکان سے باہر کی چیز ہمارے لیے ہمیشہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ مگر دنیا ہی نہیں امکان کا دائرہ بھی ہمتاوی وسیع ہے۔

دائرے کی دنیا میں دوسرے زونوں پر موجود زندگی بھی انسانی وجود سے عبارت ہے۔ وہ انسان اپنی وضع قطع، بول چال، رہن سہن اور عادت و اطوار میں ہم سے مختلف کسی مگر بنیادی جبلت اور جذبات میں یکساں شراکت رکھتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ ہمیں ان کے مسائل اور آگ اور فوق اظہار کے فہم تک رسائی کا موقع تو دیتا ہی ہے۔ اس فہم کے آئینے میں اپنے عکس کو دھوونڈنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ ترجمہ نگار اجمل کمال کا کہنا ہے کہ۔

"دنیا جہان کے ادبوں کی تحریروں سے آشنا ہونا۔ اس آشنائی کے لطف میں اوروں کو شریک کرنا، ان کا ترجمہ کرنا، ان کی تحریروں سے حاصل کی ہوئی روشنی میں اپنے زمانے اپنے خطے اور اپنی زبان کے لوہ کو برکھنا اور اس کے مقام اور اس کی سمت کا کھوج لگانے کی کوشش کرنا یہ سب پڑھنے ہی کے عمل کا حصہ ہے اور اسی کے باعث لکھنے والے نئے نئے مطالعوں کا سامنا کرتے ہیں۔"

کسانی غیر معمولی اور چونکا دینے والے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً یہ آغاز باطنی کی کسی بھی روایت سے ہوتا ہے، چاہے کتنا ہی پر تجسس کیوں نہ ہو۔ مگر معدوم ہونے ایٹلی کے آخری دم توڑتے باشندے کے اس خود کلامی اور خود ساختہ صورت گیری کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

"دور اس ڈھلان پر جو ان کی نظموں کے سامنے ہوگی۔ ایٹلی گاؤں کے مکانوں کی چھتیں اور درخت چٹانوں اور پیش والوں کے درمیان سے بمشکل دکھائی

دیتے ہوئے اب رات کے ابتدائی سايوں میں تھلنے لگے ہوں گے وہ سائے جو یہاں ہمیشہ بہت لمبے پہنچ جاتے ہیں۔ جوں ہی سورج مغرب میں ڈوبنے کو ہوتا ہے۔ کھڑکیوں اور سنگی چھتوں پر سورج کی پچی پچی شعاعیں کہیں کہیں روشنی کے اکاؤ کا قطعہ بنا رہی ہوں گی۔ اس کے سوا ہر طرف مکمل سکوت اور سناٹا چھایا ہوا ہو گا۔ نہ کوئی آواز نہ دھوئیں کا کوئی مرغولہ نہ کسی گلی میں کسی انسانی وجود کا سایہ۔"

ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے۔ قاتل بیان ہوتی ہے۔ مگر ویرانی معدوم شدہ امید اور خود فریبی سے بھرے ہوئے تمناؤں، بھوک اور یادداشت کے دھوکے جھیلنے شخص کے احساس کو ہر زونوں سے پیش کرنا اپنی نوع میں ندرت بیان کا انوکھا نمونہ ہے۔ محرر اپنے لکھنے والے کے احساس کی اقلہ گہرائی میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔ تب ہی اپنے پڑھنے والے کے فہم پر مہرانی سے دستک دیتی ہے۔

اس محرر کو پڑھنے کے تجربے سے گزرنے کے بعد ہی مجھ پر یہ واہوا کہ کالی کچھڑ رنگ اور سلین بھی وجود رکھتے ہیں اور ان کا حلوی ہو جانا کس طرح آبادی کو بہاوی میں بدل دیتا ہے۔ کپورہ چکی ہستی کو رفتہ رفتہ ویرانی میں ڈھلتے دیکھنا اس عمل کو روکنے کی ناکام مگر کوشش کرتے رہنا۔

"جب تک گاؤں اور کولیو ایٹلی میں رہے تب تک ہم شیوں گاؤں کو بے توجہی کا شکار ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہم سب مل کر آبپاشی کی ٹالیوں کو صاف کرتے دیواروں اور آبی جنگوں کی مرمت کرتے، بلکہ کبھی کبھی تو ایسے مکانوں میں جو گرنے کے قریب ہوتے شہتیروں کو مضبوط کرنے یا دیواروں کے رخنے بھرنے کا بھی کام کرتے۔"

ایٹلی کے اس آخری باشندے کی تمام تر گفتگو اور تذکروں کا مخاطب قاری ہے۔ مگر اس سارے تذکرے میں ہمیں اس کا نام معلوم نہیں ہوا۔ تاہم یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائے کو بیان عطا کرنے

والے قلم اس ایک شخص کو نامور بنا بھول گیا ہو؟
کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فراموش ہونے والی
حقیقت کا کوئی ٹیم نہیں ہوتا؟ دھیرے دھیرے
دوستوں، ہمسایوں اور آخر کار شریک حیات کی دائمی
جدائی کے وار مہمہ کر اس نے خود کو تقدیر کے رحم و
کرم پر چھوڑ دیا۔

”پنچھینا والا واقعہ پیش آیا اور پھر پورا گاؤں۔ جیسے
میرے تخیل کے باہر اس کا وجود ہی نہ ہو۔ زنگ اور
بے توجہی کے شدید سفاک حملے کی زد میں آ گیا۔ سب
لوگ ’میری یہی سمیت مجھے چھوڑ گئے تھے‘ ایٹائی مر
رہا تھا اور میں اس عمل کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہ
کر سکتا تھا اور اس خاموشی کے عین وسط میں ’میں اور
کتنا‘ دو اجنبی سایوں کی طرح ایک دوسرے کو دھکتے
رہتے تھے۔ حالانکہ ہم دونوں کو اچھی طرح معلوم تھا
کہ ہم میں سے کسی کے پاس وہ حجاب نہیں ہے جس
کی ہمیں تلاش ہے۔“

”میں اس تقدیر کے رحم و کرم پر تھا جو زنگ اور دائی
نے میرے لیے مقرر کر رکھی تھی۔“

لیکن کیا یہ واقعی تقدیر ہوتی ہے جو ہمیشہ آدمی پر
سلطہ ہو جاتی ہے؟ یا کچھ کچھ انسان خود بھی اس کا
شریک کار ہو جاتا ہے؟ سیدھی سی بات جو ہم سوچ
سکتے ہیں وہ یہ کہ جسے جو راستہ سب نے اپنایا۔ وہ کیوں
اختیار نہ کیا گیا؟ لیکن ہم میدانوں کے رہنے والے
سیدھے اور ہموار راستوں کے عادی سہولت کو آسانی
سے اختیار کر لینے کے عادی لوگ ہیں۔ شاید ہماڑوں
پر بسنے والے لوگ ہم سے مختلف زندگی کا تجربہ کرتے
ہوں۔ اگر ایسی غیر معمولی وابستگی رکھنے والے لوگ
ناپید ہو جائیں تو غیر معمولی کمائیں کس طرح جنم لیں
گی؟ پھر سوال کس طرح پیدا ہوں گے اگر۔ کیوں۔
یہ کیسے ممکن ہے۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ کا کلیہ دہرایا جانا ممکن ہے۔
مگر کچھ اور ممکنات کو اسی دنیا اسی خطے اسی تقدیر سے
واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہمارے علم میں نہ آتا ہماری بے

خبری ہو سکتی ہے۔ ان کے نہ ہونے کی توجیہ ہرگز
نہیں۔

پہنانے وحشت ویرانی اور اپنے بچوں سے جدائی
کے غم میں سپرد ڈالتے ہوئے خود کشی کر لی۔ چار سالہ
سارہ نے سانس کے عارضے سے مر کر نجات پائی اور
آندر ریاس نے بھی گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح
خیر یاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آندر ریاس کا جانا صرف ایک بیٹے کا رخصت ہونا
نہ تھا، بلکہ اس گھر کے قائم رہنے کے آخری امکان بلور
ہمارے بڑھاپے میں۔ جو اب خوف ناک حد تک
قرب آ پہنچا تھا۔ مدد اور رفاقت کی آخری امید کا
رخصت ہونا تھا۔“

میں۔ باب کا بڑھاپا اور بیٹوں کا سہارا۔ کچھ
حقیقی خصلوں کی قید سے بلورا ہوتی ہیں۔ اور اسی
لیے وہ انسانوں کو جذبات کی قدر مشترک کے رشتے میں
ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔
”موت کی نشانیاں محسوس صورت رکھتی ہیں۔“

قبر اس پر بولے ہوئے لفظ یاد کے چہرے کو تازہ
کرنے والے پھول اور سب سے بڑھ کر موت کے
حتمی بن کا مطلق شعور جو وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ ماٹرس ہوتا جاتا ہے اور جانے والے شخص کی
عدم موجودگی جانی پہچانی علوتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔
لیکن کسی شخص کا شعور الجبر ہو جانا ایسی چیز ہے جس کی
حدیں نہیں ہوتیں۔ یہ کسی کی محسوس حالت کا بالکل
الٹ ہوتا ہے۔“

معلوم ہوا کہ دو سر ایٹا کا میلو خانہ جنگی کے دوران
لاپتا ہو چکا تھا اور جس کی موت کی تصدیق بھی نہ ہو سکی
تھی۔ کیا یہ بھی ایک ایسی حقیقت نہیں جو دنیا میں بہت
سے لوگوں کو کسی نہ کسی صورت جھمیلی پڑتی ہے کہ ان
کے بارے ”لاپتا“ قرار دے دیے جاتے ہیں۔ اور
پہانچنے والے التجائیں کرتے رہ جاتے ہیں کہ اور کچھ
نہیں تو قبر کا پتہ ہی مل جائے۔

آدمی کے لیے آدمی سے زیادہ خوف ناک کوئی اور

شے نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جب وہ دوسرا آدمی وہ خود ہو۔

ویسے آپ کا کیا خیال ہے؟ خود کلامی تہائی کی انتہا پر ہی پیش آتی ہے۔ وہ تہائی چاہے حقیقی ہو یا محض ذہنی۔ ہوتی بہرحال تہائی ہے جس کا فطری رد عمل خود سے باتوں اور خود فریبی پر مشتمل تصنیفی منظر کی صورت گری میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنے آپ کو قرار دے جانے کے خدشے کے باوجود دوسرا ہٹ کے احسان اور سہارے کا متلاشی و طلب گار رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان کو مصیبتوں کے چناؤ پر مکمل اختیار ہے، لیکن پھر بھی کبھی کبھی مصیبتیں ایسا کر لیتی ہیں۔ (کیا وہ ایسا نہیں کرتیں؟) تو سب کچھ تقدیر کا کیا دھرا قرار دینا انسانوں کے لیے فراموشی اور فراری کا ایک راستہ بن جاتا ہے۔

”بیٹا کی موت کے بعد یادداشت ہی میرے زندہ رہنے کا واحد جواز تھی اور میری زندگی کا تمام حشر اس پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ان تمام برسوں کے دوران وہ میں نہ تھا جو آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ یا آگ کے کسی تہا آوارہ کتے کی طرح گاؤں بھر میں بھٹکتا پھرا۔ وہ میں نہ تھا جو اس بستر میں داخل ہو کر خاموشی میں لپٹ جاتا اور صبح تک بارش کی آواز سنا کر آتا تھا۔ ان تمام برسوں میں یہ میرا حافظہ تھا جو گاؤں بھر میں بھٹکتا پھرتا اور اب جب آخری رات آپہنچی ہے جب وقت ختم ہونے کو ہے اور میرا حافظہ آخر کار یوں پھل رہا ہے جیسے لمبے جاڑے کے بعد زمین سورج کی حدت پا کر پھلنے لگتی ہے۔“

ایٹلی کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک ایسی موت کو قریب سے دیکھنا پڑے گا جس کا شکار ہونے والے پر قریب ہوتی اس کی چلپت سے آگاہی کاغذ اب بھی مسلط ہے۔

”موت اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور کیلیہ کردار بہت مانوس ہونے کے باوجود فراموش شدہ نہیں؟ ہر تحریر اپنے بڑھنے والے کو پیش کرنا خیال سے رائے

اخذ کر کے نتیجے تک پہنچنے کا فطری تقاضا کہتی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو بطور قاری حوصلہ ہارے بغیر یہ سفر یہ تقاضا پورا کرتے ہیں؟“

بطور قاری کسی بھی نئی اور اجنبی چیز کو سمجھنے میں مشکل پیش آنا غیر قدرتی نہیں ہے بلکہ بعض چیزوں کو سمجھنے کے لیے بار بار پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب کا حجم اور قیمت دونوں ہی مختصر ہیں مگر اس میں موجود بے رحم حقیقتوں کی صورت گری اس لائق ہے کہ اسے شاہ کار قرار دیا جائے۔

”جاڑے کی موت“ کی ترکیب سن کر دل میں ایک ایسی محاسنت کا تاثر ابھرتا ہے جو محمد اور مغلوب کر دینے والی یکسانیت سے بے زاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

”ہم سب سمجھتے ہیں کہ موت کے خیال کا خوف کے بغیر سامنا نہیں کر سکیں گے کم عمری میں یہ خیال اس قدر دور کی بات معلوم ہوتا ہے وقت میں اتنے زیادہ فاصلے پر کہ یہ فاصلہ ہی اسے ہمارے لیے ناقابل قبول بنا دیتا ہے۔ پھر جوں جوں سال گزرتے جاتے ہیں اس کا بالکل الٹ۔ یعنی موت کا قریب ہمیں

خوف میں جتا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ دونوں صورتوں میں خوف یکساں رہتا ہے۔ معصوم ہو جانے کا خوف، فراموشی کے لاساں، بے انصاف سروہن کا خوف۔“

اس رد و اوش آپ کہاں کہاں چوکتے ہیں۔ حریر کی گرفت پر یا پیش آنے والے کسی واقعے کی خوف ناکی پر۔ یہ گہنا مشکل ہے۔ مگر حیرت مندے دکھ اور خوف کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑھنے والا کہہ اٹھتا ہے کہ یہ کیسے کردار ہیں۔ جو زندہ نہیں مگر زندہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

”چانک وہ درد لوٹ آیا ہے تیز دھار دم گھونٹ دینے والا درد۔ جیسے سانپوں کے گروہ نے میرے ہاتھوں میں اپنا مسکن بنا لیا ہو۔ یہ درد چند لمحوں

یہ وہی پہلی بارش ہے جو ہر خزاں میں برتی ہے۔ وہی بارش جو مکالموں اور قصوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جو آویسوں پر بھلایا لے آتی ہے۔ جو زراؤرا کر کے ان کے چہروں اور ان کے خطوں اور تصویروں کو ختم کرتی جاتی ہے۔

ایٹالی کے موسم اور مقدر پر خزاں ٹھہری ہوئی تھی۔ کرتے ہوئے مرہ پتوں نے سارے کو پیلے رنگ سے ڈھک دیا۔

خزاں۔ زوال کی علامت، درختوں کو پھر سے حیات مننا ممکن ہے اور عین امید کی علامت۔ تمہیں انسانی زندگی سے جھڑتے گھوٹوں پر بہا پلٹ کر نہیں آتی۔

معدوم ہوتے لحوں کی داستان سننے سنتے ہم یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ ایٹالی کی بریلوی، آباد رہنے کے بعد کا واقعہ تھی۔ یہ کسی طوفان، کسی آفت کے ملینیمٹ کر دینے جیسا عمل نہیں تھا۔ حرکت اور چہل پہل سے بھرپور زندگی کا جو افراد کے مریوں منت ہوئی ہے، لوگوں کی موجودگی کے احساس سے کسی ہوتے جانا ایک ست رفتار عمل تھا۔

آخر تک کر دینا ہے تو جی اور فراموشی ایٹالی کی بریلوی کے سبب تھے تو پھر ہمارے پاس بھی نئی ایٹالی موجود ہیں۔ لیکن کیا ہمارے ایٹالی کا دکھ لفظوں میں پرونے کے لیے ہمارے پاس "مخولویا یازار بس" بھی ہے؟

اور ہمارے ارد گرد، بہت قریب بھی ہو سکتا ہے ایک دل۔ ایٹالی بن چکا ہو۔ بے ارادگی اور ڈھے جانے والی امید کے ساتھ۔ آپ کی بے توجہی اور فراموشی کا شکار تو پھر کیا آپ کو اس کی خبر ہے؟



تک میرے ہسٹریوں کی ریواریوں کو کسی کتے کی طرح اپنے بچوں سے کھڑا رہتا ہے۔ پھر آہستہ بہت آہستہ دور ہونے لگتا ہے اور اپنے پیچھے میرے سینے میں سرد چمک دار دھوپ چھوڑ جاتا ہے۔

چھت اور چاند۔ کھڑکی اور ہوائے میرے مرنے کے بعد ان سب کا کیا پاتی رہ جائے گا؟ اور اگر یہ بریلوی سے آنے والے لوگوں کے میری تلاش میں آنے، مجھے پالینے اور میری آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے سے پہلے ہی میں مرجھا ہوا تو یہ سب چیزیں کس کی آنکھوں میں زندہ رہیں گی؟

موت ایک ایسا تجربہ ہے جس میں انسان دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا۔ ناگزیریت کو ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں، مگر اور ایسی کلمات میں اپنوں کی موجودگی فطری سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر کسی بھی موجودگی کے احساس کے بغیر، جو کچھ برہمچالے اور لاچارگی کے ہاتھوں جان دیتے ہوئے ایک شخص کے لیے یہ مشکل لمحہ، مشکل کی بدترین صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے میں انسانی ذہن، قریب نظر کے کرشمے دکھاتا ہے کہ اسے وہ سب اپنے پاس تے اور جاتے دکھائی دینے لگتے ہیں جو کبھی کے اس مشکل سے گزر

چکے ہوتے ہیں۔ مگر قریب تو زندگی سے مشروط ہیں تا۔ اہل انجام کے وقت ان کا کیا کام؟ تو کیا پھر اس وقت ابدی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے انسان کی حیات پر غیر معمولی خیال وارد ہوتے ہیں؟

"آپ جبکہ میری زندگی ختم ہونے کے قریب ہے اور کھڑکی کے باہر ہونے والی پہلی بارش موت کی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔"

آخری ابواب۔ معدوم ہوتی دھڑکن اور بند ہوتی آنکھوں کی ٹھکن۔

"پہلی بارش منظر پر عتاب ہے۔"

"وقت بہت سست روی سے گزر رہا ہے اور پہلی بارش رفتہ رفتہ ہسکوس کے مکان کی چھت کے سامنے اور چاند کے لامحدود دائرے کو مٹاتی جا رہی ہے۔"

شعاع کے ساتھ

ادارہ

حنا کنول بیگ۔۔۔ سیالکوٹ

بابا!۔۔۔ تو پھر ہو سنی نامیری فرینڈز کے "اعلیٰ فوق" کی عکاسی۔ یہ واقعہ بہت یادگار ہے جب بھی یہ سلسلہ پڑھتی ہوں بیٹے دنوں کی خوب صورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔
(2) تمام دن کی مصروفیت۔۔۔ دن کے آغاز سے لے کر سونے اچھلنے تک کا احوال کچھ یوں ہے کہ صبح نماز

فجر کے بعد بزار کو شش کے باوجود بھی خود کو سونے سے روک نہیں پاتی۔ سات بجے تک اٹھ کر بینک جانے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ تمام دن بینک میں مصروفیت کی نذر ہو جاتا ہے۔ بینک میں چل ہی میں تعیناتی ہوئی ہے چونکہ نئی ہوں اس لیے سیکھنے کے مراحل سے گزر رہی ہوں۔ ایم اے آکٹاکس بھی جاری ہے۔ بینک پڑھائی اور ہماری جاں نثروں۔ اس قدر مصروفیت ہے کہ خود کو میسر نہیں ہوں میں۔ مغرب تک واپسی ہوتی ہے۔ رات کا کھانا کھایا، کپڑے منج جانے کے لیے تیار کیے اور بس دن تمام لیکن شعاع کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

(3) میرے نزدیک مشکل ترین سوال ہے اپنی خوبیاں اور خامیاں بتانا۔ سب سے پہلے خامیوں پر اگ نظر ہے حد حساس اور بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہوں۔ خوبیاں۔۔۔ میں کسی سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتی۔ کسی کو دھی نہیں دیکھ سکتی۔ غصے میں بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے جس سے ناراض ہوتی ہوں یا جس پر غصہ ہوتا ہے وہی انجان بے خبر ہوتا ہے اور پھر میرا غصہ عورت پر بنا پونپنا ہے۔

(1) شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ ہوا؟ یہ وابستگی کیسے اور کب ہوئی؟ یہ مجھے خود علم نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے شعاع سے اپنا تعلق بہت پرانا ہے۔ شعور آگئی کے سب راز ہم کو شعاع نے سکھائے۔ اکثر ہوا اندر کسی کام سے گئے اور وہاں شعاع دیکھا تو بس۔ وہاں کے ہو رہے۔ میری دلچسپی صرف شعاع تک محدود نہیں رہی۔ گرنہ "خواتین ڈائجسٹ" سب سے اپنائیت ہے۔ گھر وانوں نے ہمیشہ ہی سے اس شوق کی حوصلہ افزائی کی۔

شعاع سے متعلق دلچسپ واقعہ۔۔۔ چونکہ تعابیر شاعرے کے لیے کچھ عرصہ باشل میں گزارا جو کہ بے حد خوب صورت دور تھا۔ باشل میں ہم (میری) جوئیئر فرینڈز نے ایک روز مشاعرہ کرنے کا منصوبہ بنایا میں نے تیاری کے لیے شعاع کے مقبول سلیسے "شاعری صحیح بولتی ہے" سے مدد لی۔ مشاعرہ رات کو ہونا تھا۔ میں نے اپنی دو مہتممیں اور فرینڈز کو مشاعرہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے میں وجہ بتانا بھول گئی وہ "بازوق" تھیں۔ وہ شاعری کو جذبات و احساسات کی مشکل ترین زبان قرار دیتی تھیں۔ حسب معمول جب میں مشاعرہ کر کے واپس آئی تو میری سب فرینڈز ناراض تھیں۔ میں نے ان کو منانے کے لیے ہنسنے چنے (جو جوئیئر فرینڈ مفور نے مجھے تھما دیے تھے) دیے۔ انہوں نے شان بے نیازی سے فوراً "قبول کر لیتے اور اب ملاحظہ فرمائیے میری فرینڈ عروج کے ارشادات۔" آپ یہ پنے مشاعرہ میں اس لیے کہتی ہیں تاکہ اس سے دور بھرے اشعار آتے ہیں۔

ہتا ہتا ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
 جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
 سب دوستوں میں کیرنگ مشہور ہوں۔ فریڈز
 فیملی کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ ہر کسی کی برتھ ڈے یاد
 رہتی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو میں ہر کسی سے رابطے
 میں رہتی ہوں۔

تعمری جملہ۔ اپنی یادداشت اور جنرل تاج و سبج
 ہونے کی بنا پر عروج اور ماریہ کا یہ کہنا۔
 ”آہی! آپ سی ایس ایس ضرور کریں“ آسانی سے
 کلیئر کر لیں گی۔“

اپنی لائق اور قابل تو نہیں لیکن ہاں ذہین ہوں
 لیکن ان کا اس انداز میں سراہنا بہت اچھا لگتا تھا۔
 سرعامر کا کہنا ”آپ کی قوت مشاہدہ بہت اچھی
 ہے۔“

نمائے کانو کیشن ڈے پر گولڈ میڈل ملنے پر ستائش
 بھرے انداز میں کہا تھا۔
 ”میری جتا! تم نے آج میرے سب خواب پورے
 کر دیے۔“ آج بھی میوں خون بہا رہتا ہے۔

ہاسٹل آئی عصمت کے بارے میں سنڈے
 میگزین میں میرا آرٹیکل ”اک رشتہ اک کہانی“ شائع
 ہونے پر آئی کی بی بی تہمت لیا کا گلوگیر آواز میں کہنا۔
 ”جتا! تم نے بی بی ہونے کا حق ادا کر دیا“ اک غیر ہو کر
 تم نے وہ کیا جس کی کبھی ہم نے توقع بھی نہیں کی تھی
 خوش رہو۔“

(4) شعلہ میں چھپنے والے تمام ناول اعلا ہوتے
 ہیں۔ بہت سے ناول پسند آئے۔ فرحت اشتیاق،
 شازیہ چودھری، ساجدہ حبیب، عمیرہ احمد، ہما کوکب
 اور اب نمودی۔ شازیہ چودھری کی ہر ہیروئن کا کردار
 خود سے ملتا جلتا محسوس ہوتا۔ جانے کیوں شازیہ جی!
 کیوں اتنی جلدی موت کی واوی میں چپکے سے اتر
 گئیں۔ دشت و فا کے مسافر، شرول کے دروازے،
 آپٹل میں جگنو۔ ان کی ہر تحریر کو بہت پڑھا اور لا
 جواب پایا۔ ام مریم بھی اچھا اضافہ ہیں۔ فرحت جی کے
 ناول ”ہم سبز“ اور ”وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر“ کی

صحیح سرائی میں کیا کہوں۔ الفاظ ہی نہیں ہیں۔ ساجدہ
 حبیب کی بنگلہ دلش سے جزی تحریریں دل پہ کیا غضب
 ڈھاتی ہیں غلطوں میں بیان مشکل ہے۔
 (5) ساون۔ خوب صورت موسم جس کے آتے
 ہی جتی یادیں دبے پاؤں چلی آتی ہیں۔ کوئی کتاب ہی جتن
 کر لے اس سے چھٹکارہ ممکن نہیں بقول شاعر۔
 ”اب گھر ہے تنہا یادوں کا اور اس میں ہم رہتے
 ہیں۔“

(6) پسندیدہ شعر کتاب، اقتباس ایک نہیں بہت
 سے ہیں۔
 ساجدہ حبیب کی ہر تحریر جو بنگلہ دلش سے جزی ہو،
 انجانا دکھ، اداسی دے جاتی ہے۔ کراچی کے بدلتے
 گزرتے حالات، خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ بنگلہ دلش
 کے المناک قیام پر فراز کی نظم ”اب کس کا جشن
 مناتے ہو!“ دل پہ نقش ہے اور کراچی کے موجودہ
 حالات کے پس منظر میں سچے پاکستانی کے احساسات کی
 ترجمانی عید اللہ علیم کی نظم ”گویا بیروں تلے زمین کھینچ
 لیتی ہے چند اشعار آپ کی نذر۔“

میں کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
 میرے شہر بل رہے ہیں میرے لوگ مر رہے ہیں
 بھی رہیں تمہیں نائل اس خطہ زمین پر
 وہی خطہ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
 کوئی اور تو نہیں ہے پتہ خنجر آہنگی
 ہم ہی قتل ہو رہے ہیں ہم ہی قتل کر رہے ہیں
 پسندیدہ کتاب۔ شہاب نامہ اور بلنگی۔
 پسندیدہ اقتباس۔ بہت مشکل ہے کسی ایک کو
 چننا۔
 ”وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر“ عنوان سمیت بے
 حد پسند آیا تھا۔ فریا کا اپنی ماں کے وعدے کو نبھانا اور پھر
 عزم کرنا۔
 ”اگر مجھ سے چننے کو کہا جائے ایک رشتہ یا بہت
 سے رشتے تو ہر بار میرا انتخاب ہوگا بہت سے رشتے۔“



ستارہ

یہ اس وقت کی دہلی سے جب نادر شاہ درانی کی بے وفائی نے قتل سلطنت کو ہلا کر رکھا ہوا تھا۔

محمد شاہ، فرہاد روئے ہند کا براہِ عمل ہو چکا تھا۔ اسے تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کہا گیا ہے۔ وہ ایک احمق اور عیاش بادشاہ تھا۔

اس روز نادر شاہ خاصا خوش تھا۔ اس کا لشکر دہلی سے ذرا فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ نوروہ فرہاد روئے ہند کی جانب سے ان تحائف کا بھکر تھا۔ جس کا وعدہ اس شکست خوردہ حکمران نے کر رکھا تھا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے خیمے کا پردہ ہٹا اور اس کے خدام خاص نے بتایا کہ تحائف آگئے ہیں۔

”تفصیل؟“ نادر شاہ نے دریافت کیا۔

”ایک ہانسی، ایک درجن گھوڑے، پچاس غلام اور درجن بھر حسین و جمیل ہندی دوشیزائیں۔“

یہ سب کچھ دیر میں پہنچے تھے اور نادر شاہ اس تاخیر پر اندر ہی اندر برہم تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نادر شاہ نے ان کا معائنہ دوسری صبح پر ملتوی کر دیا لیکن عورتیں۔۔۔

نادر شاہ نے ہندی عورتوں کے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور اس طرف چلا جہاں یہ عورتیں رکھی گئی تھیں۔

جس خیمے میں وہ پہنچا وہیں داخل ہوتے ہی نادر شاہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا یہاں معاملہ اس سے بھی سوا تھا۔ لگتا تھا ایک ہی جگہ پر بہت سے چاند نکل آئے ہوں۔ ہر حسینہ دوسری سے بہتر کر لگ رہی تھی۔

نادر شاہ انہیں دیکھا اور توتا رہا پھر اس کی نگاہیں

سب کا جائزہ لینے کے بعد ایک چہرے پر آکر رک گئیں۔ لڑکی نے نادر شاہ کو اپنی جانب گھورتے پایا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟“ نادر شاہ نے خواجہ سراسے دریافت کیا جو اس کے عقب میں تگوار سونٹے کھڑا تھا۔

”عالی جاہ! یہ ایک راجپوت دوشیزہ۔“ خواجہ سراسے بتایا۔

”دوشیزہ؟“ اچانک اس لڑکی کے گلاب جیسے لب کھلے اور اس کی طنزیہ تو اڑیلند ہوئی جس میں زبردست بے باکی تھی۔

”غلط! اس نے کہا، میں دوشیزہ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہوں۔“

نادر شاہ کو لڑکی کی دلیری اچھی لگی۔ اس نے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ستارہ! لڑکی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ لڑکی جس کا نام ستارہ تھا، ابھی اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اسے خواجہ سراسے پوچھا تھا۔

”لوہر آؤ۔ میرے قریب۔“ نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی جھجکی اس کے چہرے پر چٹکت اور لوہا سی نے عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ ”حقیقتاً وہ خوف زدہ تھی۔“

اس نے اس ابرائی حملہ آور کی سفاکی کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ مگر اب رہائی کیا تھا، وہ تن بہ نقد پر ہو کر آگے بڑھی۔

”مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“ نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ نسل ”راجپوت“ ہے۔ وہ

چھوٹی ہی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پھر اس کی

فورا تمہیں اپنے پاس بلواؤں گا۔
پھر اس نے وہ ہیرا نکال کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ
دیا۔

اس ہیرے کی ضرورت ستارہ کو جلد ہی پیش آئی۔
اسے خبر ملی تھی کہ نادر شاہ نے دلی کے شہروں کے قتل
عام کا حکم دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نادر شاہ کا
غصہ کیا معنی رکھتا ہے۔ زندگی بھر موت کا کھیل اس
کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

ستارہ کو دلی سے چار تھا۔ اس جگہ اس نے اپنے
دن گزارے تھے اور اس کی بہت سی محبوب شخصیتیں
یہاں تھیں۔ وہ اس قتل عام کو رونا چاہتی تھی۔ جس
کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے آغا باشی کو طلب کیا
اور ہیرا نادر شاہ کے پاس بھجوانے کے لیے قاصد
دوڑایا۔

یہ ستارہ ہی تھی جس کی التجار نادر شاہ کی تلواریں
میں تھی تھی۔ پھر بھی اس عرصے میں دلی کے قتل کو جوں
میں خون ہی خون پھیل چکا تھا۔ یہ اتنا بڑا قتل عام تھا کہ
آئینہ میں اس کی نظیریں کم لگتی ہیں۔

نادر شاہ نے دلی کی سلطنت کو اچھی طرح پاہل
کرنے کے بعد بے شمار مل قیمت کے ساتھ اپنے
ملک واپسی کا سفر شروع کیا تو ستارہ اس کے ساتھ تھی۔
نادر شاہ ہرات پہنچا تو معلوم ہوا نادر شاہ کا بیٹا اور دلی
عہد شکنوں نے رضا خان اسٹیل کے لیے آ رہا ہے۔

نادر شاہ کو بیٹے سے جدا ہونے دو سہل سے زائد
ہو چکے تھے۔ فطری بات تھی کہ وہ بیٹے کو دیکھنے کا متنی
تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس عرصے میں
شہزادے نے اپنی لیاقت سے ملک کا انتظام بہت عمدگی
سے سنبھالا تھا۔

اس جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ شہزادے کی تعریفیں
سن سن کر نادر شاہ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں بیٹا
غور میں آکر کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ کچھ لوگوں کی
سازش اس کے پس پر وہ تھی۔ اور انہوں نے شہزادے
کے اندر بھی یہ خیال ڈال دیا تھا کہ نادر شاہ آتے ہی

شادی ایک مثل سپاہی سے کر دی گئی۔ جس کے گھر
سے وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلی تھی۔ اسے ایک تاجر
گھرانے نے پناہ دی۔ یہ گھرانہ اسے ولی لایا۔ یہاں
بادشاہ کی ایک ملکہ نے اسے پسند کر لیا اور وہ شاہی محل
میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ اب تک ایک کینز کی حیثیت سے
رہ رہی تھی۔

نادر شاہ اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بچی عمر کا
آدی تھا، فولادی ذہن کا۔ مگر یہ لڑکی کسی بھادو کی طرح
اس کے سرخہ لگتی تھی۔
اچانک اس نے نرمی سے کہا۔

”ہاں کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرتی ہو؟“

ستارہ کا جسم آہستہ سے لرز اٹھا۔ وہ کسی بوجھ کو
محسوس کرتے ہوئے ڈگمگائی اور وہیں فرش پر ڈھیر
ہو گئی۔

یہ تقدیر کا ایک کھیل تھا۔
وہ جو لوہڑی بنا کر دشمن کے حوالے کر دی گئی تھی۔
ایک دم سے ایک انتہائی پاجبوت بادشاہ کی ملکہ بن گئی
تھی۔

مگر اس جگہ ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کا نام
شیرازی تھا۔

شیرازی وہ عورت تھی جو اب تک نادر شاہ کی سب
سے زیادہ منظور نظر ہونے کا شرف رکھتی تھی۔
ستارہ کی آمد نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ
لی تھی اور وہ کسی ناگن کی طرح حصے سے مل کھاری
گئی۔

پھر ستارہ کو خبر ملی کہ نادر شاہ کا لشکر اب دلی کی طرف
روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو پیچھے ہی
رکھے رہنا تھا اور اس میں نادر شاہ کا حرم بھی شامل تھا۔

پھر نادر شاہ نے اسے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک شاید
اس سے دور رہے گا۔ اس نے کہا ”تم پریشان نہ ہو۔
میں ایک ہیرا تمہیں دے رہا ہوں یہ ایک خاص نشان
ہے۔ اگر تمہیں کبھی میری سخت ضرورت محسوس ہو تو
اسے کسی قاصد کے ذریعے میرے پاس بھیج دینا۔ میں

نادر شاہ کے خیمے میں دشمن کا آدمی گھسا اور اس کے
 منجھرنے پیشہ کے لیے اس شخص کو دنیا سے رخصت
 کر دیا جس نے شک و شبہ اور حکومت و اقتدار کی لپیٹ
 میں آکر نہ صرف اپنے جیتے بیٹے کو اندھا کر دیا تھا بلکہ
 ایک باوقار بیوی پر الزام لگا کر اسے قید تھائی میں ڈال دیا
 تھا۔
 ستارہ نے نادر شاہ کی لاش کو دیکھا۔ پھر اس نے
 نہایت سکون سے اپنی بیٹی سے منجھرنے لگا اور وہیں اپنے
 سینے میں گھونپ لیا۔



تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی ہے کہ ستارہ کیا
 واقعی نادر شاہ کی ایک باوقار بیوی تھی یا یہ حقیقت ہے
 کہ وہ ولی عہد رضا خان کے سامنے دل مار گئی تھی۔ اور
 اس کے اندھا ہو جانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر
 خود کشی کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسی نیت
 سے نکلی تھی کہ وہ نادر شاہ کو ختم کر کے خود اپنا خاتمہ
 کر لے گی۔ مگر یہ تمام باتیں غیر تصدیق شدہ ہیں۔
 محقق نے ستارہ اور رضا خان کے درمیان کا ذکر ضرور کیا
 ہے۔ اور لکھا ہے کہ نادر شاہ کی اس محبوبہ ہی کی وجہ
 سے رضا خان نے اپنی آنکھیں گنوا لی تھیں اور بوڑھے
 نادر شاہ کی موت میں ستارہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

اسے پھر ایک اپنی عہدے دار میں بدل دے گا۔
 پھر ایک روز خلوت میں نادر شاہ نے جب اپنے
 شہادت کا تذکرہ ستارہ سے کیا تو اس نے شنوارے کی
 طرف داری میں اسے سمجھانا شروع کر دیا اس کا نتیجہ
 یہ نکلا کہ وہ سمجھایا یہ عورت شنوارے سے مل گئی ہے۔
 بد قسمتی سے کن ہی دنوں نادر شاہ پر ایک قاتلانہ
 حملہ ہوا۔ جو ناکام رہا۔ شیرازی نے نادر شاہ کو پٹی پڑھائی
 کہ یہ حرکت شنوارے کی ہے جو اب خود بلو شاہ بننا چاہتا
 ہے۔

اور ستارہ نے اس خیال سے کہ باپ بیٹے کی دشمنی
 طول نہ پکڑے۔ نادر شاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ بلا
 تحقیق شنوارے کو مورد الزام قرار نہ دے۔ بات شاید
 خراب نہ ہوتی اگر شیرازی نے نادر شاہ کے دل میں
 ایک خیال اور نہ ڈال دیا ہو تاکہ ستارہ شنوارے کی
 محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ ستارہ کی اس سفارش نے
 نادر شاہ کے اندر اور زہر پھیلا دیا۔ اس نے جیج کر کہا۔
 ”میں رضا خان کو اندھا کرانے جا رہا ہوں تاکہ یہ
 فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔“
 ستارہ یہ سن کر دل گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے
 ہوئے کہا۔

”شاہ! رحم کریں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اسے
 اندھا کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔“
 نادر شاہ نے غصے سے ستارہ کو دیکھا اور اسے زور
 سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر جا گری۔
 آغا پاشا نے نادر شاہ کے حکم پر اسے محل سے
 دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

نادر شاہ بے حد چڑچڑا ہوا چکا تھا اور ملکی مسائل میں
 اس طرح دھنس گیا تھا کہ اس نے ستارہ کے بارے
 میں لپیٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ تب وہ ایک روز خود ہی
 نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نادر شاہ سے ملنے چلی تو آغا بہت
 سخت پریشان ہوا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ نادر شاہ
 اسے مروا بھی سکتا ہے مگر وہ نہ مانی۔
 اسی رات!



سراوق کی شخصیت

ماڈل -----
 میک اپ ----- روز بیوی پارر
 فونو گرافر ----- موسیٰ رضا



موسم کے پکوان

خالد جیلانی

ترکیب :
 چکن بریسٹ ہمسز کو چھری سے گوویس یا چاشنا کر لیں۔ پھر نمک، لال مرچ اور سرکہ میں لپیٹ کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد میدے میں رول کریں پھر اتنے میں ڈبو کر کارن فلیکس میں لپیٹ کر گرم تیل میں فرائی کر لیں۔ مایونیز اور چلی گارلک ساس کو مکس کر لیں۔ بین رنگ میں پھر سلاوا کا پتا چکن کا پیس اور چیز کا سلاکس رکھیں۔ برگر تیار ہے۔ فریج فرائز اور سلاو کے ساتھ پیش کریں۔

سرخ پیچن

ضروری اجزا :
 سو اگلو
 تھن یاؤ
 ڈیزل کپ
 چکن
 چاول
 دودھ

زنگر رگر

ضروری اجزا :
 چکن بریسٹ ہمسز
 لال مرچ
 سرکہ
 اینڈے
 میدہ
 کارن فلیکس
 سلاو کے پتے
 سلاکس چیز
 مایونیز
 چلی گارلک ساس
 بند
 نمک تیل
 چار عدد
 ایک کھانے کا چمچ
 دو کھانے کے چمچے
 دو عدد
 چار کھانے کے چمچے
 دو کپ
 چار عدد
 چار عدد
 آٹھا کپ
 دو کھانے کے چمچے
 چار عدد
 حسب ذائقہ و ضرورت

دو کھانے کے چمچے	لسن اور ک پیٹ	توہا کلو	چینی
دو کھانے کے چمچے	سویا ساس	چار کھانے کے چمچے	سکشش بادام
آٹھ عدد	ہری پاز	ایک چمکی	زعفران
ایک کپ	مائیٹیز	ایک عدد	پاز
چار عدد	انڈے	دو دو کھانے کے چمچے	کیوٹہ لیموں کارس
حسب ضرورت	بریڈ کرمبز	حسب ذائقہ	نمک
حسب ذائقہ	نمک	ایک سے ڈیڑھ پاؤ	تھمی

ترکیب :

چکن میں نمک، لسن اور ک اور سویا ساس ڈال کر اہل لیس پھر ریشے کر لیں۔ آلو اہل کر چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ گاجر کو کدو کش کر لیں۔ ہری پاز اور ہری مرچ باریک کاٹ لیں۔ چکن کے ریشے آلو، گاجر، ہری مرچ، ہری پاز میں مائیٹیز ڈال کر گھس کر لیں۔ کباب بنا کر بریڈ کرمبز میں کوٹ کریں پھر انڈے میں ڈبو کر فرائی کر لیں۔ مزے دار چکن دیجی نیبل کباب تیار ہیں۔ نمٹو کہ چھپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کدو کا طوطو

ضروری اجزاء :

کدو	ایک کلو
چینی	توہا کلو
تھمی	ایک پاؤ
بادام پستے	حسب ضرورت
الائیچی	چند دانے

کدو کو چھیل کر بیج الگ کریں اور کش کر لیں۔ تھمی میں الائیچی دانے کڑکرائیں۔ کش کیا ہوا کدو ڈال کر ہلکی آگ پر پختے کے لیے رکھ دیں۔ گل جائے تو کھوٹ لیں پھر چینی ڈال کر پکائیں۔ شیرہ گاڑھا ہونے لگے تو بھون لیں۔ تھمی چھوڑنے لگے تو کیوٹہ ڈال کر اتار لیں۔ پھر ڈش میں نکال کر بادام پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

چاول تو ساخنہ بھگونے کے بعد نمک کے ساتھ ایک گنی اہل کر نتھار لیں اور پھیلا دیں۔ دودھ میں چینی ڈال کر پکا میں اور گاڑھا سا شیرہ بنا لیں۔ چکن میں چھ گلاس پانی، لسن کے چھ جوئے، پاز، نمک اور ایک چمچے سونف ڈال کر پکائیں۔ ایک کپ تخنی رہ جائے تو اتار لیں۔ بڑی پیمانی میں تھمی گرم کر کے الائیچی کڑکرائیں پھر تھمی سے چکن کے ٹکڑے نقل کر ڈال دیں۔ آہستہ آہستہ بھوننے کے بعد شیرہ ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد چاول بھی ڈال دیں۔ لیموں کارس، سکشش اور بادام (دو ٹکڑے کر کے) بھی ڈال دیں۔ ساتھ ہی تخنی بھی ڈال دیں۔ پانی قدرے خشک ہونے لگے تو زعفران کو کیوٹے میں گھول کر چھڑک دیں پھر دم لگا دیں۔ بیس منٹ بعد ٹرے میں نکال کر روٹیاں نمائیاں کر کے اوپر رکھیں۔

بالائی اور پستے ہوئے کھوٹے میں کیوٹہ اور بادام ہیں کر شامل کر لیں یا بادام اور ایلے ہوئے چھوہارے باریک لٹر کر ڈال دیں۔ یہ اضافی ڈش ہے جو تخنجن کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ اس کے بغیر بھی تخنجن پیش کیا جاسکتا ہے۔

چکن دیجی نیبل کباب

ضروری اجزاء :

چکن	ایک کلو
آلو	آوہا کلو
گاجر	آوہا کلو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



طوری چینی ہند پر ہوتے ہیں۔

علاج

چہ۔ کسی اچھے صابن سے دھوئیں۔ کلیرنگ کریم
کی مدد سے چہ۔ کا اچھی طرح سے مساج کریں پھر نشوونما
سے صاف کریں۔ تو لے کر گرم پانی میں جھلک کر چہ پر

بھاپ دیں۔ تاکہ سب مسام کھل جائیں۔ اس کے بعد
چہرے کو احتیاط سے روئی کی مدد سے صاف کریں تاکہ
مساموں میں کلاماوا نرم نہ جائے

خشک جلد کے لیے ہدایات اور علاج

چہ پر اگر جھڑیاں جلد کی خشکی کی وجہ سے وقت سے
پہلے نہ ہوں تو چہرے کو دھوپ کی تمنا سے بچائیں۔

جان بگاندی کیوں کے رس کو نچوڑ کر شہد میں ملا کر
چہرے پر لٹیں۔ ہندوہ منٹ کے بعد چہرہ دھوئیں اور
زیتون کے تیل میں بالائی کی کریم ملا کر دس منٹ ماسج
کریں۔ ماسک میں بادام کو پیس کر لپیٹ کریں۔ یہ استہالی
مفید ماسک ہے۔

چھانکوں چہرے کو دھوپ سے بچائیں۔ چہرہ صاف
رکھیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت کلیرنگ کریم سے
چہرے کی ماسج کریں۔ تازہ سبزیوں، فروٹ میں سیب اور
دھنن کی جن پھلوں میں زیادہ پائے جائیں استہالی
کریں۔

ماسک کی تیاری

شہد ماسک یہ ماسک نرم جلد اور جھڑیوں کے لیے
ہے اس کے لیے شہد میں چند قطرے کیوں کا عرق اچھی
طرح سے ملائیں اور چہرے پر تین منٹ تک ربت دیں اور
پھر اسکن ٹانگ لگا کر روئی کی مدد سے اتار دیں۔

انڈے کا ماسک۔ یہ ماسک زیادہ عمر کی خواتین کے لیے
ہے ایک انڈے لیں۔ اس کی سفیدی میں ایک چمچ کھیر
کا عرق اور ایک چمچ رووہ کی پوائی اچھی طرح سے ملائیں
چہرے پر لٹیں اور چہرے پر لٹیں اور توجہ دیکھتے تک
رہیں اور اس کے بعد لٹھ۔ پانی سے چہرہ دھوئیں۔



جھڑیاں

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جھڑیاں یا پاپلیس جھڑیاں کی عمر
سے جھڑیاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اختراٹ اور صبح نڈانہ
منٹ کی وجہ سے بھی چہرے پر جھڑیاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں
اور عمر زیادہ گتے نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ جلد کی خشکی کی وجہ
سے بھی جھڑیاں پڑ جاتی ہیں۔

علاج

اگر تھکرات اور صبح نڈانہ منٹ کی وجہ سے جھڑیاں
پڑ جائیں تو جلد کا کسی اچھی چہرہ ٹنک کریم سے مساج
کریں۔ گرمی اور پوری خند لیں اور پورا آرام کریں۔
اچھی خوراک جس میں پروٹین بہت زیادہ ہو پھانسی ہے
و استہالی کریں۔

ماسک

بادام باریک پیس کر رووہ میں ملا کر نرمی صورت میں
لٹائیں۔ تین منٹ کے بعد چہرہ دھوئیں۔ اس کے علاوہ
فروٹ کے کھٹ کر کے چہرے پر آہستہ آہستہ لٹیں۔
اس سے جلد تازہ ہو جائے گی۔

چھانک

پہلے یہ ہلکے دھوپ کی صورت میں چہرے پر نظر آتی ہیں
پھر چھانکوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جب چہرے پر
چھانک پڑ جائیں تو چہرے کو دھوپ سے بچائیں اور چہرہ
پر پاپیٹ کریم لگائیں۔ بادام باریک پیس کر رووہ اور کیوں
استہالی کریں۔ بادام کو پیس کر اس میں باریک اور رووہ ملا کر
چہرے پر لٹائیں اور اس میں چند قطرے کیوں کے لٹائیں یہ
چھانکوں کے لیے مفید ہے۔

کھلیں

خست دھوپ کرنی اور نیت سے چہرے کے مسام کھل
جاتے ہیں اور ان میں میل پھیل بھر جاتا ہے۔ ہرگز اور
نیت ہوا بن جاتا ہے۔ اسے ایک بیٹھتے ہیں۔ یہ عام